مستقبل کا صدمہ

ایلون ٹوفلر

مترجم: نیّر عباس زیدی

مقتدرہ قومی زبان ☆ پاکستان

ایلون ٹوفلر

مترجم نیّر عباس زیدی

مقتدرہ قومی زبان

Alvin Toffler

Translated by:
Nayyar Abbas Zaidi
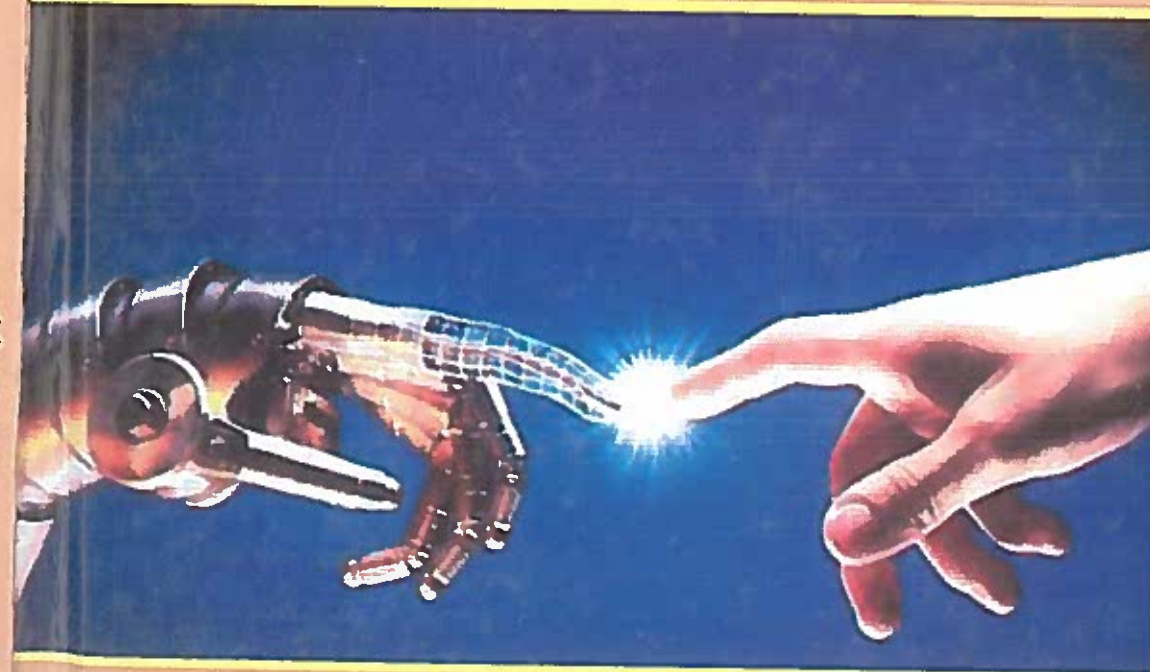
National Language Authority Pakistan

مستقبل کا صدمہ

ایلون ٹوفلر

ترجمہ

نیر عباس زیدی

نظرثانی

ڈاکٹر انجم حمید

مقتدرہ قومی زبان ☆ پاکستان

بسلسلہ درسیات: طبیعات

عالمی معیاری کتاب نمبر ISBN ۹۷۸-۹۶۹-۴۷۴-۲۷۹-۳

☆

طبع اوّل	....	۲۰۱۱ء
تعداد	....	۲۰۰۰
قیمت	....	=/۴۳۰ روپے
اہتمامِ اشاعت	....	عبدالرحیم خان
طابع	....	ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی
ناشر	....	افتخار عارف صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، ایوانِ اُردو، پطرس بخاری روڈ، ایچ۔۸/۴، اسلام آباد، پاکستان۔

☆

مطبوعات ترقیاتی منصوبہ : ۲۱
کابینہ ڈویژن، حکومت پاکستان
''سائنسی، تکنیکی وجدید عمومی موادِ مطالعہ کی قومی زبان (اُردو) میں تیاری''

پیش لفظ

سائنس و ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی نے نہ صرف انسانی زندگیوں پر اثرات مرتب کیے ہیں بلکہ انسانی اقدار کو بھی تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

ایلون ٹوفلر (Alvin Toffler) نے انہی تبدیلیوں کو محسوس کرتے ہوئے اتنے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور "Future Shock" کے عنوان سے ایک نہایت قابلِ قدر کتاب تصنیف کی ہے۔ مصنف نے مستقبل میں ظہور پذیر تبدیلیوں اور ان سے متاثرہ افراد کی کیفیات کو بیان کیا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔

اگرچہ اس کتاب سے پہلے بھی متعدد دانشوروں نے مستقبل اور اس میں ظاہر ہونے والی تبدیلیوں کے موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن ٹوفلر نے نہایت باریک بینی سے اپنی کتاب میں زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی لیے یہ کتاب جہانِ علم و دانش میں دلچسپی اور پسندیدگی کا سبب بنی ہے۔

مقتدرہ قومی زبان کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ اس نوعیت کی کتب کو اُردو ترجمے کی صورت میں منظر عام پر لایا جائے۔ اسی نقطۂ نظر سے مذکورہ بالا کتاب کا اُردو ترجمہ بعنوان ''مستقبل کا صدمہ'' پیش کیا جا رہا ہے۔ اُردو زبان کے فروغ کے لیے تراجم کی ضرورت اور اہمیت کا احساس اس زبان کے علمی دنیا میں داخل ہونے کے ساتھ ہی کر لیا گیا تھا اور انہی تراجم نے گنجینۂ اُردو کو گراں بہا آثار سے مالا مال کیا ہے۔ تراجم کے بغیر شاید اُردو زبان علمی موضوعات کی ان وسعتوں اور بلندیوں سے ہمکنار نہ ہو سکتی جن پر آج وہ نظر آ رہی ہے۔ یہ اس کے لیے باعث اعزاز و عظمت ہے۔

پیش نظر کتاب کا اُردو ترجمہ جناب سید نیر عباس زیدی نے نہایت محنت اور لگن سے کیا ہے جس کے لیے وہ بجا طور پر تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔ ادارہ ان کی خدمات کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے یہ کتاب ہمارے قارئین کے لیے باعث دلچسپی ہوگی۔

—— افتخار عارف

فہرست

☆☆☆

تعارف

تبدیلی سے متاثر ہونے کے بعد متاثرہ افراد جس کیفیت سے گزرتے ہیں، یہ کتاب اسی کیفیت کی وضاحت سے متعلق ہے۔ یہ ان طریقوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے سے متعلق ہے جن کے تحت ہم مستقبل سے مطابقت پیدا کرنے میں کامیاب یا ناکام ہوتے ہیں۔

مستقبل یا آنے والے کل کے بارے میں اس سے پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تاہم لکھی جانے والی ان کتب میں سے اکثر سخت ناگوار موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر آئندہ کے صفحات میں آنے والے کل کے بارے میں خوشگوار ''انسانی پہلو'' کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اس کتاب کا مقصد ان اقدامات پر روشنی ڈالنا بھی ہے جن کے ذریعے ہم آئندہ ''کل'' تک پہنچ پائیں گے۔ یہ صفحات عام اور روزمرہ معمولات سے متعلق ہیں یعنی وہ اشیا جو ہم خریدتے یا مسترد کرتے، وہ مقامات جو ہم پیچھے چھوڑ دیتے ہیں، ایسے ادارے جن میں ہم موجود ہوتے ہیں یا ایسے لوگ جو ایک جھونکے کی مانند ہماری زندگی میں داخل ہو کر نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح دوستی اور گھریلو زندگی کی جانچ کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب، نئی نویلی ثقافتوں اور طرز بود و باش کی چھان بین کی گئی ہے، جس میں سیاست اور کھیل کے میدانوں سے لے کر فضائی کرتب اور جنس جیسے موضوعات کی صف بندی شامل ہے۔

مذکورہ تمام باتوں کو جو چیز زندگی کی طرح ایک کتاب کی صورت میں پروتی ہے...... وہ تبدیلی کی ایک اتنی طاقتور طوفانی لہر ہے، جو اداروں کو درہم برہم، اقدار کو تبدیل اور ہماری جڑوں کو ناکارہ کر دیتی ہے۔ تبدیلی ہی وہ مرحلہ ہے جس کے ذریعے مستقبل ہماری زندگیوں پر دھاوا بولتا ہے۔ لہٰذا اس کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا مشاہدہ کیا جائے جو اس تجربے سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے عہد میں تبدیلی کی شرح، رفتار کے بجائے خود ایک عنصری قوت ہے۔ اس تیز رفتار دھچکے کے، ذاتی اور نفسیاتی اثرات کے ساتھ ساتھ عمرانیاتی اثرات بھی ہوتے ہیں۔ اگلے صفحات میں پہلی مرتبہ تیز رفتاری کے ان اثرات کا ایک ترتیب کے تحت تجزیہ کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ کتاب بڑے مدلل انداز میں اس بات کو بیان کرتی ہے کہ جب تک انسان اپنے

ذاتی اور خصوصاً، معاشرتی معاملات میں تبدیلی کی شرح پر فوری کنٹرول کرنا نہیں سیکھے گا اس وقت تک ہم مطابقت پذیری کے شدید تعطل کے سزاوار ٹھہرتے رہیں گے۔

میں نے ۱۹۶۵ء میں ''ہورائزن'' (Horizon) نامی رسالے میں چھپنے والے ایک مضمون میں سب سے پہلے ''مستقبل کے صدمے'' کی اصطلاح متعارف کروائی کہ جس کے ذریعے اس ریزہ ریزہ ہوتے دباؤ اور بے سمتی کو بیان کیا جا سکے جو انتہائی قلیل وقت میں بہت زیادہ تبدیلی کا سامنا کرنے کے باعث افراد میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تصور سے مسحور ہونے کے بعد میں نے آئندہ کے پانچ سال مختلف یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں، سائنسی تجربہ گاہوں اور مختلف حکومتی ایجنسیوں کے تحقیقی مراکز کے مطالعاتی دورے کرنے میں گزارے اور وہاں لاتعداد مضامین اور سائنسی مقالوں کا مطالعہ کیا اور عملاً بے شمار ایسے افراد کے انٹرویو بھی کیے جو تبدیلی کے مختلف پہلوؤں، تعاونی کردار اور ''مستقبل'' سے متعلق امور کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اس ضمن میں نوبل انعام یافتگان، آزاد منش افراد، ماہرین نفسیات، ڈاکٹروں، تاجروں، پیشہ وروں، پیروکاران مستقبلیت، فلسفیوں اور معلمین نے تبدیلی کے موضوع پر اپنی اپنی آراء دیں، مطابقت پذیری پر اپنے اندیشوں کا اظہار کیا اور مستقبل کے بارے میں اپنے خوف کا ذکر کیا۔ اس تجربے سے دو پریشان کن حتمی آراء سامنے آئیں۔

اس دوران پہلی بات تو یہ عیاں ہوئی کہ ''مستقبل کا صدمہ'' اب کوئی فاصلاتی اور امکانی خطرہ نہیں رہا بلکہ یہ ایک حقیقی بیماری کی صورت اختیار کر گیا ہے جس میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد گرفتار ہو چکی ہے۔ اس نفسیاتی...... حیاتیاتی صورت حال کو طبی اور نفسیاتی اصطلاحات کے ذریعے زیادہ بہتر انداز میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ ہی تبدیلی کی بیماری ہے۔

دوسری بات جو سامنے آئی اور جس سے میں مزید خوفزدہ ہو گیا وہ یہ کہ مطابقت پذیری سے متعلق لوگوں کی معلومات کس قدر کم ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ہمارے معاشرے میں تبدیلیوں کو دعوت دیتے یا تبدیلیاں لاتے ہیں بلکہ ان لوگوں کو بھی جو ہمیں ان تبدیلیوں سے مطابقت پیدا کرنے کی تربیت دیتے ہیں، بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ مستعد دانشور بڑی بہادری سے ''تبدیلی سے متعلق تعلیم دینے'' یا ''لوگوں کو مستقبل کے بارے میں تیار کرنے'' کی باتیں کرتے ہیں لیکن انھیں یہ بالکل معلوم نہیں کہ یہ کام عملی طور پر کیسے کیا جائے۔ تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے ایک ایسے ماحول میں جس کا سامنا اس سے پہلے انسان کو کبھی نہ تھا۔ یہ سماجی جانور آپس میں کس طرح تعاون کرتے ہیں۔

ہمارے ماہرین نفسیات اور سیاست دان مختلف افراد اور گروہوں کی طرف سے تبدیلی کے خلاف بڑھتی ہوئی غیر منطقی مدافعت کی وجہ سے پریشان ہیں، مثلاً کسی ادارے کا سربراہ جو اپنے ادارے کی تنظیم نو کرنا چاہتا ہے یا ایک معلم جو تدریس کا کوئی نیا طریقہ متعارف کروانا چاہتا ہے یا کسی شہر کا میئر جو اپنے شہر میں آباد مختلف نسلوں کو پُرامن رکھنے کے لیے ان میں یک جہتی پیدا کرنا چاہتا ہے...... ان تمام لوگوں کو کسی نہ کسی وقت اس ان دیکھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ ہمیں اس کے ماخذ کے بارے میں معلومات کم ہی ہیں تاہم انہی حالات میں کچھ لوگ بھوک و افلاس کا شکار کیوں ہوتے ہیں اور تبدیلی لانے کی خاطر شدت پسندی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں، اپنی قوت و صلاحیت کے مطابق اسے تخلیق کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، جبکہ دیگر افراد اس سے گریز کرتے ہیں؟ مجھے ان سوالات کے مناسب جوابات نہیں ملے بلکہ یہاں یہ بات بھی عیاں ہوئی کہ ہمارے پاس مطابقت پذیری سے متعلق کسی موزوں نظریے کا فقدان ہے۔ اس کے بغیر یہ بات خلاف قیاس ہے کہ ہمیں ان چیزوں کے کوئی واضح جوابات مل سکیں گے۔

لہٰذا اس کتاب کا مقصد مستقبل سے رشتہ استوار کرنے میں لوگوں کی مدد کرنا، ذاتی اور سماجی تبدیلیوں کا مؤثر انداز میں مقابلہ کرنا ہے، ہمارے اس ادراک کی گہرائی کے ذریعے کہ لوگ تبدیلی پر کس قسم کے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، اس جانب بڑھتے ہوئے مطابقت پذیری کا ایک نیا اور وسیع نظریہ سامنے لاتا ہے۔

یہ کتاب ہماری توجہ ایک اہم، لیکن عمومی طور پر نظر انداز شدہ ''امتیاز'' کی طرف مبذول کرواتی ہے۔ غیر متغیر تبدیلی کے اثرات کی تحقیقات کا مرکز و محور وہ منزل ہوتی ہے جس کی طرف تبدیلی ہمیں لے کر جاتی ہے نہ کہ سفر کی رفتار جو منزل نہیں ہوتی۔ اس کتاب میں، میں نے یہ وصف اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ شرح تبدیلی کے مضمرات تبدیلی کے رُخ سے علیحدہ ہوتے ہیں اور کبھی کبھار یہ شرح اس رخ سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ جب تک اس حقیقت کا ادراک نہ کیا جائے کہ مطابقت پذیری کو سمجھنے کی کوئی کوشش اس وقت تک کارگر ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ تبدیلی کے ''مواد'' اور اس کی وسعت کو واضح کرنے کی کوئی بھی کوشش اپنے اندر، اس ''مواد'' کے جزو کے طور پر، رفتار کے اثرات سموئے ہوئے ہوتی ہے۔

مشہور نظریہ ساز ولیم آگبرن نے ثقافتی پسماندگی سے متعلق اس بات کی بہت ہی بہتر انداز میں نشاندہی کی ہے کہ معاشرے کے مختلف شعبوں میں ہونے والی غیر متناسب شرح تبدیلی سے معاشرتی دباؤ کس

طرح پیدا ہوتا ہے۔ ’’مستقبل کے صدمے‘‘ کا تصور...... اور اسی سے اخذ شدہ نظریۂ مطابقت پذیری..... اس بات پر زور دیتا ہے کہ نہ صرف مختلف شعبوں میں شرح تبدیلی میں ایک خاص توازن ہونا چاہیے بلکہ ماحولیاتی تبدیلی کی رفتار کے ساتھ ساتھ نسانی ردِّ عمل کی محدود رفتار میں بھی توازن ہونا چاہیے کیونکہ ان ہی دو چیزوں کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے کی وجہ سے ’’مستقبل کا صدمہ‘‘ پیدا ہوتا ہے۔

اس کتاب کا اصل مقصد ایک نظریہ پیش کرنے سے بڑھ کر ایک مفید طریقہ کار پیش کرنا ہے۔ ماضی میں انسان زمانۂ حال پر تبصرہ کرنے کے لیے ماضی کا مطالعہ کرتے تھے۔ میں نے وقت کے دھارے کا رخ یہ سمجھ کر تبدیل کرلیا ہے کہ مستقبل کی ایک مدلل تصویر ہمیں ’’آج‘‘ سے متعلق قیمتی وجدان عطا کرسکتی ہے۔ مستقبل کو ایک دانشورانہ وسیلے کی حیثیت دیے بغیر ہمیں اپنے ذاتی اور عوامی مسائل سمجھنے میں خاصی دشواری پیش آئے گی۔ اگلے صفحات میں، میں دانستہ طور پر اس وسیلے کو تصرف میں لا رہا ہوں تاکہ یہ ثابت کرسکوں کہ اس سے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔

آخری نکتہ جو اہمیت میں کسی بھی طور پر دوسروں سے کم نہیں، وہ یہ ہے کہ یہ کتاب قاری کو ایک غیر محسوس انداز میں مستقبل میں ہونے والی تبدیلی کی طرف لے جاتی ہے اور جس کی وضاحت بہتر انداز میں آنے والے صفحات میں ہوجائے گی۔ تیزی سے وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی کے ساتھ کامیاب مسابقت کے لیے ہم میں سے اکثر افراد کو مستقبل کے حوالے سے ایک نئے رویے کی ضرورت ہے، زمانۂ حال میں ادا کیے جانے والے کردار سے متعلق ایک نیا، حساس ادراک...... اس کتاب کا مقصد قاری کی مستقبل سے متعلق آگاہی کو بڑھانا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ لینے کے بعد ایک عام قاری، مستقبل کے واقعات کے حوالے سے، اپنے اندر سوچنے، سمجھنے، قیاس کرنے اور پیش بینی کرنے کی جتنی زیادہ صلاحیت محسوس کرے گا، اتنی ہی اس کتاب کی افادیت واضح ہوتی جائے گی۔

بیان کیے گئے مذکورہ اہداف کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں بہت سے تحفظات بھی موجود ہیں۔ حقیقت کو فنا پذیری سے متعلق بھی سروکار ہونا چاہیے۔ ہر تجربہ کار رپورٹر کو کسی ایسی ’’اہم ترین‘‘ خبر پر کام کرنے کا اتفاق ضرور ہوا ہوگا جس کے بارے میں یہ گمان ہو کہ اس خبر کے الفاظ ضبطِ تحریر میں لانے سے پہلے ہی صورتِ حال تبدیل ہوجائے گی اور آج پوری دنیا ایسی ہی کسی خبر کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ لہٰذا یہ بات اس کتاب پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ غالب امکان ہے کہ اس کتاب کے مکمل کرنے کے دوران جو طویل عرصہ لگا اُس میں

بہت سے حقائق بوسیدگی کے مرحلے میں داخل ہوگئے ہوں، مثلاً وہ پروفیسر صاحبان جن کا تعارف یونیورسٹی ’’A‘‘ کے حوالے سے کروایا گیا ہے، وہ اس عرصے کے دوران یونیورسٹی ’’B‘‘ میں چلے گئے ہوں یا وہ سیاست دان جن کی پہچان ’’X‘‘ کی صورت میں کروائی گئی، وہ اس دوران ’’Y‘‘ کے مقام پر چلے گئے ہوں۔

اگرچہ تحریر کے دوران اس کتاب کو جدید ترین بنانے کی ایک بھرپور شعوری کوشش کی گئی ہے، تاہم اس کے باوجود اس میں پیش کیے گئے بہت سے حقائق یقیناً فرسودہ ہوگئے ہیں (یہ بات یقینی طور پر بہت سی کتابوں پر صادق آتی ہے مگر مصنفین اس پر اظہارِ خیال سے جان بوجھ کر گریز کرتے ہیں)۔ یہاں پر اعداد و شمار کی فرسودگی کی اپنی اہمیت ہے جو اس کتاب میں بیان کیے گئے نظریے ’’تبدیلی کی تیز رفتاری‘‘ پر دلالت کرتی ہے۔ مصنفین کو ’’حقیقت‘‘ سے ہم آہنگ ہونے میں بڑی مشکلات کا سامنا رہا۔ ہم نے ابھی تک ’’حقیقی وقت‘‘ میں کسی بات کا قیاس کرنا، اس پر تحقیق، تحریر اور اسے شائع کرنا نہیں سیکھا۔ لہٰذا قارئین کو چاہیے کہ وہ تفصیلات کی بجائے، خود کو زیادہ سے زیادہ، عمومی موضوع تک محدود رکھیں۔

ایک اور استثنا کا تعلق لفظ ’’گا‘‘ سے ہے۔ کوئی بھی سنجیدہ شخص مستقبل میں ’’پیش گوئیوں‘‘ سے سروکار نہیں رکھتا۔ ایسی چیزوں کو ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے الہامی علوم کے پروگراموں اور اخباری نجومیوں کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ پیش گوئی کی پیچیدگیوں سے ذرا سی بھی واقفیت نہ رکھنے والا، آنے والے کل سے متعلق کامل علم رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ نہایت خوبصورت اور ستم ظریفی سے بھرپور ایک چینی کہاوت ہے کہ: پیش گوئی کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ خصوصاً مستقبل کے بارے میں۔‘‘

اس کا مطلب یہ ہُوا کہ مستقبل سے متعلق ہر بیان کو، اصولی طور پر، ’’اگر‘‘، ’’اور‘‘، ’’لیکن‘‘ اور ’’مزید یہ کہ‘‘ جیسے لاحقہ الفاظ سے بھرپور ہونا چاہیے۔ تاہم اس طرح کی کسی بھی کتاب میں لاحقہ الفاظ کے شامل کیے جانے سے مراد قاری کو ’’ہوسکتا ہے‘‘ کے برفشار تلے دبانے کے مترادف ہے۔ ایسا کرنے کی بجائے میں نے، بغیر کسی پس و پیش کے، بڑی مضبوطی سے بات کرنے کی آزادی کا انتخاب کیا ہے، اور اس سلسلے میں مجھے یقین ہے کہ ذہین قاری اسلوب کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا لفظ ’’گا‘‘ کو ہمیشہ ’’شاید‘‘ یا ’’میرے خیال میں‘‘ کے تناظر میں لینا چاہیے۔ اسی طرح مستقبل کے واقعات کے بارے میں دی گئی تاریخوں کو غور کرنے کے مرحلے سے گزارنے کی ضرورت ہے۔

مستقبل سے متعلق صحت اور یقین سے بات کرنے کی عدم صلاحیت خاموش رہنے کا جواز پیش نہیں

کرسکتی۔ تاہم جہاں کہیں بھی ''ٹھوس اعداد وشمار'' دستیاب ہوئے انھیں بلاشک وشبہ ضبط تحریر میں لایا جانا چاہیے۔ لیکن جہاں کہیں بھی کسی کمی کا سامنا ہوتو ایک ذمہ دار مصنف کو.......... حتیٰ کہ ایک سائنسدان کو بھی.......... یہ حق حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ، اس پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ، تاثراتی یا حکایتی اعداد وشمار اور باخبر لوگوں کی رائے سمیت، دیگر شہادتوں پر انحصار کریں۔ اس کتاب میں، میں نے اوّل سے آخر تک یہ ذمہ داری نبھانے کی کوشش کی اور اس ضمن میں کوئی عذر خواہی بھی نہیں کی۔ مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے، کم از کم مذکورہ مقصد کی خاطر، سو فی صد ''درست'' ہونے کی بجائے پُرتخیل اور صاحبِ بصیرت ہونا زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ غلطیوں کی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے۔ دنیا کے وہ نقشے جو قرونِ وسطیٰ دور کے نقشہ نویسوں نے بنائے، وہ مایوس کن حد تک ناقص تھے، اور ان میں واقعاتی حوالے سے اتنی غلطیاں تھیں کہ آج ان پر صرف مسکرایا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ نئی چیزوں کے متلاشی افراد ان نقشوں کے بغیر نئی دنیا دریافت نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی آج کے عہد میں بہتر اور بالکل درست نقشے تیار کیے جاسکتے تھے تاوقتیکہ قرون وسطیٰ کے افراد، اپنی حدود اور دستیاب شہادتوں کے ساتھ، اپنی ان دیکھی دنیاؤں کے بارے میں اپنے مضبوط تخیلات کو کاغذ پر نقش نہ کرتے۔

ہم مستقبل کے متلاشی افراد ان قدیم نقشہ نویسوں کی طرح ہی ہیں اور اسی جذبے کے تحت ''مستقبل کے صدمے'' کا نظریہ اور ''مطابقت پذیری کی حد'' کے اصول کو یہاں بیان کررہے ہیں، کسی حتمی حوالے سے نہیں، بلکہ نئے حقائق کے پہلے تخمینے کے طور پر، اور یہ تمام تخمینے ان خطرات اور وعدوں سے بھرپور ہیں جو رفتار افزاد ھچکے کی وجہ سے وجود میں آئے۔

☆☆☆

I

پہلا حصّہ

دوام کی موت

پہلا باب

۸۰۰واں عرصۂ حیات

اکیسویں صدی کے آغاز اور موجودہ زمانے کے درمیان کی تین دہائیوں میں نفسیاتی طور پر صحت مند لاکھوں افراد کو مستقبل کے ساتھ ''اچانک'' ٹکراؤ کا سامنا ہوگا۔ دنیا کی امیر ترین اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے ترقی یافتہ اقوام سے تعلق رکھنے والے شہریوں کی اکثریت کے لیے ہمارے زمانے کو ممیز کرنے والی خصوصیات میں تبدیلی کے تقاضے کے بڑھتے ہوئے مطالبے کو پورا کرنا انتہائی مشکل یا تکلیف دہ ہوگا۔ ان کے لیے مستقبل جلد آ جائے گا۔

یہ کتاب اس تبدیلی اور اس کے مطابق ہم خود کو کیسے ڈھالیں گے، سے متعلق ہے۔ یہ ان لوگوں سے متعلق بھی ہے جو تبدیلی کو پھلتا پھولتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، جو اس کی موجوں کی بلندیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان افراد کی ایک کثیر تعداد سے متعلق بھی جو اس (تبدیلی) کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں یا اس سے راہ فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری مطابقت پذیری کی صلاحیت سے متعلق بھی ہے اور ''مستقبل اور صدمہ'' کے بارے میں بھی ہے جو اس تبدیلی کے باعث آئے گا۔

گزشتہ تین سو سال سے مغربی معاشرہ تبدیلی کے آتشیں طوفان میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ طوفان، فاصلے بڑھانے کی بجائے، فاصلوں کو کم کرنے یا سمیٹنے والی قوت کے طور پر نظر آتا ہے۔ یہ تبدیلی انتہائی ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں مسلسل بڑھتی ہوئی رفتار اور غیر معمولی اثر رکھنے والی لہروں کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔ اپنے جاری رہنے کے عمل میں یہ تمام حیرت انگیز سماجی تبدیلیوں کو جنم دیتی ہے..............شعور پر غیر معمولی اثر ڈالنے والے گرجا گھروں (Psychedelic Churches) اور ''مفت یونیورسٹیوں'' سے لے کر قطب شمالی میں موجود سائنسی شہروں اور کیلی فورنیا میں واقع، شادی شدہ عورتوں کی عیاشی کے لیے مخصوص کلبوں تک۔

یہ منفرد شخصیات کی پرورش بھی کرتی ہے، ایسے بچے جو بارہ سال کی عمر میں بچوں کا سا رویہ نہیں رکھتے، اسی طرح پچاس سال کے بالغ افراد جو بارہ سال کے بچوں کی طرح کا رویہ رکھتے ہیں۔ ایسے ا[illegible] افراد

جوغربت کا ناٹک رچاتے ہیں، ایسے کمپیوٹر پروگرامر جو اپنے کام کا آغاز ایل ایس ڈی سے کرتے ہیں۔ ایسے انتشار پسند باغی افراد جو اپنی اسی ظاہری پہچان کے ساتھ اندر سے کٹر ''مقلد'' ہیں اور ایسے مقلد افراد بھی جو اپنے مخصوص لباس کے اندر انتہائی باغی ہیں۔ شادی شدہ مبلغین بھی ہیں، ملحد وزراء بھی ہیں اور یہودی طور طریقے رکھنے والے مہایان بدھ مت بھی۔ ہمارے سامنے پوپ موسیقی ہے...... اور متحرک فنون ...... اور کھلنڈرے افراد کے کلب ہیں اور ایسے تھیٹر ہیں جہاں ہم جنس پرستوں کے لیے فلمیں چلتی ہیں...... مرکبات ہیں اور سکون آور ادویات ...... ناراضگی، دولت مندی اور بے اعتنائی۔ بہت زیادہ بے اعتنائی۔

کیا اس کی وضاحت کرنے کا کوئی طریقہ ہے جس سے اتنی عجیب وغریب صورتحال کو تحلیل نفسی کی کسی اصطلاح یا نظریۂ وجودیت کے کسی مبہم اور فرسودہ خیال کے ذریعے وضع کیا جا سکے؟ ہمارے درمیان ایک نیا اور اجنبی معاشرہ وجود میں آ رہا ہے۔ کیا اسے سمجھنے اور ترقی دینے اور اس سے رشتہ استوار کر سکنے کا کوئی طریقہ ہے؟

جو چیز ہمیں نا قابل بیان نظر آتی ہے اگر ہم اس تبدیلی کی شرح پر دوبارہ نظر ڈالیں تو وہ اس سے کافی کم نظر آئے گی جو ''حقیقت'' کو ایک تیز رفتار سیربین کی طرح بنا دیتی ہیں۔ تبدیلی کی شرح صنعتوں اور اقوام ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ یہ ایک ایسی ٹھوس قوت ہے جو ہماری ذاتی زندگیوں میں بھی داخل ہو جاتی ہے اور ہمیں نئے کردار ادا کرنے پر مجبور کرتی ہے، اور ایک نئی، خوفناک طور پر پریشان کرنے والی، نفسیاتی بیماری کے خطرے سے مقابلہ کرنا سکھاتی ہے۔ اس نئی بیماری کو ہم ''فیوچر شاک یا مستقبل کا صدمہ'' کہہ سکتے ہیں، اس کے ماخذات اور علامات کے بارے میں معلومات کا حصول ہمیں بہت سی ایسی چیزیں سمجھنے میں مدد دیتا ہے جن کا عام حالات میں، منطقی تجزیہ کرنا ممکن نہیں۔

انجانا مہمان

''ثقافتی صدمہ'' جیسی متوازی اصطلاح پہلے ہی ہمارے مقبول ذخیرۂ الفاظ میں داخل ہو چکی ہے۔ ثقافتی صدمہ دراصل وہ ''اثر'' ہے جو ایک انجانے مہمان پر کسی انجانی ثقافت میں داخل ہونے پر پڑتا ہے۔ امن کے رضا کاروں کو بورنیو (Borneo) یا برازیل میں اس کا سامنا کرنا پڑا۔ شاید مارکو پولو کو کیتھی (چین) پہنچنے پر بھی اسی کیفیت سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ ''ثقافتی صدمہ'' اس وقت درپیش ہوتا ہے جب کوئی مسافر خود کو اچانک ایک ایسے مقام پر پائے جہاں ''ہاں'' کا مطلب ''ناں'' ہو، جہاں ''ایک دام'' (Fixed Price) پر بھی گفت وشنید ہو سکتی ہو، جہاں دفتر کے باہر انتظار کرنا ہتک کا باعث نہ ہو اور اسی

طرح جہاں قہقہہ غصے کی علامت بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اسی کیفیت کا نام ہے کہ جب کسی فرد کو اس معاشرے میں اپنی کارکردگی دکھانے میں مدد دینے والے شناسا قسم کے نفسیاتی رمز اچانک اپنی جگہ چھوڑ دیں اور ان کی جگہ اجنبی اور نا قابل بیان رمز لے لیں۔

''ثقافتی صدمہ'' کا مظہر زیادہ تر اس اضطراب، مایوسی اور بے سمتی کو ظاہر کرتا ہے جو امریکیوں کو دیگر معاشروں کے افراد کے ساتھ معاملات نمٹاتے وقت درپیش ہوتی ہے۔ اس سے ابلاغ میں رکاوٹ پیش آتی ہے، حقیقت کا غلط مطلب لیا جاتا ہے اور تعاون واشتراک کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ تاہم ''مستقبل کے صدمے'' جیسے شدید اختلال کے مقابلے میں ''ثقافتی صدمہ'' ہلکا ہوتا ہے۔ ''مستقبل کا صدمہ بدحواس کر دینے والی بے سمتی ہے جو ''مستقبل'' کی قبل از وقت آمد کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ یہی چیز آنے والے کل کا ایک اہم ترین روگ بھی ہو سکتی ہے۔

مستقبل کے اس صدمے کے اثرات کا ذکر ''انڈیکس میڈیکس'' [(۱)] (Index Medicus) یا نفسیاتی بیماریوں کی کسی فہرست میں نہیں ملے گا۔ تاہم، جب تک اس کا مقابلہ کرنے کے لیے دانشمندانہ اقدام نہیں اٹھائے جائیں گے، اس وقت تک لاکھوں انسان اپنے ماحول سے منطقی طور پر ہم آہنگ ہونے کے معاملے میں خود کو بتدریج بے سمتی، بے استعدادی کا شکار پائیں گے۔ زندگی میں پہلے سے موجود بے چینی، بڑھتا ہوا اعصابی خلل، نامعقولیت اور تیزی سے بڑھتا ہوا تشدد آنے والے واقعات کی پیش لذت ہو سکتی ہے تاوقتیکہ ہم اسے سمجھیں اور اس عارضے کا علاج کریں۔

مستقبل کا صدمہ وقت اور معاشرے میں تیزی سے بڑھتی ہوئی تبدیلی کی شرح کے نتیجے کا مظہر ہے۔ یہ صورت حال پرانی ثقافت پر نئی ثقافت مسلط کر دینے کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ یہ صورت حال اپنے ہی معاشرے میں ثقافتی صدمہ ہوتا ہے لیکن اس کے اثرات انتہائی بدتر ہوتے ہیں۔ امن کے دستوں سے منسلک افراد، خصوصاً سیاح بخوبی یہ جانتے ہیں کہ جو ثقافت وہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں وہ وہیں پر موجود رہے گی لیکن مستقبل کے صدمے کا شکار فرد اس بات سے آگاہ نہیں۔

کسی فرد کو اس کی ثقافت سے جدا کر کے اچانک کسی ایسے ماحول میں لے جائیں جو اس کے اپنے ماحول سے بالکل مختلف ہو، جس میں اس کے سامنے ردعمل ظاہر کرنے کے لیے مختلف اشارے کنائے ہوں

---

(۱) طبی وسائنسی مضامین پر مشتمل جریدہ جس کا آغاز ۱۸۷۹ء میں جان شا بلنگ نے کیا۔

اور جہاں وقت، خلا، کام، محبت، مذہب، جنس اور دیگر تمام چیزوں کے بارے میں مختلف تصورات ہوں اور بعدازاں اس سے کسی شناسا سماجی ماحول میں واپس جانے کی امید بھی چھین لی جائے، اس صورت میں وہ شخص انتہائی شدید تخلل کا شکار ہوگا۔ مزید یہ کہ اگر یہ نئی ثقافت خود مسلسل کسی افراتفری کا شکار ہو اور اگر...... یہ بدتری کا تسلسل جاری رہے۔ اس کی اقدار مسلسل تبدیل ہو رہی ہوں تو ایسی صورت میں بے سمتی کی نوعیت مزید شدید تر ہو جائے گی۔ اگر تبدیل ہوتے ہوئے ماحول سے نبٹنے کے لیے ضروری اشارات (Clues) کے بارے میں متعلقہ افراد کو یہ بتا دیا جائے کہ ان حالات / ماحول میں کس قسم کے رد یے کی ضرورت ہے تو شاید یہ متاثرہ افراد کے ساتھ ساتھ دیگر افراد کے لیے بھی نقصان دہ ہو۔

اب کسی ایک فرد کی بجائے پورے معاشرے یا ایک پوری نسل کا تصور اپنے ذہن میں لائیں جس میں اس کے کمزور ترین، کم ذہین اور انتہائی نامعقول افراد بھی شامل ہوں اور جنھیں اچانک اس نئی دنیا میں منتقل کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ انتہا درجے کی بے سمتی اور بڑے پیمانے پر ''مستقبل کے صدمے'' کی صورت میں سامنے آئے گا۔

یہ وہ حالات ہیں جن کا آج کل انسان کو سامنا ہے۔ تبدیلی ایک برفانی تودے کی طرح ہمارے سروں پر گر رہی ہے اور لوگوں کی اکثریت، بے ڈھنگے انداز اختیار کیے ہوئے ہے اور اس تبدیلی کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں۔

''ماضی'' سے ناطہ ٹوٹ جانا

کیا یہ تمام مبالغہ آرائی ہے؟ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ کہنا اب ''فرسودہ'' ہو چکا کہ ہم ''دوسرے صنعتی انقلاب'' کے دور میں رہ رہے ہیں۔ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ شاید یہ کہاوت ہمارے گرد و نواح میں ہونے والی تبدیلی کی رفتار اور فضیلت کو تو متاثر کرے مگر یہ فضول ہونے کے ساتھ ساتھ گمراہ کن بھی ہے۔ کیونکہ اب جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ صنعتی انقلاب سے بڑھ کر بڑا، گہرا اور زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ بلاشبہ ایک مستند رائے کا حامل گروپ اس بات پر زور دیتا ہے کہ موجودہ صورت حال اپنی اہمیت کے اعتبار سے انسانی تاریخ کی دوسری بڑی تقسیم سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے، اور جو اپنی شدت میں تاریخی تسلسل کی پہلی بڑی شکستگی سے قابلِ موازنہ ہے، یعنی بربریت سے تہذیب کی طرف منتقلی۔

یہ نظریہ سائنسدانوں اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کی مختلف تحریروں میں بڑے بھرپور انداز میں سامنے آتا

ہے۔ مشہور برطانوی نوبل انعام یافتہ ماہر طبیعیات سر جارج تھامسن (Sir George Thomson) ''The Foreseeable future'' میں تجویز پیش کرتے ہیں کہ ''آج'' کے ساتھ تاریخی متوازیت صنعتی انقلاب نہیں بلکہ ''نوحجری عہد میں (Neolithic Age) زراعت کی ایجاد'' ہے۔ امریکی ماہر خودکارسازی جان ڈیبولڈ (John Diebold) اس خدشے سے آگاہ کرتے ہیں کہ ''ہم جس تکنیکی انقلاب کے عہد میں رہ رہے ہیں اس کے اثرات پہلے سے تجربہ شدہ کسی بھی سماجی تبدیلی سے گہرے ہوں گے۔'' برطانوی کمپیوٹر تیار کرنے والے سرلیون بیگرٹ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ''خودکارسازی'' تمام انسانی تاریخ میں ہونے والی سب سے بڑی تبدیلی'' کی نمائندگی کرتی ہے۔

صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں سے وابستہ افراد ہی کے ایسے خیالات نہیں ہیں۔ ماہر فلسفۂ فنون سر ہربرٹ ریڈ (Sir Herbert Read) ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم ایک ایسے عہد سے گزر رہے ہیں کہ ''ایک بنیادی انقلاب کی متوازیت کی تلاش کے لیے ہمیں گزشتہ کئی دہائیوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ شاید قابلِ موازنہ تبدیلی صرف وہی ہے جو نئے اور پرانے حجری عہد کے درمیان وقوع پذیر ہوئی.........'' اور کرٹ ڈبلیو مارک (Kurt.w.Marek)، جو سی۔ ڈبلیو سیرام (C.W.Ceram) کے لقب سے لکھتے ہیں اور کتاب ''Gods, Graves and Scholars'' کے مصنف ہیں، اس سلسلے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''بیسویں صدی میں رہنے والے ہم لوگ، بنی نوع انسان کی تاریخ کے ایک ایسے عہد میں رہ رہے ہیں جس کی طوالت پانچ ہزار سال ہے......اور ہم لوگ مغرب میں شروع ہونے والے روم جیسے حالات میں نہیں جیسا کہ سپینگلر (Spengler) فرض کرتا ہے، بلکہ ہم ۳۰۰۰ سال قبل از مسیح کے عہد میں ہیں۔ ہم اپنی آنکھیں قبل از تاریخ کے شخص کی حیثیت سے کھولیں تو ہم ایک بالکل ہی نئی دنیا دیکھتے ہیں۔''

اس موضوع پر سب سے قابل ذکر بیان کینیتھ بولڈنگ (Kenneth Boulding) نامی ممتاز ماہر معاشیات اور تصوراتی سماجی دانشور نے دیا، اپنی رائے کو ثابت کرنے کے لیے کہ موجودہ عہد انسانی تاریخ میں ایک اہم فیصلہ کن موڑ کی نمائندگی کرتا ہے، بولڈنگ بیان کرتا ہے کہ ''جہاں تک بنی نوع انسان سے منسلک سرگرمیوں کے اعداد و شمار اور ان کے تسلسل کا تعلق ہے، تو وہ دن (Date) جو انسانی تاریخ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے وہ انسانی یادداشت میں محفوظ ہے۔'' بے شک ہماری صدی اس انسانی تاریخ کے درمیان سے گزرنے والی وسطی پٹی کی نمائندگی کرتی ہے۔ لہٰذا وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ''آج کی یہ دنیا میری پیدائش

کے وقت کی دنیا سے بالکل ایسے ہی مختلف ہے جیسے جولیس سیزر کے عہد کی دنیا سے۔ میں انسانی تاریخ کے تقریباً وسط میں پیدا ہوا، میری پیدائش کے بعد اتنا کچھ ہی ہوا جتنا میری پیدائش سے قبل ہوا تھا۔''

اس حیران کن بیان کو کئی طریقوں سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ مشاہدہ لیا گیا ہے کہ اگر انسانی وجود کے پچاس ہزار سالوں کو ۶۲ سال پر مشتمل ایک عرصۂ حیات سے تقسیم کیا جائے تو یہ تقریباً ۸۰۰ عرصۂ حیات بنیں گے، ان ۸۰۰ عرصۂ حیات میں سے انسان نے ۶۵۰ عرصۂ حیات غاروں میں گزارے۔

گزشتہ ۷۰ عرصۂ حیات ایسے تھے کہ جن میں ایک عرصۂ حیات کا ابلاغ دوسرے عرصۂ حیات سے ممکن ہوا اور یہ سب کچھ صرف تحریر کی ایجاد کے باعث ممکن ہوا۔ گزشتہ چھ عرصۂ حیات ہی ایسے ہیں جن میں افراد نے حروف کو چھپی ہوئی حالت میں دیکھا۔ جبکہ صرف گزشتہ چار عرصۂ حیات ایسے ہیں جن میں صحت کے ساتھ وقت کو ناپنا ممکن ہوا۔ گزشتہ دو عرصۂ حیات کے دوران کسی بھی جگہ بسنے والے افراد نے برقی موٹر استعمال کی اور روزمرہ استعمال کی بیشتر اشیا جو ہم آج استعمال کر رہے ہیں اس موجودہ عرصۂ حیات یعنی ۸۰۰ ویں عرصۂ حیات میں ہی تیار ہوئیں۔

اس ۸۰۰ ویں عرصۂ حیات نے ماضی کے تمام انسانی تجربات سے ناطہ ختم کرنے کی ایک حد مقرر کر دی ہے کیونکہ اس عرصۂ حیات کے دوران وسائل کا انسان سے تعلق معکوسی نوعیت کا ہو گیا اور یہ بات معاشی ترقی میں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ صرف ایک عرصۂ حیات کے دوران، انسانی تہذیب کی اصل بنیاد یعنی زراعت، قوم در قوم اپنے غلبہ کو کھو چکی ہے۔ آج ایک درجن سے زائد بڑے ممالک میں معاشی طور پر متحرک افراد کی ۱۵ فی صد سے بھی کم تعداد زراعت کے شعبے سے وابستہ ہے۔ امریکہ کے فارم جو ۲۰۰،۰۰۰،۰۰۰ امریکیوں سمیت دنیا بھر کے ۱۱۰،۰۰۰،۰۰۰ افراد کی کفالت کرتے ہیں لیکن ان میں سے صرف ۶ (چھ) فی صد ہی زراعت کے شعبے سے وابستہ ہیں اور یہ تعداد تیزی سے مزید کم ہو رہی ہے۔

مزید یہ کہ اگر معاشی ترقی کا پہلا مرحلہ زراعت اور دوسرا مرحلہ صنعت کاری ہے لیکن ہم اس کا ایک مزید مرحلہ یعنی تیسرا بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جو بہت جلد (اچانک) آن پہنچے گا۔ ۱۹۵۶ء میں امریکہ وہ پہلی بڑی طاقت تھی جس کے غیر زرعی محنت کشوں میں سے پچاس فی صد سے زائد افراد نے صنعتی مزدور یا دستی ہنر سے منسلک افراد والا نیلا لباس پہننا ترک کر دیا۔ ان افراد کی تعداد ''سفید پوش افراد''، جو خردہ فروشی، انتظامی امور، ابلاغ، تحقیق، تعلیم اور دیگر پیشوں سے وابستہ ہیں، سے بڑھ گئی۔ اسی عرصۂ حیات میں، انسانی تاریخ میں پہلی

مرتبہ، ایک معاشرے نے نہ صرف زراعت کے شعبے سے دستبرداری اختیار کی بلکہ وہ اس قابل بھی ہوا کہ وہ ایک انتہائی مختصر عرصے میں دستی ہنرمندی سے بھی جان چھڑا سکے۔ اس طرح ''خدمات سے بھرپور'' دنیا کی پہلی معیشت معرض وجود میں آئی۔

اس کے بعد یکے بعد دیگرے تکنیکی ترقی کے حامل ممالک اس سمت میں رواں دواں ہوئے۔ آج ان ممالک میں جہاں زراعت ۱۵ فی صد یا اس سے کم شرح سے ہے وہاں مختلف پیشوں سے وابستہ افراد کی تعداد صنعتی مزدوروں سے زیادہ ہے اور ان ممالک میں سویڈن، برطانیہ، بیلجیئم، کینیڈا اور ہالینڈ شامل ہیں۔ زراعت کے لیے دس ہزار سال، صنعت کاری کے لیے ایک یا دو صدیاں اور اب، ہمارے سامنے جدید ترین صنعت کاری کا کھلا میدان۔

ایک فرانسیسی منصوبہ ساز اور سماجی فلسفی جین فوراستی (Jean Fourastic') نے اعلان کیا کہ ''صنعتی انقلاب کے باعث تخلیق پانے والی تہذیب کم صنعتی نہیں''۔ اس متذبذب حقیقت کی اہمیت کو ابھی باقاعدہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ شاید اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل یوتھانٹ[1] (U-Thant) کا وہ بیان جس میں وہ جدید ترین صنعت کاری کی طرف تبدیلی کا مطلب انتہائی جامع انداز میں سمجھانے کے قابل ہوئے اور جس میں انھوں نے اعلان کیا کہ ''آج کے عہد میں ترقی یافتہ معیشتوں سے متعلق مرکزی حیران کن حقیقت یہ ہے کہ وہ جو چاہیں کچھ بھی ہو ایک مختصر سے عرصے اور قیمت میں حاصل کر سکتے ہیں۔ وسائل کی اقسام اور مقدار جو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اب وسائل فیصلوں کو محدود نہیں کرتے بلکہ اب یہ فیصلے ہیں جو وسائل پیدا کرتے ہیں۔ یہ ایک بنیادی انقلابی تبدیلی ہے۔ شاید وہ اعلیٰ ترین انقلابی تبدیلی جو انسان کے علم میں ہو۔'' یہ یادگاری کایا پلٹ ۸۰۰ ویں عرصۂ حیات میں رونما ہوئی۔

یہ عرصۂ حیات دیگر تمام عرصۂ ہائے حیات سے اس حوالے سے بھی مختلف ہے کہ اس میں تبدیلی کی پیائش کا پیمانہ اور موقع کا حیران کن پھیلاؤ ہے۔ کچھ دوسرے عرصۂ حیات ایسے بھی آئے ہیں جن میں تاریخی انقلاب بھی رونما ہوئے، مثلاً جنگیں، طاعون، زلزلے اور قحط نے ابتدائی سماجی ادوار کو تہ و بالا کر دیا۔ لیکن یہ دھچکے اور انقلابات و بغاوتیں کسی ایک گروہ یا ملحقہ معاشروں کی سرحدوں تک محدود رہتی تھیں۔ انھیں اور ان کے اثرات کو سرحدوں سے باہر نکلنے میں نسلوں اور صدیوں کا وقت لگا۔

(۱) ۱۹۶۱ سے ۱۹۷۱ء تک اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل رہے، تعلق برما سے تھا۔

ہمارے عرصۂ حیات میں سرحدیں ختم ہو چکی ہیں۔ آج سماجی تعلقات کا جال اس قدر سختی کے ساتھ بُنا ہُوا ہے کہ معاصر واقعات کے اثرات فوراً ہی دنیا بھر میں پھیل جاتے ہیں۔ ویت نام میں ہونے والی جنگ پیکنگ، ماسکو اور واشنگٹن کی سیاسی صف بندیوں کو تبدیل کر دیتی ہے، سٹاک ہوم کے لوگوں کو احتجاج پر مجبور کرتی ہے، زیورچ میں مالیاتی لین دین پر اثر انداز ہوتی ہے اور الجیر (الجزائر) میں خفیہ سفارتی سرگرمیوں کے آغاز کا باعث بنتی ہے۔

بلاشبہ، نہ صرف یہ کہ معاصر واقعات فوری طور پر اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ بلکہ اب ہم گزشتہ واقعات کے اثرات بھی ایک نئے انداز سے محسوس کرنے لگے ہیں۔ کیونکہ ماضی ہمارے اوپر از سرنو اثرات مرتب کرنے لگا ہے۔ ہم ایک ایسی صورت حال میں گرفتار ہو گئے ہیں جسے ''وقت پھلانگنا'' کہا جا سکتا ہے۔

ماضی میں وقوع پذیر ہونے والا کوئی واقعہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جس نے اپنے وقوع پذیر ہونے کے وقت بہت ہی کم افراد کو متاثر کیا ہو لیکن آج اس کے نتائج وسیع پیمانے پر ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنگ پیلو پونیسین[1] (Peloponnesian) جدید معیارات کے مطابق ایک جنگی جھڑپ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے باوجود کہ اس میں ایتھنز، سپارٹا اور قرب و جوار کی چند ریاستوں نے حصہ لیا، جبکہ کرۂ ارض کی باقی آبادی اس جنگ سے متاثر بھی نہ ہوئی اور ان کے معمولات پر کسی قسم کا فرق بھی نہ پڑا۔ میکسیکو میں رہنے والے زاپوٹی قبائل اس سے مکمل طور پر بے بہرہ رہے۔ قدیم جاپانیوں نے ان کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

لیکن جنگ پیلو پونیسین نے یونانی تاریخ کے معمول کے دھارے کو بہت زیادہ بدل ڈالا، مثلاً انسانوں کی سرگرمیوں کو، جینز (Genes) کی جغرافیائی تقسیم کو، اقدار اور خیالات کو تبدیل کر کے اور اس جنگ نے بعد میں نہ صرف روم میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات پر اثر ڈالا بلکہ روم کے ذریعے پورے یورپ پر اثر انداز ہوا۔ اس تنازع کے وقوع پذیر ہو چکنے کی وجہ سے آج کے عہد کے یورپی لوگ ذرا مختلف ہیں۔

اس کے نتیجے میں، آج کل کی مربوط دنیا میں یہ یورپی لوگ میکسیکو اور جاپان کے باسیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پیلو پونیسین جنگ نے آج کے یورپی لوگوں کے نسبی ڈھانچے، خیالات اور اقدار پر جو اثرات مرتب کیے، یہ لوگ آج وہی اثرات پوری دنیا کو منتقل کر رہے ہیں۔ لہٰذا آج کے میکسیکو اور جاپان

(۱) ۴۳۱ سے ۴۰۴ قبل از مسیح تک لڑی جانے والی طویل جنگ جو ایتھنز کی سلطنت اور پیلو پونیسین قوم کے مابین لڑی گئی۔

کے لوگ اس زمانی طور پر دور اور دو مرتبہ ختم کیے جانے والے اثر کو محسوس کرتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ اس واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے دور میں موجود ان کے آباؤ اجداد اس اثر کو محسوس نہ کر سکے۔ اسی طریقے سے ماضی کے وہ واقعات جو کئی صدیوں اور نسلوں۔ کے گزر جانے کی وجہ سے محو ہو رہے تھے آج ہمیں جھنجھوڑنے اور تبدیل کر دینے کی غرض سے دوبارہ تازہ ہو رہے ہیں۔

جب ہم پیلو پونیسین کی جنگ، دیوار چین کی تعمیر، طاعونِ عظیم[1]، حامی النسل لوگوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ بنٹو، کے بارے میں سوچتے ہیں تو یہ ماضی کے تمام واقعات...... ان سے ''وقت کے پیچھے لے جانے'' کے اصول کے بڑھتے ہوئے اثرات پر دلالت کرتے نظر آتے ہیں۔ ماضی میں چند لوگوں کے ساتھ جو واقعہ ہوتا ہے، درحقیقت وہ آج کے تمام لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ درست نہیں ہوتی۔ مختصراً یہ کہ تاریخ ہمارے ساتھ حرکت پذیر ہے اور یہ خاص فرق، خلاف قیاس، ماضی سے ہمارے ناطے توڑنے کے عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا تمام جگہ اور ہر وقت تبدیلی کا پیش منظر بدل گیا ہے۔ تبدیلی میں ایک طاقت رہی ہے اور اب یہ طاقت ۸۰۰ ویں عرصۂ حیات میں داخل ہو کر اس نہج پر پہنچ گئی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔

لیکن موجودہ عرصۂ حیات اور گزشتہ تمام عرصہ ہائے حیات کے درمیان ''معیار'' کا حتمی فرق یہ ہے، اور جسے ہم نے ہمیشہ فراموش کیا ہے یعنی ہم نے صرف تبدیلی کے پیمانے اور وسعت کو ہی نہیں بڑھایا بلکہ ہم نے اس کی چال ڈھال (Pace) کو بھی تبدیل کر دیا ہے۔ ہم نے اپنے عہد میں ایک یکسر نئی سماجی قوت کو متعارف کروایا ہے...... تبدیلی کی اتنی تیز رفتار لہر کہ اس نے ہمارے وقت کی حس کو متاثر کیا اور اس نے ہماری روزمرہ زندگی کے معمولات کو بالکل تبدیل کر دیا اور ہر اس عمل کو بھی متاثر کیا جس کے ذریعے ہم اپنے اردگرد کی دنیا کو ''محسوس'' کرتے ہیں۔ ہم اب زندگی کو ایسا محسوس نہیں کرتے جیسے ماضی کے لوگ کیا کرتے تھے۔ یہی وہ حتمی فرق اور امتیاز ہے جو اس عصر حاضر کے انسان کو دوسرے تمام لوگوں سے علیحدہ کرتا ہے۔ یہی رفتار اس غیر ابدیت کے پیچھے پنہاں ہے...... وہ ناپائیداری...... جو ہمارے شعور میں پیوست ہوتی ہے۔ اس طریق کو شدید متاثر کرتی ہے جس سے ہم لوگوں کا تعلق، چیزوں سے اور خیالات، فن اور اقدار کی کل کائنات سے جوڑتے یا استوار کرتے ہیں۔

یہ بات سمجھنے کے لیے کہ جدید ترین صنعتی دور میں داخل ہونے سے ہمارے ساتھ کیا واقعات پیش آ

(۱) یورپ میں ۱۳۴۸ء سے ۱۳۵۰ء کے عرصہ میں پھیلنے والا طاعون۔

رہے ہیں، رفتار کے عوامل (Processess) کو سمجھنا ہوگا اور ناپائیداری کے نظریے کی مخالفت کرنی ہوگی۔ اگر تیز رفتاری ایک نئی سماجی قوت ہے تب ناپائیداری اس کا نفسیاتی جز ہے اور عصر حاضر کے انسانی رویوں میں اس کے کردار کو سمجھے بغیر جو وہ ادا کر رہا ہے، اس کی شخصیت سے متعلق ہمارے تمام نظریات، ہماری تمام نفسیات ماقبل جدید ہی رہنی چاہیے۔ ناپائیداری کے نظریے کے بغیر نفسیات مختصر طور پر ان مظاہر کا احاطہ نہیں کر سکتی جو خصوصی طور پر متقابل نوعیت کے ہیں۔

ہمارے اردگرد موجود وسائل سے تعلق میں تبدیلی لاتے ہوئے، تبدیلی کے پیش منظر کو بہت زیادہ پھیلاتے ہوئے اور اس کی رفتار کو فیصلہ کن حد تک بڑھاتے ہوئے ہم نے ناقابل تلافی حد تک ماضی سے اپنا ناطہ توڑ لیا ہے۔ ہم نے اپنی سوچ، احساسات اور مطابقت پذیری کے پرانے طریقوں سے بھی تعلق توڑ لیا ہے۔ ہم نے اپنے ذہن کو یکسر ایک نئے معاشرے کے لیے تیار کر لیا ہے اور اب ہم اس کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ یہ ۸۰۰ویں عرصۂ حیات کا پریشان کن مرحلہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جو مطابقت پذیری کے لیے انسان کی صلاحیت پر سوالیہ نشان ہے کہ وہ اس نئے معاشرے میں کس طرح چلے گا؟ کیا وہ خود کو اس کے لوازمات کے مطابق ڈھال سکے گا؟ اور اگر نہیں تو کیا وہ ان لوازمات کو تبدیل کر سکے گا؟

ان تمام سوالات کے جوابات کی سعی کرنے سے قبل ہمیں رفتار اور ناپائیداری نام کی دو قوتوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا ہوگا۔ ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ یہ دونوں قوتیں ہمارے وجود کے ترکیبی اجزاء میں کیسے تبدیلی لاتی ہیں، ہماری زندگیوں اور نفسیات یا ذہنی اجزائے ترکیبی پر کاری ضربیں کیسے لگاتیں ہیں اور انھیں ناآشنا اشکال میں کس طرح ڈھالتی ہیں۔ ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ کیوں اور کیسے اور پہلی مرتبہ ''مستقبل کے صدمے'' کی دھماکہ خیز صلاحیت ہماری راہ میں حائل ہوتی ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب

تیز رفتار دھکّا

مارچ ۱۹۶۷ء کے اوائل میں، مشرقی کینیڈا کا ایک گیارہ سالہ بچہ بڑھاپے کی وجہ سے انتقال کر گیا۔ رکی گیلینٹ ماہ و سال کے اعتبار سے تو صرف گیارہ سال کا تھا مگر اسے ایک عجیب و غریب عارضہ تھا جس کا نام پروگیریا (Progeria)[1] ...... قبل از وقت بڑھاپا ...... تھا اور اس میں ایسی علامات دکھائی دیتی تھیں جو ایک نوے (۹۰) سال کے بوڑھے شخص میں ہوتی ہیں۔ اس عارضے کی چیدہ چیدہ علامات میں بڑھاپا، شریانوں کا سخت ہو جانا، گنجاپن، کاہلی اور جھریاں پڑنا شامل ہیں۔ اُن تمام علامات کے ساتھ، انتقال کے وقت رکی ایک بوڑھا شخص تھا، اس کے مختصر عرصۂ حیات کے گیارہ سالوں میں حیاتیاتی تبدیلی کا ایک طویل عرصۂ حیات بند کر دیا گیا تھا۔

پروگیریا نامی عارضے میں مبتلا افراد کی تعداد انتہائی کم ہے تاہم، مجازی معنوں میں، اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی کے حامل تمام معاشرے اس روگ میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ وہ نہ تو بوڑھے ہو رہے ہیں اور نہ ہی سٹھیا رہے ہیں۔ بلکہ وہ تبدیلی کی ایک فوق معمول شرح کے تجربے سے گزر رہے ہیں۔

ہم میں سے بہت سے افراد ایسے ہیں جن کے ذہن میں یہ فرسودہ ''احساس'' ہوتا ہے کہ چیزیں تیز چل رہی ہیں۔ ڈاکٹر اور انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے افراد اکثر شکایت کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے شعبوں میں ہونے والی جدید ترین ترقی سے مطابقت نہیں رکھ سکتے۔ آج کے دور میں بمشکل ہی کوئی ایسی کانفرنسیں ہوتی ہیں جس میں مندوبین اپنے خطاب میں روایتی اصطلاح ''تبدیلی کا چیلنج'' استعمال نہ کریں۔ ان میں سے بہت ایسے ہیں جو ناخوشگوار موڈ میں ہوتے ہیں...... ایک شک میں مبتلا کہ تبدیلی قابو سے باہر ہے۔

تاہم ہر شخص اس پریشانی کا اظہار دوسروں سے نہیں کرتا۔ لاکھوں افراد اپنی زندگی خواب خرامی میں رہتے ہوئے گزار رہے ہیں کہ جیسے ۱۹۳۰ء کی دہائی سے لے کر اب تک کچھ تبدیل نہیں ہوا ہے اور کچھ بھی

---

(۱) ایک ایسی بیماری جس میں قبل از وقت بڑھاپے کے آثار نظر آتے ہیں۔

تبدیل نہیں ہوگا۔ انسانی تاریخ کے ایک شاندار عہد میں رہتے ہوئے وہ لوگ اس سے گوشہ گیر رہنے کی کوشش کرتے ہیں، اس میں عدم شرکت کی کوشش کرتے ہیں کہ جیسے اس کو نظر انداز کرتے ہوئے گزر جانا ممکن ہے۔ وہ ایک ''گوشہ نشین'' قسم کا سکون تلاش کرتے ہیں، تبدیلی سے ہوشیار قسم کا استثناء۔

اس قسم کے لوگوں کو ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے: بزرگ افراد، جو اپنی زندگی کے ماہ و سال گزارنے پر مجبور ہیں اور کسی بھی قیمت پر جدت کی رکاوٹوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وقت سے پہلے بوڑھے ہو جانے والے بوڑھے لوگ جن کی عمریں پینتیس اور پینتالیس سال ہے وہ طلبہ کے ہنگاموں، جنسی سرگرمیوں، ایل ایس ڈی، چھوٹی سکرٹوں وغیرہ سے پریشان ہوتے ہیں، اور بڑی بے چینی سے خود کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ، بہر حال، جوانی ہمیشہ سے باغی رہی ہے اور یہ کہ آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ ماضی سے مختلف نہیں ہے۔ حتیٰ کہ نوجوانوں میں بھی تبدیلی کا عدم ادراک پایا جاتا ہے: طلبہ ماضی سے متعلق اتنے بے بہرہ ہیں کہ انھیں ''حال'' کے حوالے سے کسی بھی قسم کی غیر معمولی تبدیلی نظر نہیں آتی۔

پریشان کن حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کی ایک واضح اکثریت جس میں تعلیم یافتہ، یا دیگر معنوں میں شائستہ طبع لوگ، تبدیلی کے نظریے کو اتنا پر خطر سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے وجود سے انکار کی کوشش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سے ایسے لوگ جو علمی حوالے سے یہ بات سمجھتے ہیں کہ تبدیلی بڑی تیز رفتاری سے وقوع پذیر ہو رہی ہے، انھوں نے بھی اس فہم و ادراک کو نہیں اپنایا، اور وہ اس باریک سماجی حقیقت کو، اپنی ذاتی زندگیوں کی ترتیب سازی کے لیے استعمال نہیں کرتے۔

وقت اور تبدیلی

ہمیں کیسے یہ معلوم ہوگا کہ تبدیلی تیزی سے رونما ہو رہی ہے؟ کیونکہ تبدیلی کو ناپنے کا کوئی واضح پیمانہ نہیں۔ کائنات کی اس گنجلک پیچیدگی میں، حتیٰ کہ کسی مثالی معاشرے میں بھی، بیک وقت، عملی طور پر تبدیلیوں کا سلسلہ رونما ہوتا ہے۔ تمام تر چیزیں...... چھوٹے سے چھوٹے وائرس سے لے کر بڑی سے بڑی کہکشاں تک...... حقیقتاً چیزیں نہیں ہیں بلکہ مراحل کے نام ہیں۔ اس میں کوئی بے تغیر نکتہ نہیں ہے، آواگون کی طرح کوئی غیر مبدل چیز، کہ جس کے لیے تبدیلی کی پیمائش جا سکے۔ لہٰذا تبدیلی لازمی طور پر تعلق پر مبنی ہوتی ہے۔

یہ بات بھی غیر یکساں ہے۔ اگر تمام کے تمام عوام اور مراحل ایک ہی رفتار سے وقوع پذیر ہوئے یا ان کے ادغام کے وقت ان کی رفتار بڑھی یا اس میں کمی واقع ہوئی، تو اس تبدیلی کا مشاہدہ کرنا ناممکن ہوگا۔ تاہم

''مستقبل'' زمانۂ ''حال'' پر مختلف رفتار سے حملہ آور ہوتا ہے۔ لہٰذا مختلف مراحل کے افشا ہو جانے پر یہ ممکن ہو جاتا ہے ان کی رفتار کا موازنہ کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر ہم یہ جانتے ہیں کہ انواع کے حیاتیاتی ارتقاء کی بجائے، ثقافتی اور سماجی ارتقاء کی رفتار خاصی تیز ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کچھ معاشرے خود کو ٹیکنالوجی یا معاشی حوالے سے، دیگر معاشروں کی نسبت، جلد ترقی کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک ہی معاشرے میں موجود مختلف شعبے مختلف شرح و رفتار سے تبدیلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہی فرق جسے ولیئم آگبرن نے ''ثقافتی تاخر'' کا نام دیا۔ مختصراً یہ کہ تبدیلی کی ناہمواری ہی اسے قابلِ پیمائش بنا دیتی ہے۔

تاہم ہمیں پیمائش کے کسی معیار کی ضرورت ہے جو انتہائی تفریق پر مبنی مراحل کا موازنہ کر سکے اور یہ معیار وقت ہی ہے۔ وقت کے بغیر تبدیلی کا کوئی مفہوم و معنی نہیں اور تبدیلی کے بغیر وقت ساکن ہو جائے گا۔ وقت کو ان وقفوں کے طور پر لینا چاہیے کہ جن میں واقعات رونما ہوئے۔ جس طرح پیسہ ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم سیب یا مالٹوں کی قیمت لگا سکیں، اسی طرح وقت ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم غیر مساوی اور متفرق مراحل کا موازنہ کر سکیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ڈیم بنانے کے لیے تین سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے، تو ہم یہ کہنا چاہ رہے ہوتے ہیں کہ اس کام میں اتنا عرصہ لگے گا جتنا زمین سورج کے گرد چکر لگانے میں لیتی ہے، یا اتنا وقت جتنا ۳۱،۰۰۰،۰۰۰ مرتبہ پنسل گھڑنے میں۔ وقت تبادلے کی وہ کرنسی ہے جو اس بات کو ممکن بناتی ہے کہ ہم اس شرح کا موازنہ کر سکیں کہ جس پر مختلف مراحل وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

تبدیلی کی ناہمواری کے ساتھ اور پیمائش کے معیار کی موجودگی میں ہمیں تبدیلی کو ماپنے میں انتہائی مشکلات کا سامنا ہے۔ جب ہم تبدیلی کی شرح کا ذکر کرتے ہیں تو ہم ان بے شمار واقعات کا ذکر کرتے ہیں جو غیر ارادی طور پر طے شدہ وقت کے وقفوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ''واقعات'' کی وضاحت کی جائے۔ ہمیں انتہائی مہارت کے ساتھ وقفوں کا چناؤ کرنا ہے۔ اس عدم مطابقت کے مشاہدے سے اخذ ہونے والے نتائج سے متعلق ہمیں انتہائی محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ تبدیلی کی پیمائش میں، آج کے عہد میں ہم لوگ سماجی مراحل کی بجائے جسمانی مراحل میں زیادہ آگے ہیں۔ مثال کے طور پر، ہم یہ بہتر جانتے کہ جسم میں گردش کرنے والے خون کے ''دوران'' (رفتار) کا موازنہ معاشرے میں پھیلائی جانے والی افواہ کی رفتار سے کیسے کیا جاتا ہے۔

تاہم ان تمام تر صلاحیتوں کے حصول کے باوجود تاریخ دانوں اور ماہرینِ آثار قدیمہ سے لے کر

سماج میں موجود سائنسدانوں، ماہرین عمرانیات، ماہرینِ معاشیات اور نفسیات دانوں کے درمیان وسیع تر معاہدہ ہے کہ جس کی وجہ سے بہت سے سماجی مراحل تیزی سے عمل میں آرہے ہیں...... نہ صرف مؤثر طریقے سے بلکہ قابلِ دید طریقے سے۔

زیرزمین شہر

مشہور ماہر حیاتیات جولیئن ہگزلے، بڑے اعلیٰ تخیل کے ساتھ ہمارے سامنے تصویر کشی کرتے ہوئے بتاتے ہیں، ''معلوم تاریخ میں انسانی ارتقاء کی رفتار انسانی ارتقاء سے پہلے کے عہد کے مقابلے میں ۱۰۰،۰۰۰ گنا تیز ہے۔'' وہ ایجادات یا ترقیاتی امور جنھوں نے حجری عہد کے دوران وقوع پذیر ہونے میں ۵۰۰،۰۰۰ سال کا عرصہ لیا، جولیئن ہکسلے کے بقول، اسی نوعیت کے واقعات کے وقوع پذیر ہونے حجری عہد کے آخر میں میں ایک ہزار سال کا عرصہ لیا؛ اور موجودہ تہذیب کے آغاز پر، تبدیلی کی یہ نوعیت تقریباً ایک سو سال میں مکمل ہوگئی''۔ تبدلی کی یہ شرح، جو گزشتہ پانچ سو سالوں سے تیزی سے جاری وساری ہے اس کی رفتار ''گزشتہ تین سو سالوں سے قابل دید ہے۔''

ایک ناول نگار اور سائنس دان سی پی سنو (C.P. Snow) تبدیلی کی اس نئی رویت پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے مطابق، ''اس صدی تک سماجی تبدیلی اتنی سست رفتار تھی کہ وہ کسی ایک شخص کے عرصۂ حیات میں توجہ سے محروم رہتی تھی۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ تبدیلی کی شرح اتنی بڑھ گئی کہ ہمارے تصورات اس سے ہم آہنگ نہ ہوسکے۔'' ایک سماجی نفسیات دان وارن بینس کے نزدیک حالیہ سالوں میں یہ عمل اس تیزی سے ہوا: ''کہ اس تبدیلی کی رفتار اور اس کی حدود کا حقیقی معنوں میں اظہار و بیان کرنے کے لیے کوئی مبالغہ آرائی، کوئی غلو، اور کوئی اخلاق سوز بات بھی کارگر نہیں...... درحقیقت صرف مبالغہ ہی درست ثابت ہوسکتا ہے۔''

اس انتہائی تیز ترین زبان کے لیے کس طرح کی تبدیلی جواز پیش کرسکتی؟ ان میں سے چند ایک پر نظر ڈالتے ہیں: وہ مراحل جن سے گزر کر انسان شہروں کی تعمیر کرتے ہیں۔ آج کے عہد میں ہم لوگ شہرکاری کی اس وسعت اور تیزی سے گزر رہے ہیں کہ جو تاریخ کے کسی عہد میں نہیں دیکھی گئی۔ ۱۸۵۰ء میں دنیا کے نقشے پر صرف چار شہر ہی ایسے تھے جن کی آبادی ۱۰۰،۰۰۰ نفوس پر مشتمل تھی۔ ۱۹۰۰ء تک ایسے شہروں کی تعداد انیس ہوگئی، لیکن ۱۹۶۰ء تک یہ تعداد ۱۴۱ ہوگئی، آج دنیا بھر میں شہری آبادی میں اضافے کی شرح ۶ء۵ فی صد سالانہ ہے، اس شرح کا تعین ہیگ (Hague) میں واقع انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس کے ایڈگر ڈی ریز

(Edgar de vries) اور جے پی تھائیس (J.P. Thysse) نے کیا۔ اپنی نوعیت کے اس اعداد و شمار کا مطلب ہے کہ گیارہ سالوں میں دنیا کی آبادی دگنی ہوجائے گی۔

اس قدر واضح پیانے پر ہونے والی تبدیلی کے معنی و مفہوم سمجھنے کے لیے ذرا یہ تصور کریں کہ کیا ہو اگر تمام کے تمام موجودہ شہر، پھیلاؤ کی بجائے اپنے موجودہ حجم پر برقرار رہتے ہیں۔ اگر صورت حال ایسی ہی رہے تو اس نئی شہری آبادی کی گنجائش کی خاطر ہمیں دُہرا شہر بنانا ہوگا جو اس زمین پر تیزی سے پھیل رہی ہے۔ ایک نیا ٹوکیو، ایک نیا ہیمبرگ، ایک نیا روم اور رنگون...... اور یہ تمام کام گیارہ سالوں میں مکمل کرنا ہوگا۔ (اس حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کیوں فرانسیسی شہری منصوبہ ساز زیرزمین شہروں کے نقشے بنارہے ہیں۔ سٹور، عجائب گھر، گودام اور کارخانے تمام کے تمام زیرزمین، اور یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ایک جاپانی ماہر تعمیرات نے ایک ایسے شہر کا نقشہ بنایا ہے جو سمندر میں بنائے گئے طوالے پر تعمیر ہوگا۔)

اسی طرح کی سُرعت پر مبنی صلاحیت، انسان کی، توانائی کی کھپت سے متعلق بھی سامنے آئی ہے۔ ہندوستان کے آنجہانی ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر ہومی بھابھہ، جنھوں نے ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال پر منعقدہ پہلی بین الاقوامی کانفرنس کی صدارت کی، نے اسی طرح تجزیہ کیا، ''مثال کے طور پر ہم ۳۳،۰۰۰ ملین ٹن کوئلے کے جلنے سے حاصل ہونے والی توانائی کے لیے حرف ''Q'' استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کے عہد سے ۱۸۵۰ء سے پہلے تک صرف ہونے والی توانائی ''Q'' فی صدی ہوگئی۔ آج یہ شرح تقریباً دس ''Q'' فی صدی ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک اندازے کے مطابق، انسان نے ماضی کے ۲۰۰۰ سالوں میں جو توانائی صرف کی، اتنی ہی توانائی گزشتہ ایک صدی میں صرف ہوئی۔

معاشی ترقی کی اس رفتار کا بھی ڈرامائی مشاہدہ ان ممالک میں کیا جاسکتا ہے جو جدید ترین صنعت کاری کی طرف گامزن ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ان کا آغاز ایک مضبوط صنعتی بنیاد سے تھا، ان ممالک کی پیداوار میں سالانہ اضافہ انتہائی خوفناک ہے جبکہ شرح اضافہ بھی بلند ہورہی ہے۔

مثال کے طور پر فرانس میں ۱۹۱۰ء سے لے کر جنگ عظیم دوم کے آغاز کے درمیانی پچیس سالوں کے دوران صنعتی پیداوار میں ۵ فی صد اضافہ ہوا تاہم ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۵ء کے درمیانی سترہ سالوں میں شرح بڑھ کر ۲۲۰ فی صد ہوگئی۔ آج جدید ترقی کے ضمن میں صنعتی ممالک میں ۵ سے ۱۰ فی صد شرح اضافہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اس اوسط میں، یقینی طور پر، کمی اور بیشی دیکھنے میں آتی ہے لیکن تبدیلی کا رُخ غلطی سے مبرا ہے۔

لہٰذا آرگنائزیشن فار اکانومک کوپریشن اینڈ ڈویلپمنٹ (Organization for Economic Cooperation and developmenet) سے تعلق رکھنے والے ۲۱ ممالک کے لیے۔ یعنی وہ ممالک جو ''باحیثیت'' شمار کیے جاسکتے ہیں، مجموعی قومی پیداوار میں اوسط سالانہ شرح اضافہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۸ء تک کے عرصے میں ۵ء۴ اور ۰ء۵ فی صد رہا۔ امریکہ نے ۵ء۴ فی صد کی رفتار سے اضافہ کیا اور جاپان سالانہ ترقی میں سب سے آگے رہا اور اس کی شرح ۸ء۹ فی صد رہی۔

ان اعداد وشمار سے جو مفہوم نکلتا ہے وہ کسی انقلابی صورت سے کم نہیں، یعنی ترقی یافتہ معاشروں میں، ہر پندرہ سال بعد مکمل پیداوار اور خدمات کا دگنا ہو جانا۔ جبکہ دگنا ہونے کی شرح سکڑ رہی ہے۔ عمومی طور پر یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ ان معاشروں میں رہنے والے وہ بچے جو لڑکپن کی عمر میں پہنچتے ہیں، وہ اپنے اردگرد انسان کی بنی ہوئی نئی اشیا تقریباً اس تعداد سے دگنی دیکھتے ہیں جو ان کے والدین نے اپنے لڑکپن کی عمر میں دیکھی۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آج کا لڑکا جب تیس سال کی عمر کو پہنچے گا تو چیزیں اس ''دگنی'' کا ''دگنا'' ہو جائیں گی۔ ستر سال پر محیط ایک عرصۂ حیات میں شاید اس طرح چیزیں پانچ مرتبہ دگنی ہو جائیں۔ چونکہ اضافے مرکب کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں لہٰذا جب کوئی شخص بڑھاپے کی عمر کو پہنچے گا تو اس کے اردگرد کی دنیا میں، اس کی پیدائش کے وقت کی نسبت بتیس (۳۲) گنا پیداوار ہو رہی ہوگی۔

نئی اور پرانی چیزوں میں تبدیلی کی اس شرح، جو ہم بیان کریں گے، کا لاکھوں افراد کی عادات، عقائد اور خود تصوری پر برقیانہ اثر پڑے گا۔ تاریخ کے کسی عہد میں بھی یہ شرح، اتنے مختصر سے وقت میں، اتنی تیزی سے تبدیل نہیں ہوئی۔

ٹیکنالوجی کا انجن

اس طرح کے غیر معمولی حقائق کے پیچھے تبدیلی کا ایک گرگراہٹ والا انجن کارفرما ہے جسے ٹیکنالوجی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ ٹیکنالوجی معاشرے میں تبدیلی کا واحد ذریعہ ہے۔ معاشرتی انقلابات پر بھی آب وہوا کی کیمیائی تبدیلی، موسموں کی تبدیلی، زرخیزی میں تبدیلی اور دیگر عوامل کا اثر ہوتا ہے تاہم ''تیز رفتار دھکے'' کے پیچھے جو بڑی قوت روبہ عمل ہے وہ، بلاشک وشبہ ٹیکنالوجی ہی ہے۔

بہت سے لوگوں کے لیے ٹیکنالوجی کا تصور دھواں دینے والی بڑی بڑی سٹیل ملوں یا مشینوں کی جھنکار میں ہے۔ شاید ٹیکنالوجی کی روایتی علامت پچاس سال قبل ہنری فورڈ کا دیا ہوا وہ عکس ہے جسے ''ماڈرن ٹائمز''

میں چارلی چیپلن نے ایک قومی سماجی تمثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ تاہم یہ علامت ٹیکنالوجی کے حوالے سے نامناسب، گمراہ کن ہے کیونکہ ٹیکنالوجی کے لیے، ہر صورت، زیادہ مشینوں اور فیکٹریوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں گھوڑوں کے ذریعے ہل چلانے کا طریقہ ایجاد ہوا اور اس ایجاد سے زراعت کے طور طریقوں میں بڑی تبدیلیاں آئیں اور وہ اتنا ہی سود مند ثابت ہوا جتنا اس ایجاد کے صدیوں بعد ہونے والی بیسمیر (Bessemer) بھٹی ہوئی۔ مزید برآں ٹیکنالوجی میں طریقہ کار کے ساتھ ساتھ مشینوں کا بھی عمل دخل ہوتا ہے جو اس ٹیکنالوجی کے اطلاق کے لیے ضروری بھی ہوسکتی ہیں اور نہیں بھی۔ ان میں وہ طریقے بھی شامل ہیں جن میں کیمیائی ردعمل ہوتا ہے، وہ طریقے بھی جن کے ذریعے مچھلیوں کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے، جنگلوں کی شجرکاری ہوتی ہے، تھیٹروں میں روشنی کا سامان ہوتا ہے، ووٹوں کی گنتی ہوتی ہے یا تاریخ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ٹیکنالوجی کی پرانی علامات آج کے عہد میں گمراہ کن ہیں جب ٹیکنالوجی کے جدید ترین مراحل پیداواری طریقوں یا کھلی بھٹی کے بغیر ہی سرانجام پا جاتے ہیں۔ بلاشبہ الیکٹرانکس میں، خلائی ٹیکنالوجی میں، اکثر نئی صنعتوں میں نسبتاً خاموش اور صاف ستھرے ماحول کی بڑی اہمیت ہے۔ اور وہ کبھی کبھار ضروری بھی ہوتا ہے اور پیداواری سلسلہ...... انسانی افواج کی تنظیمیں جو تکراری امور کی انجام دہی پر مامور ہیں۔ محض نراج پسندی ہی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ٹیکنالوجی کی علامتوں میں تبدیلی لے کر آئیں اور ٹیکنالوجی میں ہونے والی تیز تر تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہوں۔

کبھی کبھار اس رفتار کو ذرائع حمل ونقل میں ہونے والی ترقی کے ایک مختصر سے بیان کے ذریعے ڈرامائی رنگ دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ ۶۰۰۰ سال قبل از مسیح میں طویل تر فاصلوں کو عبور کرنے کے لیے انسان کو دستیاب سواریوں میں سے تیز ترین اونٹ کی سواری ہے جس کی رفتار آٹھ میل فی گھنٹہ ہے۔ جب رتھ ایجاد ہوئی تو زیادہ سے زیادہ رفتار تقریباً پچیس میل فی گھنٹہ ہوگئی۔

یہ ایجاد اتنی متاثر کن تھی، اور اس کی حد رفتار کو عبور کرنا اتنا مشکل تھا کہ جیسے ۳۵۰۰ سال بعد ۱۷۸۴ء میں برطانیہ میں پہلی ڈاک گاڑی نے کام کرنا شروع کیا تو اس کی رفتار محض دس میل فی گھنٹہ ہی تھی۔ بھاپ سے چلنے والی پہلی ریل گاڑی، جو ۱۸۲۵ء میں متعارف ہوئی، محض تیرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکی اور اس وقت کے بحری جہاز اس رفتار سے نصف پر چل رہے تھے۔ شاید ۱۸۸۰ء کی دہائی تک یہ ممکن نہیں تھا کہ انسان جدید بھاپ کے انجن کی مدد سے، ایک سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کو چھو لے۔ اس ریکارڈ تک پہنچنے کے

لیے انسان کو لاکھوں سال لگ گئے۔

تاہم اس حد کو چوگنا بنانے کے لیے صرف ۵۸ سال کا عرصہ لگا، ۱۹۳۸ء میں ہوا میں اڑتے ہوئے شخص نے ۴۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار تک رسائی حاصل کر لی۔ اس رفتار کو دگنا کرنے میں محض بیس سال کا قلیل عرصہ لگا۔ ۱۹۶۰ء تک راکٹ سیاروں کی رفتار ۴۰۰۰ میل فی گھنٹہ تک پہنچی اور خلائی کیپسولوں میں موجود انسانوں نے زمین کے گرد ۱۸،۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنا شروع کر دیا۔ اگر کسی صفحے پر موجود گراف میں ماضی کی نسلوں کے حوالے سے ترقی کی نمائندگی کی جائے تو یہ گراف عمودی شکل اختیار کرے گا۔

چاہے ہم طے شدہ فاصلوں کی پیمائش کریں، اپنی سر کردہ بلندیوں کو ماپیں، کھدائی کی گئی معدنیات کا ذکر کریں یا دھماکہ کر دینے کی صلاحیت کی بات کریں تیزی کا یہی رجحان انہی میدانوں میں کارفرما ہے۔ ان معاملات میں اور ہزاروں اعداد و شمار کے سلسلے میں یہی نمونہ ظاہر ہوتا ہے اور یہ غلطیوں سے مبرا ہے۔ کئی سو صدیاں گزر گئیں، اور پھر ہمارے وقتوں میں، اچانک حدود کو پھلانگنے کا سلسلہ، اور اسی طرح آگے بڑھنا ممکن ہوا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیکنالوجی خود اپنی آبیاری کرتی ہے۔ ٹیکنالوجی مزید ٹیکنالوجی کو جنم دیتی ہے، اگر ہم ایک لمحے کے لیے جدت کے مرحلے پر غور کریں تو ہمیں یہ بات آسانی سمجھ آ جائے گی۔ ٹیکنالوجی سے منسلک جدت تین ایسے مراحل پر مشتمل ہے جو خودکارانہ انداز میں از خود دوبارہ قوی بنانے والے ایک چکر میں چل رہی ہے۔ پہلا تو ایک پُرتخیل اور ممکن قسم کا نظریہ ہے۔ دوسرا اس کا عملی اطلاق۔ تیسرے معاشرے کے ذریعے اس کا عمل پھیلاؤ۔

جب یہ مرحلہ مکمل ہو جائے، خلا بند ہو جائے، جب نئے نقطۂ نظر پر ٹیکنالوجی کا پھیلاؤ، ردعمل کے طور پر نئے خیالات کی تشکیل میں مدد دے۔ آج اس بات کی شہادت موجود ہے کہ اس چکر کے مراحل کے درمیان کا وقت مختصر ہو گیا ہے۔

اکثر یہ بات نوٹ کی گئی ہے، اور یہ غلط بھی نہیں، کہ ماضی میں گزر جانے والے سائنسدانوں میں سے ۹۰ فی صد اب حیات ہوں، جبکہ ہر روز نئی سائنسی دریافتیں ہو رہی ہیں۔ ماضی کی نسبت انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ ان نظریات و خیالات پر عمل ہو رہا ہے۔ اصل نظریے اور اس کے عملی استعمال کے درمیان وقت کا عرصہ انتہائی قلیل ہو گیا ہے۔ ہم اور ہمارے آباؤ اجداد کے درمیان یہ ایک حیرت انگیز فرق ہے۔ پرگا سے تعلق رکھنے والے اپولونیئس (Appollonius) نے مخروطی خطوط دریافت کیے لیکن یہ 2000 سال پہلے کی

بات تھی کہ ان کا اطلاق انجینئری مسائل پر کیا گیا۔ اس بات کو بھی صدیاں بیت گئیں جب پاراسیلسوس (Paracelsus) نے یہ دریافت کیا کہ ایتھر (Ether) کو مصنوعی بے ہوشی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، اس وقت سے اسے انہی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

جدید دور میں کچھ امور میں ''تاخیر'' بھی کی گئی۔ ۱۸۳۶ء میں ایک مشین ایجاد ہوئی جو کاٹنے، بھوسا علیحدہ کرنے، بھوسے کے گٹھے بنانے اور دانوں کو بوریوں میں بھرنے کا کام کرتی تھی۔ یہ مشین اس ٹیکنالوجی پر مبنی تھی جو اس وقت بیس سال پرانی ہو چکی تھی۔ تاہم اس ایجاد کے تقریباً ایک سو سال بعد تک یعنی ۱۹۳۰ء کی دہائی تک اس مشین کی مارکیٹنگ ممکن نہ ہوئی۔ برطانیہ سے کسی ٹائپ رائٹر کے لیے پہلی سند حق ۱۷۱۴ء میں نکالی گئی لیکن تجارتی طور پر ٹائپ رائٹر کی دستیابی ڈیڑھ صدی بعد ممکن ہوئی۔ نکولس اپرٹ (Appert) نے غذا کو محفوظ کرنے کے لیے ڈبے میں بند کرنے کا عمل دریافت کیا لیکن غذا سے متعلقہ صنعت میں اس کام کی اہمیت کو تقریباً ایک صدی کا عرصہ لگ گیا۔

آج کے عہد میں نظریے اور اس کے اطلاق میں اس قسم کا تاخر نا قابل تصور ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے آباؤ اجداد سے زیادہ متجسس یا کم سست ہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مراحل کو تیز تر طے کرنے کے لیے تمام تر سماجی آلات ایجاد کر لیے ہیں۔ لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جدت کے اس چکر کے پہلے اور دوسرے مرحلے کا درمیانی وقت...... نظریہ اور اس کا اطلاق...... منطقی طور پر کم ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر فرینک لائن (Lynn) بیس بڑی جدتوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے، جیسے محفوظ کردہ غذا، ضد حیاتیہ، برقیاتی دور اور مصنوعی چمڑا وغیرہ، اس نتیجے پر پہنچے کہ اس صدی کے آغاز سے لے کر اب تک ۶۰ فی صد سائنسی دریافتیں اس مخصوص اوسط وقت سے زیادہ وقت میں کی گئیں جو ایک بڑی سائنسی دریافت کو ایک مفید ٹیکنالوجی کی صورت اختیار کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ آج ایک وسیع اور ترقی پذیر تحقیق اور صنعت، شعوری طور پر یہ کوشش کر رہی ہے کہ مزید کسی تاخر کے امکان کو رد کیا جائے۔

اگر کسی نئے خیال کو کاروباری دنیا میں پہنچنے میں کم وقت لگتا ہے تو معاشرے میں اس کے پھیلاؤ میں بھی کم وقت ہی درکار ہوتا ہے۔ اس چکر کے دوسرے اور تیسرے چکر کے درمیان وقفہ...... اطلاق اور پھیلاؤ...... الگ الگ طے ہو گیا ہے اور پھیلاؤ کی رفتار حیرت انگیز طور پر بڑھ رہی ہے۔ تاریخ میں یہ بات گھریلو استعمال کی بے شمار اشیا سے ثابت ہو چکی ہے۔

رابرٹ بی ینگ، (Robert B. Young) جن کا تعلق ''Stanford Research Institute'' سے ہے، نے وقت کے اس عرصہ کا مشاہدہ کیا ہے جو کسی نئے برقیاتی آلے کے پہلے اشتہار اور اس کو تیار کرنے والی صنعت کی پیداواری عروج کے درمیان تھا۔

مسٹر ینگ اس نتیجے پر پہنچے کہ امریکہ میں ۱۹۲۰ء سے پہلے متعارف ہونے والی اشیا میں سے اکثر ویکیوم کلینر، الیکٹرک رینج (اوون) فرج وغیرہ، ایسی ہیں جن کے متعارف ہونے اور پیداوار کے عروج کا درمیانی وقفہ ۳۵ سال تھا۔ لیکن ایسی ہی چند اشیا کا گروپ جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۹ء کے درمیانی عرصے میں منظر عام پر آیا...... جن میں الیکٹرک فرائی پان، ٹیلی وژن اور واشر۔ ڈرائیر وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے متعارف ہونے اور پیداوار کے عروج کا درمیانی عرصہ صرف آٹھ سال کا تھا۔ یہ وقفہ ۷۶ فی صد تک سکڑ گیا تھا۔

مسٹر ینگ کے بقول: ''جنگ (جنگ عظیم دوم) کے گروپ نے جدید چکر کی تیز رفتاری کا شاندار مظاہرہ کیا''۔

ایجادات کی اس بہتر رفتار، استحصال اور پھیلاؤ، ردعمل کے طور پر اس چکر کو مزید بڑھا دیں گے۔

کیونکہ نئی مشینیں یا تکنیک محض ایک پیداوار ہی نہیں بلکہ تازہ ترین پُرتخیل نظریات کا منبع بھی ہیں۔

ایک خاص حوالے سے ہر نئی مشین یا تکنیک تمام دستیاب مشینوں اور تکنیک کو تبدیل کر دیتی ہیں اور یہ کام چیزوں کو اکٹھا کر کے نئے اتصال کی صورت ممکن ہے۔ اس طرح کے ممکنہ اتصال کی تعداد نئی مشینوں اور تکنیک میں عددی اضافے کے ساتھ ساتھ شرحاً بڑھتی رہتی ہے۔ بلاشبہ ہر نیا اتصال از خود ایک سپر مشین کی حیثیت سے لیا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر کمپیوٹر نے یہ ممکن بنایا کہ ایک خلائی کوشش کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ حساس آلات ترسیل و ابلاغ کے آلات، طاقت کے ذرائع سے منسلک ہو کر کمپیوٹر اس ہیئت کا حصہ بن گئے جو عمومی طور پر ایک سپر مشین کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ایک ایسی مشین جو بیرونی خلا میں پہنچنے اور چھان بین کا ذریعہ بنی لیکن مشینوں یا تکنیک کو نئی طرز میں ڈھالنے کے لیے، انھیں تبدیل کرنے، اپنے مطابق بنانے، بہتر بنانے یا تبدیل کرنے کی ضرورت پڑی تا کہ ان تکمیلی مشینوں کو سپر مشینیں بنانے کی کوششیں ہمیں مزید تکنیکی اختراعات کرنے کی ترغیب دیں۔

یہ بات سمجھنا ناگزیر ہے کہ تکنیکی اختراع محض مشینوں اور تکنیک کو اتصال یا دوبارہ اتصالی نہیں بخشتی، نئی اہم مشینیں دیگر مشینوں میں تبدیلی کی تجویز اور مزید تبدیلی سے بڑھ کر بھی کام کرتی ہیں...... وہ سماجی،

فلسفیانہ حتیٰ کہ ذاتی مسائل کے نت نئے حل سامنے لاتی ہیں۔ یہ انسان کے مکمل دانشورانہ ماحول کو تبدیل کر دیتی ہیں...... اس کے سوچنے کا انداز اور دنیا کو دیکھنے کا طریقہ کار۔

ہم تمام لوگ اپنے ماحول سے سیکھتے ہیں، اس پر مسلسل غور و خوض کرنے کے بعد۔ شاید لاشعوری طور پر...... تا کہ کچھ مثالیں سامنے لائیں اور ان سے سیکھا جا سکے۔ ضروری نہیں کہ یہ نمونے دیگر افراد ہی ہوں۔ یہ مشینیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان کی موجودگی میں ہم کچھ نئے خطوط پر سوچنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ گھڑی کی ایجاد نیوٹن کے اس تصور سے بہت پہلے کی ہے کہ دنیا ایک بڑی گھڑی کی طرز پر میکانکی صورت میں چل رہی ہے، یہ ایک فلسفیانہ بیان ہے جس کا انسان کی دانشورانہ ترقی پر گہرا اثر ہے۔ یہ کائنات کے اس نظام پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ایک بڑی گھڑی کی صورت ہے جہاں سبب اور اثر اور، داخلی کے مقابلے میں، خارجی محرک کی اہمیت زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ اس گھڑی نے ہمارے وقت کے تصور کو بھی اثر انداز کیا ہے یعنی اس نظریے کا رائج ہو جانا کہ ایک دن، ساٹھ منٹوں پر مشتمل ہے۔ ۲۴ برابر حصوں میں تقسیم ہے، اب یہ سلسلہ ہماری زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ حال ہی میں کمپیوٹر نے ہمارے سامنے نئے خیالات کا طوفان کھڑا کر دیا ہے یعنی انسان اپنی فعلیات کے حوالے سے بڑے نظاموں کا ایک متعامل حصہ ہے، وہ جس طریقے سے سیکھتا ہے، جس طرح چیزوں کو یاد رکھتا ہے، اور جس طرح اپنے فیصلے کرتا ہے۔ فی الواقع سیاسیات سے لے کر خاندانی نفسیات اور ہر شعبے پر نئے سے نئے تخیلات کا سیلاب آیا ہے اور وہ تمام تر مفروضے کمپیوٹر کی ایجاد اور اس کے پھیلاؤ کے مرہون منت ہیں۔ اور ابھی اس کے اثرات اپنے کمال کو نہیں پہنچے۔ لہٰذا، خود کفالت پر مبنی یہ مخترع چکر، تیزی سے جاری و ساری ہے۔

اگر ٹیکنالوجی کو ایک بڑے انجن، اور رفتار افزا کے طور پر لیا جائے تو علم کو اس کا ایندھن سمجھا جائے گا اور ہم معاشرے میں جاری تیز رفتار عمل کے بنیادی نقطے پر پہنچ جائیں گے، کیونکہ ہر روز اس انجن میں زیادہ سے زیادہ ایندھن ڈالا جا رہا ہے۔

علم بطور ایندھن

انسان جس شرح سے اپنے اور کائنات کے بارے میں مفید علم اکٹھا کر رہا ہے اس میں گزشتہ ۱۰،۰۰۰ سال سے تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ لکھائی کے ایجاد ہونے سے اس شرح نے ایک چھلانگ لگائی تاہم اس کے باوجود کئی صدیوں تک اس کی رفتار، درد انگیز طور پر، سست ہی رہی۔ علم کے حصول میں اگلی

چھلانگ پندرھویں صدی میں گوٹنبرگ (Gutenburg) ودیگر افراد کے ہاتھوں منقولہ ٹائپ رائٹر کی ایجاد تک ممکن نہ ہوئی۔ رجائیت پر مبنی اکثر اندازوں کے مطابق، سال ۱۵۰۰ء سے قبل یورپ میں چھاپی جانے والی کتب کی شرح ۱۰۰۰ اعنوانات فی سال تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ، تخمینے کے ذرا سے ردوبدل کے ساتھ، کہ ۱۰۰،۰۰۰ اکتب چھاپنے کے لیے ایک صدی کا عرصہ درکار تھا۔ ۱۹۵۰ء تک، یعنی تقریباً ساڑھے چار سو سال بعد، اس شرح میں اتنی تیزی سے اضافہ ہوا کہ یورپ میں ۱۲۰،۰۰۰ اعنوانات چھپ رہے تھے۔ جس کام نے ایک صدی کا عرصہ لیا اب اسی کام میں صرف دس ماہ کا عرصہ لگا۔ اس کی ایک دہائی بعد یعنی ۱۹۶۰ء تک، اس شرح میں پھر ایک مرتبہ جست دیکھنے میں آئی، یعنی ایک صدی کا کام محض ساڑھے سات مہینوں میں مکمل کرنا ممکن ہوا اور اس دہائی کے وسط تک، بشمول یورپ، دنیا بھر میں کتابوں کی اشاعت کی شرح حیرت انگیز حد تک پہنچ گئی اور یہ ۱۰۰۰ اعنوانات یومیہ ہوگئی۔

یہ بات بڑی مشکل سے تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ہر کتاب علم کے فروغ کے لیے لکھی گئی ہے۔ تاہم ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں تیزی کا رجحان اس شرح کے متوازی ہوگیا کہ جس شرح سے انسان نے نیا علم دریافت کیا۔ مثال کے طور پر گوٹنبرگ سے قبل معلوم کیمیاؤں کی تعداد صرف گیارہ تھی۔ اینٹی مونی (Antimony) کی دریافت کے ۲۰۰ سال بعد اس وقت دریافت کیا گیا جب گوٹنبرگ پر بھی کام کیا جارہا تھا۔ اگر دریافت پر اسی شرح پر کام ہوتا رہتا تو گوٹنبرگ کے بعد اب تک ہم صرف دو یا تین اضافی عنصر ہی دریافت کرنے میں کامیاب ہوتے۔ لیکن ان ۴۵۰ سالوں میں تقریباً ستر اضافی عناصر دریافت ہوئے اور ۱۹۰۰ء سے لے کر اب تک ہم باقی عناصر پر تجربات کا کام دو صدیاں فی مرکب کی شرح سے نہیں بلکہ ہر تین سال فی مرکب کی شرح سے کر رہے ہیں۔

مزید یہ کہ اس بات پر یقین کرنے کی وجہ بھی ہے کہ اس شرح میں اب بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر آج سائنسی جریدوں اور مضامین کی تعداد دگنی ہو رہی ہے، جیسے ترقی یافتہ ممالک میں صنعتی پیداوار میں ہر سال دگنا اضافہ ہوجاتا ہے اور ایک حیاتی کیمیا دان فلپ سیکیوٹز کے خیال میں ''جانداروں کی فطرت سے متعلق گزشتہ تین دہائیوں میں جو کچھ اخذ کیا گیا وہ تاریخ انسانی میں سائنسی دریافت کے کسی عہد میں حاصل کردہ علم کو کوتاہ کردیتا ہے۔ آج صرف امریکی حکومت کے زیر اہتمام ہر سال ۱۰۰،۰۰۰ رپورٹیں، ۴۵۰،۰۰۰ مضامین، کتابوں اور مقالات شائع ہوتے ہیں۔ عالمی سطح پر سائنسی اور تکنیکی مواد کی شرح تقریباً

۶۰،۰۰۰،۰۰۰ صفحات سالانہ ہے۔

کمپیوٹر ۱۹۵۰ء کے عرصے میں منظر عام پر آیا۔ تجزیہ کاری کی لامحدود قوت اور مختلف الانوع قسم کے اعداد و شمار کی لامحدود مقدار اور اس کی حیران کن رفتار کی سہولیات کے ساتھ کمپیوٹر حصول علم کی حالیہ تیز رفتاری کے پیچھے ایک بڑی قوت کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ ہمارے گرد موجود ان دیکھی کائنات کا مشاہدہ کرنے کے لیے تیزی سے قوت پذیر تجزیاتی آلات سے لیس، اس کمپیوٹر نے حصول علم کی شرح کو گنگ کردینے کی شرح تک بڑھا دیا ہے۔

فرانس بیکن نے ہمیں بتایا کہ ''علم...... طاقت ہے''۔ اب اس جملے کو معاصر اصطلاحات میں ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے معاشرتی ماحول میں، ''علم تبدیلی ہے'' اور حصول علم کی تیز رفتاری، ٹیکنالوجی کے بڑے انجن کی ایندھن کاری کا مطلب ہے تبدیلی کی رفتار کو تیز کرنا۔

مختلف صورت حال کا بہاؤ

دریافت، اطلاق، اثر، دریافت۔ ہم یہاں تبدیلی کا سلسلہ وار ردعمل دیکھتے ہیں، انسانی معاشرتی ترقی میں تیزی کی شرح میں بتدریج اضافے کا ایک موڑ۔ یہ تیز رفتار دھکا اب اس سطح پر پہنچ گیا ہے کہ اب، تخیل کے کسی بھی پہلو سے، اسے ''معمول کے مطابق'' نہیں کہا جاسکتا۔ صنعتی معاشرے کے عمومی ادارے اسے اپنی حدود میں نہیں رکھ سکتے اور اس کے اثرات ہمارے معاشرتی اداروں کو مسلسل متزلزل کر رہے ہیں۔ تمام سماجی قوتوں میں سے تیز رفتاری سب سے اہم سب سے کم سمجھ میں آنے والی قوت ہے۔

تاہم یہ کہانی کا آدھا حصہ ہی ہے۔ کیونکہ تبدیلی کی رفتار کو ایک نفسیاتی قوت کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اگرچہ نفسیات اسے مکمل فراموش کرتی ہے، لیکن ہمارے اردگرد کی دنیا ہمارے اندرونی توازن کو متاثر کرتی ہے، اور اس خاص طریقے کو تبدیل کرتی ہے جس طرح ہم زندگی کا تجربہ کرتے ہیں۔ بیرونی تیز رفتاری، اندرونی تیز رفتاری میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

اس بات کو ایک زیادہ سادہ انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے لیکن اس صورت میں کہ ہم انسان کی انفرادی زندگی کو ایک عظیم کھاڑی کے طور پر تصور کریں جس میں ''تجربے'' کا بہاؤ جاری ہے۔ تجربے کا یہ بہاؤ بے شمار ''صورتوں'' پر مشتمل ہے یا بے شمار صورت حال کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اردگرد کے معاشرے میں تیز رفتاری اس کھاڑی میں صورتوں کے بہاؤ کو بڑی قوت کے ساتھ تبدیل کرتی ہے۔

ان صورتوں کی کوئی واضح تعریف نہیں ہے تاہم اگر ہم انھیں قابلِ نظامت حصوں میں تقسیم نہ کریں تو ہم تجربے سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں ناکام رہیں گے۔ مزید یہ کہ جب صورتوں کے درمیان حدود نا قابل تعین ہے تو ہر صورت حال کی یقینی طور پر کوئی ''اکائی'' ہے اور اس کی آہنگ سازی بھی ہے۔

ہر صورت حال کے کچھ نہ کچھ قابلِ شناختی اجزاء ہوتے ہیں۔ ان میں ''اشیا'' کا شمار ہوتا ہے۔ فطری یا انسان کی بنائی ہوئی اشیا کا جسمانی منظر۔ ہر صورت حال کسی نہ کسی ''جگہ'' پر وقوع پذیر ہوتی ہے...... وہ مقام یا احاطہ جہاں یہ عمل ہوتا ہے (یہ محض اتفاق نہیں کہ لاطینی لفظ ''Situ''[1] کا مطلب ''جگہ'' ہے) تعریف کی رو سے ہر سماجی صورت حال میں کردار...... لوگ، ہوتے ہیں۔ صورت حال میں کسی معاشرے کے تنظیمی نیٹ ورک میں موجود محل وقوع اور نظریات کا پس منظر یا معلومات بھی شامل ہوتی ہیں۔ ان پانچ اجزاء کو مدنظر رکھ کر کسی بھی صورت حال کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

ان صورتوں میں ایک علیحدہ تناظر کا عمل دخل بھی ہے، چونکہ یہ ان تمام کو قطع کرتا ہے لہٰذا اسے اکثر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہے دورانیہ...... وقت کا وہ عرصہ جس میں صورت حال وقوع پذیر ہوتی ہے۔ دو ایسی صورتیں جو دیگر تمام حوالوں سے ایک جیسی ہوں، اگر ان میں سے ایک کا دورانیہ دوسری صورت حال سے زیادہ ہے تو وہ ایک جیسی بالکل نہیں ہوں گی۔ کیونکہ وقت ایک فیصلہ کن حیثیت سے سامنے آتا ہے جس سے کسی بھی صورت حال کے معنی یا اجزاء یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے کسی جنازے کے موقع پر کی جانے والی پریڈ کو انتہائی تیز رفتاری سے سرانجام دیا جائے تو وہ آواز مزاحیہ صورت اختیار کر لے گی۔ لہٰذا کوئی ایسی صورت جو ہمارے سامنے آئے گی اس کے مختلف معنی ہوں گے، بجائے اس صورت کے جو ایک خاص اسلوب میں ہو اور ہم پر اثر انداز ہو، اور ایسا محسوس ہوگا کہ یہ آواز اچانک نکلی اور فوراً ہی اس کا اثر ختم ہو گیا۔

یہاں پر پہلا نازک مرحلہ ہے جہاں پہنچ کر کسی بڑے معاشرے میں تیز رفتار دھکا کسی معاصر فرد کے روزمرہ تجربے کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ کیونکہ تبدیلی کی رفتار، جیسا کہ ہم دکھائیں گے، بہت سی صورتوں کا دورانیہ کم کر دیتی ہے۔ یہ بات نہ صرف ان کے ''مزے'' کو تبدیل کر دیتا ہے بلکہ تجربے کی کھاڑی میں ان کے بہاؤ کو تیز تر کر دیتا ہے۔ نسبتاً سست رفتاری سے تبدیلی ہوتی زندگی کے مقابلے میں بہت سی صورتیں ایک مجوزہ وقت میں اس کھاڑی سے گزر رہی ہیں...... اور یہ انسانی نفسیات میں عمیق تبدیلیوں پر دلالت کرتی ہے۔ جب

۲۔ اسی سے لفظ ''Situation'' بنا ہے۔

ہم ایک وقت میں کسی خاص صورتِ حال پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں، تو وہ شرح جس سے مختلف صورتیں ہمارے قریب سے گزر جاتی ہیں زندگی کے مجموعی ڈھانچے کو پیچیدہ تر کر دیتی ہیں، ان کرداروں کی تعداد دگنی کر کے جو ہم نے ادا کرنے ہیں اور ان منتخب شدہ چیزوں کی تعداد سے جنھیں سرانجام دینے کے لیے ہمیں مجبور کیا جاتا ہے۔ رد عمل کے طور پر، یہ چیز معاصر زندگی سے متعلق پیچیدگی کی راہ میں حائل ہونے کا کردار ادا کرتی ہے۔

مزید یہ کہ مختلف صورتوں کا تیز ترین بہاؤ پیچیدہ میکانیے سے مزید کام کی توقع رکھتا ہے جس کے ذریعے ہم اپنی توجہ ایک صورت حال سے دوسری صورت حال پر مبذول کرتے ہیں۔ کسی معاملے کا آگے پیچھے ہونا، طویل کام کے لیے کم وقت درکار ہونا، ایک وقت میں کسی ایک مسئلے یا صورتِ حال پر اطمینان بخش توجہ۔ یہی وہ چیز ہے جو اس مبہم سوچ کے پیچھے کارفرما ہے کہ ''چیزیں بہت تیز چل رہی ہیں''۔ یقیناً ایسا ہے۔ ہمارے اردگرد۔ اور ہمارے اندر۔

تاہم ایک اور اہم اور طاقت ور طریقہ ہے جس کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی کی رفتار زندگی سے ہم آہنگی کو پیچیدہ بنا ڈالتی ہے۔ یہ ہمارے وجود کے اندر موجود انوکھے پن اور جدت کی مداخلت کاری سے جنم لیتی ہے۔ ہر صورت حال انوکھی ہے۔ لیکن مختلف صورتیں ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں۔ دراصل یہی وہ چیز ہے جو ہمیں تجربے سے سیکھنا ممکن بناتی ہے۔ اگر ہر صورت حال میں ندرت پائی جاتی ہے، اور وہ تجربے میں آنے والی پہلی صورتوں سے مماثلت نہیں رکھتی، تو ہم آہنگ ہونے کی ہماری صلاحیت معدوم ہو جائے گی۔

تاہم تبدیلی کی تیز رفتاری انوکھی اور شناسا صورتوں کے درمیان توازن کو یکسر تبدیل کر دیتی ہے۔ اور تبدیلی کی بڑھتی ہوئی شرح ہمیں نہ صرف تیز تر بہاؤ سے ہم آہنگ ہونے پر مجبور کرتی ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ صورتوں کی مطابقت پر اکساتی ہے کہ جن پر پہلے سے موجود تجربات کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور اس سادہ سی حقیقت کے نفسیاتی دلائل، جن کا ذکر اس کتاب کے آنے والے صفحات میں ہوگا، کسی بھی دھماکے سے کم نہیں۔

انسٹی ٹیوٹ فار دی سٹڈی آف سائنس ان ہیومن آفیئرز کے کرسٹوفر رائٹ کہتے ہیں: ''جب بیرونی دنیا میں چیزیں تبدیل ہونا شروع ہو جائیں تو آپ محسوس کرتے ہیں کہ اندر ایک متوازی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ اس طرح کی اندرونی تبدیلیوں کی نوعیت اتنی عمیق ہوتی ہے کہ جونہی تیز رفتار دھکا رفتار پکڑتا ہے، تو یہ ہماری اس صلاحیت کو ٹیسٹ کرتا ہے جو ان ضابطوں کے درمیان زندگی گزارنے کی ہے جنھوں نے اب تک

انسان اور معاشرے کی وضاحت کی ہے۔ ایک ماہر تحلیل نفسی ایرک ایرکسن کے بقول، ''فی الوقت ہمارے معاشرے میں، 'واقعات کا قدرتی سلسلہ' محض یہ ہے کہ شرح تبدیلی کو، انسانی اور اداروں کی مطابقت پذیری کے حوالے سے اب تک نہ حاصل کی جاسکنے، والی حدود تک بلند ہو جانا چاہیے۔''

اپنی بقا کے لیے، اور ہماری اصطلاح ''مستقبل کے صدمے'' کا رخ موڑنے کے لیے، کسی بھی فرد کو، پہلے سے کہیں زیادہ، شاید لامحدود حد تک مطابقت پذیر اور اثر پذیر ہونا پڑے گا۔ اسے خود کو مستحکم کرنے کے یکسر نئے راستے تلاش کرنے ہیں کیونکہ تمام تر چیزوں...... مذہب، قوم، طبقہ، خاندان یا پیشہ...... کی پرانی جڑیں تیز رفتار دھکے کے طوفانی اثرات کی وجہ سے متزلزل ہیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ اس کام کو کرنے کے قابل ہو، اسے، تفصیلاً، سمجھنے کی ضرورت ہے کہ تیز رفتاری کے اثرات اس کی ذاتی زندگی میں کیسے داخل ہوتے ہیں، اس کے برتاؤ میں کیسے سرایت کرتے ہیں اور بقا کے معیار کو کیسے تبدیل کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اسے سمجھ لینا چاہیے کہ ناپائیداری کیا ہوتی ہے۔

☆☆☆

تیسرا باب

زندگی کی شرح رفتار

کچھ عرصے قبل تک اس کی تصویر ہر ٹیلی ویژن پر، ہوائی اڈوں اور ریلوے سٹیشنوں پر آویزاں پوسٹروں پر، ورقی اشتہاروں پر، ماچس کی ڈبیوں پر اور جریدوں پر دیکھی جاسکتی تھی۔ وہ میڈی سون ایونیو (Madison Avenue) کی ایک متاثر کن تخلیق تھی...... ایک افسانوی کردار جس کی شناخت لاکھوں افراد نیم شعوری طور پر کر سکتے ہیں۔ وہ ایک جوان، کلین شیو شخص تھا، اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا، وہ اٹیچی کیس اٹھائے ہوئے اپنی اگلی کاروباری مصروفیت کی طرف گامزن ایک عام تاجر دکھائی دیتا تھا۔ اس کے کاندھوں کے قریب مشینی کھلونوں کو چلانے کے لیے تتلی کی شکل کی ایک چابی لٹکی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کی کمر میں ورم آ گیا تھا۔ اس تصویر کے متن میں اس بات پر زور دیا گیا تھا اور ''چابی دیئے گئے'' افسران و منتظمین کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ شیریٹن ہوٹلوں میں جا کر اپنی ''رفتار'' سست کریں۔ ''چابی دیا ہوا'' یہ شخص، جو (اپنی منزل کی طرف) رواں دواں ہے، وہ اب بھی، مستقبل کی لوگوں کے لیے زبردست علامت ہے، وہ لاکھوں افراد جو انتہائی تیزی سے اپنے کام سرانجام دینے میں ایسے مصروف ہوتے ہیں جیسے ان کی کمر میں بھی کوئی چابی لگی ہو۔

اوسط درجے کا کوئی بھی انسان ٹیکنالوجی کی جدت یا حصول علم اور شرح تبدیلی کے چکر کے درمیان موجود رشتے سے متعلق کم جاننے کے ساتھ اس کی پروا بھی کم ہی کرتا ہے۔ اس کی بجائے وہ اپنی زندگی کی شرح رفتار کی ہر نوعیت سے مکمل آشنائی رکھتا...... ہے۔

زندگی کی اس شرح رفتار پر عام لوگ تو کبھی کبھار تبصرہ کرتے ہیں لیکن ماہرینِ نفسیات یا ماہرین عمرانیات اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے۔ کرداری علوم کے حوالے سے یہ موافقت کا نقص ہے، کیونکہ زندگی کی اس شرح رفتار کے انسان کے رویے پر گہرے اثرات ہوتے ہیں جو مختلف لوگوں سے مضبوط اور تقابلی ردعمل کا موجب ہوتے ہیں۔

حقیقتاً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ زندگی کی شرح رفتار انسانیت پر ایک خط کھینچ کر، ہمیں مختلف گروہوں میں

تقسیم کرتی ہے اور والدین اور بچوں میں غلط فہمیاں پیدا کرتی ہے، میڈیسن ایونیو (Madison Avenue) اور مین سٹریٹ (Main Street) کے درمیان مردوں اور خواتین، امریکیوں اور یورپ کے باشندوں، مشرق اور مغرب میں منقسم کر دیتی ہے۔

مستقبل کے لوگ

کرۂ ارض کے لوگ نسل، قوم، مذہب یا نظریات کی بنیاد پر ہی تقسیم نہیں بلکہ، ایک تناظر میں، ''وقت پر مبنی مقام'' بھی لوگوں کو تقسیم کرتا ہے۔ دنیا کی موجودہ آبادی کا جائزہ لیتے ہوئے ہم ایک ایسے چھوٹے گروہ کے بارے میں بھی جان لیتے ہیں جو ہزاروں سال پہلے کی طرح ابھی تک ریچھ یا دوسرے جانوروں کا شکار کرنے اور مختلف پھل اور دوسری خوردنی اشیا اکٹھی کرنے میں اپنی زندگیاں گزار رہا ہے جبکہ باقی انسانوں کی اکثریت کا انحصار اس کی بجائے زراعت پر ہے۔ وہ کئی حوالوں سے صدیوں پہلے موجود آباواجداد کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ ان مجوزہ گروہوں کی مجموعی تعداد بنی نوع انسان کی کل آبادی کا ستر فی صد بنتی ہے۔ اور انھیں ماضی کے لوگ کا کہا جاتا ہے۔

اس کے برعکس دنیا کی کل آبادی کا ۲۵ فی صد صنعتی ترقی یافتہ جدید معاشروں میں زندگی گزار رہا ہے۔ یہ لوگ بیسویں صدی کے پہلے حصے کی پیداوار ہیں، جن کی زندگی میں مشینی ترقی اور تعلیم کے پھیلاؤ نے انقلاب برپا کر دیا ہے، ان لوگوں کی پرورش اپنے ملک میں موجود زراعت کے زیر اثر ہوئی۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ زمانۂ حال'' کے لوگ کہلاتے ہیں۔

تاہم دنیا کی بقیہ تین و چار فی صد آبادی نہ تو زمانہ ماضی سے تعلق رکھتی ہے اور نہ ہی زمانہ حال سے کیونکہ سانتا مونیکا، کیلی فورنیا اور کیمبرج، میساچوسٹس، نیویارک، لندن اور ٹوکیو جیسے ٹیکنالوجی اور ثقافتی تبدیلی کے بڑے بڑے مراکز میں لاکھوں مرد و خواتین ایسے ہیں جن کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ زمانہ ''مستقبل'' کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جہت ساز لوگ اس آگہی سے ناآشنا ہیں، وہ آج کے عہد میں ایسے زندگی گزار رہے ہیں جیسے لاکھوں لوگ آنے والے کل میں گزاریں گے۔ دنیا بھر کی آبادی میں ان لوگوں کی تعداد چند فی صد ہی ہے تاہم وہ ہمارے درمیان ''مستقبل'' سے تعلق رکھنے والی عالمی برادری کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ انسان کے ''پیشگی'' نمائندے ہیں اور جدید ترین صنعتی معاشرے سے تعلق رکھنے والے اس عالمگیر معاشرے کے شہری ہیں جو پیدائش کے کٹھن مرحلے میں ہے۔

ان لوگوں کو باقی انسانوں سے کیا چیز ممتاز کرتی ہے؟ یقیناً یہ لوگ باقی انسانوں کی نسبت دولت مند، بہتر تعلیم یافتہ اور زیادہ متحرک ہیں۔ یہ لوگ زیادہ عرصے تک زندہ رہتے ہیں۔ لیکن زمانۂ ''مستقبل'' سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں کا نشانِ امتیاز یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے سے ہی زندگی کے ایک نئے اور ''ایک قدم آگے'' کے چلن پر گامزن ہیں۔

یہ لوگ اپنے اردگرد موجود لوگوں کی نسبت ''تیز تر'' زندگی گزار رہے ہیں۔ کچھ لوگ زندگی کی اس تیز رفتاری کی طرف انتہائی لگن کے ساتھ ''مائل'' ہیں...... اور اسے حاصل کرنے کے لیے اپنی ڈگر سے ہٹ کر سرتوڑ کوششیں کرتے ہیں اور ''جہاں جہاں کوئی حرکت ہو رہی ہو'' اس وقت خود کو بڑا متجسس، عدم اطمینان کا حامل اور دباؤ کا شکار سمجھتے ہیں۔ (یقینی طور کچھ لوگ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ ''حرکت'' کیا ہے، جب تک کہ یہ کسی خاص رفتار سے عمل پذیر نہ ہو) مثال کے طور پر جیمز اے ولسن اس نتیجے پر پہنچا کہ ''مشہور زمانہ چیز'' اخراج الرجال'' کے پیچھے کارفرما خفیہ محرکات میں سے ایک زندگی کی تیز شرح رفتار کی طرف رغبت بھی ہے...... جس کے تحت یورپی سائنس دانوں کی ایک کثیر تعداد امریکہ اور کینیڈا منتقل ہو گئی ہے۔ نقل مکانی کرنے والے ۵۱۷ برطانوی سائنسدانوں اور انجینئروں کا مشاہدہ کرنے کے بعد، ولسن اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف بہتر معاوضے اور بہتر تحقیقی سہولیات ہی نہیں بلکہ زندگی کی تیز شرح رفتار بھی ان کے لیے کشش کا باعث بنی۔ انھوں نے مزید کہا، ''نقل مکانی کرنے والے ان لوگوں کے لیے شمالی امریکہ کی تیز شرح رفتار ہی ان کی دلچسپی کا باعث نہیں بنی بلکہ بات یہ ہے کہ انھوں نے اس رفتار کو دیگر تمام باتوں پر فوقیت دی۔'' اسی طرح مسی سیپی میں عوامی حقوق کی تحریک کے ایک روح رواں نے کہا، ''جو لوگ تیز ترین شہری زندگی کے عادی ہیں وہ دیہی جنوبی امریکہ میں ایسی زندگی کی سہولیات حاصل نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ بے وجہ لوگ کسی نہ کسی سمت میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔ سفر کرنا ہی کامیابی کے حصول کا ذریعہ ہے۔'' بظاہر بے مقصد نظر آنے والا یہ عمل ایک متبادل میکانکی عمل کا نام ہے۔ زندگی کی اس شرح رفتار کی طرف مائل ہونے کی اس مضبوط لگن کو سمجھنے کے بعد ہی ہم اس قابل ہوں گے کہ اس ناقابل بیان یا ''بے مقصد'' ردعمل کی وضاحت کر سکیں۔

کچھ لوگ زندگی کی اس نئی اور تیز رفتاری پر کامیابی سے گامزن ہیں، جبکہ دیگر لوگ اس سے اس قدر گریزاں کہ وہ اسے ایک نہ ختم ہونے والا چکر قرار دیتے ہیں۔ جدید ترین صنعت پر مبنی اس ابھرتے ہوئے معاشرے میں مصروف عمل ہونے کا مطلب ہے کہ ایسی دنیا میں مصروف ہو جاؤ جو پہلے کی نسبت انتہائی تیز

رفتاری سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ وہ اس ''رفتاری'' سے پسپائی اختیار کرتے ہوئے اپنی ہی رفتار سے چلنا چاہتے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ چند سال پیشتر لندن اور نیویارک میں منعقد ہونے والے "Stop the world....I want to get off" نامی میوزیکل شو نے انتہائی شہرت و مقبولیت پائی۔

ہپیوں (hippies) کے خصوصی وصف پر مبنی ایک اصول 'اپنے لیے پسند کریں یا پیچھے ہٹ جائیں' "opt out" یا "copout" ان کے اس عزم کے باوجود کہ ٹیکنالوجی کی ثقافت سے گریز کیا جائے اب اتنا مؤثر نہیں رہا جتنا زندگی کی اس تیز شرح رفتار سے دوری کی ایک لاشعوری کوشش، کیونکہ یہ زندگی ان چند لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ یہ بھی کوئی اتفاق نہیں کہ یہ لوگ معاشرے کو ''چوہا دوڑ'' سے تشبیہ دیتے ہیں...... ایک اصطلاح جو خصوصیت کے ساتھ 'شرح رفتار' سے وابستہ ہے۔

بزرگ لوگوں سے متعلق یہ بات قرین قیاس ہے کہ وہ تبدیلی کی اس رفتار کے خلاف سختی سے ردعمل کا اظہار کریں۔ اس مشاہدے سے متعلق ریاضی کا ایک ٹھوس اصول ہے کہ عمر کا قدامت پرستی سے ایک رشتہ ہوتا ہے: بزرگوں کے لیے وقت تیزی سے گزرتا ہے۔

جب ایک پچاس سالہ باپ اپنے پندرہ سالہ بیٹے سے کہتا ہے کہ اسے کار کے حصول کے لیے مزید دو سال انتظار کرنا ہوگا تو اس ۷۳۰ دنوں کے وقفے سے مراد باپ کی زندگی کا محض ۴ فی صد ہے جبکہ یہی ۷۳۰ دن اس بچے کی زندگی کا ۱۳ فی صد بنتے ہیں۔ یہ بات انتہائی حیران کن ہے کہ بیٹے کو یہی تاخیر باپ کی نسبت تین یا چار گنا طویل نظر آتی ہے۔ اسی طرح ایک چار سالہ بچے کے لیے زندگی کے دو گھنٹے اس کی ۲۴ سالہ ماں کی زندگی کے ۱۲ گھنٹوں کے برابر ہیں۔ لہٰذا اس بچے کو یہ کہنا کہ وہ مٹھائی کے ایک ٹکڑے کے لیے دو گھنٹے انتظار کرے، درحقیقت اس بچے کی ماں کو کافی کے ایک کپ کے لیے ۱۴ گھنٹے انتظار کرانے کے مترادف ہے۔

وقت کے حوالے سے اس طرح کے امتیازات کی ایک حیاتیاتی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ مانچسٹر یونیورسٹی کے ماہر نفسیات جان کوہن کہتے ہیں، ''بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ تقویمی سال تیزی سے سکڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ماضی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ ہر گزرنے والا سال، گزرے ہوئے والے سال کی نسبت طوالت میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے، ممکنہ طور پر اس کی وجہ جسم میں میٹابولک (Metabolic) عوامل کا بتدریج سست پڑ جانا ہے''۔ ان کے اپنے حیاتیاتی توازن کی سست روی کے باعث عمر رسیدہ افراد کو حقیقتاً ایسا نہ ہونے کے باوجود دنیا تیز چلتی ہوئی معلوم ہو سکتی ہے۔

وجوہات جو بھی ہوں، تبدیلی کی کوئی بھی رفتار، جو کسی مجوزہ وقفے میں، کسی تجرباتی ''ذریعے'' میں مزید صورتوں کو اکٹھا کرنے کا اثر رکھتی ہے وہ عمر رسیدہ لوگوں کے خاص تناظر میں بڑی نظر آتی ہے۔ جوں جوں معاشرے میں تبدیلی کی شرح تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے توں توں عمر رسیدہ افراد کی کثیر تعداد بڑی دلچسپی سے اس فرق کو محسوس کرتی ہے۔ عمر رسیدہ افراد تارک الدنیا ہو کر ایک نجی ماحول تک محدود ہو جاتے ہیں اور انتہائی تیزی سے سرگرم عمل بیرونی دنیا سے، جس حد تک ممکن ہو، اپنا ناطہ توڑ لیتے ہیں اور اپنی موت تک مجہول حالت میں اپنے ماہ و سال گزارتے ہیں۔ ہم لوگ عمر رسیدہ افراد کے نفسیاتی مسائل اس وقت تک حل نہیں کر سکتے جب تک ہم وہ ذرائع تلاش نہ کر لیں...... بائیوکیمسٹری (حیاتی کیمیا) یا ازسرِ نو تعلیم کے ذریعے...... جن سے ان کی وقت کے ادراک کی حس تبدیل ہو سکے، یا ان کے لیے ایسے محصورے تعمیر کیے جائیں جہاں زندگی کے چلن کو کنٹرول کیا جا سکے، بلکہ وہ ان کی خاص تقویم کے مطابق ہو جہاں وقت ان کے خاص تناظر میں کٹ سکے۔

بظاہر ناقابلِ بیان نظر آنے والے تفاوت...... نسلوں کے درمیان، والدین اور بچوں کے درمیان، شوہر اور بیوی کے درمیان...... کو زندگی کی شرح رفتار اور اس کی رفتار کی پہچان امتیازی ردعمل سے ہوتی ہے۔ یہی بات ثقافتی تفریق پر بھی صادق آتی ہے۔

ہر ثقافت کی ڈگر کی اپنی صفاتی رفتار ہوتی ہے۔ مشہور ایرانی ناول نگار اور مضمون نگار ایف ایم اسفندیاری نے ایک خاص واقعے کے حوالے سے مختلف شرح رفتار کے حامل دو نظاموں کا ذکر کیا ہے۔ جب جنگ عظیم دوم سے قبل جرمنی سے تعلق رکھنے والے انجینئر ان کے ملک (ایران) میں ریل کی پٹڑی بچھانے میں مدد فراہم کر رہے تھے۔ ایران اور مشرقی وسطیٰ سے تعلق رکھنے والی اقوام، امریکیوں اور یورپی اقوام کی نسبت ''وقت'' کے حوالے سے سستی پر مبنی ایک رویہ رکھتی تھیں۔ جب ایرانی محنت کشوں کے گروپ مسلسل دس منٹ تاخیر سے پہنچتے تو اُن جرمن لوگوں نے، جو خود غیر معمولی طور پر وقت کے پابند تھے اور ہمیشہ جلدی اور پھرتی میں رہتے تھے، انھیں نوکریوں سے برخاست کرنا شروع کر دیا۔ ایرانی انجینئروں کو اپنے جرمن ہم منصبوں کو یہ بات سمجھانے میں خاصا وقت لگا کہ مشرقی وسطیٰ کے معیارات کے مطابق یہ محنت کش حیران کن حد تک وقت کی پابندی کر رہے ہیں، اگر انھیں برخاست کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا تو ہمیں کام کرنے کے لیے سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی بھی دستیاب نہ ہوگا۔

وقت کے ساتھ یہ بے اعتنائی ان لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث ہو سکتی ہے جن کی زندگی کی شرح

رفتار انتہائی تیز ہو اور وہ وقت کے انتہائی پابند ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اطالوی شہروں میلان اور تورین (Turin) جن کا شمار جنوبی علاقوں کے صنعتی شہروں میں ہوتا ہے، سے تعلق رکھنے والے افراد، زندگی میں سست چلن اور رفتار کے حامل (جزائر) سسلی کے باشندوں کو کم تر سمجھتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کی زندگیاں ابھی تک سست رفتار زراعت سے وابستہ ہیں۔ سٹاک ہوم یا گوٹی بورگ سے تعلق رکھنے والے سویڈن کے باشندے لیپ لینڈرز (Laplanders) کے بارے میں یہی خیالات رکھتے ہیں۔ امریکی لوگ میکسیکو کے باشندوں کے لیے حقارت پر مبنی سوچ رکھتے ہیں، وہ میکسیکو کے باشندے جن کے لیے ''لیت ولعل'' کافی ہوتی ہے۔ خود امریکہ میں شمال میں بسنے والے لوگ جنوب میں بسنے والے باشندوں کو سست رو کہتے ہیں اور معاشرے کے اوسط طبقے کے حبشی النسل لوگ محنت کش حبشیوں کو ملامت کرتے رہتے ہیں۔

جبکہ اس کے برعکس، اور کسی بھی دوسری قوم کی نسبت، امریکیوں اور کینیڈا کے باشندوں کو تیز رفتار، جلدی کام کرنے والا اور ''اپنا مقصد حاصل کرنے والا'' سمجھا جاتا ہے۔

کبھی کبھار افراد کی اکثریت بڑی مستعدی کے ساتھ زندگی کی شرح رفتار میں تبدیلی کو روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ ایک تشخیصی قسم کا عناد ہے اس عمل کی طرف جو بہت سے افراد کے نزدیک یورپ کی ''امریکیت'' کہلاتی، وہ نئی ٹیکنالوجی جس پر جدید ترین صنعت کی بنیاد رکھی گئی ہے اور ان میں سے اکثر کے خاکے امریکی تحقیقی لیبارٹریوں میں تیار کیے گئے ہیں، ان کی آمد سے معاشرے میں تبدیلی کی ایک ناگزیر تیزی آتی ہے اور انسان کی انفرادی زندگی کی شرح رفتار میں بھی لازمی تیزی پیدا ہوتی ہے۔ امریکہ مخالف لابی کے لوگ اپنے ذاتی استعمال کے لیے امریکی کمپیوٹر یا کوکا کولا کو رد کر دیں لیکن ان کی تنقید کا اصل ہدف بدیسی چیزوں کے ہاتھوں یورپ کا غلبہ ہوسکتا ہے۔ جدید ترین صنعت کاری کے پیشرو کی حیثیت سے امریکہ ایک نئی، تیز، اور غیر مطلوب رفتار کی نمائندگی کرتا ہے۔ مختصراً یہ کہ اسی مسئلے کی نمائندگی بڑے زور و شور کے ساتھ حال ہی میں پیرس میں متعارف ہونے والے امریکی ڈرگ سٹوروں سے ہوئی۔ بہت سے فرانسیسیوں کے لیے ان ڈرگ سٹوروں کا وجود امریکی ''ثقافتی سامراجیت'' کا اشتعال انگیز اور منحوس ثبوت ہے۔ امریکیوں کے لیے صرف ایک بےضرر سے سوڈا پلانٹ کے لیے اس قسم کا ردعمل نا قابل فہم ہے۔ جو چیز اس حقیقت کو عیاں کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ''لی ڈرگ سٹور'' پر ایک پیاسا فرانسیسی جلد تیار ہونے والے ملک شیک کو فوراً ''نگلتا'' ہے بجائے بیرونی یا دور دراز واقع کیفے میں تیار ہونے والے مفرح مشروب کے انتظار کرنے کے۔ یہ بات بھی قابل توجہ

ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں تشکیل پانے والی نئی ٹیکنالوجی کے فروغ سے تقریباً ۳۰،۰۰۰ کیفے کا کاروبار متاثر ہوا اور انھوں نے ہمیشہ کے لیے اپنے دروازے بند کر لیے، ''ٹائم میگزین'' کے الفاظ میں یہ لوگ ''جلد آرڈر والی ثقافت'' (Short order culture) کے متاثرین ہیں۔ (ایسا ممکن ہے کہ یورپی افراد کی بڑی تعداد ''ٹائم'' کو پسند نہیں کرتی، اس کی وجہ صرف سیاسی نہیں بلکہ اس کی جڑیں لاشعوری طور پر اس کے عنوان سے جڑی ہیں۔ ٹائم اپنے ایجاز و اختصار اور شاندار اسلوب کے ساتھ امریکی طرز بود و باش کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ امریکی زندگی کی شرح رفتار کی عکاسی کرتا ہے اور اسے بیرونی دنیا تک پہنچاتا ہے)۔

متوقع دورانیہ

یہ بات سمجھنے کے لیے کہ زندگی کی شرح رفتار تکلیف دہ اور خلل انگیز کیوں ہے، ضروری ہے کہ ''متوقع دورانیے'' کے نظریے کو سمجھا جائے۔

انسان کا تخیل وقت اس کے اندرونی آہنگ سے منسوب ہے۔ لیکن وقت سے متعلق اس کے رویے ثقافتی طور پر مشروط ہیں۔ ان شرائط کا ایک حصہ بچے کے اندر واقعات کے دورانیے، مراحل یا تعلقات کے حوالے سے، تواتر کے ساتھ بچے کے اندر توقعات کی تعمیر کرنا ہے۔ بے شک بچے کو سکھائے جانے والے علوم میں سے اہم ترین بات یہ ہے کہ اسے بتایا جائے کہ یہ چیزیں کب تک برقرار رہیں گی۔ اس علم کی تعلیم عموماً بڑے دقیق، غیر رسمی اور اکثر لاشعوری انداز میں دی جاتی ہے۔ تاہم سماجی طور پر موزوں ''متوقع دورانیوں'' کے ایک مجموعے کے بغیر کوئی فرد بھی کامیابی سے اپنے امور سرانجام نہیں دے سکتا۔

بچپن سے ہی کوئی بچہ سیکھنا شروع کر دیتا ہے، مثال کے طور پر جب بچے کا باپ علی الصبح کام پر جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کئی گھنٹے تک گھر واپس نہیں آئے گا۔ (اگر وہ واپس آ جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کچھ گڑبڑ ہے؛ ضابطہ خراب ہو گیا۔ بچہ بہت جلد یہ بات بھی سیکھ جاتا ہے کہ ''کھانے کا دورانیہ'' نہ تو ایک منٹ ہے اور نہ ہی پانچ گھنٹے، عمومی طور اس کا دورانیہ ۱۵ منٹ سے ایک گھنٹہ ہے۔ بچہ یہ بات بھی جان لیتا ہے کہ فلم دیکھنے کے لیے جانے کا مطلب ہے کہ یہ کام دو سے چار گھنٹے کا ہے، لیکن امراضِ اطفال کے ماہر ڈاکٹر کے پاس جانے کا مطلب ہے کہ یہ کام ایک گھنٹے سے زیادہ کا ہے۔ وہ بچہ یہ بھی سیکھ لیتا ہے کہ سکول کے اوقات چھ گھنٹے تک رہتے ہیں۔ بچہ کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ ایک استاد کے ساتھ اس کا تعلق تعلیمی سال کے اختتام تک رہے گا، لیکن اس کے دادا اور دادی کے ساتھ اس کا تعلق کا دورانیہ طویل ہے۔ یقیناً کچھ

تعلق ایسے ہوتے ہیں جن کا ساتھ عمر بھر کا ہوتا ہے۔ایک بالغ رویے میں ہم سب لوگ، محبت کے اظہار کے لیے ایک خط لکھنا پسند کرتے ہیں اور اس میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے دورانیوں کے بارے میں ہم لوگ بخوبی جانتے ہیں۔یہی متوقع دورانیے ہوتے ہیں، جو مختلف معاشروں میں مختلف ہوتے ہیں، جن کے بارے میں لوگ بہت جلد جان لیتے ہیں، اور جب زندگی کی شرح رفتار تبدیل ہوتی ہے تو یہ متوقع دورانیے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کون لوگ زندگی کی اس تیز رفتاری سے متاثر ہوتے ہیں اور کون لوگ اس صورت حال میں گزارہ کر رہے ہیں۔ جب تک کوئی فرد اپنے متوقع دورانیوں کو ترقی کی رفتار کے مطابق نہیں بنائے گا اس وقت تک وہ بظاہر اور دیگر نوعیتوں میں ایک جیسی نظر آنے والی دو صورت احوال کو یکساں ہی سمجھتا رہے گا۔تاہم تیز رفتار دھکا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس قسم کی صورتیں وقت کے دباؤ میں آ جائیں گی۔

وہ فرد جس نے تیز رفتاری کے اصول کو اپنا لیا......وہ اس بات کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے ارد گرد کی دنیا میں چیزیں تیزی سے چل رہی ہیں......وہ وقت کے دباؤ کے لیے خود کارانہ اور لاشعوری طور پر تلافی کے لیے تیار ہیں۔اس بات کی پیش گوئی کرنا کہ یہ صورتیں کم عرصے کے لیے قائم رہیں گی، ایسے میں وہ شخص جس کے متوقع دورانیے کا عرصہ کم ہے مسائل کا کم شکار ہوتا ہے اور اسے کم دھچکا لگتا ہے، بہ نسبت اس شخص کے جو عمومی حالات میں مختلف صورتوں میں متوقع دورانیوں کو مختصر کرنے کے لیے تیار نہیں۔

مختصراً یہ کہ زندگی کی شرح رفتار میں تیزی کو ایک محاورے، مزاح کے ایک انداز، کفِ افسوس، شکایات یا نسلی تعصب کے طور پر نہیں لینا چاہیے۔ یہ ایک اہم نفسیاتی تغیر ہے جسے مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔گزشتہ ادوار میں جب معاشرے میں تبدیلیوں کی رفتار سست تھی، اس وقت انسان اس تغیر سے نا آشنا رہ سکتا تھا اور رہتا تھا۔کسی فرد کی تمام زندگی میں شرح رفتار میں تبدیلی نہ ہونے کے برابر ہوئی ہوگی۔تاہم اس تیز رفتار دھکے نے اس صورتِ حال کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔کیونکہ یہ صرف زندگی کی رفتار میں ایک قدم کی تیزی ہے کیونکہ سائنسی، ٹیکنالوجی اور سماجی تبدیلیوں کی بدولت کسی فرد کی انفرادی زندگی میں تبدیلی محسوس کی جاسکتی ہے۔انسانی رویوں اور ردعمل کا ایک بڑا حصہ زندگی کی شرح رفتار کی طرف کشش یا عناد کے مرہونِ منت ہے جو اس معاشرے یا معاشرے کے کسی گروہ کی طرف سے عائد کیا جاتا ہے جس میں وہ رہ رہا ہے۔اس اصول پر

کاربند نہ ہو سکنے کی وجہ تعلیم اور نفسیات کا، خطرناک حد تک، عدم حصول ہے کیونکہ یہی چیزیں اس جدید ترین صنعتی معاشرے میں انسان کو مفید کردار ادا کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔

ناپائیداری کا نظریہ

سماجی اور نفسیاتی تبدیلی سے متعلق ہمارے بہت سے نظریات نسبتاً جامد معاشروں میں موجود انسان کی ایک مکمل تصویر پیش کرتے ہیں......لیکن ایک معاصر شخص کی نامکمل اور مسخ شدہ تصویر پیش کرتے ہیں۔یوں ماضی کے انسان یا زمانۂ حال کے شخص اور مستقبل کے کسی شخص میں موجود انتہائی معمولی فرق کو واضح نہیں کیا جاتا۔اس فرق کو ایک لفظ ''ناپائیداری'' میں بیان کیا گیا ہے۔

ناپائیداری کا نظریہ تبدیلی کے عمرانی تصورات اور انسانی انفرادی نفسیات کے درمیان ایک طویل عرصے سے گمشدہ رشتے کو واضح کرتے ہیں۔ان دونوں کے ملاپ سے انتہائی تیز رفتاری سے روبہ عمل تبدیلیوں کو ایک نئی طرح سے سمجھنا ممکن ہو جاتا ہے اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے یہ چیزیں ہمیں ایک نیا انداز عطا کرتی ہیں ...... جو انتہائی بنیادی لیکن طاقتور ہے...... یعنی صورت حال کے بہاؤ کی شرح کو استنباطی طریقے سے ماپنا۔

ناپائیداری روزمرہ کی زندگی میں ایک نیا ''عارضی پن'' ہے۔یہ ایک موڈ اور ''وقتی'' احساس کا نام ہے۔فلسفی اور نظریہ ساز ہمیشہ اس بات سے آگاہ رہے ہیں کہ انسان ایک بے ثبات چیز ہے۔بڑے پیمانے پر اپنی حسیات کے حوالے سے، ناپائیداری ہمیشہ اس کا جزو زندگی رہی ہے مگر اس عہد میں ناپائیداری کچھ زیادہ سریع القوۃ اور گہری نوعیت کی ہے۔لہٰذا ''دی زو سٹوری'' (The Zoo Story) میں ایلبی (Albee) کا کردار جیری خود کو ایک ''مستقل تغیر پذیر'' شخص قرار دیتا ہے اور ایبی پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تنقید نگار ہیرولڈ کلرمین (Harold Clurman) لکھتا ہے: ''ہم میں سے کوئی بھی محفوظ پناہ گاہ میں نہیں ہے......یعنی اصل گھروں میں۔ہم تمام لوگ ایک جیسے ہیں اور ایسے گھروں میں رہتے ہیں جہاں ہم بڑے عجیب و غریب انداز میں اپنے ہمسایوں سے ایسے مراسم استوار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو ہماری روح کی تسکین کا باعث بنیں۔'' دراصل ہم ایک ایسے عہد کے شہری ہیں جو ناپائیداری کا عہد ہے۔

تاہم یہ صرف لوگوں سے ہمارے تعلقات ہی نہیں جو شدید نزاکت اور ناپائیداری پر مبنی نظر آتے ہیں، اگر ہم انسان کی ذات سے باہر نکل کر دیکھیں تو ہم اس کے تعلقات کی پہچان مختلف رشتوں سے کریں گے۔لہٰذا دیگر لوگوں سے اس کے تعلقات کے ساتھ ساتھ ہم فرد کے اشیا کے ساتھ تعلقات پر بھی بات کریں

گے۔ ہم اپنے مشاہدے کے لیے اس کے مقامات کے ساتھ تعلقات کی بھی بات کریں گے۔ ہم اس کے اردگرد موجود اداروں یا تنظیمی ماحول اور ان سے فرد کے تعلقات کا بھی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم معاشرے میں رائج مختلف نظریات یا معلومات کے پھیلاؤ کے حوالے سے اس کے روابط پر بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔

یہ پانچ قسم کے تعلقات......اور وقت......سماجی تجربات کا تانا بانا بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ، جیسا پہلے بیان کیا گیا ہے، اشیا، مقامات، لوگ، تنظیمیں اور نظریات تمام تر صورتوں کے بنیادی اجزا ہیں۔ یہ فرد کا ان اجزا میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک ممتاز تعلق ہی ہے جو کسی صورت حال کی تشکیل کرتا ہے۔

اور بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعلقات ہی ہیں جو کسی معاشرے میں تیز رفتاری پیدا ہونے کی وجہ سے، وقت کی نوعیت کے اعتبار سے مختصر اور سکڑ کر دب گئے ہیں۔ وہ تعلقات جو کبھی طویل المدت ہوتے تھے اب ان کے متوقع دورانیے مختصر ہو گئے ہیں۔ یہی اختصار اور دباؤ جو ہمیں ایک محسوس کرنے والی حس عطا کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ہم یکے بعد دیگرے تبدیل ہونے والے، بغیر جڑ کے، اور غیر یقینی ٹھکانوں میں رہ رہے ہیں۔

بے شک ناپائیداری کو ہم اصطلاح کے طور پر اس شرح کی حیثیت سے بیان کر سکتے ہیں جس پر ہمارے تعلقات ایک خاص انداز سے الٹ گئے ہیں۔ اب یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ مختلف صورتوں کو ہمارے تجربے سے گزرنے میں پہلے کی نسبت کم وقت لگتا ہے، تاہم یہ ممکن ہے کہ انھیں ان کے اجزا میں توڑ دیا جائے اور انھیں اس شرح کی مناسبت سے ماپا جائے، کہ جس شرح پر یہ اجزا ہماری زندگیوں میں داخل ہوتے ہیں اور خارج ہوتے ہیں......بالفاظ دیگر انھیں تعلقات کے دورانیوں کے حوالوں سے ماپا جائے۔

اگر ہم ''اُلٹ پلٹ'' کے نقطۂ نظر کے حوالے سے ناپائیداری کے نظریے کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ہمیں ناپائیداری صحیح معنوں میں سمجھ آئے گی، مثلاً ایک ایسے سٹور پر جہاں سبزی فروخت ہوتی ہے وہاں ٹن پیکنگ میں بند مارچوب[1] کی نسبت دودھ زیادہ فروخت ہو رہا ہے۔ دودھ کی فروخت بھی ہو رہی ہے اور یہ دوسری چیزوں (کی فروخت) کا نعم البدل بھی ثابت ہو رہا ہے۔ اب ایک ہی دُکان پر تمام اشیا رکھنے کا رجحان تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے۔ ایک مستعد تاجر فروخت ہونے والی اشیا میں ردوبدل کی شرح کو بہتر جانتا ہے اور اسی لیے وہ پورے سٹور میں موجود اشیا کی عمومی قیمتوں سے بھی بخوبی واقف ہوتا ہے۔ دراصل وہ اشیا میں ردّوبدل اور اس کی شرح کو اپنے کاروباری ادارے کی کامیابی قرار دیتا ہے۔

۱۔ سوسن قبیلے کی ایک سدابہار بوٹی جسے سبزی کے طور پر کھایا جاتا ہے۔

لہٰذا ہم تمثیل کے ذریعے ناپائیداری کو کسی فرد کی انفرادی زندگی میں اس کے مختلف تعلقات میں الٹ پلٹ کی شرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس شرح کی رو سے ہر کسی میں امتیاز بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ کسی فرد کے لیے اس کی زندگی میں الٹ پلٹ کی شرح دوسرے فرد کی نسبت کم ہے۔ ماضی اور حال کے لوگوں نے نسبتاً ''کم ناپائیداری'' کی زندگی گزاری......یعنی ان کے تعلقات دیرپا ہوتے تھے۔ لیکن ''مستقبل'' کے لوگ ''انتہائی ناپائیداری'' کی کیفیت میں رہتے ہیں......ایک ایسی حالت جس میں رشتوں کا دورانیہ مختصر ہے، تعلقات کی تعداد کثیر ہے اور اس کی رفتار انتہائی تیز ہے۔ ان کی زندگیوں میں اشیا، مقامات، لوگ، نظریات اور تنظیمی ڈھانچے بڑی تیزی سے ''پرانے'' ہو جاتے ہیں۔

اس بات سے اس صورت حال پر شدید اثر پڑتا ہے کہ جیسے وہ حقیقت کو دیکھتے ہیں، ان کا عزم کیسا ہے اور ان میں کون سی صلاحیت موجود ہے......یا تعاون کرنے کی عدم صلاحیت۔ یہ مقررہ وقت میں کیے گئے کام کی تعداد ہے جو ماحول میں موجود جدّت اور پیچیدگی سے جڑی ہوئی ہے اور وہ مطابقت پذیری کی صلاحیت کو کمزور کرتی ہے اور مستقبل کے دھچکے کا خطرہ پیدا کرتی ہے۔

اگر ہم یہ دکھانے میں کامیاب ہو جائیں کہ بیرونی دنیا سے ہمارے رشتے اور تعلقات زیادہ سے زیادہ ناپائیدار ہو رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارے پاس اس تخیل کے مضبوط شواہد موجود ہوں گے کہ مختلف صورتوں کا بہاؤ تیزی اختیار کر گیا ہے۔ اور ہمارے پاس خود کو اور دیگر افراد کو دیکھنے کا ایک یکسر نیا اور تیز طریقہ آ گیا ہے۔ لہٰذا آئیں اور زندگی کو ایک انتہائی ناپائیدار معاشرے میں تلاش کریں۔

☆☆☆

دوسرا حصّہ

ناپائیداری

چوتھا باب

اشیا: پھینک دینے والا معاشرہ

''بار بی''، ایک بارہ انچ لمبی، پلاسٹک کی بنی ہوئی، موجودہ عہد میں سب سے زیادہ شناسا اور سب سے زیادہ فروخت ہونے والی گڑیا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں متعارف ہونے کے بعد سے دنیا میں ''بار بی'' نامی گڑیا کے خریداروں کی تعداد ۱۲،۰۰۰،۰۰۰ ہوگئی ہے۔ یہ تعداد لاس اینجلس، لندن یا پیرس کی آبادی سے زیادہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ''بار بی'' کو انتہائی پسند کرتی ہیں کیونکہ یہ گڑیا ''انتہائی حقیقی'' دکھائی دیتی ہے اور اس کو ہر طرح کا لباس پہنایا جا سکتا ہے۔ اس گڑیا کو تیار کرنے والی، میٹل انکارپوریشن کمپنی، اس گڑیا کے لیے ایک مکمل وارڈ روب بھی فروخت کرتی ہے، جس میں دن میں پہننے کے لیے عمومی کپڑے، پارٹی میں جانے کے لیے رسمی لباس، تیراکی اور سکیٹنگ کے لیے لباس ہوتے ہیں۔

حال ہی میں میٹل نامی کمپنی نے ایک نئی پہلے سے بہتر اور جدید ترین ''بار بی'' گڑیا متعارف کروائی۔ اس نئی گڑیا کا جسم نسبتاً تیکھا دبلا پتلا ہے، آنکھوں کی پلکیں حقیقی اور اس کی کمر لچک دار ہے جو اسے اس سے پہلے کی نسبت زیادہ ''انسان نما'' بنا دیتی ہے۔ مزید یہ کہ میٹل کمپنی نے، پہلی مرتبہ، یہ اعلان کیا کہ اگر کوئی نوجوان خاتون نئی ''بار بی'' خریدنا چاہتی ہے (اور اس کے پاس پرانی بار بی گڑیا موجود ہے) تو اسے پرانی گڑیا کے عوض ایک خاص تاجرانہ رعایت ملے گی۔

میٹل کمپنی نے جس چیز کا اعلان نہیں کیا وہ یہ ہے کہ آج کے عہد کی یہ بچی جو کل کے دنیا کے جدید ترین صنعتی عہد میں داخل ہوگی اور جب وہ پرانی گڑیا کے عوض نئی ٹیکنالوجی کی حامل جدید ترین گڑیا حاصل کر لے گی تو وہ اس نئے معاشرے سے متعلق ایک بنیادی سبق سیکھے گی: چیزوں کے ساتھ انسان کے تعلقات بڑی تیزی سے ''عارضی'' ہوتے جا رہے ہیں۔

انسان کی بنائی ہوئی اشیا کے سمندر نے اسے گھیرا ہوا ہے اور یہ وہ سیلاب قدرتی اشیا کے ایک بڑے سمندر میں ہی موجود ہے۔ لیکن یہ روز افزوں بڑھتی ہوئی ٹیکنالوجی سے پیدا شدہ ماحول ہے جو کسی فرد کے لیے

اہمیت کا حامل ہے۔ پلاسٹک یا پتھر کی کوئی ساخت، کسی کھمبے کی روشنی سے منعکس ہونے والی گاڑی کی ست رنگی چمک، کسی جیٹ طیارے کی کھڑکی سے کسی چہرے کی ارتعاش پذیر تصویر۔ یہ کسی شخص کے وجود کی عام حقیقتیں ہیں۔ انسان کی بنائی ہوئی چیزیں اس کے لاشعور میں داخل ہوتی ہیں اور اسے چکا چوند کرتی ہیں۔ ان کی تعداد میں، ایک دھماکہ خیز قوت کے ساتھ، اضافہ ہو رہا ہے جو اس کے فطرتی ماحول کے مطابق بھی ہیں اور اس سے مربوط بھی۔ اور یہ بات آج کی نسبت جدید ترین صنعتی معاشرے میں مزید درست ثابت ہوگی۔

مادہ پرستی کے مخالف لوگ چیزوں کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم نہ صرف اپنی مفید کارکردگی کی وجہ سے بلکہ اپنے نفسیاتی اثرات کی وجہ سے اشیا انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ہم لوگ چیزوں کے ساتھ تعلقات استوار کر لیتے ہیں۔ چیزیں ہمارے تسلسل یا عدم تسلسل کی حس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ مختلف صورتوں کی تشکیل میں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہیں اور مختلف چیزوں سے ہمارے تعلقات زندگی کی شرح رفتار کو تیز کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ چیزوں کے ساتھ ہمارے رویے معیار کو جانچنے کے بنیادی معیارات کی عکاسی کرتے ہیں۔ کوئی بھی فرق اس بات سے زیادہ ڈرامائی نہیں جو ان چھوٹی بچیوں کی اس کھیپ کے مابین پایا جاتا ہے، جنھوں نے اپنی باربی نامی گڑیوں کی جگہ بخوشی نئی اور جدید باربی لے لی ہیں، اور ان بچیوں میں جنھوں نے اپنی ماں اور دادیوں کی طرح پرانی باربی گڑیوں سے چمٹی ہوئی ہیں اور اسی سے محبت کیے جا رہی ہیں تاوقتیکہ وہ انھیں اس محبت والے دور سے جدا کر دے۔ اسی فرق میں وہ تضاد پایا جاتا ہے جو ماضی اور مستقبل کے درمیان ہے اور ان معاشروں کے درمیان بھی جن کی بنیاد دوام پر ہے اور اس نئے اور تیزی سے تشکیل پاتے ہوئے معاشرے کے درمیان جس کی بنیاد ناپائیداری پر ہے۔

شادی کا کاغذی لباس

انسان اور اشیا کے درمیان تعلقات میں ناپائیداری بڑھ رہی ہے اور اس کی عکاسی اس ثقافت سے ہوسکتی ہے جس نے تجارت سے اثر انداز ہونے والی گڑیا کی مالکہ بچی کو گھیرا ہوا ہے۔ اس بچی کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ صرف باربی گڑیا ہی ایسی چیز نہیں جو اس کی زندگی میں بڑی تیزی سے ہو کر گزر جاتی ہے بلکہ ڈائپرز، ببز، پیپر نیپکنز، کلی نیکس، تولیے اور مشروبات کی ناقابل واپسی بوتلیں...... یہ تمام چیزیں وافر مقدار میں اس بچی کے گھر میں استعمال ہوتی ہیں جنھیں استعمال کے بعد بے دردی سے پھینک دیا جاتا ہے۔ مکئی کے کلچے، ٹن پیکنگ میں مارکیٹ میں دستیاب ہیں جنھیں ایک مرتبہ استعمال کے بعد پھینک دیا جاتا ہے۔ پالک

کو پلاسٹک کے تھیلوں میں بند کیا جاتا ہے جنھیں گرم کرنے کے لیے ابلتے ہوئے پانی میں ڈالا جا سکتا ہے اور پھر اسے پھینک دیا جاتا ہے ٹی وی ڈنر پکانے کے بعد ایسی ٹرے میں پیش کیا جاتا ہے جنھیں بعد میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس بچی کا گھر ایک ایسی بڑی مشین کی مانند دکھائی دیتا ہے جس میں چیزیں بہتی ہیں یعنی چیزیں داخل ہو رہی ہوتی ہیں اور اس جگہ سے دور جا رہی ہوتی ہیں اور اس عمل کی رفتار تیز سے تر ہو رہی ہے۔ اپنی پیدائش سے لے کر اب تک یہ بچی ایک ایسی ثقافت میں رہ رہی ہے جہاں چیزوں کو استعمال کے بعد پھینک دینے کا رواج ہے۔

اشیا کو ایک مرتبہ یا کم عرصے کے لیے استعمال کرنا اور اس کے بعد اس چیز کی جگہ نئی چیز کا آ جانا......

اس بات کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ پبلیسس (Publicis) نامی ایک فرانسیسی اشتہاری کمپنی کے ایک مارکیٹ سے متعلق محقق اُرئیل رون (Uriel Rone) نے مجھے بتایا کہ: ''ایک فرانسیسی گھریلو عورت تلف پذیر چیزیں استعمال نہیں کرتی تھی، اس کی بجائے کہ وہ پرانی چیزوں کو تلف کر دے وہ ان پرانی اشیا کو بھی اپنے گھر میں رکھنا پسند کرتی ہے۔ ہم ایسی کمپنی کی نمائندگی کر رہے تھے جو پلاسٹک کے بنے ہوئے تلف پذیر پردے متعارف کروانا چاہ رہی تھی۔ ہم نے انہی اشیا کے لیے ایک مارکیٹنگ تحقیق کی اور ہم نے یہ محسوس کیا کہ اس چیز کی شدت سے مخالفت کی جا رہی ہے۔'' تاہم اس قسم کی مخالفت اب ترقی یافتہ دنیا میں ختم ہوتی جا رہی ہے۔

ایک مصنف ایڈورڈ میز نے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا؛ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جب بہت سے امریکی سویڈن گئے تو وہ اس ملک میں صفائی کی صورت حال دیکھ کر حیران ہوئے، ''ہم لوگ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ اس ملک کی شاہراہوں کے کنارے بیئر یا کسی مشروب کے خالی ٹن (Tin) یا بوتلیں نظر نہیں آتیں، جیسا کہ، امریکہ میں نظر آتی تھیں اور یہ ان لوگوں کے لیے شرمندگی کا باعث تھیں۔ لیکن یہ بات بھی حیران کن تھی کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں سویڈن کی شاہراہوں کے کنارے خالی بوتلیں اور ٹن نظر آنے لگے مجھے...... یہ کیا ہوا؟ سویڈن کا معاشرہ، امریکی طرز پر چلتے ہوئے، اشیا کو خریدنے، استعمال کرنے اور پھینکنے والا معاشرہ بن چکا تھا۔'' آج جاپان میں تلف پذیر ٹشو اتنے عام ہو چکے ہیں کہ رومال نہ صرف متروک، بلکہ غیر صحت بخش تصور کیے جاتے ہیں۔ برطانیہ میں اگر کوئی چاہے تو چھ پنس میں ''تلف پذیر ڈینٹامینک ٹوتھ برش'' خرید سکتا ہے، اس پر ٹوتھ پیسٹ لگا ہوتا ہے اور اسے ایک مرتبہ استعمال کے بعد پھینکا جا سکتا ہے۔ فرانس میں بھی تلف پذیر سگریٹ لائیٹر عام ہیں۔ گتے کے بنے ہوئے دودھ کے ڈبوں سے لے کر خلائی مشینوں کو تقویت دینے والے راکٹوں تک ہر چیز عارضی اور ایک مرتبہ استعمال کے لیے بنائی جا رہی ہے اور وہ تعداد میں خاصی زیادہ ہے اور

یہ ہماری طرز زندگی کے لیے ناگزیر ہوتی جارہی ہے۔

حال ہی میں متعارف ہونے والے کاغذ کے یا کاغذ نما کپڑوں نے تلف پذیری کو ایک قدم آگے بڑھا دیا ہے۔ جدید ترین بوتیکس اور محنت کشوں کے کپڑے فروخت کرنے والے سٹور اب شاپنگ سنٹر میں نظر آنے لگے ہیں جہاں بھڑکیلے رنگوں اور دیدہ زیب ڈیزائنوں والے اپیرل دستیاب ہوتے ہیں۔ فیشن میگزینوں میں اکثر ایسے خوبصورت گاؤن، کوٹ، پینٹوں حتیٰ کہ لباسِ عروسی کے اشتہار ہوتے ہیں جو کاغذ سے تیار کیے جاتے ہیں۔ ایسے ہی لباس میں ملبوس ایک دلہن کی تصویر اتاری گئی جس نے سفید رنگ کا لیس نما کاغذ زیب تن کیا ہوا تھا۔ تصویر کے نیچے جو عبارت تحریر تھی وہ یہ تھی، شادی کے بعد ''کچن کے لیے بہترین پردے''۔

کاغذ کا تیار کردہ لباس بچوں کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ ایک ماہر فیشن لکھتا ہے: ''عنقریب بچیاں اس قابل ہو جائیں گی کہ وہ اپنے لباس پر آئس کریم گرائیں، تصاویر بنائیں اور اس پر کوئی چیز کندہ کریں اور ان کی مائیں ان کی ''تخلیقیت'' پر کھڑی مسکراتی رہیں' اور بڑوں میں سے وہ افراد جو اپنی تخلیقیت دکھانا چاہیں ان کے لیے ایک ایسا لباس ہے جس پر پینٹ کیا جا سکتا ہے، ''اس کے ساتھ برش بھی ہیں'': اس کی قیمت 2.00 ڈالر ہے۔

کاغذ کے اس اژدھام کے پیچھے قیمت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور پر سادہ سے ''A'' لائن لباسوں کی بھرمار ہے جس کے بارے کہا جا سکتا ہے: ''سیلولوس فائبر اور نائیلون کے ناموں سے بے پرواہ'' ۲۹ء ڈالر کی قیمت کا حامل یہ لباس جسے خرید کر استعمال کے بعد پھینک دیا جائے صارف کے لیے سستا ہے بجائے اس کے کہ عام لباس کو ڈرائی کلینرز کے پاس بھیجا جائے۔ بہت جلد ایسا ہوگا۔ لیکن اس میں معاشیات کے بہت سے مسائل آڑے آرہے ہیں، جبکہ پھینک دینے والی ثقافت کے بہت سے اہم نفسیاتی پہلو ہیں۔

ان پھینکی جانے والی اشیا کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لیے ہم لوگ چیزوں کو پھینکنے والی ذہنیت بھی استوار کر لیتے ہیں۔ دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ یہ ذہنیت، منطقی طور پر تبدیل شدہ، ایسی سوچ کو جنم دیتی ہے جس کا تعلق جائیداد اور دیگر اشیا کے ساتھ ہے۔ تلف پذیری کی سوچ، معاشرے میں پھیل جانے سے انسان اور اشیا کے ساتھ تعلقات کے دورانیے مختصر ہو جاتے ہیں۔ کسی ایک چیز کے ساتھ زندگی کے ایک طویل عرصے تک وابستہ رہنے کی بجائے ہم لوگ ان چیزوں کے ساتھ ایک مختصر عرصے کے لیے وابستہ رہتے ہیں، جن کی جگہ دوسری چیزیں آجائیں گی۔

گُم شدہ سپر مارکیٹ

ناپائیداری کی طرف کا سفر تعمیرات کے شعبے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی ماحول میں سے یہی وہ چیز ہے جو ماضی میں انسان کی حسنِ پائیداری میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ وہ بچی جس نے اپنی باربی گڑیا کو تبدیل کر لیا وہ اپنے اردگرد موجود عمارتوں اور تعمیرات کی ناپائیداری بھی دیکھتی ہے۔ ہم لوگ بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرتے ہیں۔ ہم گلیاں، سڑکوں کی کھدائی کر دیتے ہیں اور حیران کن تعداد میں عمارتیں تعمیر کرتے ہیں۔

سٹینفورڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ای ایم کارٹر کہتی ہیں، ''عمارتوں کی اوسط عمر بڑی تیزی سے کم ہو رہی ہے، غاروں کے زمانے میں یہ عمر لامحدود تھی...... امریکی نوآبادیاتی دور میں گھروں کی اوسط عمر سو سال تھی، جبکہ اب یہ عمر چالیس سال رہ گئی ہے''۔ ایک برطانوی مصنف مائیکل وڈ کہتے ہیں: امریکیوں نے...... ''اس دنیا کو گزشتہ 'کل' میں تعمیر کیا، اور وہ صحیح معنوں میں جانتے ہیں کہ عمارتیں کتنی نازک، ناپائیدار اور کتنی تغیر پذیر ہیں۔ نیویارک شہر میں، بلامبالغہ، عمارات ایک رات میں غائب ہو جاتی ہیں اور صرف ایک سال میں شہر کا منظر تبدیل ہو سکتا ہے۔''

ناول نگار لوئس اوچنکلوس (Louis Auchincloss) اس بات کا اظہار ناراضگی سے کرتے نظر آتے ہیں، ''نیویارک شہر میں رہنے کا خوف ایک ایسا خوف ہے جیسے ہم اس شہر کے باسی ہیں جس کی کوئی تاریخ نہیں...... میرا خاندان آٹھ پشتوں سے نیویارک شہر میں رہ رہا ہے...... وہ لوگ جن جن مکانات میں رہائش پذیر رہے ان میں سے صرف ایک باقی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے میں 'گم شدہ ماضی' مراد لیتا ہوں۔'' نیویارک شہر میں رہنے والے معززین میں سے بہت کم لوگ، جن کے آباؤ اجداد پیورٹو ریکو (PuertoRico) کے ہسپانوی علاقوں، مشرقی یورپ کے دیہی علاقوں یا جنوبی نخلستانوں سے امریکہ آ کر آباد ہوئے، اپنے احساسات کو مختلف نقطۂ نظر سے بیان کر سکتے ہیں۔ تاہم ''گم شدہ ماضی'' ایک حقیقی مظہر ہے، اور اس بات کا امکان ہے کہ اس کا پھیلاؤ ہو جائے گا اور یہ آنے والے وقت میں یورپ کے تاریخی اہمیت کے حامل شہروں کو نگل جائے گا۔

ایک ڈیزائنر...... فلسفی بک منسٹر فولر (Buckminster Fuller) نے ایک مرتبہ نیویارک کو ''خالی کرائے جانے، تلف کیے جانے، ہٹائے جانے، عارضی خالی لاٹ کا حامل، نئی تنصیبات اور دہرائے جانے والے عوامل کا شہر قرار دیا۔ یہ مرحلہ ہمیں کسی کھیت میں فصلوں کی کاشت کے سالانہ اصول میں نظر آتا ہے۔ ہل چلانا، بیج کاشت کرنا، فصل کاٹنا، دوبارہ ہل چلانا اور پھر دوسری فصل کاشت کرنا وغیرہ وغیرہ...... بہت سے لوگ نیویارک کی سڑکوں کے کنارے تعمیر ہونے والی عمارتوں کو ان کے عارضی ہونے کی وجہ پریشانی کے

طور پر دیکھتے ہیں جنھیں عنقریب غائب ہو جانا ہے۔ ان کے نزدیک پائیداری نیوٹن کے تصور کائنات میں سابقہ یادگاروں کا نام ہے، لیکن جو لوگ نیویارک شہر میں اس صدی کے آغاز سے رہ رہے ہیں وہ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کا عملی مشاہدہ کرتے ہیں۔''

وہ بچے جو ''نیوٹنی نظریۂ اضافیت'' کا احساس رکھتے ہیں، میرا ایک ذاتی تجربہ اسے میرے سامنے لایا۔ کچھ عرصہ قبل میری بیگم نے میری بیٹی کو اس سپر مارکیٹ میں بھیجا جو ہمارے مین ہیٹن اپارٹمنٹ سے چند بلاکس کے فاصلے پر تھی۔ ہماری بیٹی اس سپر مارکیٹ میں اس سے پہلے ایک یا دو مرتبہ جا چکی تھی۔ وہ بیٹی تقریباً آدھ گھنٹے بعد پریشانی کے عالم میں واپس آئی اور کہا، ''اس سپر مارکیٹ کو گرا دیا گیا ہے، مجھے وہ سپر مارکیٹ نظر نہیں آئی''، اسے یقیناً گرا دیا گیا تھا۔ اس کے نزدیک کیرن کی نظر ایک اور بلاک پر پڑی۔ چونکہ بچی کی ناپختگی کی عمر تھی اس کے ذہن میں فوراً ہی خیال آیا کہ اس عمارت کی جگہ نئی عمارت تعمیر ہو گئی ہے۔ اور امریکہ میں پروان چڑھتی بارہ سالہ بچی کے ذہن میں یہ خیال آنا فطری بات تھی۔ شاید ایسا خیال ایسی بچی کے ذہن میں کبھی نہ آتا جس کی پرورش نصف صدی قبل ہوئی ہوتی۔ کیونکہ اس وقت کا ماحول دیرپا اور پائیدار تھا جبکہ چیزوں کے ساتھ ہمارا تعلق نسبتاً کم پائیدار تھا۔

ناپائیداری کی معیشت

ماضی میں پائیداری کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ چاہے اس کا تعلق جوتے کے ایک جوڑے بنانے سے ہو یا کسی گرجا گھر کی تعمیر سے، انسان کی تمام تخلیقی اور پیداواری توانائیوں کا مرکز و محور پیداوار کی پائیداری میں اضافہ کرنا تھا۔ انسان چیزوں کو قائم رہنے کے لیے بناتا تھا۔ اسے ایسا کرنا پڑتا تھا۔ جب تک اس کے اردگرد کی دنیا نسبتاً غیر تبدیل پذیر تھی ہر چیز کے کوئی نہ کوئی مخصوص کام انجام دیتی تھی، اور معاشی منطق پائیداری کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ اگرچہ ان چیزوں کی گاہے بگاہے مرمت کی ضرورت پڑتی رہتی تھی تاہم وہ بوٹ جن کی قیمت پچاس ڈالر تھی اور وہ دس سال تک پہنے جا سکتے تھے وہ ان بوٹوں کی نسبت کم مہنگے تھے جن کی قیمت دس ڈالر ہے لیکن انھیں صرف ایک سال تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جیسے ہی معاشرے میں تبدیلی کی شرح میں تیزی آئی، پائیداری کی معاشیات ناپائیداری کی معاشیات سے تبدیل ہوتی گئی...... اور اسے ایسا ہونا بھی چاہیے۔

پہلی بات تو یہ ہوئی کہ تیزی سے ترقی کرتی ہوئی ٹیکنالوجی سے چیزوں کی تیاری کی لاگت، کمی کا

باعث بنی اور اس کی شرح مرمت کی لاگت بھی کم ہوئی۔ کیونکہ آج کے دور میں چیزوں کو تیار کرنے کے تمام مراحل خود کار ہیں جبکہ مرمت کا سلسلہ دستی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عموماً چیزوں کو تبدیل کروانا، چیزیں مرمت کرانے کی نسبت سستا کام ہے۔ معاشی طور پر یہ بات دانشمندی پر مبنی ہے کہ سستی چیزیں بنائی جائیں، جو ناقابل مرمت پھینک دیے جانے کے قابل ہوں چاہے وہ مرمت کی جانے والی چیزوں کی نسبت کم دیرپا ہوں۔

دوسری بات، ترقی پذیر ٹیکنالوجی کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چیزوں کو بہتر سے مزید بہتر کیا جائے۔ دوسری نسل کے لیے بنائے جانے والے کمپیوٹر پہلی نسل کے لیے بنائے جانے والے کمپیوٹروں سے بہتر جبکہ تیسری نسل کے لیے بنائے جانے والے کمپیوٹر دوسری نسل کے کمپیوٹروں سے بہتر ہیں۔ جب تک ہم ٹیکنالوجی کو مزید ترقی دینے کے بارے میں سوچیں گے تو انتہائی مختصر وقفوں کے ساتھ مزید بہتری آتی رہے گی، دیرپا چیزوں کی تیاری کی بجائے مختصر مدت کے لیے چیزوں کی تیاری کے لیے ایک ٹھوس معاشی سوچ/احساس کی ضرورت ہے۔ پٹسبرگ (Pittsburgh) میں اربن ڈیزائن ایسوسی ایٹس سے منسلک ایک شہری منصوبہ ساز نقشہ بنانے والے ڈیوڈ لیوئس (David Lewis) میامی شہر میں تعمیر ہونے والے ایسے اپارٹمنٹس کا ذکر کرتے ہیں جو اپنی تعمیر کے صرف دس سال بعد تلف کر دیے گئے۔ نئی عمارتوں میں کام کرنے والا ایئر کنڈیشننگ کا نظام ان ''پرانی'' عمارتوں کے کرایوں کے تعین پر بری طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔ جب تمام باتوں کا جائزہ لیا گیا تو یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ان اپارٹمنٹس میں بہتری پیدا کرنے کی بجائے انھیں تلف کرنا بہتر ہوگا۔

تیسری بات یہ ہے کہ جوں جوں تبدیلی معاشرے کے دور افتادہ علاقوں میں جتنی تیزی سے پہنچتی ہے مستقبل کی ضروریات کے بارے میں اتنی ہی غیر یقینی کی کیفیت بھی بڑھتی ہے۔ تبدیلی کی ناگزیریت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات غیر یقینی کیفیت اختیار کرتی جا رہی ہے کہ یہ تبدیلی ہم لوگوں سے کیا کیا تقاضے کرے گی، ہم غیر متبدل مقاصد کو پورا کرنے والی مضبوط اور مستحکم اشیا کی تیاری سے گریز کرتے ہیں۔ مستحکم صورتوں اور افعال کے عزم سے گریز کرتے ہوئے، ہم مختصر عرصے تک استعمال کے لیے چیزوں کی تعمیر کرتے ہیں یا اس کی بجائے ایسی چیز تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مطابقت پذیر ہو۔ ہم لوگ ٹیکنالوجی کے حوالے سے ''بڑے ٹھنڈے طریقے'' سے (اپنی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے) چل رہے ہیں۔

تلف پذیری میں اضافہ۔ یعنی پھینک دینے کی ثقافت کے رائج ہونے کے بعد۔ اس قسم کے مضبوط دباؤ کا ردعمل ہے۔ جیسے جیسے تبدیلی تیز تر ہوتی چلی جائے گی اور پیچیدگیوں میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا،

ہم تلف پذیری کے اصول میں مزید وسعت کی توقع کرتے رہیں گے اور انسان کے چیزوں کے ساتھ تعلقات میں مزید کمی ہوتی رہے گی۔

کھیل کا منقولہ میدان

تلف پذیری کے علاوہ کچھ دوسرے ردِّعمل بھی ہیں جو ایسے ہی نفسیاتی نتائج پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آج ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ چیزوں کو ایک کی بجائے، مختصر عرصے کے استعمال کے لیے بہت بڑی تعداد میں تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ پھینک دی جانے والی اشیا نہیں ہیں۔ عمومی طور یہ بہت زیادہ مہنگی اشیا ہیں اور انھیں تلف کرنا آسان نہیں۔ ان کی تعمیر اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے کہ اگر ضروری ہو، تو انھیں، استعمال کے بعد، ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جائے۔

لہٰذا لاس اینجلس کے بورڈ آف ایجوکیشن نے فیصلہ کیا ہے کہ مستقبل میں اس شہر میں کل سکولوں کے ۲۵ فی صد کمرۂ جماعت عارضی ڈھانچوں کی صورت میں ہوں گے جنھیں ضرورت کے مطابق ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکے گا۔ امریکہ کے ہر ضلعے میں کچھ عارضی کمرۂ جماعت موجود ہیں، مزید کا سلسلہ جاری ہے۔ سکولوں کی تعمیراتی اداروں کے لیے عارضی کمرۂ جماعت کی وہی حیثیت ہے جو کپڑے کی صنعت کے لیے کاغذی لباس کی ہے۔ مستقبل کا پیشگی مزہ۔

عارضی کمرۂ جماعت کا مقصد سکولوں کے نظام کو تیزی سے منتقل ہوتی ہوئی آبادیوں کی ضروریات سے ہم آہنگ ہونا ہے۔ لیکن عارضی کمرۂ جماعت، تلف پذیر کپڑوں کی طرح، مختصر عرصے کے لیے انسان، چیزوں کے رشتوں کو ماضی کی نسبت مختصر عرصے کے لیے استوار کرنے کا باعث ہیں۔ لہٰذا عارضی کمرۂ جماعت اساتذہ کی عدم موجودگی میں بھی بہت سی چیزیں سکھاتے ہیں۔ باربی نامی گڑیا کی طرح، یہ بھی کسی بچی کو اس کے ماحول میں موجود اشیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا سبق دیتی ہیں۔ جونہی کوئی بچہ اپنے کمرۂ جماعت کے بارے میں مکمل معلومات کا احساس کرتا ہے...... یعنی وہ کس طرح کمرۂ جماعت کے اردگرد کی تعمیرات میں اپنے آپ کو متناسب کرتا ہے، موسم گرما کے کسی دن ڈیسک اسے کیسا محسوس ہوتا ہے، اور آواز اس میں کیسے گونجتی ہے، تمام کی تمام لطیف خوشبوئیں اور اجزائے ترکیبی جو کسی ڈھانچے کو انفرادیت بخشتی ہیں اور اسے حقیقت کا رنگ دیتی ہیں۔ پھر وہی ڈھانچا دوسرے بچوں کے استعمال کے لیے، کسی دوسری جگہ لے جانے کے لیے اس کے ماحول سے ہٹا لیا جاتا ہے۔

یہ منقولہ کمرۂ جماعت صرف اور صرف امریکی طرز کا مظہر نہیں۔ برطانیہ میں مشہور ماہر تعمیرات

کیڈرک پرائس (Cedric Price) نے ایک چیز ڈیزائن کی ہے جسے انھوں نے "تھنک بیلٹ" (Think belt) کا نام دیا ہے اور جو ایک کامل منقولہ یونیورسٹی ہے جو نارتھ سٹیفورڈ شائر میں 20,000 سے زائد طلبہ کی خدمت سرانجام دینے کا کام کرے گی۔ کیڈرک پرائس کے بقول "یہ یونیورسٹی مستقل عمارت کی بجائے عارضی عمارتوں پر انحصار کرے گی" اور یہ یونیورسٹی غیر مستقل اور منقولہ چیزوں کا بہترین استعمال کرے گی"...... مثال کے طور پر کمرۂ جماعت ریل کے ڈبوں میں تعمیر کیے جائیں گے کہ انھیں، چار میل لمبے کیمپس کے ساتھ، کسی بھی جگہ منتقل کیا جا سکے گا۔

مکانات کی تعمیر میں مساحت ارضی گنبد ہیڈ کوارٹروں کی تعمیر یا پوسٹوں کو ہدایات دینے کی غرض سے ہوا سے بھرے ہوئے پلاسٹک کے بلبلے استعمال میں لائے جاتے ہیں اور انجینئروں و ماہرین تعمیرات کے ڈرائنگ بورڈوں سے اٹھا کر لے جائے جانے والے عارضی ڈھانچے اور ان کے نقشے بنائے جا رہے ہیں۔ نیویارک شہر میں پارکوں کے محکمے نے "کھیل کے بارہ منقولہ میدانوں" کی تعمیر کا اعلان کیا ہے جو چھوٹے، عارضی کھیل کے میدان ہیں اور انھیں شہر کی ان خالی جگہوں پر اس وقت تک نصب کیا جائے جب تک کہ ان کا کوئی دوسرا استعمال سامنے نہ آ جائے، ایسی صورت میں ان کھیل کے میدانوں کو ان جگہوں سے اکھاڑ کر کسی اور جگہ لے جایا جائے گا۔ ایک وقت ایسا تھا جب کسی شخص کے پڑوس میں کھیل کا میدان مستقل طور پر موجود ہوتا تھا اور جب کسی کے بچے، حتیٰ کہ، بچوں کے بچے بھی، اپنی اپنی باری پر تقریباً ایک ہی تجربے سے گزرتے تھے۔ تاہم جدید ترین صنعتی دور کے کھیل کے میدان مستقل بنیادوں پر ایک جگہ نہیں۔ کھیل کے یہ میدان ڈیزائن کے اعتبار سے عارضی ہیں۔

''معیاری'' تفریح گاہ

انسان اور چیزوں کے درمیان قائم رشتوں کے دورانیہ میں کمی، جو پھینک دی جانے والی چیزوں اور عارضی تعمیرات کی بہتات کی مرہون منت ہے، اس میں ''ترمیم پذیری'' کے پھیلاؤ کی وجہ سے مزید شدت پیدا ہوئی ہے۔ ترمیم پذیری کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک ایسی کاوش ہے جو، کسی تعمیراتی ڈھانچے کے ذیلی حصوں کو نسبتاً کم پائیدار بنا کر طلب، اس کے عمومی ڈھانچے کو دوام بخشے۔ لہٰذا کیڈرک پرائس کے ''تھنک بیلٹ'' پلان میں یونیورسٹی کے شعبہ جات اور طلبہ کے اپارٹمنٹس سٹیل کے ایسے ڈھانچوں کی بنی ہوئی ہے جنھیں کرین کے ذریعے اٹھایا جا سکتا ہے اور انھیں عمارت کے فریموں میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس تعمیراتی ڈھانچے کے نسبتاً مستقل حصے یہ فریمز ہی ہیں۔ جبکہ اپارٹمنٹ کے ذیلی حصے ایسے ہیں جنھیں مکمل طور پر تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ان کی جگہ دوسرے حصے آ سکتے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ تلف کیے جانے اور حرکت پذیری میں، تعلقات کے دورانیے کے حوالے سے، امتیاز انتہائی باریک ہے۔ حتیٰ کہ جب تعمیراتی اکائی تلف نہ کی جائیں، بلکہ انھیں از سرِنو ترتیب دیا جائے تو نتیجہ ایک تشکیلی صورت اور ایک نئی شناخت کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک ٹھوس ڈھانچا حقیقت میں تلف کردیا گیا ہو اور ایک نیا ڈھانچا معرض وجود میں آیا ہو اگرچہ اس کے کچھ یا تمام اجزا ایک جیسے ہی رہے ہوں۔

آج بہت سی عمارات ایسی ہیں جنھیں ''مستقل'' سمجھا گیا ہے جبکہ انھیں ایک تشکیلی اکائی کے منصوبے کے طور پر بنایا گیا اور ان کی اندرونی دیواریں اور تقسیم کرنے والے عناصر و اجرا مرضی کے مطابق تبدیل کیے جاسکتے ہیں تاکہ ان کے اندر نئے نمونے بنائے جاسکیں۔ یہ حرکی تقسیم، یقینی طور پر ایک ناپائیدار معاشرے کی علامت کے طور پر لی جاسکتی ہے۔ کوئی بھی شخص کسی بھی بڑے دفتر میں، عملے کے بے شمار اراکین، تیزی سے متحرک ڈیسکوں اور کمروں کو تقسیم کرنے والی اندرونی میٹنگ کے قریب سے گزرے بغیر داخل نہیں ہوسکتا۔ حال ہی میں سویڈن میں...... کی ایک فتح ہوئی: اپسالا (Uppsala) کے ایک جدید ماڈل اپارٹمنٹ کی تمام دیواریں اور کمرے منقولہ تھے۔ اس اپارٹمنٹ میں رہنے والے کرایہ داروں کو رہائش کی جگہ میں ردوبدل کرنے کے لیے صرف ایک پیچ کس کی ضرورت تھی، کہ وہ اپنے اپارٹمنٹ کو ایک نیا تاثر دے سکیں۔

تاہم کبھی کبھار ترمیم پذیری تلف پذیری کے ساتھ بلاواسطہ جڑی ہوتی ہے۔ ایک عام سا بال پوائنٹ اس کی ایک مثال ہے۔ اگر کوئی شدید نقصان دہ صورت نہ ہو تو، اسے ایک طویل عرصے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے اور اسے مرمت بھی کیا جاسکتا ہے تاکہ اس کی عمر بڑھ سکے۔ ایک عام پن کے لیے تکنیکی طور پر ایک فائدہ ہے کیونکہ یہ استعمال کرنے والے کو ایک حرکت پذیری عطا کرتا ہے۔ یہ تحریر کرنے کا ایک ایسا ذریعہ عطا کرتی ہے۔ بال پوائنٹ کی ایجاد نے اس امر کا انضمام کردیا اور اس کی جدت کو بڑھایا۔ اس ایجاد سے ہمیں ایک ایسا پن مل گیا جس میں روشنائی کا اپنا انتظام تھا لیکن یہ اتنا سستا تھا کہ جس وقت اس میں روشنائی ختم ہو تو اسے پھینک دیا جاسکے۔ یہ پن اور روشنائی کے ملاپ کی پہلی تلف پذیر ایجاد تھی۔

تاہم ہم نے ابھی تک ایسے نفسیاتی رویے اختیار نہیں کیے جس کے ساتھ قلت کا تصور جڑا ہو۔ لہٰذا آج بھی لوگوں کی ایک خاصی بڑی تعداد موجود ہے جو ایک استعمال شدہ بال پوائنٹ کو پھینک دینے پر بھی خود کو قصوروار تصور کرتے ہیں۔ پن بنانے والی کمپنی کا اس نفسیاتی حقیقت پر ایک خاص ردِعمل تھا اور انھوں نے اسی

مقیاسی اصول کو مدنظر رکھ کر ایک بال پوائنٹ پن بنایا۔ ایک بیرونی فریم جسے استعمال کرنے والا اپنے پاس رکھ سکتا ہے اور اندرونی سکہ جسے پھینک کر دوسرا ڈال سکتا ہے۔ روشنائی کے اس سکے کو قابل استعمال بنا کر، اس کے اندر موجود چیز کی قیمت پر اس پورے بال پوائنٹ کی عمر کو بڑھایا جاسکتا ہے۔

تاہم کُل چیزوں کی نسبت حصّوں کی تعداد زیادہ ہے، چاہے وہ انھیں اپنے اردگرد شفٹ کر رہا ہے تاکہ نئے کُل کو تخلیق کرے یا انھیں تلف کرکے ان کی جگہ دیگر چیزوں کو لے آئے، استعمال کنندہ اپنی تمام زندگی میں چیزوں کو استعمال کی خاطر لانے کو تلف کرنے کے مرحلے سے تیزی سے گزرتا ہے، یعنی چیزوں کے ساتھ کے تعلق کی مدت میں ایک عمومی زوال ہے جس کا نتیجہ بہاؤ، تحرک اور ناپائیداری ہے۔

ان اصولوں کی پاسداری اور اس کی عکاسی کے حوالے سے تعمیرات کا ایک شاندار نمونہ وہ پلان تھا جسے ایک برطانوی تھیٹر کی پروڈیوسر جولٹل وڈ نے ایک سٹرکچرل انجینئر فرینک نیوبائی، ایک سسٹم کنسلنٹ اور ایک تھنک بیلٹ ماہر تعمیرات کیڈرک پرائس کی مدد سے تیار کیا۔

مس لٹل وڈ ایک تھیٹر تیار کروانا چاہتی تھیں جس میں ہمہ گیری کو زیادہ سے زیادہ حد تک حاصل کیا جاسکے، جس میں وہ خاتون ایک عام ڈرامے سے لے کر سیاسی ریلی کا اہتمام کرسکے، جس میں ڈانس سے لے کر کشتیوں کا میچ کروایا جاسکے...... اور ان کا اہتمام بیک وقت کیا جاسکے۔ ایک نقاد رینر بنہم نے اس صورت حال کو سب سے بہتر بیان کیا ہے، ''مکمل امکانیت کا علاقہ''۔ اس کا نتیجہ ''تفریح گاہ'' کا ایک شاندار منصوبہ تھا جسے ''دنیا کا سب سے پہلا دیوہیکل سپیس موبائل'' بھی کہا گیا۔ یہ منصوبہ کسی کثیر الجہت عمارت کے لیے نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد زندگی کی تمام ضروریات کو مکمل کرنے والے ایک سیٹ کی مانند تھا مقیاسی حصوں پر مشتمل ایک اجتماعی چیز جسے لامحدود مقاصد کے لیے اکٹھا کیا جاسکے۔ تقریباً ''مُستقل'' ستون جس میں لامحدود خدمات کا حصول ممکن ہو...... جیسے ٹوائلٹ اور الیکٹرانک کنٹرول یونٹس...... جن پر بڑی بڑی کرینوں کے ذریعے مقیاسی اشیا رکھ دی جاتی ہیں تاکہ انھیں مرضی کے مطابق عارضی شکل دی جاسکے۔ ایک شام کی تفریح کے بعد کرینیں دوبارہ آتی ہیں، ان بڑے بڑے ہالوں اور نمائشی کمروں کو از سرِنو ترتیب دیتی ہیں، ریستورانوں کو علیحدہ علیحدہ کرکے چیزوں کو اپنی اپنی جگہ رکھ دیتی ہیں۔

رینر بنہم اس عمل کو ایسے بیان کرتے ہیں...... ''تفریح گاہ دس سال کے استعمال کے لیے ایک شہری ساز و سامان ہے...... یہ بڑی اور نو مستقبل کی مشین چلتی ہے اور اپنے منقولہ حصوں...... دیواروں، فرش، چلنے کی

جگہ، خود کار سیڑھیوں، نشست گاہوں اور چھتوں، سٹیم اور فلمی سکرینوں، لائٹوں اور ساؤنڈ سسٹم...... کبھی کبھار ایک بہت ہی چھوٹے حصے جیسے دیوار میں لگا دیا گیا ہو، اور لوگوں کے چلنے کی بیرونی جگہوں، اور دبائے جانے والے بٹنوں سے مزین ہوتی ہیں تاکہ چیزیں خود بخود چل سکیں۔

''یہ سب کچھ، جب روبہ عمل ہوتا ہے (اور پھر اس کا اشتہار دیا جاتا ہے کہ آئندہ پروگرام عنقریب کہاں منعقد ہونے والا ہے) تو ایک نئی توانائی کے ساتھ: بغیر کسی مستقل جگہ یا کسی نمونے کے سامنے کھڑا ہوتا ہے...... کیونکہ اس تفریح گاہ کے مستقل اجزا میں صرف وہ ڈھانچا ہوتا ہے جس پر عارضی تعمیرات نظر آ سکتی ہیں''۔

ایک ایسی تعمیر جسے ''پلگ کیا جانا'' یا ''کلپ کیا جانا'' کہا جا سکتا ہے اس پر پورے کے پورے ''ناپائیدار تعمیرات'' کے شہر بسائے جاتے ہیں۔ اس تفریح گاہ کے نظریات کو بڑھاتے ہوئے، ایسی مقیاسی تعمیرات کی تجویز دی جاتی ہے اور اس پر زندگی کی مختلف پہلوؤں کی عکاسی ممکن ہے۔ لہٰذا اس تعمیر کے کُل کو ۲۵ سال کے لیے بنایا جاتا ہے جبکہ عارضی طور پر تعمیر کیے جانے والی مقیاسی تعمیرات اور ان کے اجزا تین سال کی مدت کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ اپنے تخیلات کے مزید پھیلاؤ کے لیے انھوں نے متحرک فلک بوس عمارتوں کا تصور بھی دیا ہے جن کی بنیادوں مستقل نہیں ہوتیں بلکہ ''زمین پر عارضی تعمیرات'' کر سکنے والی مشینیں یا معلق جہاز ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی صورت حال شہری مناظر میں دیکھی جا سکے گی جو کسی مستقل پوزیشن سے مبرا ہوگی، ہوا سے بھری ہوئی کسی چیز پر تیرتی ہوئی، کسی نیوکلیائی توانائی سے چلتی ہوئی اور اپنی اندرونی شکل کو اس رفتار سے بھی تیز تبدیل کرتی ہوئی کہ جس سے آج کا نیویارک اپنا منظر تبدیل کرتا ہے۔

یہ مناظر چاہے حقیقی صورت اختیار کریں یا نہیں، تاہم یہ بات قرین قیاس ہے کہ معاشرہ اس سمت میں رواں دواں ہے۔ پھینک دی جانے والی چیزوں کی ثقافت میں وسعت، عارضی ڈھانچوں کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ وسعت اور مقیاسی تعمیرات بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہیں، اور یہ تمام چیزیں ایک ہی نفسیاتی منزل کی طرف بڑھ رہی ہیں: انسان کا اپنے گرد و نواح کی چیزوں کے ساتھ رشتہ بے ثباتی کا ہے۔

کرایہ داری کا انقلاب

ایک اور پیش رفت انسان اور چیزوں کے تعلق کو یکسر تبدیل کر رہی ہے: کرایہ داری کا انقلاب۔

کرایہ داری کا پھیلاؤ، ایسے معاشروں کی خصوصیات جو جدید ترین صنعت کی طرف گامزن ہیں، وہ ان تمام صلاحیتوں کی حامل ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ برقی کاروں، تلف پذیر نیپیز اور جان لٹل وڈ کی ''تفریح گاہ''

کے درمیان تعلق پہلی جھلک میں تو ثقیل نظر آتا لیکن ان کا گہرا مشاہدہ ان چیزوں میں گہری مماثلت ثابت کرتا ہے کیونکہ کرایہ داری کا نظام بھی ناپائیداری میں شدت لے کر آتا ہے۔

(یورپ میں آنے والے) بحران عظیم کے دوران جب لاکھوں لوگ بے روزگار تھے اور ان کے پاس اپنے گھر بھی نہیں تھے، تو سرمایہ دارانہ معاشروں میں سب سے مضبوط معاشی تحرک اپنے گھر کا مالک ہونا سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ میں آج بھی اپنے گھر کا مالک ہونے کی خواہش بڑی شدید ہے لیکن جنگ عظیم دوم کے بعد سے کرایہ پر دستیاب نئے اپارٹمنٹ بڑی تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں نئے ہاؤسنگ اپارٹمنٹس کی شرح ۸ فی صد تھی، ۱۹۶۱ء میں یہ شرح بڑھ کر ۲۴ فی صد ہوگئی۔ ۱۹۶۹ء میں امریکہ میں پہلی مرتبہ نجی مکانات سے بھی زیادہ اپارٹمنٹس کی تعمیر کے پرمٹ دیئے گئے۔ اپارٹمنٹ میں رہائش، کئی وجوہات کی بنا پر، رائج ہو گئی تھی اور یہ رواج خاص طور پر نوجوان لوگوں میں دیکھنے میں آیا جو، ایم آئی ٹی پروفیسر برنہام کیلی کے بقول، کم از کم مداخلت والے گھر پسند کرتے ہیں۔

کم از کم مداخلت سے مراد صرف یہ ہے کہ انسان اپنے خرچ کردہ پیسوں کے عوض، پھینک دی جانے والی چیزوں کو استعمال کرنے کے عرصے میں حاصل کرتا ہے۔ اس سے مراد وہ خدمت بھی ہے جو عارضی تعمیرات اور مقیاسی اجزا سے لی جاتی ہے اپارٹمنٹ کے ساتھ وابستگی، ایک خاص تعریف کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، اس وابستگی سے مدت میں کم ہوتی ہے جو گھر کے کسی مالک کو اپنے گھر سے ہوتی ہے۔ رہائشی کرایہ داری کا رواج ظاہری ماحول سے رشتے اور اس کی شدت سے انتہائی کم ہے۔[1]

تاہم اس سے بھی زیادہ حیران کن بات ان شعبوں کا بھی کرایہ داری کے نظام میں منسلک ہونا ہے جو ماضی میں اس تصور سے نابلد تھے۔ ڈیوڈ ریس مین نے لکھا ہے، ''لوگوں کو اپنی کاریں انتہائی پسند ہیں؛ وہ ان کاروں سے متعلق باتیں کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کا اظہار اکثر انٹرویوز میں کیا جاتا ہے

(۱) تاہم یہ بات نوٹ کی جا سکتی ہے کہ امریکہ میں لاکھوں افراد ایسے ہیں جو اپنے گھروں میں رہتے ہیں لیکن انھوں نے ۱۰ فی صد یا اس سے بھی کم ڈاؤن پیمنٹ کی ادائیگی کر کے گھر خریدا ہے دراصل وہ لوگ بینکوں اور دیگر قرض دینے والے اداروں کے حوالے سے خریدار ہیں۔ ان خاندانوں کے لیے بینک کے لیے دیا جانے والا ماہوار چیک کسی گھر کے مالک کو دیئے جانے والے ماہوار چیک سے کم نہیں۔ ان لوگوں کی ملکیت محض استعاراتی ہے، چونکہ یہ لوگ اس جائیداد میں کوئی خاص مفاد نہیں رکھتے لہٰذا ان لوگوں کی اپنی جائیداد کے ساتھ کوئی مضبوط جذباتی و نفسیاتی وابستگی نہیں ہوتی۔

......لیکن ان لوگوں کی محبت اور لگاؤ شاذ ہی اتنی شدت تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کی میعاد طول اختیار کر جائے۔''
اس حقیقت کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ امریکہ میں ایک کار کا مالک، اوسطاً، اپنی کار ساڑھے تین سال تک اپنے پاس رکھتا ہے؛ جبکہ بہت سے ایسے ہیں جو اپنی کاریں ہر سال یا دو سال بعد تبدیل کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ۲۰ بلین ڈالر پر مشتمل پرانی کاروں کا کاروبار چل رہا ہے۔ اسی وجہ سے خودکار مشینوں کے حوالے سے پہلی مرتبہ اس روایت کو رد کرنے کا کامیاب موقع ملا کہ زیادہ تر خریداری مستقل بنیادوں پر ہوتی ہے۔ ہر سال کار کے ماڈل کا تبدیل کیا جانا، اعلیٰ ترین اشتہارات کا سلسلہ، جس کے پیچھے صنعت کی یہ حوصلہ افزائی بھی ہو کہ وہ اس کی کاروباری اعانت بھی کرے، تو ہر اوسط امریکی مرد کی زندگی میں نئی (نئی استعمال شدہ) کار کی خریداری کو معدوم کر دیا ہے۔ اس کے باعث خریداریوں کے درمیان وقفہ کم ہو گیا لہٰذا مالک اور کار کے تعلق کا دورانیہ بھی کم ہو گیا۔

تاہم حالیہ سالوں میں کار کی صنعت میں ایک نئی قوت ابھر کر سامنے آئی اور اس نے اس صنعت کے روایتی پیمانوں کو یکسر تبدیل کر دیا۔ یہ کرایہ پر کاروں کی دستیابی ہے۔ آج امریکہ میں لاکھوں افراد ایسے ہیں جو گاہے بگاہے کاروں کو کرایے پر حاصل کرتے رہتے ہیں، یہ مدت چند گھنٹوں سے لے کر چند مہینوں تک ہو سکتی ہے۔ بہت سے بڑے شہروں کے باسی، خاص طور پر نیویارک شہر جہاں کاروں کی پارکنگ ایک بھیانک مسئلہ ہے، اپنی کار خریدنے سے انکاری نظر آتے ہیں اور وہ ہفتے کے اختتام پر تفریح کرنے کی غرض سے، اسی موقع پر دیہی مقامات پر جانے کے لیے حتیٰ کہ شہر کے اندر بھی کہیں جانے کے لیے کرایہ پر کاریں لینا پسند کرتے ہیں کیونکہ شہروں میں گاڑیوں میں گھومنا پھرنا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔ آج کل گاڑیوں کا حصول بغیر کسی رکاوٹ اور پریشانی کے امریکہ کے ہر ہوائی اڈے پر ہر ریل، سڑک، سٹیشن یا ہوٹل سے با آسانی ممکن ہے۔

مزید یہ کہ امریکی عوام کرایہ داری کی عادت کو اپنے ساتھ بیرونی ممالک بھی لے گئے ہیں۔ تقریباً نصف ملین امریکی بیرونی ملک ہوتے ہوئے کرایہ کی گاڑیاں اپنے لے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۵ء تک یہ شرح بڑھ کر ایک ملین تک ہو جانے کا امکان ہے اور امریکہ سے تعلق رکھنے والی کرایہ داری کی کمپنیاں پچاس ملکوں میں کام کر رہی ہیں اور اب ان کے بیرونی مسابقین بھی پیدا ہو گئے ہیں اور اب یورپ سے تعلق رکھنے والی گاڑیوں کی کمپنیاں بھی امریکی کمپنیوں کے مقابلے پر آ گئی ہیں۔ ''پیرس میچ'' میں چھپنے والے کارٹون میں دکھایا گیا ہے کہ ایک اڑن طشتری کے قریب خلائی مخلوق کھڑی ہے وہ ایک پولیس کے سپاہی سے دریافت کر رہی ہے کہ

اسے کرایے پر گاڑی کہاں سے دستیاب ہو گی۔ اب یہ نظریہ فروغ پا رہا ہے۔

گاڑیوں کا کرایے پر حصول اپنے ساتھ امریکہ میں ایک نئے جنرل سٹور کا وجود لے کر آ رہا ہے جس میں کوئی چیز بھی فروخت نہیں ہوتی بلکہ کرایے پر دستیاب ہے۔ اب امریکہ میں ایسے ۹۰۰۰ سٹورز ہیں جو کرایے کی مد میں ایک بلین ڈالر کا کاروبار کرتے ہیں اور اس شرح میں ۱۰ سے ۲۰ فی صد سالانہ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ پانچ سال قبل اس قسم کے سٹوروں کا وجود نہیں تھا۔ آج بمشکل ہی کوئی ایسی چیز ہو جسے کرایے پر حاصل نہ کیا جاتا ہو۔ سیڑھی سے لے کر لان کے اوزاروں تک، برساتی کوٹ سے لے کر اصلی Rouaults تک۔

لاس اینجلس میں کرایہ کا کاروبار کرنے والی کمپنیاں تازہ جھاڑیاں اور درخت تک پراپرٹی کا کام کرنے والی کمپنیوں کو دیتی ہیں جو ماڈل گھروں کے اندر عارضی طور پر سبزہ کا کاشت کرنا چاہتی ہیں۔ سان فرانسسکو میں ایک ٹرک پر اشتہار درج تھا، ''پورے...... تازہ کرایے کے پودوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ فلاڈلفیا میں قمیصیں بھی کرایے پر دستیاب ہیں۔ امریکی اب ہر چیز کرایے پر دیتے ہیں گاؤن، بیساکھیاں، زیورات، ٹی وی سیٹ، کیمپ لگانے کے آلات و سامان، ایئر کنڈیشنر، وہیل چیئرز، لیلین، سکیز، ٹیپ ریکارڈر، شیمپئن فاؤنٹین اور سلور کی بنی ہوئی چیزیں۔ ویسٹ کوٹ مینز کلب نے ایک پیش کاری کے لیے انسانی کھوپڑی کرایے پر لی، ''وال سٹریٹ جرنل'' نے تو ایک اشتہار دیا، ''گائے کرایے پر حاصل کریں''۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ سوئٹزرلینڈ سے شائع ہونے والے خواتین کے ایک میگزین ''Svensk Damtidning'' نے ۱۹۸۵ء کی دنیا سے متعلق پانچ حصوں پر مشتمل ایک سیریز چھاپی۔ دیگر چیزوں کے ساتھ، اس میں عکاسی کی گئی، ''ہم لوگ اپنی نیند اور آرام کے لیے ایسا فرنیچر استعمال کریں گے جس میں بٹن لگے ہوں، جب ہم لوگ ناشتہ کریں گے یا مطالعہ کریں گے، یا ہم اسی جگہ سے ایسا بیڈ کرایے پر حاصل کر لیں گے جہاں سے ہم نے میز، پینٹنگ اور واشنگ مشین کرایے پر حاصل کی۔''

متجسس امریکی ۱۹۸۵ء کا انتظار نہیں کر رہے، بے شک کرایہ داری کے کاروبار کے عروج میں سب سے شاندار چیز فرنیچر کو کرایے پر حاصل کرنا ہے۔ کچھ تیار کنندگان اور کرایے پر چیزیں دینے والی کمپنیاں ایسے چھوٹے اپارٹمنٹس تیار کر لیں گی جن کا کرایہ بیس سے پچاس ڈالر ماہوار ہو گا، ان میں پردے، چھوٹے قالین اور ایش ٹرے تک رکھی ہوں گی۔ ایک ایئر لائن کی سٹیورڈ نے بتایا، ''علی الصبح آپ کسی چھوٹے سے شہر میں پہنچ جائیں گے اور شام تک آپ کو جھولنے والا بستر دستیاب ہو جائے گا۔'' کینیڈا سے نیویارک تبدیل ہو کر آنے

والے ایک شخص نے بتایا: ''یہ نئی چیز ہے، یہ رنگین ہے، مجھے پوری دنیا میں یہ کام کرنے میں حرج محسوس نہیں ہوا جب میرا تبادلہ کیا گیا۔''

ولیم جیمز نے ایک مرتبہ لکھا، ''وہ زندگی جس میں کوئی چیز حاصل کر لی گئی ہو وہ اس زندگی سے نسبتاً کم آزاد ہے جس کی بنیاد کچھ کرنے یا کچھ ہونے پر ہو''۔ کرایہ داری کا عروج اس کاوش سے ذرا ہٹ کر ہے جس میں کسی چیز کو حاصل کر لیا گیا ہے اور اس میں کسی چیز کے کرنے اور ہونے کی بڑھوتری پائی جاتی ہے۔ اگر مستقبل سے تعلق رکھنے والے لوگ ماضی کے لوگوں سے تیز تر زندگی گزاریں تو انھیں مزید لچکدار ہونا چاہیے۔ اور وہ لوگ دوڑ میں حصہ لینے والوں کی مانند ہیں...... یعنی تمام تر چیزوں کے ساتھ کسی مسئلے میں گریز ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ چیزوں کی بہتات چاہتے ہیں اور یقیناً ان چیزوں کی بھی جو جدید ٹیکنالوجی انھیں آفر کراتی ہے، لیکن ذمہ داری کی نہیں، اور آج کی دنیا میں، چیزوں کی جمع آوری کے ساتھ۔ انھیں اس بات کا ادراک ہے کہ تبدیلی کی ان غیر یقینیوں کے ساتھ انھیں ہلکے پھلکے سامان کے ساتھ ہی چلنا ہے۔

اس کے وسیع تر اثرات جو بھی ہوں کرایہ داری نے انسان اور اس کے استعمال میں آنے والی تمام تر چیزوں کے درمیانی عرصے کو مزید کم کر دیا ہے۔ اس بات کی وضاحت ایک سادہ سے سوال سے ہو جاتی ہے: ایک امریکی مرد کے ہاتھوں سے اوسطاً کتنی کاریں...... کرایہ پر، مستعار یا ملکیتی...... (استعمال ہو کر) گزرتی ہیں؟ کار کے مالکان کے لیے شاید یہ جواب بیس سے پچاس ہو۔ تاہم بڑی تعداد میں کرایہ پر حاصل کرنے والے کے لیے یہ شرح ۲۰۰ یا اس سے زائد ہو جاتی ہے۔ جبکہ کسی ایک خاص گاڑی سے خریدار کا اوسط تعلق انتہائی مختصر ہوتا ہے۔

کرایہ داری کسی ایک خاص چیز سے مختلف لوگوں کے تعلق کو ظاہر کرتی ہے یوں لوگوں سے چیزوں کا اوسط تعلق کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب ہم اس اصول کا پھیلاؤ مختلف چیزوں تک کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات عیاں ہوتی ہے کرایہ داری کا عروج پھینک دی جانے والی چیزوں، عارضی ڈھانچوں اور متقیاسیت کے متوازی چلتا ہے اور ان کے اثرات کی اہمیت اجاگر کرتا ہے۔

عارضی ضروریات

یہاں یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ غیر مروج ہونے کے نظریے کی طرف توجہ مبذول کروائی جائے۔ اشیا کے غیر مروّج ہونے کے خوف کی وجہ سے تاجر حضرات جدّت کی طرف بھی متوجہ ہوئے کیونکہ اب صارف کرایہ پر حاصل ہونے والی، پھینک دی جانے والی اور عارضی اشیا کی طرف بھی راغب ہوتا ہے۔

غیر مروج ہونے کا یہ نظریہ ان لوگوں کو خاصا پریشان کر رہا ہے جو چیزوں کے دوام پر اپنی زندگی گزار چکے ہیں اور یہ بات اس وقت خاص طور پر پریشان کن ہوتی ہے جب اس کو ایک منصوبے کے تحت سرانجام دیا جائے۔ غیر مروجہ چیزوں کی منصوبہ سازی حالیہ سماجی تنقید کا اتنا نشانہ بنی رہی ہے کہ ایک عام قاری اسے تعلقات کو مختصر کرنے کا بنیادی ذریعہ، خاص ذریعہ یا ایک خاص رخ سمجھتا رہا ہے۔

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ کچھ تاجر حضرات اپنی فروخت شدہ اشیا کی تبدیلی اور گارنٹی کے لیے تگ ودو کرتے ہیں۔ اس بات میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ وہ ماڈل سالانہ بنیادوں پر تبدیل کیے جاتے ہیں کہ جن کے بارے میں امریکی (اور دیگر) صارفین آشنا ہو جاتے ہیں کہ یہ ٹیکنالوجی کے حوالے سے بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔ ڈیٹرائٹ (امریکہ) کی تیار کردہ کاریں آج گیسولین کی فی میل اوسط کو بہتر بنانے کے بارے میں مزید بہتری کے لیے کام نہیں کرتیں جتنا وہ دس ماڈل پہلے کرتی تھیں، اور تیل کی کمپنیاں، اپنی مصنوعات میں مشمولہ تمام چیزوں سے متعلق بلند و بانگ دعوے کرتی ہیں، وہ گاڑی کی رفتار میں ست روی کا باعث ہیں نہ کہ تیزی کا۔ مزید یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ میڈلسن ایونیو اکثر نئی خصوصیات سے متعلق مبالغہ آرائی کرتی ہے اور صارفین کی اس سلسلے میں بھی حوصلہ افزائی کرتی ہے وہ نئی چیزوں کی (خریداری کی) راہ استوار کرنے کے لیے ''نیم'' بے کار چیزوں سے چھٹکارا حاصل کرے۔

لہٰذا یہ بات درست ہے کہ کبھی کبھار صارف ماہرانہ طریقے سے تیار شدہ چیز کے چنگل میں آ جاتا ہے...... یعنی کسی پرانی تیار شدہ چیز جس کی ''موت'' دیدہ دانستہ اس کی تیار کنندہ نے تجویز کر دی ہو اور ساتھ ہی ''نئی اور بہتر'' چیز بھی سامنے آتی ہے اور اس سے متعلق اشتہار دیا جاتا کہ یہ جدید ترین ٹیکنالوجی کی شاندار جیت ہے۔

یہ وجوہات، ازخود، ہماری زندگی میں اشیا کی تبدیلی اور ترسیل کی شرح میں اضافے کا باعث نہیں۔ تیزی سے چیزوں کا غیر مروج ہونا تیز رفتاری کے مرحلے کا جزو لاینفک ہے۔ ایک ایسا مرحلہ جس میں سپارک پلگوں کے استعمال کا عرصہ حیات ہی شامل نہیں بلکہ مکمل معاشروں کی زندگی کی بات ہوتی ہے۔ سائنس کے عروج سے منسلک ہوئے اور معلومات کے حصول سے رفتار حاصل کر کے، یہ تاریخی عمل کچھ مسابقین کے منفی استعمال کے لیے بمشکل استعمال کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ غیر مروج ہونا بغیر کسی ''پلاننگ'' کے یا ''پلاننگ'' کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ چیزوں کے حوالے سے غیر مروج ہونا تین شرائط کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی تیار شدہ

چیز اس حد تک غیر معیاری ہو جائے کہ کسی نہج پر پہنچ کر وہ اپنی کارکردگی مکمل طور پر سرانجام نہ دے سکے.....اس کے کسی حصّے کا جل جانا، اس میں کسی قسم کی لیکیج ہونا، اس کے پائیوں کا زنگ آلود ہونا۔ ان تمام تر عوامل کا صارف کے لیے کیا جانا ناگزیر ہے، اگر کوئی تیار شدہ چیز ان تمام کاموں کو کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تو یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اب تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہ غیر مروج ہونا اس کی فعالیت کا فقدان ہے۔

کسی چیز کا غیر مروج ہونا اس وقت بھی سامنے آتا ہے جب کوئی نئی چیز منظر عام پر آتی ہے اور پرانی تیار شدہ چیز کے مقابلے میں اپنی کارکردگی بہتر طریقے سے پیش کرتی ہے۔ نئی انٹی بائیوٹک کسی انفیکشن کے علاج کے لیے پرانی کے مقابلے بہتر کارکردگی دکھاتی ہیں۔ نئے کمپیوٹر ۱۹۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی ایام کے کمپیوٹروں کے مقابلے میں یقینی طور پر تیز تر کارکردگی دکھاتے ہیں اور سستے بھی ہیں۔ یہ غیر مروج ہونا ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے ہے۔

غیر مروج ہونے کا عمل اس وقت بھی ہوتا ہے جب صارف کی ضروریات میں تبدیلی آ جائے، جب کسی تیار شدہ چیز سے لیے جانے والوں کاموں میں بھی تبدیلی آ جائے۔ ان ضروریات کو اتنی آسانی سے بیان نہیں کیا جا سکتا جتنا ایک ترتیب یافتہ، غیر مروج عمل کے ناقدین بیان کرتے ہیں۔ کوئی بھی چیز چاہے وہ کوئی کار ہو یا ٹن کھولنے کا آلہ، اسے مختلف حوالوں سے جانچا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک کار ذریعہ آمد و رفت سے بڑھ کر ایک چیز ہے۔ یہ استعمال کنندہ کی شخصیت کا عکس ہے، ایک معیارِ زندگی ہے، رفتار سے منسوب ایک لطف کا ذریعہ، حواس سے متعلق وسیع تر محرکات کا ذریعہ...... لمسی، شمومی اور بصری حس سے متعلق۔ اب یہ صارف کی ترجیحات پر منحصر ہے کہ وہ ایسے عوامل سے اطمینان حاصل کرتا ہے جو گیس کی کھپت یا پک اپ پاور سے بھی زیادہ ہوں۔

یہ روایتی خیال کہ کسی چیز کا ایک ہی، اور آسانی سے بیان کیا جانے والا، کام ہوتا ہے، ہماری معلوم شدہ انسانی نفسیات، فیصلہ کرنے کی صلاحیت میں اقدار کے کردار اور عقل سلیم سے ٹکراتا ہے۔ تمام چیزیں کثیر جہتی ہوتی ہیں۔ اسی چیز کا بہترین نمونہ کچھ عرصہ قبل ہی میرے سامنے آیا جب میں نے ایک چھوٹے لڑکے کو کتابوں کی دکان سے گلابی رنگ کی چھ (مٹانے والی) ربڑیں لیتے دیکھا۔ اس تجسس میں کہ اس نے اتنی تعداد میں ربڑیں کیوں خریدی ہیں، میں نے ان میں سے ایک کو اٹھا کر غور سے دیکھنا شروع کر دیا اور اس لڑکے سے پوچھا، ''کیا یہ اچھا مٹاتی ہیں؟'' لڑکے نے جواب دیا، ''مجھے نہیں معلوم، لیکن ان کی خوشبو اچھی ہے!'' اور یقیناً ان کی خوشبو اچھی تھی۔ جاپانی تیار کنندگان نے ان پر خاصی مقدار میں خوشبو لگائی تھی، شاید کسی کیمیکل کی ناگوار بو کو ختم کرنے کے لیے۔ مختصر یہ کہ صارفین کی ضروریات اور وقت کے مطابق چیزیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں چیزیں عنقا ہیں ضروریات آفاقی سطح کی ہیں اور غیر متبدل ہیں کیونکہ ان کا سراسر تعلق ''بنیادی'' قسم کے کاموں سے ہے۔ تاہم چیزوں کی بہتات سے انسانی ضروریات حیاتیاتی بقا سے، بالواسطہ، کم ہی منسلک نظر آئیں اور وہ یکسر انفرادیت پر مبنی تھیں۔ مزید یہ کہ ایک ایسے معاشرے میں جو پیچیدگی کا شکار ہو، تیز رفتاری پر مشتمل تبدیلی، افراد کی ضروریات کو تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ جو بیرونی ماحول سے اس کے تفاعل اور روابط سے جنم لیتی ہے اور یہ تبدیلی بھی بڑی تیز رفتاری سے انجام پاتی ہے۔ معاشرہ جتنی تیزی سے ترقی کرتا رہے گا ضروریات اتنی عارضی ہوتی چلی جائیں گی۔ اس نئے معاشرے میں چیزوں کی بہتات کی پیش نظر کوئی بھی فرد ان قلیل المیعاد ضروریات کا شکار ہو سکتا ہے۔

عموماً اس بات کے واضح تخیل کے بغیر کہ اس کی کون کون سی ضروریات پوری ہونی چاہئیں صارف کے اندر ایک بے معنی قسم کی خواہش ہے کہ وہ تبدیلی کا خواہش مند ہے۔ ان احساسات پر اشتہارات اثر انداز ہوتے ہیں اور سرمایہ کاری کا باعث ہیں، لیکن اس بات کا ایقان مشکل ہے کہ اس چیز کی تخلیق ایک ہاتھ سے ہوئی۔ لہٰذا مختصر دورانیوں کے تعلقات کے حوالے سے کوئی صلاحیت یا وصف، کسی سماجی ڈھانچے میں بڑی گہرائی کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے بہ نسبت ان دلائل کے جو ایک خاص منصوبہ سازی کے تحت غیر مروج ہونے یا ''میڈیسن ایونیو'' کے تجویز کردہ، ایک خاص ترتیب کے تحت بنائی گئی تاثیر سے۔

وہ تیزی جس کے تحت صارف کی ضروریات تبدیل ہوتی ہیں اس کی عکاسی اس خوش دلانہ آمادگی سے ہوتی ہے جس کے تحت خریدار چیزوں کی بہتاتِ اکٹھی کرتے ہیں اور ان برانڈوں کو پسند کرتے ہیں۔ اگر اشتہارات کے ایک معروف نقاد اسسٹنٹ اٹارنی جنرل ڈونلڈ ایف ٹرنر اپنے اس مؤقف میں حق بجانب ہیں اشتہارات کا اصل مقصد ''دیرپا ترجیحات'' فراہم کرنا ہے تو یہ مقصد ناکامی کا شکار ہے کیونکہ برانڈ کی تبدیلی اتنی کثیر تعداد میں ہے اور عام ہے کہ خوراک کی صنعت سے متعلق ایک جریدے کے الفاظ میں یہ چیز، ''قومی سطح کے اشتہارات بنانے والوں کا دردِ سر بن گئی ہے۔''

بہت سے برانڈ متروک ہو جاتے ہیں۔ وہ برانڈ جن کا وجود قائم و دائم رہتا ہے ان کی صورت حال میں تواتر کے ساتھ تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ہنری ایم شاشے کے بقول، ''صارفین کے استعمال میں آنے والی اشیا میں سے.....کیا کوئی ایسا برانڈ ہے جو اپنی وہی پوزیشن برقرار رکھے ہوئے ہے جو دس سال قبل تھی؟'' جیسے امریکہ میں تیار ہونے والی اعلیٰ ترین دس سگریٹوں میں سے صرف پال مال (Pall Mall) ہی ایسی سگریٹ

ہے جس نے مارکیٹ میں اپنی فروخت کی وہ شرح قائم رکھی ہوئی ہے جو دس سال قبل تھی۔ کیملز (Camels) نے مارکیٹ میں اپنی شرح ۱۸ سے ۹ فی صد کرلی۔

لکی سٹرائک (Lucky strike) بڑی تیزی سے نیچے آئی یعنی ۱۴ فی صد سے ۶ فی صد پر دیگر برانڈ اوپر چلے گئے مثال کے طور پر سلیم (Salam) کی شرح فروخت ۱ فی صد سے بڑھ کر ۹ فی صد ہوگئی۔ اس سروے رپورٹ کے بعد بھی کچھ تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔

ایک مؤرخ کے لیے اس قسم کی تبدیلیاں کتنی غیر اہم کیوں نہ ہوں، تواتر کے ساتھ ہوتا ہوا ردوبدل، جس پر اشتہارات کا اثر تو ہے لیکن یہ مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں نہیں، یہ مختصر دورانیے میں متعارف ہوکر، فرد کی روزمرہ زندگی میں ایک تحرک پیدا کرتے ہیں۔ یہی چیز کسی معاشرے میں رفتار کی حس، افراتفری اور ناپائیداری کو جنم دیتی ہے۔

وقتی ''فیشن'' بنانے والی مشین

تیزی سے تبدیل ہوتی ترجیحات جو ٹیکنالوجی کی اعلیٰ ترین رفتار کی مرہون منت ہیں اور اسی کے تفاعل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، وہ پیداوار اور اس کے مختلف برانڈوں کی شہرت میں تبدیلی کا نہ صرف موجب ہوتی ہیں بلکہ وہ پیداوار کے عرصہ استعمال کو بھی کم کردیتے ہیں۔ خودکار مشینوں کے ایک ماہر جان ڈائی بولڈ کسی بھی تاجر کو یہ بات باور کروانے میں عار محسوس نہیں کرتے کہ انھیں اپنی تیار شدہ اشیا کے مختصر عرصہ استعمال سے متعلق سوچنا شروع کردینا چاہیے۔ سمتھ برادرز کے کھانسی کے ڈراپس، کالومیٹ کا بیکنگ سوڈا اور آیووری صابن مارکیٹ میں اپنی طویل حکمرانی کی وجہ سے امریکی ادارے بن گئے۔ جان ڈائی بولڈ مزید تجویز پیش کرتے ہیں کہ آنے والے وقت میں بہت کم اشیا ہی اتنا طویل دورانیہ نکال سکیں گی۔ ہر صارف کے پاس سپر مارکیٹ یا ڈپارٹمنٹل سٹور جانے کا تجربہ ہوگا تاکہ وہ کسی برانڈ یا پیداوار کو تبدیل کرواسکے، صرف یہ بات جاننے کے لیے کہ وہ یہی برانڈ یا پیداوار کو تلاش نہیں کرسکتا۔ ۱۹۶۶ء میں امریکہ کی سپر مارکیٹوں میں تقریباً ۷۰۰۰ نئی اشیا آگئیں۔ اس وقت فروخت ہونے والی اشیا میں سے ۵۵ فی صد ایسی ہیں جن کا دس سال قبل وجود نہیں تھا۔ اور اُس وقت دستیاب اشیا میں سے ۴۲ فی صد اشیا یکسر غائب ہوچکی ہیں۔ یہ عمل ہر سال بڑی شدت کے ساتھ دہرایا جاتا ہے۔ لہٰذا سال ۱۹۶۸ء میں صارفین کے لیے پیک شدہ چیزوں کی مد میں ۹،۵۰۰ نئی اشیا متعارف ہوئیں، جس میں سے ہر پانچ میں سے ایک چیز نے اپنی فروخت کا ہدف حاصل کیا۔ ایک خاموش لیکن تیزی سے ہوتی ہوئی کمی پرانی چیزوں کو ختم کردیتی ہے اور نئی مصنوعات سیلاب کی مانند مارکیٹ میں آجاتی ہیں۔

ایک ماہر معاشیات رابرٹ تھیوبالڈ لکھتے ہیں، ''وہ مصنوعات جو پچیس سال تک فروخت ہوا کرتی تھیں اب پانچ سال سے زیادہ فروخت نہیں ہوتیں۔ دواسازی اور الیکٹرانک کے متلون شعبوں میں یہ عرصہ اور بھی کم ہوکر چھ ماہ تک رہ جاتا ہے۔'' جونہی زندگی کی شرح رفتار تیز ہوتی ہے کارپوریشنیں اس بات کا ادراک لیے ہوئے مارکیٹ میں تجارت کرتی ہیں کہ وہ مارکیٹ میں اپنی جگہ چند ہفتوں تک برقرار رکھ سکیں گی۔

یہاں ''زمانہ حال'' ہمیں ''مستقبل'' کا پیشگی مزہ دیتا ہے۔ یہ ایک غیر متوقع چیز میں پنہاں ہے: وہ رجحان جو ایک لہر کے بعد دوسری لہر کی طرح، اعلیٰ ٹیکنالوجی کی وجہ سے، معاشروں میں رائج ہورہا ہے۔ ماضی کے محض چند سالوں میں ہی امریکہ، مغربی یورپ اور جاپان میں ہم نے ''بارڈوٹ ہیئر ڈوس'' (Bardot hairdos) ''قلوپطرہ لُک'' (Cleopatra look)، جیمز بانڈ اور بیٹ مین کی مقبولیت میں اچانک عروج یا زوال دیکھنے میں آیا، یہاں پر Super Balls، Thffany Lampshodes، آئرن کراس، دھوپ کے چشمے، Badges اور بٹنوں کا ذکر نہیں جن کے ساتھ احتجاجی نعرے یا جنسی لطائف بھی درج ہوتے تھے، ایلن گنز برگ کے اشتہار یا Humphrey Bagart مصنوعی پلکیں اور دیگر بے شمار نمائشی اشیا اور انوکھی چیزیں جو اس تیزی سے بدلتی ہوئے پاپ ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں۔ یا انھیں اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا۔ جدید ذرائع ابلاغ اور نفیس مارکیٹنگ کا سہارا لیے ہوئے اس طرح کے رجحانات ہم عملی طور پر دیکھتے ہیں۔ اور وہ فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح کے عارضی رجحانات میں مصروفِ عمل تاجران اپنی مصنوعات کے مختصر سے مختصر دورانیوں کے لیے پیشگی تیار ہوتے ہیں۔ لہٰذا سان گیبرائیل، کیلی فورنیا میں ایک کمپنی متعارف کروائی گئی جو ''کارن بول ریلش'' کی طرز پر تھی، اس کمپنی کا نام وہام۔ او (Wham-o) مینوفیکچرنگ کمپنی ہے، اس کمپنی کا کام جدید رجحانات پر مبنی مصنوعات کی تیاری ہے۔ اس کمپنی نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں Hula hoop متعارف کروائے تھے اور حال ہی میں نام نہاد سُپر۔ بال (گیند) تیار کی ہیں۔ مؤخرالذکر اونچی اچھلنے والی ربڑ کی گیند ہے جو جلد ہی بڑوں اور بچوں میں یکساں ایکسچینج کے فرش پر لوگوں کو اچھالتے ہوئے دیکھا۔ وال سٹریٹ کے منتظمین نے یہ گیند اپنے دوستوں کو دی اور نشریات کے ادارے کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے شکایت کی کہ ''ہمارے تمام اعلیٰ عہدیداران ہماری عمارت کے بڑے ہال میں اپنی اپنی Super-Balls کے ساتھ کھیل رہے ہیں''۔ وہام۔ او، اور دیگر کمپنیاں اسے پسند کرتی ہیں تاہم ان کا نظام کسی بھی چیز کی اچانک ناکامی کی وجہ سے ختم نہیں ہوتا اور وہ لوگ اپنی مصنوعات کے حوالے سے چیزوں کے

بارے میں پیش بینی کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ ''عارضی'' مصنوعات کو ڈیزائن کرنے اور اس کی تیاری کرنے کے ماہر شمار کیے جاتے ہیں۔

یہ حقیقت کہ مختلف رجحانات، خاصی حد تک، مصنوعی طور پر بنائے جاتے ہیں، ان کی اہمیت وافادیت کو کم کر دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ تیار کردہ رجحانات بھی تاریخ میں نئے نہیں۔ لیکن اس سے پہلے کبھی بھی یہ اتنی تیزی سے شعور میں داخل اور اثر انداز نہیں ہوتی تھیں اور اس سے پہلے کبھی بھی رجحان ''تشکیل'' دینے والوں، اس کو مقبول عام کرنے کی خواہش لیے ہوئے ذرائع ابلاغ اور اس چیز کی فوری فروخت کی متمنی کمپنیوں کے درمیان کبھی بھی اتنا بہتر تعاون واشتراک دیکھنے میں نہیں آیا۔

آج کی جدید معاشیات میں ان تمام تر رجحانات کی تشکیل اور ان کے عملی اطلاق کے لیے ایک رواں مشینری ایک جزو لاینفک ہے۔ جوں جوں مصنوعات کے عرصۂ استعمال کے مختصر ہونے کا احساس ہوتا چلا جائے گا یہ طریقہ کار دیگر لوگ بھی اختیار کرتے چلے جائیں گے۔ کسی بھی عام پیداوار اور ایک خاص رجحان کے تحت تیار کردہ چیز کے درمیان کھینچی گئی لکیر بتدریج ماند پڑ جائے گی۔ ہم لوگ بڑی تیزی سے عارضی مصنوعات کے عہد میں داخل ہو رہے ہیں، جو عارضی طریقوں سے تیار کی گئی ہوں اور وہ عارضی ضروریات پوری کرتی ہیں۔

لہٰذا ہماری زندگی میں چیزوں کی تعداد کثیر ہو گئی ہے۔ ہم لوگ پھینک دی جانی والی چیزوں، عارضی طرز تعمیر، متحرک اور ناپائیدار چیزوں، کرایے پر حاصل کی گئی چیزوں اور فوری موت کے لیے تیار شدہ اشیا کے سیلاب کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان تمام زاویوں سے اسی جانب مضبوط دباؤ بھی بڑھتے ہیں: انسان اور چیزوں کے درمیان ایک ناگزیر اور عارضی تعلق۔

ماحول کے ساتھ ہمارا مختصر ہوتا ہوا تعلق، اشیا کی پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہمارے بڑے سیاق وسباق کا محض ایک چھوٹا سا جزو ہے لہٰذا آیئے اس ناپائیدار ترین معاشرے میں زندگی میں تحقیق وجستجو کرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں۔

☆☆☆

پانچواں باب

مقامات: نئے خانہ بدوش

ہر جمعے کی سہ پہر ۴:۳۰ بجے ''وال سٹریٹ'' کے ایک ادھیڑ عمر، لمبے تڑنگے آفیسر بروس روب (Bruce Robe) کالے رنگ کے لیدر بریف کیس میں کاغذوں کی ایک بڑی تعداد ٹھونس کر، اپنے دفتر کے ریک سے کوٹ اٹھا کر باہر آتے ہیں اور چل پڑتے ہیں۔ تین سال سے زائد ہوئے ان کا یہی معمول ہے۔ پہلے وہ لفٹ کے ذریعے ۲۹ویں منزل سے نیچے آتے ہیں۔ پھر وہ رش سے بھری سڑکوں پر دس منٹ پیدل چل کر وال سٹریٹ کے ہیلی پورٹ پر آتے ہیں۔ یہاں آ کر وہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر، آٹھ منٹ بعد، جان ایف کینیڈی ہوائی اڈے پر آ جاتے ہیں۔ یہاں سے وہ ٹرانس ورلڈ ایئر لائنز کے جیٹ (طیارے) میں بیٹھ جاتے ہیں اور شام کا، ہلکا پھلکا، کھانا کھاتے ہیں، ان کا بڑا طیارہ بحر اوقیانوس پر پرواز کرتا ہوا، مغرب کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے، بغیر کسی تاخیر کے، ایک گھنٹہ دس منٹ بعد وہ کولمبس، اوہائیو کے ہوائی اڈے کے ٹرمینل کی عمارت سے تیز رفتاری سے باہر آتے ہیں اور پہلے سے انتظار میں کھڑی، ایک کار میں بیٹھ جاتے ہیں اور تقریباً ۳۰ منٹ میں وہ اپنی منزل: یعنی اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں۔

مسٹر روب (Robe) ہفتے میں چار راتیں مینہٹن میں واقع ایک ہوٹل میں گزارتے ہیں۔ باقی تین راتیں وہ ۵۰۰ میل دور، کولمبس میں اپنے کنبے کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ان دو مختلف اور بہترین دنیاؤں سے لطف اندوز ہونے کے لیے، یعنی امریکا کے ایک عالیشان تجارتی مرکز میں ملازمت اور (امریکا کے) وسط المغرب، دیہی اور نسبتاً پرسکون علاقے میں کنبے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے، وہ سالانہ ۵۰،۰۰۰ میل کا سفر کرتے ہیں۔

روب کا معاملہ غیر معمولی ہے...... لیکن اتنا غیر معمولی بھی نہیں۔ کیلی فورنیا میں زرعی اراضی اور مویشی فارموں کے مالکان پیسیفک کوسٹ یا سان برنارڈینو (Bernardino) ویلی سے ۱۲۰ میل روزانہ کا ہوائی سفر کر کے امپیریل ویلی میں واقع اپنے فارموں پر جاتے ہیں اور رات کے وقت واپس اپنے گھروں

میں آ جاتے ہیں۔ پین سلوینیا سے تعلق رکھنے والے ایک متحرک انجینئر کا نوعمر بیٹا فرینکفرٹ، جرمنی کے ایک دندان ساز سے علاج کی خاطر متواتر فرینکفرٹ جاتا ہے۔ یونیورسٹی آف شکاگو کے ایک فلسفی ڈاکٹر رچرڈ مکینیون نے نیویارک میں واقع نیو سکول فار سوشل ریسرچ کی کلاس کی تدریس کی غرض سے پورے سمسٹر کے دوران ہفتے میں ایک مرتبہ ۱۰۰۰ میل کا یک طرفہ سفر کیا۔ سان فرانسسکو سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان ہونولولو (ہوائی) میں رہنے والی اپنی گرل فرینڈ سے ملاقات کی خاطر ہر ہفتے کے اختتام پر بحرالکاہل کے اوپر تقریباً ۲۰۰۰ میل کا ہوائی سفر کرتا ہے اور نیو انگلینڈ (امریکا) سے تعلق رکھنے والا ایک صارف نیویارک میں کام کرنے والے ہیئر ڈریسر کے پاس معمول کے مطابق جاتا ہے۔

تاریخ میں کبھی بھی فاصلے اتنے کم نہیں ہوئے۔ اور مقامات سے انسان کا تعلق کبھی بھی اتنا زیادہ، کمزور اور عارضی نہیں رہا۔ ٹیکنالوجی کے حوالے سے ترقی یافتہ تمام تر معاشروں میں اور خاص طور پر ان لوگوں میں جنھیں میں نے "مستقبل کے لوگ" کہہ کر پکارا ہے، ادل بدل کرنا، سفر کرنا اور اپنے کنبے کے پاس دوبارہ پہنچ جانا ان کی فطرت ثانیہ ہے۔ مجازی طور پر ہم کلینکس یا بیئر کے ٹن "پھینک" دیتے ہیں۔ ہم انسانی زندگی میں مقامات کی اہمیت کا تاریخی زوال دیکھ رہے ہیں۔ ہم خانہ بدوشوں کی ایک نئی نسل کی پرورش کر رہے ہیں اور کچھ لوگ یہ گمان بھی کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہجرتیں کتنی بھاری بھرکم، وسیع تر اور اہمیت کی حامل ہیں۔

۳،۰۰۰،۰۰۰ میل والا کلب

بک منسٹر فلر (Buck minster Fuller) کے بقول ۱۹۱۴ء میں ایک روایتی امریکی اوسطاً ۱،۶۴۰ سالانہ کا سفر کرتا تھا، اس میں سے ۱۳۰۰ میل کا سفر وہ ادھر اُدھر پیدل گھوم کر کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صرف ۳۴۰ میل سالانہ کا سفر گھوڑے پر یا میکانکی ذرائع سے کیا کرتا تھا۔ ۱،۶۴۰ میل کے ان اعداد کو بنیاد بنا کر یہ ممکن ہے کہ ہم ایک اوسط امریکی کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنی مدتِ حیات میں مجموعی طور پر ۸۸،۵۶۰ میل کا سفر کیا۔[۱] جبکہ اس کے مقابلے میں آج ایک امریکی شہری، جو کار کا مالک ہے، ۱۰،۰۰۰ میل سالانہ کا سفر اپنی کار پر کرتا ہے...... اور اس کی مدت حیات اپنے باپ اور دادا سے بھی زیادہ ہے۔ مسٹر فلر نے چند سال قبل تحریر کیا، "۶۹ سال کی عمر میں پہنچ کر میں ان لاکھوں افراد میں سے ایک ہوں جنھوں نے اپنی زندگی میں ۳،۰۰۰،۰۰۰

(۱) یہ اعداد و شمار اوسط عمر ۵۴ کو ملحوظ خاطر رکھ کر تشکیل دیے گئے ہیں، ۱۹۲۰ء میں امریکہ سے تعلق رکھنے والے سفید فام مرد کی اوسط عمر ۵۴ء۱ سال تھی۔

میل یا اس سے زیادہ کا سفر کیا"۔ ۱۹۱۴ء کے عہد سے تعلق رکھنے والے ایک امریکی سے ۳۰ گنا زیادہ سفر۔

اوسط اعداد و شمار متزلزل ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۷ء میں ۱۰۸،۰۰۰،۰۰۰ امریکیوں نے ۳۶۰،۰۰۰،۰۰۰ دورے کیے جس میں اپنے گھر سے باہر ۱۰۰ میل سے زائد فاصلے پر ایک رات کا قیام بھی شامل ہے۔ صرف یہ دورے ہی ۳۱۲،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل پر مبنی ہیں۔

اگر ہم جمبو جیٹ، ٹرک، کاروں، ریل گاڑیوں، سب ویز اور اسی طرح کی چیزوں کے سلسلوں کے متعارف ہونے کو فراموش بھی کر دیں، تو حرکت پذیری میں ہماری "معاشرتی سرمایہ کاری" حیران کن ہے۔ امریکی خطوں میں ہموار سڑکوں اور گلیوں کا اضافہ ۲۰۰ میل فی گھنٹہ یومیہ کی حیران کن شرح سے ہوا اور یہ اضافہ گزشتہ بیس سال سے ہو رہا ہے۔ یوں ہر سال امریکا میں نئی سڑکوں اور گلیوں میں ۷۵،۰۰۰ میل کا اضافہ ہوتا ہے جو دنیا بھر کے تین چکر لگانے کے لیے کافی ہے۔ اس دوران امریکی آبادی میں ۳۸ء۵ فی صد کی شرح سے اضافہ ہوا جبکہ سڑکوں اور گلیوں کی تعمیر کی اوسط شرح ۱۰۰ فی صد رہی۔ اگر ایک اور زاویے سے ان اعداد و شمار کو دیکھا جائے تو صورت حال مزید ڈرامائی ہے: امریکا میں لوگوں کے سفر کرنے کی فی میل اوسط، گزشتہ ۲۵ سال میں امریکی آبادی کی شرح سے چھ گنا زیادہ ہے۔

تمام تر جدید تکنیکی تخیلات کی رو سے یہ انقلابی اقدامات خلا میں فی کس نقل و حرکت کی شرح کے، کسی نہ کسی حد تک، متوازی ہیں۔ کوئی بھی شخص جس نے سٹاک ہوم (Stockholm) میں واقع سٹرینڈ ریگ (strandreg) نامی جگہ کو اس وقت دیکھا ہو جب وہ پرسکون ہوتی تھی، اگر اسے وہی جگہ آج دکھائی جائے تو وہ اس منظر کو دیکھ کر چونک جائے گا۔ روٹرڈیم اور امسٹرڈیم میں، گزشتہ پانچ سالوں کے دوران تعمیر ہونے والی سڑکیں اب خوف ناک حد تک رش سے بھری ہوتی ہیں: اور گاڑیوں کی تعداد میں اتنی تیزی سے اضافہ ہوا ہے کہ ماضی میں کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

گھر سے دیگر قریبی مقامات تک سفر میں اضافے کے ساتھ ساتھ تجارت اور پیشہ ورانہ سفر میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا ہے جس میں گھر سے دور رات کا قیام بھی شامل ہے۔ اس موسم سرما میں تقریباً ۱۵،۰۰۰،۰۰۰ جرمن باشندے سپین میں اپنی چھٹیاں گزاریں گے اور ہزاروں کی تعداد میں افراد ہالینڈ اور اٹلی کے ساحلوں پر جائیں گے۔ سویڈن ہر سال ۱۱،۲۰۰،۰۰۰ ایسے افراد کا خیر مقدم کرتا ہے جن کا تعلق سکینڈینیویا ممالک سے نہیں۔ ہر سال ایک ملین غیر ملکی امریکا کا دورہ کرتے ہیں جبکہ سالانہ ۴،۰۰۰،۰۰۰ امریکی دیگر ممالک میں جاتے ہیں۔

''لی فگارو'' (Le Figaro) نامی جریدے کے ایک لکھاری نے بجا طور پر اسے ''بڑے پیمانے پر انسانی تبادلہ'' قرار دیا ہے۔

اس کرۂ ارض پر (اور کبھی کبھار اس کے نیچے) انسانوں کی یہ مصروف نقل و حرکت جدید ترین صنعتی معاشرے کی شناختی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ اس کے برعکس صنعتی دور سے پہلے کی اقوام ساکن، منجمد تھیں اور ان کی آبادیاں ایک مقام کے ساتھ وابستہ دکھائی دیتی تھیں۔ ذرائع نقل و حمل کے ایک ماہر ولفریڈ اوون (Wilfred Owen)، ''متحرک اور جامد اقوام کے درمیان فاصلے'' کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں کہ لاطینی امریکا، افریقہ اور ایشیا کو یورپین اکانومک کمیونٹی (EEC) کے ممبر ممالک میں موجود سڑکوں کی شرح تک پہنچنے کے لیے ۴۰،۰۰۰،۰۰۰ لمبی سڑکیں تعمیر کرنی ہوں گی۔ اس تقابل کے بڑے گہرے معاشی نتائج سامنے آئیں گے، لیکن ان نتائج میں بڑے عمیق اور عمومی طور پر نظر انداز کیے گئے، ثقافتی اور نفسیاتی نتائج ہیں کیونکہ ہجرت کرنے والے، مسافر اور خانہ بدوش ایسے لوگ نہیں جو ایک جگہ پر مقیم رہیں۔

سویڈن میں فلیمینکو

شاید نفسیاتی طور اہم ترین نقل و حمل جو کوئی فرد کر سکتا ہے وہ اپنے گھر کا از سر نو جغرافیائی تعین کرنا ہے۔ جغرافیائی نقل و حمل کی یہ ڈرامائی قسم امریکا اور دیگر ترقی یافتہ اقوام میں بڑے واضح انداز میں دیکھی جا سکتی ہے۔ امریکا کا ذکر کرتے ہوئے پیٹر ڈروکر کہتے ہیں: ''ہماری تاریخ میں سب سے بڑی ہجرت جنگ عظیم دوم کے دوران دیکھنے میں آئی؛ اور اس وقت سے لے کر اب تک یہ سلسلہ بغیر کسی کمی کے جاری و ساری ہے'' اور ایک سیاسی محقق ڈینیل ایلیزر (Elaser) ان بے شمار امریکیوں کا ذکر کرتے ہیں ''امریکا کے باشندے (شہری) خطے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا شروع ہو گئے ہیں...... ان کا یہ انداز خانہ بدوشوں کے اس طرز زندگی کو محفوظ رکھتا جو کسی ایک خاص جگہ سے وابستہ نہیں......''

مارچ ۱۹۶۷ء اور مارچ ۱۹۶۸ء کے درمیان...... یعنی صرف ایک سال میں...... ۳۶،۶۰۰،۰۰۰ امریکی (ایک سال سے کم بچے ان اعداد و شمار میں شامل نہیں) ایسے تھے جنھوں نے اپنی رہائش کی جگہ تبدیل کی۔ یہ تعداد کمبوڈیا، گھانا، گوئٹے مالا، ہنڈراس، عراق، اسرائیل، منگولیا، نکاراگوا اور تیونس کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔ یہ صورت حال بالکل ایسی ہے کہ ان ممالک کی تمام تر آبادی اچانک کسی اور جگہ جا کر واپس آ جائے۔ امریکا میں ہر سال اس پیمانے پر نقل و حرکت ہوتی ہے۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر اب تک ہر پانچ امریکیوں

میں سے ایک ایسا ہے جس نے اپنے گھر کا پتہ تبدیل کیا ہو، اپنے بچوں کو لے کر، کچھ گھریلو سامان لے کر کسی نئے مقام پر از سر نو زندگی کا آغاز۔ حتیٰ کہ تاریخ میں ہونے والی بڑی ہجرتیں، منگول، انیسویں صدی میں یورپی اقوام کی مغرب کی طرف روانگی بھی اعداد و شمار کے موازنے سے چھوٹی نظر آتی ہیں۔

جبکہ امریکا میں جغرافیائی نقل و حمل کی اس بلند شرح کا دنیا میں موجود اعداد و شمار سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا (بدقسمتی سے دستیاب اعداد و شمار واضح نہیں)، یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ ان ترقی یافتہ ممالک میں جہاں روایات کی پاسداری کی جاتی ہے انسان اور کسی مقام کے درمیان قدیمی روابط اب تنزلی کا شکار ہیں۔ لندن سے شائع ہونے والے سماجی علوم کے ایک جریدے ''نیو سوسائٹی'' کی رو سے، ''برطانوی لوگ، ماضی کے لوگوں کی سوچ سے بھی زیادہ نقل و حمل کرنے والے متحرک لوگ ہیں......'' ۱۹۶۱ء میں برطانیہ اور ویلز کی ۱۱ فی صد آبادی ایسی تھی جو اس وقت اپنے آبائی گھروں میں ایک سال سے بھی کم رہتی تھی...... برطانیہ کے مختلف خطوں میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہجرت کی تحریکیں بڑے زور و شور سے جاری ہیں۔ کینسنگٹن (Kensington) میں ۲۵ فی صد سے زائد افراد ایسے تھے جو اپنے گھروں میں ایک سال سے بھی کم رہے، ہیمپسٹیڈ (Hhmpstead) میں یہ شرح ۲۰ فی صد تھی اور چیلسی (chelsea) میں ۱۹ فی صد۔''

اسی برطانوی جریدے (New Society) میں این لیپنگ (Anne lapping) نے لکھا، ''گھروں کے نئے مالکان سے، ان کے آباؤ اجداد کی نسبت، یہ توقع زیادہ کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے گھر تبدیل کریں گے۔ (قرض کے لیے) رہن رکھے جانے کی مدت آٹھ سے نو سال ہے......'' یہ مدت امریکا میں رائج مدت سے ذرا مختلف ہے۔''

فرانس میں گھروں کی کمی اور اس کی بڑھتی ہوئی شرح اندرونی نقل و حمل میں ذرا سی رکاوٹ کا باعث ہے لیکن یہاں بھی ایک ماہر شماریاتِ آبادی کے بقول ہر سال ۸ سے ۱۰ فی صد فرانسیسی اپنے گھر تبدیل کرتے ہیں۔ سویڈن، جرمنی، اٹلی اور ہالینڈ میں بھی اندرونی ہجرت کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سے تمام یورپ میں، کسی بھی چیز سے زیادہ، بڑے پیمانے پر بین الاقوامی ہجرت کی لہر دیکھنے میں آئی ہے۔ شمالی یورپ میں معاشی استحکام و ترقی کی وجہ سے ملازمین کی قلت پیدا ہوئی (ماسوائے برطانیہ) جس کی وجہ سے بحیرۂ روم اور مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے ممالک سے بڑی تعداد میں بے روزگار زرعی محنت کش ان ممالک میں کھنچے چلے آئے۔

ان محنت کشوں میں سے ہزاروں کا تعلق الجزائر، سپین، پرتگال، یوگوسلاویہ اور ترکی سے ہے۔ ہر جمعے کی سہ پہر استنبول میں ۱۰۰۰ سے زائد ترک محنت کش ایک ٹرین سوار ہوتے ہیں جو انھیں شمال کی سمت مطلوبہ ممالک تک لے جاتی ہے۔ ان لوگوں کے لیے، مسافروں سے بھرا ہوا میونخ کا ریل ٹرمینل اترنے کی ایک مخصوص جگہ بن گئی ہے اور اب میونخ میں ترکی زبان کا اخبار بھی شائع ہوتا ہے۔ کولون (Cologne) میں واقع ایک فورڈ کمپنی کی بڑی فیکٹری میں ایک چوتھائی ملازمین ترکی سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے افراد سوئٹزرلینڈ، فرانس، برطانیہ، ڈنمارک اور انتہائی شمال میں واقع سویڈن تک چلے گئے ہیں۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ بارھویں صدی میں تعمیر ہونے والے، برطانوی قصبے پینگ بورن (Pangbourne) کے ایک ہوٹل میں مجھے اور میری بیگم کو سپین سے تعلق رکھنے والے ویٹرز نے کھانا پیش کیا۔ اور سٹاک ہوم شہر کے وسط میں واقع مشہور ویول (Vivel) ریستوران میں جب ہم لوگ گئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ یہ جگہ، اس ملک میں بسنے والے، سپین کے باشندوں کی ملاقات کی مخصوص جگہ بن گئی ہے جو کھانا موجود ہونے کے باوجود فلیمینکو موسیقی سننے کے لیے بھوکے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس وقت وہاں سویڈن کے باشندوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا، ماسوائے ہمارے اور الجزائر کے چند باشندوں کے، ہر شخص ہسپانوی زبان بول رہا تھا۔ لہٰذا یہ بات جان کر کوئی حیرت نہیں کہ آج کے سویڈن کے ماہر عمرانیات اس بات پر شدید بحث کر رہے ہیں کہ بیرونی ممالک سے تعلق رکھنے والے محنت کشوں کی آبادی کو سویڈن کی ثقافت میں ضم ہو جانا چاہیے یا ان لوگوں کو اپنی ثقافتی روایات برقرار رکھنے کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے ..... یعنی ''پگھلائے جانے کا'' وہی عمل جو امریکی ماہرین عمرانیات نے اُس وقت استعمال کیا جب امریکا میں لوگ بڑی آزادی کے ساتھ نقل مکانی کر رہے تھے۔

''مستقبل'' کی طرف ہجرت

ان لوگوں میں واضح فرق ہے جو امریکا کے اندر ہی نقل مکانی کرتے ہیں وہ جو یورپ میں ہجرت کرتے ہیں۔ یورپ میں ہونے والی نئی ہجرت کا دارومدار زراعت سے صنعت کی طرف کا ارتقاء ہے؛ زمانہ ماضی سے زمانہ حال کی طرف سفر، جیسے کہ پہلے بھی ہوا کرتا تھا۔ ہجرت کرنے والے لوگوں کی ایک قلیل تعداد صنعت کاری سے جدید ترین صنعت کاری کے ارتقاء سے منسلک ہے۔ اس کے برعکس امریکا میں لوگوں کی آباد کاری زرعی روزگار پر ہونے والے زوال کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کا موجب مشینی ترقی اور جدید ترین صنعتی معاشرے کا قیام ہے جو مستقبل کی طرز زندگی ہے۔

اس عمل کو سمجھنا اس وقت آسان ہوگا اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ عوام کا کون سا طبقہ ہجرت کر رہا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ تکنیکی طور پر پس ماندہ اور محروم لوگ، جیسے شہروں میں رہنے والے حبشی النسل لوگ، اپنے قریبی علاقوں یا ملحقہ ریاستوں میں ہجرت کرنے والے نمایاں لوگ ہیں، لیکن یہ لوگ اور ان کے گروہ مجموعی آبادی کا ایک چھوٹا سا جز ہیں اور یہ سمجھ لینا فاش غلطی ہوگی کہ جغرافیائی طور پر ہجرت کرنے کی بڑی شرح غربت، بے روزگاری یا تعلیم کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ درحقیقت یا بات دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ افراد جن کے پاس کالج کی ایک سالہ تعلیم ہے (ایسے افراد کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے) ان لوگوں کی نسبت زیادہ ہجرت کرتے ہیں جن کے پاس یہ تعلیم نہیں۔ لہٰذا امریکی آبادی میں سب سے زیادہ ہجرت کرنے والوں میں ان افراد کی اکثریت ہے جو تکنیکی اور پیشہ ورانہ شعبوں سے وابستہ ہیں۔ ہم یہ جان پاتے ہیں کہ امریکا میں ادھر سے ادھر ہجرت کرنے والوں میں متمول قسم کے اعلیٰ افسران بھی شامل ہیں جو کثرت سے یہ عمل سرانجام دے رہے ہیں۔ (مشینی دنیا کی بین الاقوامی تجارت میں یہ بات گھریلو مذاق کے طور پر لی جاتی ہے کہ IBM کا انگریزی میں مطلب ہے I have been moved) جدید ترین صنعت کاری کے اس ابھرتے ہوئے دور میں ایسے ہی لوگ۔ پیشہ ورانہ مہارت کے حامل، تکنیکی اور انتظامی امور سے وابستہ افراد۔ محنت کشوں کی مجموعی افرادی قوت میں شرحاً زیادہ ہیں۔ یہی لوگ اس معاشرے کو ایک مخصوص رنگ دیتے ہیں جیسے ماضی میں، ایک خاص لباس میں ملبوس فیکٹری کا محنت کش دیتا تھا۔

جس طرح بھوک و افلاس کے مارے اور بے روزگاری زرعی محنت کش لاکھوں کی تعداد میں ''زرعی ماضی'' سے یورپ کے ''صنعتی حال'' کی طرف تیزی سے جا رہے ہیں اسی طرح ہزاروں یورپی سائنسدان، انجینئر اور تکنیکی ماہرین امریکا اور کینیڈا جیسے جدید ترین صنعتی ممالک میں منتقل ہو رہے ہیں۔ مغربی جرمنی سے تعلق رکھنے والے طبیعیات کے شعبے میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر روڈولف موسبور (Rudolf Mossbauer) نے اعلان کیا کہ وہ، اپنے ملک میں انتظامی و مالی معاملات میں عدم اتفاق کی وجہ سے، امریکا منتقل ہونے کا سوچ رہے ہیں۔ یورپ سے تعلق رکھنے والے وہ سیاسی وزراء جو اس ''ٹیکنالوجی کے خلا'' کی وجہ سے پریشان تھے اور ویسٹنگ ہاؤس (Westinghouse)، الائیڈ کیمیکل، ڈوگلاس ایئر کرافٹ (Dougles Aircraft) جنرل ڈائنامکس (General Dynamics) یا دیگر امریکی کمپنیوں کی طرف، بے بسی کے عالم میں دیکھ رہے تھے، انھوں نے لندن اور سٹاک ہوم میں تربیت یافتہ افراد بھیجے تاکہ لوگوں کو ترغیب دی جائے

کہ وہ فلکی طبیعیات کی بجائے ٹربائن انجینئر بننا پسند کریں۔

لیکن ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ امریکا کے اندر بھی ''اخراج الرجال'' کا سلسلہ جاری ہے ہزاروں سائنسدان اور انجینئر کسی ایٹم کے اجزاء کی طرح ادھر سے ادھر گھوم رہے ہیں۔ دراصل وہاں نقل وحرکت کی دو جانی پہچانی صورتیں ہیں۔ یہ دو واضح رخ بنتے ہیں ایک شمالی کی جانب سے اور دوسرا جنوب کی جانب سے، یہ دونوں رخ کیلی فورنیا اور بحرالکاہل کی ساحلی ریاستوں پر یکجا ہو جاتے ہیں اور ان کا مشترکہ اتصالی مقام ڈینور (Denver)۔ ''اخراج الرجال'' کا ایک بہاؤ جنوب کی جانب سے شکاگو اور کیمبرج، پرنسٹن اور لانگ آئی لینڈ (Long Island) کی طرف ہے۔ ایک متوازی بہاؤ انسانوں کو خلاء میں واپس اور فلوریڈا میں واقع الیکٹرانکس کی صنعت کی طرف لے جاتا ہے۔

میرے ایک شناسا خلائی انجینئر نے پرنسٹن میں آر سی اے کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر جنرل الیکٹرک میں ملازمت اختیار کرلی۔ وہ گھر جو اس نے دو سال قبل خریدا تھا اسے فروخت کر دیا گیا؛ اس کا خاندان ایک کرایے کے مکان میں منتقل ہو گیا جو فلاڈیلفیا سے ذرا باہر واقع تھا، اور پھر خاندان کے لیے ایک نیا مکان تعمیر کیا گیا۔ وہ لوگ اس نئے مکان میں...... جو تقریباً پانچ سال کے عرصے میں چوتھا مکان ہے...... اس صورت میں منتقل ہوں گے اگر اس کا کسی اور مقام پر تبادلہ نہ ہوا یا اسے دیگر کسی کمپنی کی طرف سے بہتر روزگار کی دعوت نہ ملی اور ہر وقت کیلی فورنیا اپنی طرف مائل کر رہا ہوتا ہے۔

لوگوں کے لیے انتظامات کرنے کی سرگرمی کے حوالے سے یہ ایک نسبتاً غیر واضح جغرافیائی نمونہ ہے، لیکن جو کچھ بھی ہے، اس کی عمل کاری ایک بڑے پیمانے پر ہے۔ ایک دہائی قبل ایک جریدے ''The Organization Man'' میں ولیم وائٹ نے اعلان کیا ''جو شخص اپنا گھر چھوڑتا ہے وہ صرف امریکی معاشرے ہی میں مستثنیٰ نہیں بلکہ وہ اس کے لیے کنجی کا کام کرتا ہے۔ تعریف کی رو سے ''منظم شخص'' وہ شخص ہے جو اپنا گھر چھوڑتا ہے...... اور یہ عمل سرانجام دیتا رہتا ہے''۔ اس کی خصوصیات، جو اس خاص وقت میں درست تھیں، آج بھی درست نظر آتی ہیں''۔ جریدے ''وال سٹریٹ'' میں چھپنے والے ایک مضمون...... ''How Executive Family Adapts to Incessant Moving About Country'' میں ''کارپوریٹ خانہ بدوشوں'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں منٹگمری وارڈ ریٹیل کے سلسلے سے تعلق رکھنے والے ایک اعلیٰ آفیسر ایم ای جیکبسن کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ اور ان کی بیگم، جن کی عمریں مضمون کے لکھے

جانے کے وقت ۴۶ سال تھیں، اپنی چھبیس سالہ ازدواجی زندگی میں اٹھائیس مرتبہ ادھر سے ادھر گئے۔ ان کی بیگم نے آنے والے مہمانوں کو بتایا: ''مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم کیمپ لگانے کے عمل سے گزر رہے ہیں''۔

ان لوگوں کا معاملہ تو ایک مثال ہے جبکہ ان کی طرح کے لوگ ہر دو سال میں ایک مرتبہ ضرور ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں اور اس تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بات محض اس لیے درست نہیں کہ کارپوریٹ ضروریات مسلسل تبدیل ہو رہی ہیں بلکہ اعلیٰ آفیسران اپنے اچھے ملازمین اور نائبین کی تربیت کے دوران یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ انھیں لازماً ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جائے اور یہ عمل بار بار دہرایا جائے۔

ان افسران کی ایک گھر سے دوسرے گھر میں ایسی تبدیلی کہ گویا ایک براعظم کے حجم کی شطرنج کی بساط پر یہ لوگ مدث العمر کے کھلاڑی ہیں، اس صورت حال نے ایک ماہر نفسیات کو مجبور کیا کہ وہ پیسے کی بچت کرنے کا ایک نظام تجویز کرے جسے ''مقیاسی خاندان'' کا نام دیا جائے۔ اس سکیم کے تحت وہ افسر اپنے گھر کو ہی نہیں چھوڑتا بلکہ اپنے کنبے کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔ پھر وہ کمپنی اس کے لیے ایک ملتا جلتا کنبہ تلاش کرتی ہے (اس کے کنبے کے لیے نعم البدل کے طور پر فراہم کرنے کے لیے شخصی اوصاف بڑے محتاط انداز میں تلاش کیے جائیں) جو اسی جگہ پر مقیم ہو۔ پھر اس پیچھے رہ جانے والے کنبے کے لیے ایک متبادل افسر فراہم کر دیئے جاتے ہیں۔ ابھی تک کسی نے بھی اس خیال کو سنجیدگی سے سوچنے کی آمادگی ظاہر نہیں کی۔

مختلف پیشہ ورانہ افراد، اور اعلیٰ افسران جو مسلسل اس قسم کے ''موسیقی گھرانوں'' کے عمل سے گزر رہے ہیں، ان کے علاوہ بھی ایسے گروپ موجود ہیں جو اس معاشرے میں مسلسل تحرک وتبدیلی کے مرحلے میں ہیں۔ فوج کے بڑے انتظامی ڈھانچے میں ایسے کئی ہزار خاندان ہیں جو، حالت امن اور حالت جنگ دونوں میں بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ فوج کے ایک کرنل کی بیگم نے ستم ظریفی کے سے انداز میں کہا، ''اب میں مزید گھروں کی تزئین وآرائش نہیں کروں گی، جو پردے ایک گھر کے لیے موزوں ہوتے ہیں وہ دوسرے کے لیے نہیں اور چھوٹے قالین تو ہمیشہ غلط سائز یا رنگ کے ہوتے ہیں۔ اب میں صرف اپنی کار کی سجاوٹ پر توجہ دیتی ہوں''۔ اس سارے بہاؤ میں لاکھوں کی تعداد میں پیشہ ورانہ مہارت کے حامل محنت کش بھی شریک ہو گئے ہیں۔ ایک اور سطح پر ۷۵۰،۰۰۰ طلبہ اس عمل میں شریک ہو گئے ہیں جو اپنی آبائی ریاستوں سے دور رہ کر تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اس کے علاوہ وہ لاکھوں افراد بھی جو اپنے گھر سے تو دور ہیں لیکن اپنی آبائی ریاست میں رہ رہے ہیں۔ ان لاکھوں افراد کے لیے اور خاص طور پر ''مستقبل کے لوگوں'' کے لیے گھر وہیں

ہے جہاں وہ اسے حاصل کرلیں۔

خودکشیاں اور ''لفٹ'' لے کر جہاں نوردی کرنے والے

انسانوں کی زندگی میں اس طرح کے مد و جزر کے لمحات ان کے اندر، تمام طرح کے، شاذ توجہ طلب، ذیلی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ایسے کاروبار جن میں صارف کے گھر کے پتے پر چیزیں بھیجنا مقصود ہو، بے شمار ڈالر خرچ کرنے کا باعث بنتے ہیں کیونکہ ان پتوں کی فہرست کو تازہ رکھنا پڑتا ہے۔ یہی بات ٹیلی فون کمپنیوں پر صادق آتی ہے۔ ۱۹۶۹ء میں واشنگٹن ڈی سی کی ٹیلی فون بک میں ۱۸۸۵،۰۰۰ اندراج میں سے تقریباً نصف گزشتہ سال کے پتے تھے۔

اسی طرح تنظیموں اور اداروں کو اس بات پر خاصی پریشانی کا سامنا ہے کہ وہ معلوم کریں کہ ان کے ممبران کہاں ہیں۔ تعلیمی محققین کی ایک تنظیم نیشنل سوسائٹی فار پروگرامڈ انسٹرکشن (National Society for programmed Instructions) کے ایک تہائی ممبران نے صرف، حالیہ، ایک سال میں اپنے پتے تبدیل کیے۔ حتیٰ کہ دوستوں کو بھی ایک دوسرے کے بارے میں تازہ ترین معلومات اور پتے رکھنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ اسی حوالے سے کاونٹ لین فرینکو ریسپونی (Count lanfranco rasponi) کی شکایت کو ہمدردانہ انداز میں دیکھا جاسکتا ہے جو شکوہ کرتے ہیں کہ سفر اور نقل و حرکت نے ''معاشرے'' کو تباہ کردیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب کوئی سماجی موسم باقی نہیں رہا کیونکہ ایک وقت میں کوئی بھی شخص کسی بھی جگہ موجود نہیں۔ ماسوائے عدم وجود والوں کے۔ مسٹر کاونٹ نے مزید کہا، ''اس (صورت حال) سے پہلے اگر آپ کو رات کے کھانے کے لیے ۲۰ کی ضرورت ہوتی تھی، تو آپ ۴۰ کا کہتے تھے...... لیکن اب آپ ۲۰۰ کا کہیں گے''۔

ان تمام تر مشکلات کے باوجود، جغرافیے کے جور و جبر کا رد کیا جانا آزادی کی ایسی نئی صورت فراہم کرتا ہے جو لاکھوں افراد کی نشاط و مسرت کا ثبوت ہے۔ رفتار، نقل و حرکت حتیٰ کہ از سر نو آباد ہونا کئی لوگوں کے لیے مثبت تعبیر لے کر آئی۔ اس کا مطلب وہ نفسیاتی وابستگی ہے جو امریکا اور یورپ کے لوگ اپنی گاڑیوں کے لیے رکھتے ہیں...... مکانی آزادی کی تکنیکی تجسیم۔ تحرک کے حوالے سے تحقیق کرنے والے ارنسٹ ڈچر (Earnest Dichter) نے اپنے عہد میں فرائڈ سے منسوب ایک، حماقت پر مبنی، نظریے کو تو رد کردیا لیکن وہ اس وقت ایک صاحب بصیرت شخص محسوس ہوا جب اس نے تجویز دی کہ گاڑی ''حکمرانی کرنے کا ایک طاقتور ترین ہتھیار ہے'' جو مغرب سے تعلق رکھنے والے ایک عام شخص کو بھی میسر ہے۔ (زندگی کے) آغاز کے لیے

گاڑی ایک جدید عہد کی علامت ہے۔ ایک بالغ معاشرے میں داخل ہونے کے لیے سولہ سال کے ہونے کا 'لائسنس' ضروری ہے''۔

ان کے بقول دولت مند و متمول اقوام میں، ''اکثر لوگوں کے پاس کھانے کے لیے وافر ہوتا ہے اور ان کی رہائش کی جگہ بھی مناسب ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کے اس ہزار سالہ خواب کی تعبیر و تکمیل کے بعد اب وہ اپنے اطمینان کی مزید چیزیں تلاش کرنے نکلے ہیں۔ اب وہ سفر کرنا چاہتے ہیں، دریافت کرنا چاہتے ہیں یا کم از کم جسمانی طور پر آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ گاڑی ان کی نقل و حرکت کی ایک متحرک علامت ہے......'' کوئی بھی خاندان، کسی معاشی بحران کی صورت میں، جس چیز سے سب سے آخر میں جان چھڑانا چاہے گا وہ اس کی گاڑی ہے، اور کوئی امریکی والدین کسی نوخیز نوجوان کو سخت سے سخت سزا دے سکتے ہیں وہ اسے اس کی کار کے استعمال سے محروم رکھنا ہے۔

امریکی لڑکیوں سے جب یہ پوچھا گیا کہ وہ کسی لڑکے کے بارے میں سب سے ضروری چیز کیا سمجھتی ہیں تو انھوں نے فی البدیہہ جواب دیا ''کار''۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق انٹرویو دینے والی ۶۷ فی صد لڑکیوں نے ''کار'' کو ضروری چیز بتایا، اور البقوئرکیو این ایم سے تعلق رکھنے والے ایک ۱۹ سالہ لڑکے نے بڑی ادا سے جواب دیا، ''اگر کسی لڑکے کے پاس کار نہ ہو تو اس کے پاس لڑکی بھی نہیں ہونی چاہیے''۔ نوجوان طبقے میں کار کا جنون کس نوعیت کا ہے، اس بات کی غمازی وسکونسن (Wisconsin) سے تعلق رکھنے والے ایک سترہ سالہ لڑکے کی خودکشی کے المناک واقعے نے کی، اس لڑکے کا نام ولیئم نیبل تھا جسے تیز رفتاری کے باعث لائسنس منسوخ ہونے کی وجہ سے، اس کے والد نے گاڑی چلانے سے منع کردیا تھا۔ ۲۲ بور کی رائفل سے اپنے دماغ میں گولی مارنے سے پہلے اس لڑکے نے ایک نوٹ میں لکھا، ''لائسنس کے بغیر میں اپنی کار کے ساتھ ساتھ اپنی سرگرمیوں اور سماجی زندگی سے بھی محروم ہوگیا ہوں۔ لہٰذا میرے خیال میں اب تمام تر چیزوں کا خاتمہ کرلینا چاہیے''۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ تکنیکی اعتبار سے ترقی یافتہ دنیا کے لاکھوں نوجوان مشہور شاعر میرینیٹی (Marinetti) سے متفق ہیں، جس نے تقریباً نصف صدی قبل یہ آواز بلند کی تھی: ''ریس میں دوڑنے والی، شور کرتی ہوئی ایک کار پرواز والی ''فتح'' سے بہتر ہے''۔

مستقل سماجی عدالت سے آزادی کا تصور مستقل جغرافیائی حالت سے اتنا قریب تر ہے کہ جب جدید ترین صنعتی معاشرے میں رہنے والا شخص خود کو سماجی طور پر دبا ہوا محسوس کرتا ہے تو اس کی پہلی خواہش

دوبارہ نقل مکانی کرنا ہوتی ہے۔ اپنے ہی علاقے میں پرورش پانے والے کسان یا اپنے ہی خطے میں کوئلے کی کانوں میں محنت مزدوری کرنے والے ایک کان کن کے ذہن میں شاذ ہی اس قسم کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ میرے ایک طالب علم نے، جو امن کے دستوں میں اپنی خدمات سرانجام دینے کے لیے بڑی شد و مد سے جا رہا تھا، مجھے کہا، ''نقل مکانی کرنے سے بہت سے مسئلے حل ہو جاتے ہیں، لہٰذا یہ عمل جاری رکھیں!''۔ لیکن نقل مکانی کا عمل اس وقت اپنا بھرپور نتیجہ پیش کرتا ہے جب آپ اسے آزادی کے حصول کے لیے استعمال کریں، نہ کہ اس عمل کو بیرونی دباؤ کی وجہ سے کیا جائے۔ جریدے ''ریڈ بک'' (Redbook) کے مستقل خریداروں میں سے ۵۳۹ سے کیے گئے ایک سروے، کہ ان لوگوں نے گزشتہ سال میں اپنا پتہ کیوں بدلا، میں لوگوں نے مختلف وجوہات بیان کیں، ایسی وجوہات بیان کرتے ہوئے، ''پرانا گھر بڑے خاندان کے لیے چھوٹا پڑ گیا تھا''، ''خوشگوار آب و ہوا کے لیے'' محض دس فی صد نے یہ جواب دیا، ''ہم صرف تبدیلی چاہتے تھے''۔

نقل مکانی کرنے کی اس شدید خواہش کا مظاہرہ لفٹ لے کر جہاں نوردی کرنے والی ان خواتین نے کیا جو عمرانیاتی حوالے سے اپنا ایک قابل شناخت طبقہ بنانا چاہتی ہیں۔ لہٰذا برطانیہ سے تعلق رکھنے والی ایک نوجوان کیتھولک لڑکی نے ایک جریدے کے لیے اشتہارات اکٹھے کرنے کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر لفٹ لے کر ترکی کا سفر کرنے فیصلہ کیا۔ ہیمبرگ (جرمنی) میں لڑکیاں بکھر گئیں، پہلی لڑکی، جیکی، یونانی جزائر کا چکر لگا کر استنبول پہنچی اور پھر برطانیہ واپس آ گئی جہاں آ کر اس نے ایک اور جریدے میں ملازمت اختیار کی اور اس ادارے میں اس نے خاصے عرصہ اس لیے ملازمت کی کہ وہ اپنے اگلے سفر کے لیے سرمایہ اکٹھا کر سکے، اس کے بعد وہ واپس آئی اور ایک ویٹرس کی حیثیت سے کام کیا اور ایک ہوسٹس کے عہدے پر ترقی لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''مجھے یقین نہیں کہ میں برطانیہ میں ایک طویل مدت کے لیے رہوں''۔ ۲۳ سال کی عمر میں جیکی لفٹ لے کر سفر کرنے والی جہاں نورد بن گئی ہے، جس نے تھکاوٹ کے آثار کے بغیر ہی تمام یورپ کا دورہ کیا، اپنے پشتنی بیگ میں رکھے ہوئے ایک گیس پسٹل کے ساتھ وہ برطانیہ واپس آئی، چھ یا آٹھ ماہ قیام کیا اور پھر روانہ ہو گئی۔ اٹھائیس سالہ رتھ بھی گزشتہ کئی سالوں سے اسی قسم کی زندگی گزار رہی ہے، کسی ایک خاص مقام پر اس کا زیادہ سے زیادہ قیام تین سال کا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ لفٹ لے کر جہاں نوردی کرنا انتہائی شاندار ہے کیونکہ یوں لوگوں سے ملاقات کرنا ممکن ہوتا ہے اور ''آپ لوگوں کے ساتھ زیادہ وابستہ نہیں ہوتے''۔

خاص طور پر نوخیز لڑکیاں...... جو شاید اپنے گھریلو اور پابندیوں والے ماحول سے فرار چاہتی

ہیں...... جہاں نوردی کی بڑی شائق ہوتی ہیں۔ جریدے ''Serenteen'' کے ایک سروے سے ظاہر ہوا کہ نوخیز بچیوں میں سے ۴۰ء۲ فی صد ایسی ہیں جنھوں نے، سروے سے پہلے، موسم سرما میں کسی جگہ کا سفر کیا۔ ان تمام سفروں میں سے ۶۹ فی صد سفر بچیوں کو اپنی آبائی ریاست سے باہر لے گئے اور ۹ فی صد سفر بیرون ملک لے کر گئے۔ لیکن سفر کرنے کی لگن نوخیزی یعنی، تیرہ سے انیس سال کی عمر، سے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نیویارک کے ایک ماہر نفسیات بتھ (Beth) کی بیٹی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کی سہیلی نے یورپ کا سفر اختیار کیا ہے تو وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لے کر بولی: ''میں نو (۹) سال کی ہو گئی ہوں لیکن ابھی تک یورپ نہیں دیکھا''!

نقل و حمل کے اس مثبت رجحان کی عکاسی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امریکی لوگ سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا یونیورسٹی آف مشی گن میں موجود محققین اس نتیجہ پر پہنچے کہ لوگ سفر کرنے والوں کو ''خوش قسمت'' یا ''خوش'' سمجھتے ہیں۔ سفر کرنے سے مراد منصب کا حصول ہے، جس کی توضیح ان بے شمار امریکی مسافروں سے ہو جاتی جو اپنی سفری بیگوں پر ہوائی کمپنی کا دیا گیا ٹیگ، سفر سے واپس آنے کے خاصے عرصے بعد تک لگائے رہتے ہیں۔ ایک مشاہدے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ کسی شخص نے ایک خاص قسم کا کاروبار کیا ہوا ہے جس میں، منصب کے حوالے سے حساس، مسافروں کے لیے ہوائی کمپنی کے ٹیگ دھونے اور انھیں استری کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

اس کے برعکس گھریلو سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا باعث ہمدردی ہے نہ کہ مبارکباد کا موقع۔ ہر کسی نے نقل مکانی کرنے میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ جنھوں نے ایک مرتبہ نقل مکانی کی ان کی دوبارہ نقل مکانی کرنے کے امکانات ان لوگوں کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں جنھوں نے کبھی نقل مکانی نہیں کی۔ فرانسیسی ماہر عمرانیات الین ٹورین (Alain Touraine) اس بات کی یوں وضاحت کرتے ہیں، ''ایک مرتبہ اس قسم کی تبدیلی لا کر اور اپنے طبقے سے نسبتاً کم وابستگی رکھ کر، اس قسم کے لوگ دوبارہ نقل مکانی کرنے کے لیے دوبارہ تیار ہوتے ہیں......'' اور برطانیہ سے تعلق رکھنے والے، تاجر یونین کے عہدیدار آر کلارک نے کچھ عرصہ قبل منعقد ہونے والی ''افرادی قوت کی بین الاقوامی کانفرنس'' میں بتایا کہ کہ نقل مکانی کرنے کی عادت زمانۂ طالب علمی ہی میں پڑ جاتی ہے۔ انھوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ وہ لوگ جنھوں نے اپنے کالج کے دور کے ایام اپنے گھربار سے دور گزارے، وہ پابندیوں سے آزاد حلقوں کی طرف زیادہ نقل مکانی کر گئے بہ نسبت ان لوگوں کے جو تعلیم یافتہ نہیں تھے اور دستی محنت کش

تھے۔ مسٹر ٹورین مزید کہتے ہیں یہ (گھر سے دور) کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والے لوگ اپنی آئندہ زندگی میں نسبتاً زیادہ نقل و حمل کرتے ہیں بلکہ وہ لوگ اپنے بچوں میں بھی ایسے روّیے منتقل کرتے ہیں جو نقل مکانی میں معاون و مددگار ثابت ہوں۔ کچھ کارکنان کے لیے خاندانوں کی دوبارہ آبادکاری ایک دیرینہ ضرورت ہے، بے روزگاری کا تسلسل یا دیگر مشکلات، متوسط طبقے یا اعلیٰ طبقے کی نقل مکانی کی وجہ بہتر زندگی کا تسلسل بھی ہوسکتی ہیں۔ ان کے لیے سفر کرنا ایک لطف ہے اور باہر کی طرف سفر کرنے سے مراد ''اوپر'' کی طرف سفر کرنا لیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ان اقوام میں جو جدید ترین صنعتی دور کی طرف گامزن ہیں، اور ان لوگوں میں جو ''مستقبل'' کے لوگ ہیں، نقل مکانی زندگی گزارنے کا ایک طریق کار ہے، ماضی کی پابندیوں سے آزادی ہے اور ایک فراواں قسم کے مستقبل کی طرف بڑھتا ہوا قدم ہے۔

نقل مکانی کرنے والے غم زدہ لوگ

''غیر منقول'' لوگوں کا روّیہ ڈرامائی طور پر اس سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ ہندوستان یا ایران کا دیہی کاشتکار ہی ایسا نہیں جو اپنی تمام زندگی ایک جگہ گزارنا چاہتا ہے بلکہ یہ بات ابتدائی سطح کی صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں پر بھی صادق آتی ہے۔ ترقی یافتہ معیشتوں میں ٹیکنالوجی کی تبدیلی کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس سے، پہلے سے موجود صنعت پرانی ہوتی رہتی ہے اور راتوں رات نئی صنعت وجود میں آتی رہتی ہے جو لاکھوں غیر ہنرمند یا نیم ہنرمند محنت کشوں کو نقل مکانی پر مجبور کرنے کا باعث ہے۔ معیشت کی ضرورت بن جاتی ہے کہ افراد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوں اور مغربی ممالک کی بہت سی حکومتیں...... خاص طور پر سویڈن، ناروے، ڈنمارک اور امریکا...... خاصی بڑی رقم مختص کرتی تاکہ محنت کشوں کی حوصلہ افزائی کی جاسکے کہ وہ نئی ملازمتیں اختیار کریں اور اس تگ و دو میں اپنا گھر بار چھوڑیں۔ اپالاچیا کے کان کنان یا فرانسیسی صوبوں کے ٹیکسٹائل مزدوروں کے لیے یہ صورت حال انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بڑے شہروں میں کام کرنے والے وہ محنت کش بھی، جو شہروں کی وسعت کی وجہ سے متاثر ہوئے اور انھیں ان کے سابقہ گھروں کے قریب ہی دوبارہ آباد کر دیا گیا، اس کے باوجود، ان لوگوں کا پھیل جانا ان کے لیے اذیت کا باعث بنا۔

میساچوسٹس جنرل ہسپتال کے سینٹر فار کمیونٹی سٹوڈیوز سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر مارک فریڈ کہتے ہیں، ''ایسے لوگوں کے ردِعمل سے متعلق مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ انھیں دکھ

بھرے نقصان کا احساس ہوتا ہے، ایک طویل عرصے پر مبنی خواہش، عموماً مایوسی بھرا لہجہ، نفسیاتی، سماجی یا جسمانی کرب...... احساس بے بسی، گاہ بگاہے بلاواسطہ یا کسی دیگر طریقے سے غصے کا اظہار اور اپنی گم گشتہ جگہ کو مثالی چیز کے طور پر پیش کرنا وغیرہ۔'' مارک فریڈ مزید کہتے ہیں، ''ان لوگوں کا ردِعمل بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی وفات پا جانے والے شخص کے لیے۔''

فرانسیسی وزارت سماجی امور کے ماہر عمرانیات مونیق ویوٹ کہتے ہیں، ''فرانسیسی لوگ اپنے جغرافیائی پس منظر سے شدید وابستگی اور جذباتیت رکھتے ہیں۔ اپنے گھر سے ۳۰ یا ۴۰ کلومیٹر دور بھی کسی روزگار کے لیے وہ پس و پیش سے کام لیتے ہیں...... اور وہ اس طرح کا سفر کرنے سے خاصا گریز کرتے ہیں۔ محنت کشوں کی یونینز اس طرح کی نقل مکانی یا سفر کرنے کو 'دیس نکالے' کا نام دیتی ہیں۔

حتیٰ کہ کچھ تعلیم یافتہ اور صاحب ثروت لوگ بھی نقل مکانی کرنے پر افسردگی کا اظہار کرتے ہیں۔
ایک مصنف کلفٹن فیڈی مین، کنکٹیکٹ جیسے پرسکون مقام سے لاس اینجلس منتقلی کی داستان سناتے ہوئے کہتے ہیں، ''مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں عجیب و غریب قسم کے جسمانی اور ذہنی عارضوں کی بوچھاڑ کے سامنے کھڑا ہوں...... چھ مہینے کے عرصے میں میری بیماری نے مجھے تنگ کر کے رکھ دیا۔ ماہر علم الاعصاب نے تشخیص کے بعد میری بیماری کو ''ثقافتی دھچکے'' کا نام دیا......'' نہایت خوشگوار حالات کے حصول کے باوجود، کسی نئی جگہ پر آبادکاری، بہت سے پیچیدہ نفسیاتی الجھنوں کا باعث بن جاتی ہے۔ کینیڈا کے ایک مضافاتی علاقے کرسٹ وڈ ہائٹس (Crestwood Heights) کا مشاہدہ کرتے ہوئے ماہرین عمرانیات جے آر سیلے، آر اے سم اور ای ڈبلیو لو سلے کہتے ہیں: ''وہ تیزی جس کے تحت تبدیلی نے مکمل ہونا ہے اور وہ گہرائی جس تک تبدیلی نے شخصیت میں سرایت کرنا ہے، اس خاص چیز کی خاطر روّیے میں لچک اور شخصیت میں استحکام کی ضرورت ہے۔ مثالیت پسندی، کبھی کبھار گفتگو، غذائی عادات اور زیبائش و آرائش کی ترجیحات نسبتاً غیر متوقع پن سے سرانجام دی جانی چاہئیں اور غلطی سے مبرا خیالات کی روشنی میں روّیے تشکیل پانے چاہئیں۔''

وہ اقدامات جن کے اٹھائے جانے سے افراد اس طرح کی ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں، ان کا مشاہدہ یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا کے ماہر نفسیات جیمز ایس ٹائی پرسٹ نے کیا ہے، ''وہ افراد جنھوں نے ترک وطن کیا، ان میں ایک خاص قسم کا روّیہ دیکھنے میں آیا۔ ابتدائی طور پر فرد اپنے ''حال'' سے تعلق رکھتا ہے تاکہ وہ روزگار تلاش کرسکے، پیسہ کما سکے اور اپنی رہائش کے لیے جگہ کا بندوبست کرسکے۔ عمومی طور پر یہ اوصاف انتخاب

اور حد درجے کی نفسی حرکی سرگرمیوں سے جڑے ہوتے ہیں......''

ایک نئے ماحول میں جیسے ہی انسان کو اجنبیت یا ناموافقیت کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس ذرا بڑھ جاتا ہے، ایک نیا مرحلہ ''نفسیاتی دور'' شروع ہو جاتا ہے، اس نئے دور کی علامات میں بڑھتی ہوئی پریشانی اور دباؤ؛ بڑھتی ہوئی ذہنی مشغولیت، جسمانی مشغولیت اور جسمانی نوعیت کی علامات؛ گزشتہ سرگرمیوں کے برعکس معاشرے سے عمومی پس قدمی؛ اور کسی حد تک عداوت اور شکوک وشبہات''۔ اختلاف اور بے بسی کی حس شدت اختیار کر جاتی ہے اور یہ عرصہ بے آرامی اور اضطراب کی ایک کیفیت بن جاتا ہے۔ نسبتاً کم یا زیادہ بے چینی کا یہ عرصہ......ایک یا کئی ماہ تک برقرار رہ سکتا ہے''۔

یوں تیسرے مرحلے کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نئے ماحول سے ہم آہنگی کی ایک قسم ہے، ایک تہ نشینی کا عمل انتہائی شدت کے معاملات میں، ''شدید قسم کی اضطرابی کیفیت جس میں مزاج میں انتشار، دماغ میں غیر معمولی مواد کی افزائش اور حقیقت کے ساتھ ناطہ ٹوٹنا شامل ہے۔'' مختصر یہ کہ کچھ لوگ مناسب طریقے سے مطابقت نہیں کر سکتے۔

''گھر'' کے حصول کے لیے تحرک

اگر وہ لوگ مطابقت پذیری کر بھی لیں تو وہ ایسے نہیں رہتے جیسے پہلے تھے، کیونکہ ضرورت کے تحت کی گئی نئی آباد کاری پرانے تعلقات کے ایک پیچیدہ جال کو توڑ دیتی ہے اور نئے تعلقات کو جنم دیتی ہے۔ یہی تعطل ہے، جسے اگر ایک سے زائد مرتبہ دہرایا جائے تو ''عدم وابستگی'' کو جنم دیتی ہے اور اس کیفیت کا مشاہدہ کئی مصنفین نے ان لوگوں میں کیا ہے جو بہت زیادہ تغیر پذیر ہیں۔ جو شخص تغیر پذیر ہے وہ اتنی عجلت میں ہوتا ہے کہ اسے کسی ایک جگہ پر اپنی جڑیں جمانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ لہٰذا ہوئی کمپنی کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو یہ کہتے سنا کہ وہ اپنے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی سیاست میں عدم شرکت اور عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ، ''چند سال گزرنے کے بعد میں یہاں نہیں ہوں گا۔ آپ کئی بار پودا تو لگاتے ہیں مگر آپ اسے ایک تناور درخت بنتے نہیں دیکھ سکتے''۔

اس عدم شرکت یا، بہتر انداز میں کہیں تو، محدود شرکت، پر ان لوگوں نے تنقید کی ہے جو اس کے اندر ابتدائی نہج یا ابتدائی سطح کی جمہوریت کے روایتی نظریے سے روگردانی کے اثرات دیکھتے ہیں۔ تاہم وہ ایک اہم حقیقت کو بھی نظر انداز کرتے ہیں: اس بات کا امکان کہ وہ لوگ جو سماجی معاملات میں خود کو گہرائی کے ساتھ

شامل کرنے سے انکار کر دیتے ہیں وہ ان افراد کی نسبت زیادہ اخلاقی ذمہ داری کا ثبوت دے سکتے ہیں، بہ نسبت ان لوگوں کے جو سماجی معاملات میں بڑی گہرائی سے شامل ہو جاتے ہیں، اور پھر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہ آباد کار ٹیکس کی شرح میں تو اضافہ کر دیتے ہیں مگر کسی بانسری نواز کو پیسے دینے سے انکاری ہو جاتے ہیں کیونکہ انھوں نے کافی دیر تک وہاں رہنا نہیں ہوتا اور وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ وہ لوگ سکول سے کیے گئے معاہدے کو ختم کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ اور تمام تر نتائج بھگتنے کے لیے دیگر افراد کے بچوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کیا اس سے ایک اور بات سامنے نہیں آتی، کیا یہ ذمے داری کا زیادہ احساس نہیں کہ خود کو وقت سے پہلے ہی ناموزوں قرار دے دینا؟ تاہم اگر کوئی شخص خود کو شرکت سے باز رکھتا ہے، تنظیموں میں شرکت سے اجتناب برتتا ہے، ہمسایوں سے قریبی مراسم نہیں رکھتا اور، مختصراً یہ کہ، خود کو اس وابستگی سے دور رکھتا ہے کہ معاشرے یا خود کو جو چاہیے ہو؟ کیا افراد یا معاشرہ وابستگی کے بغیر چل سکتے ہیں؟

وابستگی کی کئی صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک اپنے مقام سے وابستگی ہے۔ ہم نقل مکانی کی خصوصیات سے اس وقت ہی بہرہ مند ہو سکتے ہیں اگر ہم پہلے کسی ایک جامد مقام کی مرکزیت کو روایتی انسان کی نفسیاتی تعمیر میں پہچان کر سکیں۔ اس مرکزیت کی عکاسی ہماری ثقافت میں کئی طریقوں سے عیاں ہے بے شک تہذیب کا آغاز زراعت سے ہی ہوا ہے۔ جس کا مطلب ہوا ایک جگہ رہائش اختیار کرنا اور کم از کم بے کیف قسم کی نقل مکانی اور قدیم حجری دور کے خانہ بدوشوں کی ہجرت کا اختتام۔ اور وہ خاص لفظ ''جڑیں''، جس پر ہم خاصی توجہ دیتے ہیں، آج کے عہد میں اس کی اصل زراعت سے ہے۔ تمدنی عہد سے پہلے کا ایک خانہ بدوش ''جڑوں'' سے متعلق ہونے والی گفت وشنید کو بمشکل ہی سمجھ پاتا ہے۔

''جڑوں'' سے متعلق نظریے کو ایک مخصوص رہائشی جگہ سے مشتق کر دیا گیا ہے اور اس سے عمومی مراد مستقل ''گھر'' ہی لی جاتی ہے۔ اس بے رحم، بھوک وافلاس سے بھرپور اور خطرناک دنیا میں، بے شک ایک جھونپڑا ہی کیوں نہ ہو، اس کی جڑیں زمین میں پیوست نظر آتی ہیں، اسے نسل در نسل وراثت میں دیا جاتا ہے، اور یہ کسی بھی شخص کا ''قدرت'' اور ''ماضی'' سے ساتھ رابطہ ہوتا ہے۔ گھر کو غیر منقولہ سمجھنے کو عطیہ سمجھا جاتا تھا اور ادب میں گھر کی اہمیت پر حد درجہ لکھا جا چکا ہے۔ ''آرام کرنے کی خاطر گھر کا حصول کریں کیونکہ گھر بہترین جگہ ہے''، یہ سطور سولھویں صدی سے تعلق رکھنے والے دانشور تھامس ٹوسر نے ایک ہدایت نامہ (Instruction to houses fory) میں لکھیں، اور اس میں بے شمار چیزیں ہیں جو کوئی بھی شخص، ایک تیکھی اور طنز آمیز ضلع

جگت کی رو سے کہہ سکتا ہے کہ ''گھریلو بیمار'' وہ لوگ ہیں جنھیں ثقافت میں جما دیا گیا ہے۔ ''کسی انسان کا گھر اس کا قلعہ ہوتا ہے......''، ''گھر جیسی کوئی جگہ نہیں......''، ''گھر پیارا گھر......'' گھر کی جذباتی تعریف کرنے کا سلسلہ، شاید، برطانیہ میں انیسویں صدی میں اس وقت عروج پر پہنچ گیا جب صنعت کاری دیہی لوگوں کی اکھاڑ پچھاڑ کر رہی تھی اور انھیں شہری زندگی گزارنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ غریب عوام کی نمائندگی کرنے والا شاعر تھامس ہڈ (Thomas Hood) ہمیں بتاتا ہے، ''تادمِ آخر ہر دل، ''گھر''، 'گھر' کی صدا دیتا رہتا ہے......'' اور ٹینی سن (Tennyson) نے تو بڑی سیری کے ساتھ ایک روایتی منظر کشی کی ہے:

ایک برطانوی گھر...... جس پر صبح کی ملگجی، مدھم روشنی پڑتی ہے
شبنم سے بھرے کھیت، شبنمی درخت،
نیند سے بھی نرم...... ہر چیز اپنی روایتی ترتیب میں موجود،
ایک روایتی، قدیمی، سکون کا بسیرا دکھائی دیتا ہے۔

ایک ایسی دنیا جسے صنعتی انقلاب نے مسلسل ہلا رکھا ہے، اور جس میں تمام تر چیزیں یقینی طور پر ''ترتیب'' میں موجود نہیں ہیں، گھر ہی لنگر کا کام کرتا ہے، طوفان میں ایک مستحکم مقام۔ اگر اور کچھ نہیں تو، کم از کم، اس کا شمار ایک ایسی چیز کے طور پر ہوتا ہے جو ایک جگہ ساکن ہے۔ صد افسوس! یہ شاعری تھی، حقیقت نہیں تھی اور یہ ان قوتوں کو قابو میں نہیں رکھ سکتی، جو انسان کو کسی ایک مستحکم جگہ سے آزاد کر دیں۔

جغرافیائی تقسیم کا خاتمہ

ماضی کا خانہ بدوش برفانی طوفانوں اور جھلسا دینے والی گرمی میں سفر طے کیا کرتا تھا، اس پر بھوک کا بھی غلبہ ہوتا تھا۔ مگر وہ اپنے ساتھ، جینس کو بھی چھپا سکنے والا خیمہ، اپنا کنبہ اور باقی قبیلے کے افراد، لے کر چلتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا سارا سماجی ماحول اور لوازمات ہوتے تھے، اور عموماً وہ مادی ڈھانچا بھی ہوتا تھا جسے ''گھر'' کہا جا سکے۔ اس کے برعکس آج کے عہد کے خانہ بدوش مادی ڈھانچے اور اشیاء کو پیچھے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ (یہ چیز ان جدول میں موجود اعداد و شمار کا حصہ بن جاتی ہیں جو ان کی زندگی میں منتقل ہونے منتقل ہونے والی اشیاء کی شرح کو ظاہر کرتی ہیں)۔ وہ لوگ اپنے کنبے کے علاوہ تمام تر اشیاء اور سماجی تناظر پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔

کسی جگہ کی اہمیت کو کم گردانا، اس کے ساتھ وابستگی میں کمی آنا مختلف طریقوں سے بیان کی جاتی ہے۔ اس کی حالیہ مثال امریکا میں ای وی (Ivy) لیگ کالجز کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ اپنے ادارے میں داخلوں کی

پالیسی میں جغرافیائی امور کو قابلِ لحاظ تصور نہیں کرتے گی۔ یہ ممتاز قسم کے تعلیمی ادارے درخواست دہندگان پر جغرافیائی قدغن لگاتے تھے، اور ان طلبہ کو، جان بوجھ کر، ترجیح دیتے تھے جن کے گھر کیمپس سے دور ہوتے تھے، اور یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ انتہائی بہترین تربیت یافتہ طالب علم تیار کریں گے۔ اس کی مثال یوں پیش کی جاتی ہے کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیانی عرصے میں ہاورڈ یونیورسٹی نے ان طلبہ کی تعداد نصف کر دی تھی جن کا تعلق نیو انگلینڈ اور نیویارک سے تھا۔ اسی یونیورسٹی کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے بتایا: ''ہم لوگ جغرافیائی تقسیم نامی اس چیز سے اپنا ہاتھ کھینچ رہے ہیں۔''

یہ بات اب عیاں ہو چکی ہے کہ کسی مقام کو اب تفریق کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔ لوگوں کے درمیان اختلاف یا امتیاز، اب، جغرافیائی پس منظر کی حد بندیوں سے مشتق نہیں۔ درخواست پر تحریر کردہ پتا عارضی بھی ہو سکتا ہے۔ بہت سے افراد ایسے ہیں جو کسی ایک جگہ، منفرد قسم کی علاقائی یا مقامی خصوصیات کے حصول کی خاطر، جم کر نہیں رہتے ییل (Yale) یونیورسٹی میں امور داخلہ کے ڈین (Dean) نے بتایا: ''ہم لوگ اب بھی اپنی بھرتی کرنے والی ٹیموں کو نیواڈا (Nevada) جیسی دور دراز جگہوں پر بھیجتے ہیں لیکن ہارلیم (Harlem)، پارک ایونیو (Park Avenue) اور کوئینز (Queens) کے علاقوں میں زیادہ تنوع پایا جاتا ہے''۔ اسی عہدیدار کے بقول ییل (Yale) یونیورسٹی نے طلبہ کے انتخاب کے لیے جغرافیائی حد بندی کا معیار عملی طور پر ختم کر دیا ہے۔ اور انہی کے مثنیٰ پرنسٹن یونیورسٹی کے ایک عہدیدار نے بتایا: ''ہم لوگ اس جگہ کو نہیں دیکھتے جہاں سے لوگوں کا تعلق ہوتا ہے بلکہ ایک بہتر قسم کا (خاندانی) پس منظر ہوتا ہے جس کی ہمیں تلاش ہوتی ہے۔''

نقل مکانی نے اس ''برتن'' کو اس کامل طریقے سے ہلا جُلا دیا کہ لوگوں کے درمیان امتیازات اب مقامات کی بنیادوں پر نہیں رہی۔ یونیورسٹی آف پینی سلوینیا کے پروفیسر جان ڈائیمین کہتے ہیں کہ مقامات سے وابستگی میں اس حد تک زوال آ چکا ہے کہ، آج کسی شہر یا ریاست سے وفاداری، کسی ادارے، پیشے یا کسی رضاکار ادارے سے وفاداری کی نسبت کمزور پڑ گئی ہے''۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشرتی طبقات اب مقامات کی بنیاد پر تعمیر کیے گئے سماجی ڈھانچوں (شہر، ریاست، قومیت یا پڑوس) کی بجائے اس قسم کے طبقات (ادارے، پیشہ، دوستی کا سلسلہ) پر تعمیر ہو گئے ہیں جو نقل پذیر، مادے کی طرح سریع الحرکت اور تمام تر عملی مقاصد کے لیے، کسی مستحکم مقام سے عاری ہے۔

تاہم وابستگی ظاہری طور پر تعلق کے دورانیے سے جڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ثقافتی لوازمات پر مبنی

متوقع دورانیوں کے سیٹ سے، پس ہم تمام نے جذباتیت کے ساتھ ان رشتوں کو اہمیت دینا سیکھ لیا جو ہمیں ''مُستقل یا نسبتاً دیرپا نظر آتے ہیں اور، جتنا ممکن ہو سکے، قلیل دورانیے کے تعلقات سے جذباتی وابستگی سے گریز کیا جائے۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ امیدیں بھی ہوا کرتی ہیں؛ گرمیوں کا رومانس ان میں سے ایک ہے۔ لیکن عمومی طور پر، تعلقات کے ایک وسیع تناظر میں باہمی ربط برقرار رہتا ہے۔ کسی مقام سے وابستگی کا تعلق نقل پذیری سے نہیں بلکہ نقل پذیری کے ساتھ جڑی ہوئی چیز سے ہے..... مقام کے ساتھ تعلقات کا مختصر دورانیہ۔

اس بات کو امریکا ہی کی ایک مثال سے ثابت کرتے ہیں، امریکا میں نیویارک سمیت ستر بڑے شہروں میں کسی ایک جگہ اوسط دورانیہ چار سال سے کم کا ہے۔ اس چیز کا موازنہ کسی مستحکم جگہ رہنے والے ایک دیہی شخص کی خصوصیات سے کریں۔ مزید یہ کہ از سرِ نو رہائشی آبادکاری بہت سے دوسرے، مقامات کے حوالے سے بننے والے تعلقات، اور ان کے دورانیوں کے تعین کرنے میں فیصلہ کن ہے، یعنی جب کوئی فرد اپنے گھربار سے ناطہ توڑتا ہے تو وہ اپنے پڑوس میں موجود تمام ''ذیلی'' چیزوں سے ناطہ توڑ لیتا ہے۔ وہ اپنی سپر مارکیٹ، گیس سٹیشن، بس سٹاپ اور حجام سمیت تمام تر چیزوں میں تبدیلی لے آتا ہے، لہٰذا گھر کے تعلق کے ساتھ ساتھ اس ''مقام'' سے وابستہ تمام چیزوں کے ساتھ تعلق بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا نقل مکانی کرنے کے بعد ہم اپنی مدتِ حیات میں نہ صرف زیادہ سے زیادہ مقامات کا تجربہ کرتے ہیں بلکہ، اوسطاً، ہر مقام کے ساتھ اپنا ربط مختصر سے مختصر عرصے کے لیے رکھتے ہیں۔

اس تمام صورتِ حال کی روشنی میں ہم نے واضح طور پر مشاہدہ کرنا شروع کر دیا کہ معاشرے میں موجود تیز رفتار دھکا فرد پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے، کیونکہ مقامات کے ساتھ انسانوں کے رشتوں کا مشاہدہ، چیزوں کے ساتھ اس کے تعلق کی قطع و برید کے مساوی ہے۔

ان دونوں معاملات میں کوئی بھی فرد مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے تعلقات تیزی سے قطع کرے۔ دونوں معاملات میں ناپائیداری کی سطح بلند ہوتی ہے۔ اور دونوں ہی معاملات میں اُسے زندگی کی چال تیز تر ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

☆☆☆

چھٹا باب

لوگ: معیاری انسان

ہر موسمِ بہار میں مشرقی امریکہ کے تمام حصوں میں موشِ شمالی[1] کی مانند، بڑے پیمانے پر ایک ہجرت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تنہا یا گروپوں کی صورت میں، سلیپنگ بیگوں (سیاحت کے لیے مختص بیگ)، کمبل اور پانی میں استعمال کے لیے سوٹوں سے لیس، مختلف امریکی کالجوں کے تقریباً ۱۵،۰۰۰ طلبہ، اپنے نصاب کو ایک طرف چھوڑ کر، عارضی قیام کا جذبہ لے کر فورٹ لوڈرڈیل (Fort Lauderdale) فلوریڈا کے گرم ساحل کا رخ کرتے ہیں۔ وہاں پر، تقریباً ایک ہفتے تک، سورج اور جنس کے پجاریوں کا اُمڈتا ہوا رش تیراکی کرتا ہے، نیند کے مزے لیتا ہے، ایک دوسرے سے مذاق کرتا ہے، بیئر پیتا ہے اور ریت میں بیٹھتا، لیٹتا اور اٹکھیلیاں کرتا ہے۔ اس کارگزاری کے بعد مختصر لباس میں ملبوس لڑکیاں اور ان کے ''مجسمے نما'' چاہنے والے اپنی اپنی کٹ (Kit) پیک کرتے ہیں اور ایک بڑے ''انخلا'' میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پھر کوئی بھی شخص اس تفریحی شہر میں داخل ہونے والی ہنگامہ خیز ''فوج'' کا خیر مقدم کرنے کے لیے بنائے گئے بوتھ سے لاؤڈ سپیکر میں ایسی آوازیں سن سکتا ہے: ''ایک کار، جس میں دو افراد سوار ہیں، وہ کسی ایک مسافر کو اٹلانٹا تک لے جا سکتی ہے......واشنگٹن تک لفٹ چاہیے......لوئیسول (Louisville) کے لیے دس بجے روانگی......'' چند گھنٹوں میں ہی اس ''ساحلی۔ اور۔ جشنِ مے نوشی'' کی پارٹی میں، ریت میں پڑے ہوئے بیئر کے خالی ڈبوں اور شراب کی خالی بوتلوں کے علاوہ، کچھ باقی نہیں رہتا، جبکہ مقامی تاجروں کے کیش رجسٹروں میں ۵ء۱ ملین ڈالر کی اشیاء اور ان کی فروخت کی تفصیلات درج ہوتے ہیں ...... یہ تاجر حضرات اس سالانہ ''لشکر کشی'' کو مخربِ اخلاق ''نعمت'' سمجھتے ہیں جو عوامی شعور کے لیے ایک خطرہ ہے جبکہ یہ نجی منافع کی ضمانت بھی ہے۔

جو چیز اس نوجوان طبقے کو اپنی طرف کھینچتی ہے وہ چمکتی دھوپ کے نہ قابو آنے والے جنون کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے۔ نہ ہی یہ صرف جنسی کشش ہے، کیونکہ یہ چیز دیگر مقامات پر بھی دستیاب ہے۔ بلکہ یہ، احساس

۱۔ قطبِ شمالی کے چوہے کی مانند جانور، جو خوراک کی تلاش میں ترکِ وطن کرتا ہے۔

ذمہ داری کے بغیر، آزادی کا احساس ہے۔ اس سہولت سے لطف اندوز ہونے والی نیویارک کی ایک ۱۹ سالہ لڑکی نے کہا: ''یہاں آ کر آپ کو یہ پریشانی نہیں رہتی کہ آپ کیا کر رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں کیونکہ، صاف بات یہ ہے کہ، آپ ان لوگوں کو آئندہ زندگی میں نہیں دیکھ پائیں گے۔''

فورٹ لوڈرڈیل (Fort Lauderdale) کا یہ ''تفریحی میلہ'' لوگوں کا ایک ایسا عارضی اجتماع ہے جو لوگوں کے درمیان عارضی تعلقات کا تنوع فراہم کرتا ہے۔ اور یہ ناپائیداری اور عارضی پن ہی ہے جو جدید ترین صنعت کاری کی طرف بڑھنے پر انسانی رشتوں کی خصوصیات فراہم کرتی ہے۔ جس طرح ہماری زندگی کے منظرنامے میں چیزیں اور مقامات آنے اور گزر جاتے ہیں بالکل اسی طرح لوگ بھی آتے اور چلے جاتے ہیں۔

''شمولیت'' کی قیمت

شہرکاری...... شہروں میں رہنے والوں کا طریق زندگی...... نے اس صدی کے آغاز سے عمرانیات پر اپنا قبضہ جمایا ہوا ہے۔ میکس ویبر نے اس بات کی نشاندہی کی کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شہروں میں رہنے والے لوگ اپنے گردونواح کے پڑوسیوں کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتے جیسا کہ ان کے لیے چھوٹے طبقات میں جاننا ممکن تھا۔ جارج سیمل (Simmel) اس نظریے کو ایک قدم آگے لے گئے جب انھوں نے بڑے انوکھے انداز میں، یہ اعلان کیا کہ اگر شہروں میں بسنے والا ہر فرد، اپنے ساتھ رابطے میں آنے والے ہر شخص کے ساتھ جذباتی وابستگی کا مظاہرہ کریں، یا اپنے ذہن میں ان لوگوں کی معلومات اکٹھی کرے تو وہ فرد ''اندرونی طور پر ریزہ ریزہ ہو جائے گا اور دماغی طور پر ایک ایسی صورت حال کا شکار ہو جائے جو ناقابل تصور ہے۔''

لوئس ورتھ (Louis wirth) نے شہری رشتوں کی پارہ پارہ نوعیت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا، ''اپنی مخصوص خصوصیات کے حوالے سے شہروں میں بسنے والے لوگ ایک دوسرے سے 'ٹکڑوں میں بٹے ہوئے کرداروں' کی صورت میں ملتے ہیں۔ ان لوگوں کا دوسروں پر انحصار دیگر افراد کی کامل سرگرمیوں کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہوتا ہے''۔ لوئس ورتھ اس بات کو یوں بھی کہتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ ہم ہر ملنے والے فرد کی مکمل شخصیت میں شامل ہو جائیں، ہم لوگ اس سے سطحی اور جزوی تعلق ہی رکھتے ہیں۔ ہم اپنی ضروریات کے تحت جوتوں کی کمپنی کے ایک سیل مین کی کارکردگی سے ہی غرض رکھیں گے: ہمیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے کہ اس کی بیوی الکحل کی عادی (شرابی) ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنے گردونواح کے لوگوں سے محدود نوعیت کے تعلقات استوار کرتے

ہیں۔ شعوری یا لاشعوری طور پر ہم بیشتر لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات رسمی سطح کے ہی رکھتے ہیں۔ جب تک ہم اس جوتوں کے سیل مین کے گھریلو مسائل سے روشناس نہ ہو جائیں، اس کی عمومی توقعات، خواب اور پریشانیاں وغیرہ، وہ شخص ہمارے لیے، اپنی ہی سطح کے کسی اور سیل مین کی طرح، قابل مبادلہ ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم نے انسانی تعلقات کے مقیاسی اصول کا اطلاق کیا ہے۔ ہم نے ایک ''تلف پذیر'' شخص بنالیا ہے: ''معیاری'' شخص۔

کسی بھی شخص سے کامل نوعیت کا تعلق رکھنے کی بجائے ہم اس کی شخصیت کے ایک معیاری جزو سے سروکار رکھتے ہیں۔ ہر شخصیت کو اس طرح کی ہزاروں ''معیاری'' اکائیوں کے روپ میں دیکھا جانا چاہیے۔ لہٰذا کوئی بھی شخص مجموعی حیثیت میں قابلِ مبادلہ نہیں، لیکن ''معیاری'' اکائیوں کی صورت میں ایسا ممکن ہے۔ چونکہ ہم نے مذکورہ شخص سے صرف جوتوں کا ایک جوڑا ہی خریدنا چاہتے ہیں، نہ کہ اس دوستی، محبت یا نفرت لہٰذا ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم اس کی شخصیت کی دیگر ''معیاری'' اکائیوں کا جائزہ لیں۔ ہمارا تعلق محفوظ حد تک محدود ہے۔ دونوں جانب محدود قسم کی ذمہ داری ہے۔ یہ تعلق رویوں اور روابط کی کچھ تسلیم شدہ چیزوں تک مشروط ہے۔ دونوں فریق، شعوری یا لاشعوری طور پر حدود اور قوانین کو سمجھتے ہیں۔ مشکلات اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب دونوں میں سے کوئی فریق ان جانی پہچانی حدود کو پار کرتا ہے، جب وہ کسی ایسی اکائی سے منسلک ہونے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے مطلوبہ مقصد سے ربط نہ رکھتی ہو۔

آج کے عہد کا عمرانیاتی اور نفسیاتی ادب اس بیگانگی کے لیے مختص ہے جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اس طرح کے تعلقات کے پارہ پارہ ہونے کا موجب ہے۔ وجودیت کے لیے کہی جانے والی باتوں میں سے بہت کچھ اور طلبہ کی بغاوت اس کی ملامت کرتی ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اپنے ساتھی افراد کے ساتھ، مناسب حد تک، وابستہ و منسلک نہیں ہوتے۔ لاکھوں نوجوان افراد ایسے ہیں جو ''کامل وابستگی'' کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔

اس مقبول عام نتیجے پر پہنچنے سے قبل کہ ''معیاریت'' بری چیز ہے، معاملے کی تہ تک پہنچنا مناسب ہوگا۔ ایک مشہور نظریہ ساز ہاروے کوکس (Harvey Cox) نے مسٹر سیمل (Simmel) کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ایک شہری ماحول میں رہ کر یہ کوشش کہ ہر شخص سے دلچسپی رکھی جائے اور منسلک ہوا جائے، کسی بھی شخص کو خود تباہی اور جذباتی کھوکھلے پن کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں، ''ایک شہری شخص کو دیگر افراد کے ساتھ غیر شخصی نوعیت کے تعلقات رکھنے چاہئیں۔ محض اس غرض سے کہ وہ ذہنی طور پر

آسودگی حاصل کر سکے...... اس کی زندگی ایک ایسے نقطے کی نمائندگی کرتی ہے جس کا درجنوں نظاموں اور ہزاروں افراد سے تعلق ہے۔ اس کی یہ صلاحیت کہ وہ ان تمام افراد میں سے چند کو گہرائی سے جانے، اسی شخص کے دیگر افراد سے تعلقات میں گہرائی کو کم کرنے کا موجب ہے۔ ایک شہری کے لیے ڈاکیے کی گپ شپ سننا ایک خوش گوار عمل تو ضرور ہے لیکن اسے اُن لوگوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی جن کے بارے میں ڈاکیا گفتگو کرنا چاہ رہا ہے''۔

''معیاریت'' پر کفِ افسوس ملنے سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ ہم خود سے یہ سوال کریں کہ کیا واقعی، انسان کی اس روایتی حالت میں واپس جانے کو ترجیح دیں گے جس میں انسان چند لوگوں کی مکمل شخصیت سے تعلق رکھتا تھا بجائے اس کے کہ وہ بے شمار لوگوں کی ''معیاری'' (جزوی) شخصیت سے سروکار رکھے۔ روایتی شخص جذباتیت سے اتنا پُر ہے اور اس حد تک رومانیت کا شکار ہے کہ ہم لوگ اکثر اس قسم کے ردِ عمل کے خدشات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہی لکھاری حضرات جو منتشر ہونے کے عمل پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں بیک وقت آزادی کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ تاہم وہ ان لوگوں کی عدم آزادی کو نظر انداز کرتے ہیں جو تعلقات کے ایک کامل سلسلے میں بندھے ہوتے ہیں کیونکہ کوئی بھی رشتہ باہمی مطالبوں اور اُمیدوں پر دلالت کرتا ہے۔ کسی بھی تعلق میں جتنی گہرائی اور شناسائی ہوگی دونوں فریق ان توقعات پر پورا اترنے کے لیے ایک دوسرے پر اتنا ہی دباؤ ڈالیں گے۔ یہ تعلق جتنا مضبوط اور کامل ہوگا اتنے ہی ''معیاری'' لوگ سامنے آئیں گے اور ہم لوگ اتنی ہی توقعات کریں گے۔

ایک معیاری تعلق میں طلب اور توقعات کی بڑی پابندی ہوتی ہے۔ جب تک جوتوں کا سیل مین اپنی محدود خدمات ہمارے لیے سرانجام دیتا رہے گا، وہ ہماری محدود توقعات پوری کرتا رہے گا، ہم اس بات پر زور نہیں دیتے کہ وہ ہمارے خدا پر یقین رکھتا ہے یا نہیں، وہ اپنے گھر پر صاف ستھرا رہتا ہے یا نہیں، ہماری سیاسی اقدار میں شریک ہے یا نہیں، اسی موسیقی اور غذا سے لطف اندوز ہوتا ہے یا نہیں جس سے ہم ہوتے ہیں۔

ہم اس شخص کو زندگی کے دیگر معاملات میں آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسے وہ شخص ہمیں آزاد چھوڑ دیتے ہیں...... جیسے وہ شخص ہمیں آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ ہم ملحد ہوں یا یہودی، مگر جنس پرست یا ہم جنس پرست، جان برچ یا کمیونسٹ۔ یہ بات ایک مکمل تعلق کے لیے درست نہیں اور کبھی بھی نہیں ہوسکتی۔ کسی خاص حد تک، منتشر ہونے کا عمل اور آزادی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

ہم میں سے تمام لوگ اپنی اپنی زندگی میں کچھ مکمل تعلق کے خواہاں ہوتے ہیں۔ لیکن اس بات کو فضول سمجھنا کہ ہم اس قسم کے تعلقات استوار نہیں کر سکتے ایک احمقانہ سوچ ہے۔ اور کسی ایسے معاشرے کو ترجیح دینا جس میں کسی فرد سے، محض چند لوگوں کے ساتھ، بجائے زیادہ لوگوں کے ساتھ ''معیاری'' قسم کے تعلق کے، کلی قسم کا تعلق ماضی کی قید میں واپس جانے کی خواہش ہے...... ایک ایسا ماضی جب افراد ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط بندھن میں بندھے ہوتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ سماجی رواجوں، جنسی سرگرمیوں، سیاسی اور مذہبی پابندیوں کا شکار تھے۔

یہاں کہنے کا مقصد یہ بھی نہیں کہ ''معیاری'' نوعیت کے تعلقات اپنے ساتھ کسی قسم کے خدشات لیے ہوئے نہیں اور یہ ممکنہ تمام دنیاؤں میں سب سے بہتر ہے۔ دراصل اس صورت حال میں شدید خطرات ہیں جن کی نشاندہی کرنے کی ہم کوشش کریں گے۔ تاہم، اب تک، ان تمام معاملات کی عوامی اور پیشہ ورانہ بحث ناقابل ارتکاز ہے۔ کیونکہ اس سارے عمل نے لوگوں کے درمیان ذاتی تعلقات کی باریک ابعاد کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے: ان کا دورانیہ۔

انسانی تعلقات کا دورانیہ

مسٹر ورتھ (Wirth) جیسے ماہرین عمرانیات نے انسانی تعلقات اور رشتوں کی عارضی نوعیت کو شہری معاشروں میں گزارنے کا مشورہ دیا ہے لیکن انھوں نے انسانی تعلقات کے مختصر دورانیوں کو دیگر رشتوں کے مختصر دورانیوں سے جوڑنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی انھوں نے یہ سعی کی کہ ان دورانیوں میں بڑھتے ہوئے زوال کو دستاویزی شکل دیں۔ جب تک ہم انسانی بندھوں کے عارضی کردار کا تجزیہ نہ کریں، اس وقت تک ہم جدید ترین صنعت کاری کے سفر کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔

انسانی رشتوں اور تعلقات کے اوسط دورانیے کی شرح میں آنے والی کمی اسی قسم کے رشتوں میں اضافے کا نتیجہ ہے۔ کسی شہر میں رہنے والا ایک فرد ایک ہفتے میں، اوسطاً، اس تعداد سے زائد لوگوں سے رابطہ کر لیتا ہے، جتنی تعداد میں دیہات میں رہنے والا زمیندار ایک سال یا، اپنی تمام زندگی، میں لوگوں سے ملتا ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ اس دیہی شخص کے کچھ لوگوں سے تعلقات بھی عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے افراد کی اکثریت ایسی ہے جس کے ساتھ اس کا تعلق ''کامل'' اور مکمل نوعیت کا ہوتا ہے۔ ایک شہری شخص کے پاس بھی افراد کا ایک ایسا گروہ ہوسکتا ہے جس کے ساتھ اس کا تعلق

طویل عرصے پر مشتمل ہو، لیکن وہ ایسے سینکڑوں بلکہ ہزاروں افراد سے بھی تعلق رکھتا ہے جنھیں اس نے صرف ایک یا دو مرتبہ ہی دیکھا ہو اور جو لوگ، بعد میں، گمنامی میں چلے گئے ہوں۔

ہم میں سے تمام لوگ انسانی تعلقات استوار کرتے ہیں، جیسے ہی ہم، متوقع دورانیوں کے ایک تعبیر کئے جاسکنے والے سیٹ کے ساتھ، دیگر لوگوں کی نسبت، زیادہ دیر چلیں گے۔ دراصل اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ دیگر لوگوں کے ساتھ تعلقات میں متوقع دورانیوں کے حوالوں سے تعلقات کی درجہ بندی کی جائے۔ ایک ثقافت سے دوسری ثقافت اور ایک شخص سے دوسرے شخص کی نسبت تعلقات کی نوعیت میں یقینی فرق ہوتا ہے۔ تاہم جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں اور ان کی آبادیوں میں روایتی طور پر مندرجہ ذیل قسم کی ترتیب پائی جاتی ہے:

طویل دورانیے کے تعلقات: ہم لوگ اپنے کنبے اور، کسی نہ کسی حد تک، قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ مدت العمر تعلقات رکھیں گے۔ اور ضروری نہیں کہ ان کی یہ خواہش ہمیشہ ہی پوری ہو، طلاق اور خاندانوں میں انتشار کی بڑھتی ہوئی شرح اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تاہم ہم لوگ اب بھی ''تادم حیات'' ازدواجی بندھن میں بندھے رہنے کے لیے شادی کرتے ہیں اور سماجی طور پر مثالی چیز مدت العمر بندھن ہی ہے۔ اس ناپائیدار معاشرے میں اس طرح کی مناسب یا حقیقت پسندانہ توقع رکھنا بحث طلب امر ہے۔ بہرحال حقیقی بات یہی ہے کہ خاندانی رشتوں کے بارے میں یہی امید رکھی جاتی ہے کہ وہ طویل المیعاد ہوں، چاہے مدت العمر نہ بھی ہوں، اور جو شخص اس قسم کے تعلقات توڑ لیتا ہے اس کے ساتھ ایک خلش وابستہ ہو جاتی ہے۔

اوسط دورانیے کے تعلقات: اس درجے میں چار قسم کے تعلقات آتے ہیں۔ متوقع دورانیوں میں بتدریج کم ہوتی ہوئی مدت کے حوالے سے، ان رشتوں میں دوستوں، پڑوسیوں، روزگار کے ساتھی، ایک ہی چرچ کے ساتھی، کلب اور رضاکار تنظیموں کے ارکان شامل ہیں۔

روایتی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ، بالعموم، دوستیوں کو، خاندانی رشتوں کی طرح، قائم و دائم رہنا چاہیے۔ ثقافتی طور پر ''پرانے دوستوں'' کی بڑی قدر و قیمت ہے اور دوستی ترک کرنے والے کو کچھ الزامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم ایک خاص قسم کی دوستی، شناسائی نسبتاً کم دیرپا شمار کی جاتی ہے۔

پڑوسی کی حیثیت سے رشتے اب زیادہ طویل المیعاد تصور نہیں کیے جاتے۔ جغرافیائی ردوبدل کی

شرح بہت زیادہ ہے۔ ان رشتوں کی طوالت کی توقع اس وقت کی جاتی ہے جب کوئی فرد کسی ایک مقام پر مستقل طور پر رہتا ہے کیونکہ یہ وقفہ چھوٹے سے چھوٹا ہوتا جارہا ہے۔ کسی پڑوسی سے ناطہ ٹوٹ جانا دیگر مشکلات کا موجب تو ہوسکتا ہے مگر یہ ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں۔

اپنے روزگار کے ساتھیوں کے ساتھ تعلقات میں دوستی کا معاملہ مختلف ہوتا ہے اور یہ پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات پر کم ہی غالب آتے ہیں۔ روایتی طور پر، خاص طور پر اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد کے درمیان، پیشہ ور اور تکنیکی افراد کے درمیان تعلق دیر تک قائم رہنے کی امید کی جاتی ہے۔ تاہم یہ توقع اور امید بھی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے اور ہم اس چیز کا مشاہدہ کریں گے۔

کسی ایک تنظیم کے ارکان...... لوگوں کے ساتھ کسی گرجا گھر یا شہری تنظیم، سیاسی پارٹیوں اور اسی طرح تعلقات...... کبھی کبھار دوستی میں تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن جب ایسا عملی طور پر ہوتا ہے تو اسی نوعیت کے روابط دوستی، پڑوسیوں سے تعلقات یا ساتھی کارکنان کی نسبت جلد ختم ہونے والے تصور کیے جاتے ہیں۔

مختصر دورانیے کے تعلقات: اگرچہ تمام نہیں، لیکن اکثر روزگار سے متعلق تعلقات اس درجہ بندی میں آتے ہیں۔ ان میں سیلز کلرکوں، رسدی سلسلوں سے مربوط افراد، گیس سٹیشنوں پر کام کرنے والے افراد، گوالے، حجام وغیرہ شامل ہیں۔ اس میں ردوبدل کی شرح زیادہ ہے اور اگر کوئی شخص اس قسم کے تعلقات ختم کرے تو اس میں کسی قسم کی شرمساری نہیں ہوتی۔ ان پیشوں میں کچھ استثنا بھی ہیں جیسے ڈاکٹر، قانون دان اور اکاؤنٹنٹ جن کے ساتھ تعلقات دیرپا ہونے کی امید ہوتی ہے۔

یہ درجہ بندی حتمی اور سکہ بند نہیں۔ ہم میں سے اکثر افراد دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات روزگار کے حوالے سے تعلقات دوستی، پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہم میں سے بہت سے افراد اپنی نجی زندگی میں دیرپا تعلق استوار کرلیتے ہیں۔ شاید ہم کافی عرصے کسی ایک ڈاکٹر کے پاس جارہے ہوں یا ہم اپنے کسی کالج کے دوست سے قریبی تعلق استوار کرلیں۔ اس طرح کے معاملات غیرمعمولی ہوتے ہیں، لیکن ہماری زندگی میں ان کی تعداد انتہائی کم ہوتی ہے۔ ان کی مثال لمبی شاخوں والے پھولوں کی سی ہے جو کسی گھاس کے میدان پر لگے ہوں، جس کی ہر شاخ ایک مختصر دورانیے کے تعلق کو ظاہر کرتی ہے، ایک عارضی تعلق۔ یہ ان تعلقات کی پائیداری ہے جو انھیں قابل توجہ بناتی ہے۔ اس طرح کے مستثنیات اصول کو زائل نہیں کرتے۔ وہ اس کلیدی اصول کو تبدیل نہیں کرتے کہ، ایک مسلسل عمل کے دوران، ہماری زندگی میں باہمی

تعلقات کا دورانیہ مختصر سے مختصر عرصے کا ہوتا جا رہا ہے۔

عجلت میں خیر مقدم

شہر کاری کا تیزی سے بڑھتا ہوا رجحان دباؤ کے عمل میں سے ایک ہے جو ہمیں انسانی تعلقات کی ناپائیداری کی طرف لے جا رہا ہے۔ جس طرح پہلے بیان کیا گیا ہے شہر کاری افراد کے بہت بڑے اژدہام کو انتہائی قریب لے آتی ہے اور یوں بننے والے تعلقات کی اصل تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ عمل جغرافیائی نقل پذیری کی وجہ سے نافذ ہوتا ہے اور اس کا بیان گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔ جغرافیائی نقل پذیری ہماری زندگیوں میں نہ صرف مقامات کے بہاؤ کو تیز تر کرتی ہے بلکہ افراد کے بہاؤ کو بھی تیزی بخشتی ہے۔

سفر کے عمل میں اضافے کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھی مسافروں، ہوٹل کلرکوں، ٹیکسی ڈرائیوروں، ہوائی کمپنی میں سیٹیں بک کرانے والوں، بار برداروں، خاتون ملازماؤں، ویٹروں، اپنے ساتھ کام کرنے والوں، دوستوں کے دوستوں، کسٹم حکام، ٹریول ایجنٹوں اور دیگر بے شمار افراد کے ساتھ ناپائیدار اور سطحی تعلقات قائم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کسی فرد کی نقل پذیری جتنی زیادہ ہوگی اس کے مختصر، بالمشافہ تفاعل، انسانی تعلقات، مختلف لوگوں کے ساتھ تعلق کی نوعیت جزوی اور، سب سے بڑھ کر، وقت کی قید میں دبے ہوئے ہوں گے۔ (اس طرح کے تعلقات ہمیں فطری اور غیر اہم نظر آتے ہیں۔ ہم اس بات پر غور کرنے کے لیے شاذ ہی وقت نکالتے ہیں کہ اس ''سیارے'' پر موجود ۶۶ بلین افراد جو ہم سے پہلے گزرے، ان میں سے کتنے افراد کو، اپنی زندگیوں میں، انسانی رشتوں میں ناپائیداری کی اس شرح کو دیکھنے کا موقع ملا۔)

اگرچہ سفر تعلقات کی تعداد بڑھا دیتا ہے...... عموماً خدمات فراہم کرنے والے افراد یا دیگر...... رہائشی نقل مکانی بھی ہماری زندگیوں میں لوگوں کا تنوع لے کر آتی ہے۔ نقل مکانی تمام تر درجوں میں تعلقات کو ختم کر دینے کا باعث بنتی ہے۔ ایک نوجوان آبدوز انجینئر جس کا تبادلہ میئر آئی لینڈ (Mare Island) کیلی فورنیا سے نیو پورٹ نیوز ورجینیا کر دیا گیا ہے، وہ صرف اپنے خاص کنبے کو ہی ساتھ لے کر جائے گا۔ وہ اپنے والدین، بیگم کے رشتہ دار، پڑوسیوں، خدمات فراہم کرنے والوں، تاجروں، اپنی ملازمت کے ساتھیوں اور دیگر افراد کو پیچھے ہی چھوڑ جائے گا۔ اس کے مراسم میں بھی کمی آ جائے گی۔ نئی جگہ پر رہائش اختیار کرنے کے بعد اس کی بیگم اور بچے ہی (لوگوں سے) نئے (اور ایک مرتبہ پھر ناپائیدار) تعلقات کا آغاز کریں گے۔

یہاں پر ایک شادی شدہ، خاتون کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے گزشتہ سترہ سالوں میں گیارہ مرتبہ

نقل مکانی کی، وہ اس عمل کو یوں بیان کرتی ہیں: ''جب آپ کسی جگہ رہتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے گردونواح میں تبدیلیوں کا ایک سلسلہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کسی دن ایک نیا ڈاکیا ڈاک لے کر آتا ہے۔ چند ہفتوں بعد سپر مارکیٹ کے کاؤنٹر پر بیٹھنے والی لڑکی غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ نئی لڑکی آ جاتی ہے۔ پھر آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ گیس سٹیشن پر کام کرنے والا مکینک بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ اسی دوران کوئی پڑوسی آپ کے ساتھ والے گھر سے شفٹ ہو جاتا ہے اور ایک نیا خاندان وہاں آ جاتا ہے۔ یہ تبدیلیاں ہر وقت ہوتی رہتی ہیں، لیکن وہ بتدریج عمل میں آتی ہیں۔ لیکن جب آپ نقل مکانی کرتی ہیں تو آپ کو تمام تر بندھن اور تعلق یکسر توڑنے پڑتے ہیں اور ان کا آغاز نئے سرے سے کرنا ہوتا ہے۔ آپ کو بچوں کے علاج کے لیے نیا ڈاکٹر تلاش کرنا پڑے گا، ایک نیا دندان ساز، کار کے لیے ایک نیا مکینک جو آپ کے ساتھ چالاکی نہ کرے، آپ اپنی تمام تنظیموں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور نئی میں شمولیت اختیار کرتے ہیں''۔ یہ پہلے سے برقرار تعلقات کے تمام سلسلوں کو معدوم کر دینے کی صورت ہے جو نقل مکانی کو بعض افراد کے لیے نفسیاتی الجھن کا باعث بناتی ہے۔

کسی بھی فرد کی زندگی میں یہ چکر جتنی تیزی سے چلے گا، اس سے منسوب تعلقات کا دورانیہ، یقینی طور پر، مختصر سے مختصر ہوتا چلا جائے گا۔ آبادی کے بڑے حصوں میں یہ عمل اتنی تیزی سے وقوع پذیر ہو رہا ہے کہ، انسانی تعلقات کے حوالے سے، وقت سے وابستہ روایتی تخیلات حیران کن حد تک تبدیل ہو رہے ہیں۔

روزنامہ نیویارک ٹائمز میں چھپنے والی ایک کہانی کے مطابق، ''فروگ ٹاؤن روڈ (Frogtown Road) میں ہونے والی ''پینے پلانے'' والی ایک پارٹی میں یہ بات چل نکلی کہ اس پارٹی میں موجود افراد کتنے عرصے تک نیو کانان (New Canaan) میں مقیم رہے۔ کسی بھی شخص کے لیے یہ بات باعث حیرت نہیں تھی کہ جو جوڑا وہاں سب سے زیادہ عرصے کے لیے مقیم رہا اس کا مدت قیام پانچ سال تھا''۔ ایسے زمانوں اور مقامات پر جو سست رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہے ہیں پانچ سال کا عرصہ کسی خاندان کے نئے طبقے میں جا کر آباد ہونے میں اور وہاں جا کر ''قبولیت'' کا مرحلہ عبور کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ آج کے عہد میں کسی نئی جگہ جا کر آباد ہونے اور وہاں روزمرہ زندگی کے لیے درکار وقت انتہائی مختصر ہو چکا ہے۔

لہٰذا ہمارے پاس امریکی دیہی علاقوں میں پیشہ ورانہ خدمات کے حوالے سے ''خیر مقدم'' کرنے کے لیے ایک ''ویگن'' سروس ہے جو اس بڑھتے ہوئے عمل میں معاون و مددگار ہونے کے لیے اس خطے میں موجود بڑے بڑے سٹوروں اور ایجنسیوں کو متعارف کروانے کا کام کرتی ہے۔ خیر مقدم کرنے والی اس ویگن کا

ملازم۔ جو عمومی طور پر ادھیڑ عمر کی ایک خاتون ہوتی ہے...... نئے منتقل ہونے والے افراد کے پاس جاتی ہے۔ اس طبقے سے متعلق سوالات کرتی ہے، تعارف نامے انھیں دے آتی ہے، اور، کبھی کبھار معمولی قسم کے گفٹ سرٹیفکیٹ بھی، جو مقامی سٹوروں پر استعمال ہو سکتے ہیں۔ چونکہ خدمات کے شعبے میں ایسا کرنے سے صرف تعلقات استوار کرنے پر ہی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور یہ صورت اشتہاری مہم سے ذرا مختلف نوعیت کی ہے لہٰذا اس ''ویگن'' کی افادیت انتہائی شاندار رہتی ہے۔

نئے پڑوسیوں اور دوستوں سے مربوط ہونے کے عمل میں کچھ لوگوں کی موجودگی تیزی لانے کا باعث ہوتی ہے...... یہ لوگ عموماً طلاق یافتہ خواتین یا بڑی عمر کی غیر شادی شدہ خواتین ہی ہوتی ہیں...... جو اس طبقے میں، ایک رسمی ''رابطہ کاری'' کا کام کرتی ہیں۔ اس طرح کے افراد ترقی یافتہ دیہی علاقوں اور ہاؤسنگ سکیموں میں پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی افادیت رٹگرز (Rutgers) یونیورسٹی کے ماہر عمرانیات رابرٹ گٹمین نے بیان کی ہے جو اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس قسم کا ''رابطہ کار'' چونکہ معاشرے کے مرکزی دھارے سے ہٹا ہوا ہوتا/ ہوتی ہے لہٰذا وہ نئے آنے والوں کا رابطہ کروا کر تسکین محسوس کرتا ہے/کرتی ہے۔ وہ اس کام کا آغاز لوگوں کو پارٹیوں اور تقریبات میں مدعو کر کے کرتے ہیں۔ نئے آنے والوں کے لیے یہ بات بڑی حوصلہ افزا ہوتی ہے کہ اس جگہ کے ''پرانے'' رہائشیوں۔ بہت سے طبقات میں پرانے رہائشیوں کا مطلب ہے دو سال پرانے رہائشی...... میں سے کوئی شخص انھیں مدعو کرنا چاہتا ہے۔ نئے آنے والوں کو تاسف کا احساس اس وقت ہوتا ہے کہ ''رابطہ کار'' بذات خود ''اجنبی'' خاتون ہے، جس پر، بعض معاملات میں، وہ لوگ اس سے قطع تعلق ہو جاتے ہیں۔

گٹمین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا، ''رابطہ کار کے لیے، خوش قسمتی سے، نئے آنے والوں کو لوگوں سے متعارف کروانے کے بعد سے ہی، اور نئے آنے والے کے لیے، رابطہ کار سے قطع تعلق کرنے سے پہلے ہی، اس ماحول میں نئے لوگوں کی آمد ہو جاتی ہے اور وہ ان لوگوں کا ہاتھ، دوستی کے لیے، ایک مرتبہ پھر تھام لیتا ہے/ لیتی ہے۔''

معاشرے میں موجود دیگر افراد بھی تعلقات بننے کے عمل میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا، گٹمین نے مزید بتایا، ''مستفیض ہونے والے افراد بتاتے ہیں، انھیں مکان کا قبضہ لینے سے قبل، پراپرٹی ڈیلرز نے پڑوسیوں سے متعارف کروایا۔ کچھ معاملات میں پڑوس میں رہنے والی خواتین نے اپنی پڑوسی خواتین کو مدعو کیا،

یہ دعوت کبھی انفرادی طور پر اور کبھی اجتماعی طور پر۔ پڑوس میں بسنے والی خواتین، یا ان کے شوہر معمول کے کام کرتے ہوئے، باغیچہ کی دیکھ بھال کرتے ہوئے، گھر کے باہر صفائی کرتے ہوئے یا بچوں کو بہلاتے ہوئے، ایک دوسرے سے متعارف ہو جاتے ہیں۔ اور یقینی طور پر کچھ باقاعدہ ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں جن کا اہتمام بچے کرتے تھے، جو اس انسانی آبادی کے نئے ماحول میں پہلے لوگ ہیں جنھوں نے ایک دوسرے سے تعلقات استوار کیے۔''

کسی بھی فرد کو اس طبقے میں متعارف کروانے کے لیے مقامی تنظیمیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ بات جدید ہاؤسنگ سکیموں کی بجائے دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے مالک مکان حضرات پر بہتر صادق آتی ہے۔ گرجا گھر، سیاسی پارٹیاں اور خواتین کی تنظیمیں بہت سے ایسے تعلقات استوار کر دیتی ہیں جن کو نئے آبادکاروں کی ضرورت رہتی ہے۔ گٹمین کے بقول، ''کبھی کبھار نئے آنے والوں کو کوئی پڑوسی کسی رضا کار تنظیم کے بارے میں بتا دیتا ہے اور اس نئے آنے والے کو پہلی میٹنگ میں لے جاتا ہے؛ لیکن ان معاملات میں بھی نئے آبادکار کو کسی سے منسلک ہونے کے لیے ابتدائی گروپ خود تلاش کرنا ہوگا''۔

اس بات کا احساس کہ کوئی بھی نقل مکانی آخری نہیں، یعنی کسی بھی سڑک پر خانہ بدوش، اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ اکٹھے ہوں گے، نقل مکانی کریں گے اور ان تعلقات کی تشکیل کے خلاف کام کریں گے جو ''معیاری'' سے ذرا بڑھ کر ہیں، اور اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر تعلقات یکسر ختم ہو جائیں تو انھیں زندگی میں نئے سرے سے شامل ہو جانا چاہیے۔

تاہم اگر تعلقات کے آغاز کا دورانیہ وقت کے حوالے سے مختصر ہے، تو رخصت ہونے۔ تعلقات کو یکسر ترک یا ختم کرنے کا وقت بھی ''جلد'' لایا جا سکتا ہے۔ یہ بات روزگار کے حوالے سے تعلقات کے بارے میں درست ہے کیونکہ یہ تعلقات کسی واضح سمت کی طرف گامزن نہیں، لہٰذا ان کا آغاز اور اختتام فوری ممکن ہے۔ ایک دیہی علاقے کے ایک فوڈ سٹور کے مینجر نے اسی طرح کے تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے کہا، ''یہ لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، کسی دن آپ انھیں یاد کرتے ہیں اور پھر آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈلاس (Dallas) چلے گئے ہیں۔'' بزنس ویک میں کالم لکھنے والے ایک مصنف نے اس بات کا مشاہدہ کیا، ''واشنگٹن ڈی سی میں خردہ فروشوں کو اپنے صارفین سے طویل المیعاد اور مضبوط تعلقات استوار کرنے کا موقع شاذ ہی ملتا ہے۔'' نیو ہیوکمو ٹرلائن کے ایک کنڈکٹر نے بتایا، ''مجھے ہر روز نئے سے نئے چہرے نظر آتے ہیں۔''

بچے بھی انسانی تعلقات کی ناپائیداری سے جلد آگاہ ہوجاتے ہیں۔ ماضی کی آیا والا کام اب بے بی سسٹر (Sitter) سروس کے سپرد کردیا گیا ہے جو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ہر مرتبہ نئی خاتون کو بھیج دیتے ہیں۔ اور اسی قسم کے، وقت کی قید میں جکڑے ہوئے، تعلقات کی عکاسی خاندانی ڈاکٹر کے نظریے کے ختم ہونے سے سامنے آئی ہے۔ ایک روایتی، خاندانی ڈاکٹر، پرائیویٹ پریکٹس کرنے والا، کسی ماہر طبیب کی سی مہارت تو نہیں رکھتا تھا لیکن یہ سہولت تھی کہ وہ کسی ایک خاص مریض کو پیدائش سے لے کر وفات تک دیکھ سکتا ہے۔ آج کے دور میں مریض کسی جگہ مسلسل نہیں جاتا۔ وہ کسی طبیب کے پاس جا کر ایک طویل المیعاد تعلق استوار کرنے کی بجائے، بے شمار ماہر طبیبوں سے مشورہ کرتا ہے، ان تعلقات کو بار بار تبدیل کرنے کی وجہ سے وہ ہر مرتبہ ایک نئے طبقے میں داخل ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ کسی ایک رشتے میں قائم رہتے ہوئے بھی تعلقات مختصر سے مختصر ہوگئے ہیں لہٰذا ''کرسٹ وڈ ہائیٹس'' (Crestwood Heights) میں لکھنے والے، ماہرین اور عمومی شخص کے معائنے پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''کسی ایک ملاقات کا مختصر دورانیہ، ان کے تعلقات کی نوعیت، جو دونوں فریقوں کے حوالے سے ایک مصروفیت، وقت کی قیود میں جکڑی ہوئی زندگی، جس کا مطلب ہے کہ کوئی بھی پیغام کسی ایک مختصر سے طبقے ہی میں گردش کرے گا اور ان میں سے بہت افراد نہیں ہوں گے......'' مریض اور ڈاکٹر کے اس تعلق اور اس کی نوعیت، اس کے منتشر ہونے کے عمل سے صحت پر ہونے والے اثرات اور بڑی سنجیدگی سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

مستقبل میں دوستی

جتنی مرتبہ بھی خاندان نقل مکانی کرتا ہے وہ بہت سے دوستوں اور شناسا لوگوں سے تعلقات میں تبدیلی لاتا رہتا ہے۔ پیچھے رہ جانے والے بتدریج بھلا دیئے جاتے ہیں۔ علیحدگی تمام تر رشتوں ناطوں کو ختم نہیں کرتی۔ ہم قدیمی مقام سے تعلق رکھنے والے ایک یا دو دوستوں سے روابط برقرار رکھتے ہیں اور ہم اپنے عزیز رشتہ داروں سے بھی خال خال تعلقات رکھنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن ایک مرتبہ ہی کی نقل مکانی میں تعلقات یکسر تبدیل ہوجاتے ہیں۔ پہلے پہل زور وشور سے خطوط کا تبادلہ ہوتا ہے۔ شاذ و نادر ملاقاتیں اور ٹیلی فون کالوں کے تبادلے بھی ہوتے ہیں، مگر بتدریج ان کی شرح کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ بالآخر یہ سلسلہ بند ہوجاتا ہے۔ ایک دیہی برطانوی علاقے کے رہنے والے شخص نے لندن چھوڑنے کے بعد کہا: ''آپ اسے (لندن کو) فراموش نہیں کرسکتے۔ باوجود اس کے کہ آپ کا خاندان بھی کہیں اور رہ رہا ہو۔

پلمسٹیڈ (Plumstead) اور ایلتھام (Eltham) میں ہمارے کئی دوست ہیں، لیکن ہم لوگ اختتام ہفتہ پر اب بھی وہاں (لندن) جاتے ہیں۔ لیکن آپ اس سلسلے کو ہمیشہ برقرار نہیں رکھ سکتے''۔

جان بارتھ (John Barth) نے دوستیوں میں آنے والی تبدیلیوں اور اس حس سے متعلق اپنے ناول ''دی فلوٹنگ اوپرا'' (The Floating Opera) کے ایک پیراگراف میں رکھا: ''ہمارے دوست ماضی میں کہیں گُم ہوجاتے ہیں؛ پھر ہم ان میں گھل مل جاتے ہیں؛ پھر وہ تیر کر آگے آجاتے ہیں، پھر ہم افواہوں اور سُنی سنائی باتوں پر یقین کرتے ہیں یا ان سے رابطہ توڑ دیتے ہیں؛ وہ دوبارہ پیچھے چلے جاتے ہیں، پھر ہمیں اپنی دوستی بحال کرنی پڑی ہے...... تازہ رکھنی پڑتی ہے۔ یا اس نتیجے پر پہنچا پڑتا ہے کہ ہم اور وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کو سمجھ جائیں''۔ ان کی اس ان کہی تجویز میں واحد نقص یہ ہے کہ ان کے نزدیک وہ بہاؤ جس پر دوستی قریب آتی اور دور ہوتی ہے وہ سُستی اور بے مقصدیت پر مبنی ہے آج کے دور میں یہ بہاؤ تیزی اختیار کر گیا ہے۔ اب دوستی اس چھوٹی کشتی کی مانند ہے جو تبدیلی کے دریا کی تیز رفتار لہروں پر چل رہی ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی میں افرادی قوت کی نقل پذیری کے شعبے سے منسلک پروفیسر ایلی گنز برگ (Eli Ginzberg) کہتے ہیں، ''بہت جلد تمام لوگ، اس ملک کی ایسی قوم بن جائیں گے جو بڑے شہروں میں رہنے والی ہوتی ہے جن کے کوئی خاص بندھن یا وابستگیاں نہیں ہوتیں اور طویل المیعاد دوستیاں اور پڑوسی نہیں ہوتے''۔

''مستقبل میں دوستی'' کے موضوع پر پڑھے جانے والے ایک مقالے میں ماہر نفسیات کورٹنی ٹال (Courtney Tall) تجویز پیش کرتے ہیں، ''نقل پذیری کی بڑھتی ہوئی شرح کی وجہ سے ''چند'' لوگوں کے ساتھ قریبی تعلقات اور اس میں استحکام غیر مؤثر ہوگا کیونکہ اس معاشرے میں خود کار سازی کی وجہ سے مفادات کی وسعت، مطابقت پذیری میں تنوع اور بڑے پیمانے پر تبدیلی رونما ہوتی ہے...... افراد اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کریں گے کہ وہ مشترکہ مفادات کی بنیاد پر ''غیر رسمی'' قسم کے تعلقات استوار کرسکیں اور ذیلی گروپوں سے وابستگی اختیار کریں، اور پھر اس قسم کی دوستیوں کو آسانی سے چھوڑ سکیں، چاہے کسی اور مقام پر چلے جائیں اور اسی قسم کے، مشترکہ مفادات پر مبنی کسی گروپ سے وابستگی اختیار کریں، چاہے وہ اسی علاقے میں ہی کیوں نہ ہو...... مفادات بڑی تیزی سے تبدیل ہوتے رہیں گے......

''تشکیل دینے اور پھر ختم کردینے کی یہ صلاحیت، یا شناسائی کی سطح کو کم کردینا، تعلقات کو فوراً ختم کردینا، جس کے ساتھ نقل پذیری بھی وابستہ ہو، کسی بھی فرد کی زیادہ دوستیاں بنانے پر منتج ہوں گی، اور اس کی

شرح زمانہ حال سے بڑھی ہوئی ہوگی......

بہت سے افراد کے لیے مستقبل میں دوستی باعث طمانیت ہوگی کیونکہ یہ مختصر استحکام اور دورانیے کے تعلقات فراہم کرکے، ماضی میں قائم ہونے والے طویل المیعاد، تعلقات کا نعم البدل ثابت ہوگی۔

سوموار سے جمعہ تک کے دوست

عارضی تعلقات کے سلسلے کے جاری رہنے پر یقین کی ایک وجہ مختلف پیشوں میں جدید ٹیکنالوجی کے اثرات ہیں۔ حتیٰ کہ اگر بڑے شہری علاقوں کی طرف بہاؤ رک جائے اور لوگ اپنی اپنی جغرافیائی حدود تک ہی مسدود رہیں تب بھی، روزگار میں تبدیلیوں کے باعث تعلقات کی تعداد میں اضافے اور دورانیے میں کمی واقع ہوتی رہے گی۔ کیونکہ جدید ٹیکنالوجی کو متعارف ہونا چاہیے ہم اسے خودکار سازی کہیں یا نہیں، لازمی طور پر ان مہارتوں اور شخصیات میں تبدیلی سے مشروط ہے جو معیشت کی ضرورت ہیں۔

مختلف پیشوں میں تخصیص میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ بیک وقت ٹیکنالوجی میں جدت کسی مخصوص پیشے میں متوقع مدت میں کمی کردیتی ہے۔ افرادی قوت کے امور کے ماہر اور معاشیات دان نارمن اینن (Norman Anon) کہتے ہیں، ''پیشوں کا ابھر کر سامنے آنا اور پھر ان کا روبہ زوال ہونا اتنی تیزی سے عمل میں آئے گا کہ لوگ اپنے بارے میں غیریقینی کا شکار رہیں گے''۔ انھوں نے یہ بات بھی نوٹ کی ہوائی کمپنی میں فلائٹ انجینئر کا پیشہ اچانک ابھرا لیکن پندرہ سال کے مختصر عرصے میں معدوم ہونا شروع ہوگیا''۔

سرکردہ روزناموں کے صفحات میں ''مدد کی ضرورت'' کے عنوانات کے تحت اشتہارات پر نظر دوڑائیں تو ہمیں احساس ہوگا کہ نئے پیشے حیران کردینے والی رفتار سے بڑھ رہے ہیں۔ سسٹمز اینالسٹ، کنسول آپریٹر، کوڈر، ٹیپ لائبریرین، ٹیپ ہینڈلر کمپیوٹر سے متعلق چند پیشے ہیں۔ انفارمیشن ریٹریول، آپٹیکل سکیننگ، تھن فلم (Thin Film) ٹیکنالوجی ایسے شعبے ہیں جنھیں نئی مہارتوں کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ پرانے پیشے اپنی اہمیت کھودیتے ہیں یا یکسر ختم ہوجاتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں فارچون میگزین (Fortune magazine) نے ان ۱۰۰۳ نوجوان افسران کے خیالات پر مبنی ایک سروے کیا جنھیں بڑی امریکی کارپوریشنوں نے بھرتی کیا تھا، تو ان کے سامنے یہ حقیقت آئی کہ ہر تین میں سے ایک افسر ایسے روزگار پر کام کررہا تھا جو اس کی ملازمت شروع کرنے سے پہلے موجود ہی نہیں تھا۔ ایک اور بڑا گروپ ایسا تھا جس میں اسامیاں ہیں جن پر ان افراد سے پہلے صرف ایک مرتبہ ہی بھرتی کی گئی تھی۔ اگر اس پیشے کا نام برقرار رکھا گیا تو

کم از کم کام کی نوعیت میں تبدیلی ضرور ہوتی ہے اور ان اسامیوں پر آنے والے افراد تبدیل ہوجاتے ہیں۔

تاہم ملازمت اور روزگار میں تبدیلی ٹیکنالوجی میں تبدیلی سے بلاواسطہ متاثر نہیں ہوتی۔ اس سے ادغام اور تبادلہ جات کی عکاسی بھی ہوتی ہے جو مختلف صنعتیں تیزی سے تبدیل ہوتے ماحول سے ہم آہنگ ہونے کے لیے، تنظیم سازی اور ازسرنو تنظیم سازی کی صورت میں کرتی ہیں، اور یہ تمام تبدیلیاں صارفین کی ترجیحات کے لیے کی جاتی ہیں۔ بہت سے دیگر دباؤ بھی ایسے ہوتے ہیں جو تواتر کے ساتھ پیشہ ورانہ ادغام کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے یکجا ہوجاتے ہیں۔ امریکی محکمہ محنت کے تکمیل کردہ ایک حالیہ سروے کی رو سے امریکی افرادی قوت سے تعلق رکھنے والے ۰۰۰،۰۰۰،۷۱ افراد اوسطاً ۲ء۴ سال سے موجودہ کام کررہے تھے، تین سال قبل کئے گئے سروے کے مطابق یہ شرح ۶ء۴ تھی، یعنی یہ ۹ فی صد کم ہوئی ہے۔

محکمہ محنت کی ایک اور رپورٹ کی رو سے، ''۱۹۶۰ء کی دہائی کے آغاز پر موجود ایسی صورت حال کے تحت، افرادی قوت میں موجود اوسطاً بیس سالہ شخص سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ چھ یا سات مرتبہ اپنا روزگار تبدیل کرے''۔ لہٰذا اپنے ''ذریعۂ معاش'' سے متعلق سوچنے کی بجائے، جدید ترین صنعتی معاشرے کے ایک فرد کو اپنے ''ذریعۂ معاش کے سلسلے'' سے متعلق سوچنا ہوگا۔

آج کے دور میں، افرادی قوت کو شمار کرنے کے لیے، افراد کو ان کے موجودہ پیشوں کے حوالے سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی محنت کش ''مشین آپریٹر''، ''سیلز کلرک''، یا ''کمپیوٹر پروگرامر'' ہوسکتا ہے۔ یہ نظام جو نسبتاً کم حرکی دور میں معرض وجود میں آیا، افرادی قوت کے امور کے کئی ماہرین کے نزدیک اب موزوں نہیں رہا۔ اب کوششیں کی جارہی ہیں کہ ہر محنت کش کو نہ صرف اس کے موجودہ عہدے کی نسبت سے پہچانا جائے، بلکہ اس کے خاص ''وصفِ روزگار'' کے حوالے سے جس پر وہ کاربند رہا، ہر شخص کا ''وصف روزگار'' یا ''سلسلہ معاش'' مختلف ہوسکتا ہے لیکن بہت سے ''وصف روزگار'' دوبارہ جاری کیے گئے ہیں۔ جب یہ پوچھا گیا، ''کیا کیا جائے؟'' جدید ترین ٹیکنالوجی کے عہد کا شخص خود پر اپنے موجودہ (عارضی) روزگار کی چھاپ نہیں لگائے گا بلکہ اپنے خاص ''وصف روزگار'' اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی۔ اس طرح کی چھاپ جدید صنعتی مارکیٹ میں ملازمت کے لیے ضروری ہے بہ نسبت آج استعمال ہونے والے شماریاتی حوالوں کے، جس میں اس بات کا کوئی حوالہ نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ماضی میں کیا کرتا رہا یا یہ کہ وہ مستقبل میں کون سا کام کرنا پسند کرے گا۔

آج کے عہد میں امریکی ملازمتوں میں ردوبدل کی بڑھتی ہوئی شرح مغربی یورپ کے ممالک پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ برطانوی صنعتوں میں روزگار کے ردوبدل کی شرح ۳۰ سے ۴۰ فی صد سالانہ ہے۔ فرانس میں ۲۰ فی صد افرادی قوت سالانہ اپنا روزگار تبدیل کر لیتی ہے اور مونیق ویوٹ (Monique Viot) کے مطابق اس شرح میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ سویڈش مینوفیکچرنگ ایسوسی ایشن کے ڈائریکٹر اولوف گسٹفسن (Olef Gustafsson) کہتے ہیں، سویڈن میں، ''ہم لوگ افرادی قوت میں ردوبدل کی اوسط شرح ۲۵ سے ۳۰ فی صد ہی شمار کرتے ہیں...... شاید کچھ مقامات پر یہ شرح ۳۰ سے ۴۰ فی صد تک پہنچ گئی ہے''۔

روزگار میں ردوبدل کی شرح شرحاً بڑھ رہی ہے یا نہیں، اس بات سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ قابل پیمائش اعداد و شمار پر ہی گفتگو ہو سکتی ہے۔ ان اعداد و شمار میں وہ تبدیلیاں وقوع پذیر ہوں۔ لندن کے ٹیوی سٹاک (Tavistock) انسٹی ٹیوٹ سے تعلق رکھنے والے اے کے رائس اس بات پر زور دیتے ہیں، ''ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں تبادلہ فیکٹری کے اندر ایک ''نئی زندگی'' کا آغاز اور تاثر ہے''۔ روزگار میں ردوبدل کے حوالے سے اس طرح تبدیلیوں کا شمار نہ کرنا حقیقتاً ہونے والی تبدیلیوں کے اعداد و شمار کو ظاہر نہیں کر سکتا لہٰذا روزگار میں ہونے والے ردوبدل کا ناکافی اندازہ لگایا گیا ہے۔ ہر تبدیلی پرانے انسانی رشتوں کو ختم کر دینے اور نئے رشتے تشکیل دینے کے مترادف ہے۔

روزگار میں کسی قسم کا ردوبدل اپنے ساتھ دباؤ لے کر آتا ہے۔ اس فرد کو پرانی عادات سے جان چھڑانی چاہیے، پرانے رویے ترک کر دینے چاہئیں اور چیزوں کو کرنے کی نئی راہیں تلاش کرنی چاہئیں۔ حتیٰ کہ اگر کام کی نوعیت ایک جیسی ہی کیوں نہ ہو، تو وہ ماحول جہاں یہ کام ہو رہا ہے وہ مختلف ہے۔ اسی طرح کسی نئے طبقے میں جا کر آباد ہونا بھی دباؤ کا باعث بنتا ہے، نووارد شخص، بڑی تیزی سے، تعلقات استوار کرنے کے دباؤ میں ہوتا ہے۔ یہاں پر اس مرحلے کو تیزی بخشنے میں عمومی رابطہ کار افراد اہم کردار ادا کرتے ہیں، یہاں پر بھی کوئی فرد تنظیموں سے وابستہ ہو کر...... جو عمومی طور پر بے قاعدہ قسم کی ہوتی ہیں، بجائے کمپنیوں کی باقاعدہ تنظیم سازی کے۔ یہاں پر یہ احساس، کہ کوئی بھی روزگار مستقل نہیں ہوتا، اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جو تعلق استوار ہوا ہے وہ مشروط، معیاری اور اکثر تعریفوں کی رو سے، ناپائیدار ہے۔

بھرتی ہونے والے اور منحرف ہونے والے

جغرافیائی نقل پذیری پر بحث کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ کچھ افراد اور گروہ، دیگر افراد اور

گروہوں کی نسبت زیادہ نقل پذیر ہیں۔ پیشہ ورانہ نقل پذیری کے حوالے سے بھی، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ افراد اور گروہ، دیگر کے مقابلے میں، روزگار کی تبدیلی زیادہ کرتے ہیں۔ ایک سطحی سے نظریے کی رو سے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جو لوگ جغرافیائی طور پر نقل پذیر ہوتے ہیں وہ پیشہ ورانہ طور پر نقل پذیر ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر، نقل پذیری کی رو سے ہمیں نسبتاً کم متمول، کم ہنرمند افراد میں، شرح زیادہ نظر آئی۔ زور دار جھٹکوں اور معیشت کے دھچکوں کا مقابلہ کرنے والوں کو، کہ جس معیشت میں تعلیم یافتہ اور تیزی سے بڑھتے ہوئے ہنرمند کارکنوں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے، غریب افراد ایک روزگار سے دوسرے روزگار کی طرف گیند کی طرح لڑھکتے رہتے ہیں، انھیں سب سے آخر میں روزگار میسر آتا ہے اور سب سے پہلے برطرف کیا جاتا ہے۔

تعلیم کی اوسط شرح اور وسائل کی اوسط دستیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی ہمیں ایسے افراد مل جاتے ہیں جو، زراعت سے وابستہ آبادیوں کی نسبت زیادہ نقل پذیر ہیں اور نسبتاً مستحکم ہیں۔ اور پھر، پہلے کی طرح، ان لوگوں میں روزگار کے ردوبدل کی مناسبت سے بڑھتی ہوئی شرح پائی جاتی ہے، خاص طور ان گروہوں میں جو مستقبل کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں...... سائنسدان اور انجینئر، اعلیٰ تعلیم کے حامل پیشہ ور افراد اور ٹیکنیشن، ناظمین اور مینجر۔

حالیہ ہونے والے ایک مطالعے کے مطابق یہ بات سامنے آئی کہ دیگر امریکی صنعتی یونٹوں کے مقابلے میں تحقیق اور ترقیاتی صنعت کے میدان میں سائنسدانوں اور انجینئروں کی ملازمتوں میں ردّوبدل کی شرح تقریباً دگنی ہے۔ اس کی وجہ تلاش کرنا انتہائی آسان ہے۔ مختصراً یہ کہ یہی چیز ٹیکنالوجی کی تبدیلی کا آغاز ہے۔ ایک نہج جس پر پہنچ کر علم کے پرانے ہونے کا عمل تیز تر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ویسٹنگ ہاؤس (westinghouse) میں سمجھا جاتا ہے کہ ایک گریجویٹ انجینئر کی 'نصف زندگی' صرف دس سال ہے...... جس کا مطلب ہے کہ جو کچھ اس نے سیکھا ان میں سے نصف صرف ایک دہائی میں پرانا ہو جائے گا۔

روزگار میں تبدیلی کی بڑھتی ہوئی شرح اس بات کی عکاسی بھی کرتی ہے کہ اس کا گہرا اثر ذرائع ابلاغ، خصوصاً اشتہارات پر ہوتا ہے۔ اشتہارات کے شعبے سے وابستہ ۱۴۵۰ امریکی افراد پر کیے گئے ایک حالیہ سروے کے مطابق گزشتہ دو سالوں کے دوران ۷۰ فی صد افراد نے اپنا روزگار تبدیل کیا۔ صارف کی ترجیحات میں ہونے والی تیز تر تبدیلیوں کو ظاہر کرتے ہوئے، خاص طور پر فنون، کاپی سٹائل اور پیداواری شعبوں میں، برطانیہ میں وہی پرانا سلسلہ بار بار دُہرایا جاتا ہے۔ ایک ایجنسی سے دوسری ایجنسی میں عملے کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے

چاہے وہ شفٹوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو، اور بہت سی ایجنسیاں کسی ملازم کو مستقل اور باقاعدہ ملازم اس وقت تک نہیں بناتیں جب تک وہ لگاتار ایک سال کے لیے کام نہ کرے۔

شاید ایک بڑی ڈرامائی تبدیلی انتظامی امور کے عہدوں پر غالب آ گئی، ان عہدوں پر جن پر ''قسمت'' اور ''تقدیر'' کے معاملات زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے تھے اور جو نسبتاً ''کم خوش نصیب'' لوگوں کو غم زدہ کرتے تھے۔ صنعتی امور اور نفسیات کے پروفیسر ڈاکٹر ہارولڈ لیوٹ کہتے ہیں، ''تاریخ میں پہلی مرتبہ متروک ہونے کا عمل انتظامیہ کے لیے اہم مسئلہ بن گیا ہے کیونکہ پہلی بار علم پر متعلقہ تجربے کی اہمیت تیزی سے کم ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے''۔ نئی انتظامیہ کو تربیت دینے میں ایک طویل عرصہ لگتا ہے اور تربیت کا سلسلہ بھی ایک دہائی میں پرانا ہو جاتا ہے، جیسا کہ انجینئروں کے مسئلے میں ہوتا ہے، ڈاکٹر لیوٹ تجویز پیش کرتے ہیں کہ مستقبل میں، ''ہمیں ایسے پیشے ترتیب دینے کی ضرورت ہے جو، وقت کے ساتھ ساتھ، بجائے اوپر جانے کے نیچے کی طرف آئیں......شاید کوئی شخص اپنے پیشے میں ذمہ داری کے عروج پر بہت جلد ہی پہنچ جائے اور پھر یہ امید کی جائے کہ وہ نیچے کی طرف سفر کرے گا یا اس کام سے فارغ ہو کر کوئی سادہ، نسبتاً آسان قسم کے روزگار سے وابستہ ہو جائے گا''۔

روزگار کا تنوع چاہے اوپر کی طرف ہو، نیچے کی طرف یا کسی اور سمت کی طرف مستقبل میں روزگار میں تبدیلی کی شرح زیادہ ہی ہے نہ کہ کم۔ یہ حقیقت کرایہ داری کے عمل سے گزرنے والے افراد کے تبدیل شدہ رویوں سے پہلے ہی عیاں ہو چکا ہے۔ سلینیز (Celanese) کارپوریشن کے اعلیٰ افسر نے اس بات کا اعتراف کیا، ''مجھے اس بات کا احساس اس وقت ہوتا تھا جب میں ملازمتوں کے لیے امیدواروں کے کوائف نامے دیکھتا تھا کہ وہ امیدوار پہلے ہی کئی ملازمتیں کر چکے ہیں، میں اس بات سے پریشان ہو جاتا تھا کہ یہ لڑکا ملازمت کی تلاش میں ہے یا قسمت آزمائی کر رہا ہے۔ مجھے اس سے زیادہ غرض نہیں تھی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس نے یہ تمام ترکاوشیں کیوں کیں۔ بیس سالوں میں پانچ یا چھ ملازمتیں ایک بونس......اور حقیقت یہ ہے کہ اگر میرے سامنے ایک جیسے دو تعلیم یافتہ افراد ہوں تو میں ایک ہی جگہ رہ کر کام کرنے والے شخص پر، اس شخص کو ترجیح دوں گا جو کسی مناسب وجہ کے تحت دو مرتبہ اپنا روزگار تبدیل کر چکا ہو۔ کیوں؟ مجھے معلوم ہے کہ وہ مطابقت پذیر ہے۔'' انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف میں اعلیٰ افسران کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فرینک میک کیبے (Dr. Frank McCabe) کہتے ہیں، ''آپ نئے آنے والوں کا خیر مقدم کرنے میں جتنے کامیاب ہوں

گے، آپ کی کمپنی کی کامیابی کی شرح اتنی بلند ہوگی، نئے آنے والے تحرک پذیر ہوتے ہیں۔''

اعلیٰ ترین ملازمتوں میں تبدیلی کی بڑھتی ہوئی شرح اپنے خاص نمونے لیے ہوئے ہے لہٰذا ''فارچون میگزین'' (Fortune) کی رپورٹ کے مطابق: ''کسی اہم عہدیدار کا (کسی ادارے سے) دستبردار صرف روزگار کے تقاضوں کے لیے نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک مربوط سرگرمیوں کا سلسلہ ہوتا ہے۔ جب کوئی اعلیٰ افسر کسی جگہ سے جانا چاہتا ہے تو اس کے زیر اثر کام کرنے والے اس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ انھیں بھی ساتھ لے کر جائے؛ اگر وہ انھیں ساتھ لیکر نہ جائے تو وہ (خواہش رکھنے والے) عملے کے دیگر افراد کو تنگ کرنا شروع کر دیتے ہیں''۔ سٹین فورڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (Stanford Research intitute) کی کام کے ماحول سے متعلق ایک رپورٹ پر کوئی حیرت نہیں جس میں انھوں نے سال ۱۹۷۵ء سے متعلق پیش گوئی کی ہے: ''اعلیٰ ترین سطح کے روزگار میں ایک ہنگامہ خیزی اور بے چینی کی امید ہے......انتظامی امور کا ماحول بے ترتیبی کا شکار رہے گا''۔

روزگار کی اس افراتفری کے پیچھے ٹیکنالوجی کی جدت ہی کارفرما نہیں، بلکہ نئی چیزوں کی فراوانی بھی ہے، جس سے نئے مواقع پیدا ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تسکین کی امید بھی پیدا ہوتی ہے۔ فورڈ موٹر کمپنی کے ایک ذیلی ادارے فلکو (Philco) میں صنعتی تعلقات کے وائس پریذیڈنٹ کہتے ہیں، ''جو افراد تیس سال قبل کام کرتے تھے اور اس روزگار کو اس امید سے سرانجام دیتے تھے کہ وہ اسے جاری رکھیں گے حتیٰ کہ انھیں معلوم ہو جائے کہ وہ کہیں اور جا رہے ہیں۔ لیکن آج کے عہد کا شخص محسوس کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ اس کے لیے مزید روزگار کے وسیلے فوری طور پر دستیاب ہوں''، اور بہت سے افراد کے لیے دستیاب بھی ہوتے ہیں۔

عموی طور پر ایک نیا روزگار ایک نئے ملازم کو لے کر آتا ہے بلکہ ایک نیا مقام، نئے کام کرنے والے، نیا طرز زندگی......لہٰذا روزگار اور معاش کا ایک تسلسل ہے جس پر افراد گامزن ہیں، جنھیں ترقی کرتے ہوئی معیشت سے یہ یقین دہانی ہوئی کہ ان کے لیے وافر سہولیات میسر ہیں، اس کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی معاش کے حصول میں ۱۸۰ ڈگری کی سطح کا بھی موڑ مڑ سکتے ہیں، اور وہ بھی اس وقت جب دیگر افراد اپنی ریٹائرمنٹ کا سوچ رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں رئیل اسٹیٹ کے ایک قانون دان کا معلوم ہوا جس نے اپنی فرم کو چھوڑ کر معاشرتی علوم پڑھنے شروع کر دیے۔ میڈیسن ایونیو[1] (Madison Avenue) پر واقع

---

(۱) نیویارک کی ایک مشہور شاہراہ جہاں بڑے کاروباری مراکز ہیں۔

ایک اشتہاری کمپنی کی کاپی سپروائزر نے پچیس سالہ تجربے کے بعد بتایا، ''میرے لیے مسلسل ایک جگہ بیٹھنا بوریت اور یکسانیت کا باعث بن گیا تھا، مجھے اس سے جان چھڑانی تھی''۔ وہ بعد میں ایک لائبریرین بن گئیں۔ لانگ آئی لینڈ (Long Island) کے ایک سیلز افسر اور الی نائس (Illinois) کے ایک انجینئر نے اپنی اپنی ملازمتیں چھوڑیں اور دونوں تربیتی استاد بن گئے۔ ایک اعلیٰ درجے کے انٹیریئر ڈیکویٹر (Interior dewrator) نے سکول جا کر غربت کے تدارک کے ایک فلاحی پروگرام میں ملازمت اختیار کر لی۔

''کرایہ'' پر محنت کشوں کی خدمات حاصل کریں

ملازمت کی ہر تبدیلی اس شرح پر منتج ہوتی ہے جس پر لوگ ہماری زندگی میں گزرتے ہیں، جوں جوں تبدیلی کی شرح بڑھتی چلی جاتی ہے، تعلقات کا دورانیہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ بات حیران حد تک اس وقت پروان چڑھی جب انسانی خدمات۔ عارضی امدادی خدمات۔ کے مساوی کرایہ پر خدمات حاصل کرنے کا انقلاب برپا ہوا۔ آج امریکہ میں ہر ۱۰۰ میں سے ایک ملازم ایسا ضرور ہے جسے، سال کے کسی وقت میں، نام نہاد ''عارضی امدادی خدمات'' کے لیے بلایا جاتا ہے اور صنعت کی وقتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کہا جاتا ہے اور مناسب معاوضہ دیا جاتا ہے۔

فی الوقت ۵۰۰ کے لگ بھگ عارضی امدادا ایجنسیاں ہیں جو صنعتی اداروں کو تقریباً ۷۵۰،۰۰۰ ایسے ملازمین کی فراہمی کو ممکن بتاتی ہیں جن کی ملازمت عارضی بنیادوں پر ہیں ان ملازمین میں سیکریٹری، ریسپشنسٹ سے لے کر دفاعی انجینئر تک ہوئے ہیں۔ جب ایوکو کارپوریشن (Avco corporation) کو حکومتی ٹھیکوں کے لیے فوری طور پر ۱۵۰ ڈیزائن انجینئروں کی خدمات کی ضرورت تھی تو انھوں نے یہ افراد ''کرایہ پر خدمات'' فراہم کرنے والی کمپنیوں سے حاصل کیں۔ ان کی بھرتی میں کئی مہینے صرف کرنے کی بجائے، انھوں نے مکمل عملے کی بھرتی مختصر عرصے میں کر دی۔ عارضی ملازمین کو سیاسی مہموں کے دوران استعمال کیا گیا تاکہ وہ ٹیلی فون اور میمیو گراف (Mimeograph) مشینوں کو کنٹرول کر سکیں۔ انھیں ایمرجنسی ڈیوٹی کے لیے ہسپتالوں اور فیکٹریوں میں پودوں کی شجرکاری کے لیے بھی بلایا گیا ہے۔ انھیں تعلقات عامہ سے متعلق سرگرمیوں میں استعمال کرنے کے لیے بھی بلایا گیا ہے۔ انھیں تعلقات عامہ سے متعلق سرگرمیوں میں استعمال کرنے کے لیے بھی مدعو کیا گیا ہے (اور لینڈو (Orlando) اور فلوریڈا میں ایسے لوگوں کی خدمات کسی بڑے شاپنگ سنٹر کی مشہوری کے لیے ڈالر بل دینے کے لیے حاصل کی گئیں) خلافِ معمول یہ بات بھی سامنے آئی

کہ ان لوگوں میں سے ہزاروں افراد ایسے ہیں جو دفتر کا عمومی کام کرتے ہیں تاکہ کام کے انتہائی دباؤ کے وقت، بڑی کمپنیوں کے باقاعدہ عملے کی مدد کرتے ہیں۔ معاوضوں پر افرادی قوت حاصل کرنے والی ایک کمپنی آرتھر ٹریچر سروس سسٹم (Arthur Treacher Service system) نے اشتہار دیا کہ وہ معاوضوں پر خاتون ملازمہ، خانساماں، گھریلو ملازمین، ڈرائیور، باورچی، آیا، تربیت یافتہ نرسیں، پلمبر، الیکٹریشن اور گھریلو خدمات کے لیے دیگر افراد بھی فراہم کیے جاتے ہیں، انھوں نے مزید کہا، ''بالکل ایسے ہی جیسے ایوس (Avis) رینٹ کارز والے'' (اپنی خدمات فراہم کرتے ہیں)۔

عارضی ضروریات کے لیے، معاوضے پر، عارضی افراد کا حصول، اشیاء کو کرایہ پر حاصل کرنے کے مترادف ہے اور یہ سلسلہ صنعتی دنیا میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ عارضی خدمات کے لیے افرادی قوت فراہم کرنے والی سب سے بڑی کمپنی مین پاور انکارپوریٹڈ (Manpower Incorporated) نے اپنے کام کا آغاز فرانس میں ۱۹۵۶ء سے کیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ہر سال اس نے اپنی کارکردگی کو دگنا کیا ہے اور اب فرانس میں اس طرح کی ۱۲۵۰ ایجنسیاں ہیں۔

وہ لوگ جو عارضی خدمات فراہم کرنے والی کمپنیوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں، اس قسم کے ذریعۂ معاش اختیار کرنے کی کئی وجوہات بیان کرتے ہیں۔ ایک الیکٹرو مکینیکل انجینئر ہوک ہارگیٹ (Hoke Hargett) کہتے ہیں، ''میں جس کام پر بھی جاتا ہوں وہ ہنگامی کام ہوتا ہے اور جب دباؤ شدید ہو تو میری کارکردگی بہتر ہو جاتی ہے۔'' آٹھ سالوں کے دوران انھوں نے گیارہ مختلف کمپنیوں کے ساتھ کام کیا، اور اپنے ساتھ کام کرنے والے سینکڑوں ملازموں سے ملے اور پھر انھیں چھوڑ دیا۔ کچھ تربیت یافتہ افراد کے لیے ملازمت کی تلاش کے باقاعدہ سلسلے میں تحفظ ملازمت کا احساس زیادہ ہوتا ہے بجائے جدید ترین صنعتوں میں موجود ''نام نہاد'' مستقل ملازمتوں کے۔ دفاعی صنعتوں میں عملے کو مختصر کرنے اور برطرف کرنے کا سلسلہ اتنا عام ہے کہ ''مستقل'' ملازم کو بھی یہ خطرہ رہتا ہے کہ اسے بغیر کسی زیادہ وارننگ کے، نکال کر سڑک پر کھڑا کر دیا جائے گا۔ جبکہ عارضی امدادی انجینئر، اپنے پراجیکٹ کی تکمیل پر، دیگر کسی کام پر روانہ ہو جاتا ہے۔

ان عارضی، امدادی ملازمین کے لیے ایک بات اور بھی اہم ہے کہ یہ اپنی اپنی باری کا انتخاب خود کر سکتے ہیں۔ وہ جب اور جہاں چاہیں زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ اور چند لوگوں کے لیے اپنے سماجی تعلقات کو وسعت دینے کا یہ ایک دانستہ طریقہ کار ہے۔ ایک جوان، شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں کو اپنے شوہر کو تبادلے

کی وجہ سے ایک نئے شہر میں، مجبوراً، جانا پڑا، جب اس کے دو بچے سکول چلے جاتے تو وہ تنہائی کا شکار ہو جاتی۔ عارضی امدادی سروس سے منسلک ہونے کے بعد، اس نے ایک سال میں آٹھ یا ۹ مہینے تک کام کیا، اور اس دوران ایک کمپنی سے دوسری کمپنی میں جانے کی وجہ سے اس کے بے شمار لوگوں کے ساتھ تعلقات استوار ہوئے جن میں سے کچھ کو اس نے اپنا دوست بنالیا۔

دوستوں کو کیسے چھوڑا جائے......

پیشہ ورانہ تبدیلی کی بڑھتی ہوئی شرح اور ملازمتوں سے منسوب تعلقات میں معاوضوں اور کرایہ داری کے پھیلاؤ کی وجہ سے اس رفتار میں مزید اضافہ ہو جائے گا جس پر انسانی تعلقات بنائے اور بھلائے جاتے ہیں۔ تاہم یہ رفتار معاشرے میں مختلف گروہوں کو مختلف انداز سے متاثر کرتی ہے۔ عمومی طور پر محنت کش طبقے کے افراد، متوسط اور اعلیٰ درجے کے گروہوں کی نسبت اپنے رشتہ داروں کے قریب رہنا پسند کرتے ہیں اور ان پر انحصار کرتے ہیں۔ ایک ماہر نفسیات لیونارڈ ڈوہل (Leonard Duhl) کے الفاظ میں، ''ان لوگوں کے لیے رشتہ داری کا بندھن کچھ اور معنی لیے ہوئے ہے، پیسے کی کم دستیابی کے ساتھ، مجبوریوں کے حامل شخص کے لیے فاصلہ زیادہ دکھائی دیتا ہے''۔ محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ عارضی تعلقات سے ہم آہنگی کم ہی پیدا کرتے ہیں۔ وہ تعلقات استوار کرنے میں زیادہ عرصہ لگاتے ہیں اور انھیں ترک کرنے میں پس و پیش سے کام لیتے ہیں۔ اور یہ بات بھی حیران کن نہیں کہ ملازمتوں کی تبدیلی کے وقت بھی اس قسم کا پس و پیش دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ اس وقت اپنا روزگار تبدیل کرتے ہیں جب انھیں کرنا پڑے لیکن عموماً اپنی مرضی کے بغیر۔

لیونارڈ ڈوہل مزید نشاندہی کرتے ہیں، ''(امریکہ میں موجود) پیشہ ورانہ، نصاب سے منسلک اور اعلیٰ انتظامی طبقہ فاصلوں اور جسمانی دوری کے باوجود بھی مفادات کے رشتوں میں بندھا ہوا ہے اور اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ آپس میں عملی تعلقات کے حامل ہیں۔ متحرک افراد، بآسانی متبادل رشتے بنانے والے، اور مسائل کے حل کے لیے بندھن اس گروپ کی سرکردہ خوبیاں ہیں۔''

کسی شخص کی زندگی میں لوگوں کے داخل ہونے اور چلے جانے کے عمل میں جو چیز کارفرما ہے وہ تعلقات استوار کرنے کی صلاحیتیں نہیں بلکہ ان تعلقات کو ترک کرنا بھی شامل ہے، نہ صرف لوگوں سے وابستہ ہونا بلکہ غیر وابستہ بھی ہونا۔ جو لوگ اس مطابقت پذیر صنعت کے بہتر حامل ہیں وہ اس معاشرے میں بہتر کارکردگی دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کتاب ''Social Mobility in Industial Society''

میں سیمور لپسٹ (Seymour Lipset) اور رینارڈ بینڈکس (Reinhard Bendix) کہتے ہیں، ''سرکردہ کاروباری حضرات میں سے متحرک لوگ اثر پذیری سے روگردانی کرنے اور مدد فراہم کرنے والے افراد سے تعلقات استوار کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔''

اس قسم کے افراد ایک ماہر عمرانیات لائیڈ وارنر (Lloyd Warner) کی معروضات سے متفق نظر آتے ہیں جن کا کہنا ہے، ''کارپوریٹ مینیجروں اور مالکان کی شخصیت کا سب سے کامیاب وصف یہ ہے کہ وہ اپنے آبائی خاندانوں سے انتہائی گہری وابستگی سے مبرا ہو جاتے ہیں، یہ لوگ ماضی سے بھی خاص وابستگی کا مظاہرہ نہیں کرتے اور یہ لوگ بآسانی زمانہ حال اور مستقبل سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ ایسے لوگ ہیں جو عملی اور روحانی طور پر اپنا گھر بار چھوڑ چکے ہیں...... یہ لوگ دیگر افراد کے ساتھ بآسانی اپنا رشتہ جوڑ اور توڑ سکتے ہیں۔''

ایک اور جگہ کتاب ''Big Business Leaders in America'' کے لیے کیے گئے ایک مطالعے میں مسٹر وارنر (Warner) جیمز ابیلگلن (Abegglen) کے ساتھ مل کر یہ تجزیہ پیش کرتے ہیں: ''تمام افراد سے بیشتر یہ لوگ تحرک میں آئے، انھوں نے اپنے گھر بار چھوڑے، اور وہ تمام چیزیں بھی جو ان پر دباؤ ڈال سکتی تھیں۔ انھوں نے ایک معیار زندگی، معیار آمدن اور طرز زندگی ترک کر کے ایک ایسا طرز زندگی اختیار کیا جو اس (طرز زندگی) سے بالکل مختلف تھا جس میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ ایک متحرک شخص سب سے پہلے اپنی آبائی جگہ کے ماحول کو ترک کرتا ہے، ان چیزوں میں اس کا آبائی گھر، اپنے شناسا پڑوسی اور بہت سی مثالوں میں اپنا شہر، ریاست اور وہ خطہ بھی، جس میں انھوں نے جنم لیا۔

''جسمانی طور پر کسی جگہ سے منتقل ہونا، اس متحرک شخص کے لیے، اس سارے عمل میں سے ایک جزوی چیز ہے، جس مرحلے سے اس نے گزرنا ہوتا ہے۔ اسے افراد کے ساتھ ساتھ مقامات بھی تبدیل کرنے ہوتے ہیں۔ ابتدائی زندگی کے دوستوں کو بھی چھوڑنا ہوتا ہے کیونکہ ماضی سے وابستہ ''نچلے طبقے'' کی شناسائی ''کامیاب حال'' سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس کا آبائی گرجا گھر اس سے چھوٹ جاتا ہے، ساتھ ہی اس کی ابتدائی زندگی کے کلب اور اس کے خاندان اور ابتدائی زندگی کے دوست اور ساتھی افراد کی ٹولی۔ ان تمام باتوں میں سب سے اہم، اور شاید ایک متحرک شخص کے لیے سب سے بڑا مسئلہ، یہ ہے کہ اسے اپنے والدہ، والدہ، بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ ماضی سے وابستہ تمام انسانی رشتوں سے ناطہ توڑنا پڑتا ہے۔''

لہٰذا کسی بزنس میگزین میں یہ بات پڑھنا باعث حیرت نہیں کہ، ایک نئے ترقی پانے والے اعلیٰ افسر اور اس کی بیگم کے لیے ایک بہترین گائیڈ کی ضرورت ہوتی ہے جو خود لوگوں سے علیحدہ ہو چکا ہو۔ وہ انھیں سمجھاتا ہے کہ اس نے، آرزدگی کو کم کرنے کی خاطر، پرانے دوستوں اور ماتحتوں سے بتدریج ناطہ توڑ لیا ہے''۔ اسے یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ''وہ دفتر میں وقفوں کے دوران کافی پینے کے لیے لوگوں سے منطقی طور سے معذرت کرے''۔ اسی طرح اپنے محکمے میں ہونے والے ''بوولنگ (Bowling) اور تاش کے اکٹھ کو، پہلے کبھی کبھار، اور پھر اکثر، ترک کیا کرے''۔ ماتحت لوگوں میں سے گھر پر دی جانے والی دعوتوں کو قبول کرنا چاہیے، لیکن بار بار اس عمل کو دہرانا نہیں چاہیے، ماسوائے اس صورت میں جب یہ دعوت ماتحت افراد کے گروپ کو دی جائے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس قسم کا میل جول ختم ہو جانا چاہیے۔

ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس خاص معاملے میں، بیگمات بڑا مسئلہ ہوتی ہیں، کیونکہ ''وہ دفتری نظام کے آداب و مراتب کی پروا نہیں کرتیں۔'' ایک کامیاب شخص کو یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیگم کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرے کیونکہ وہ خاتون، اپنے شوہر کی نسبت، پرانے تعلقات سے زیادہ وابستہ ہوتی ہے۔ لیکن ایک اعلیٰ افسر کے بقول، ''کسی شخص کی بیگم اس کے لیے ایک بڑا خطرہ بن سکتی ہے اگر وہ اپنے شوہر کے ماتحت افراد کی بیگمات سے قریبی دوستی استوار کر لیتی ہے۔ اس خاتون کی دوستیاں اس کے شوہر کو مشکلات سے دوچار کریں گی، اپنے ماتحت لوگوں کی پہچان میں دقت پیدا کریں گی اور اس کے روزگار کو خطرات لاحق کریں گی''۔ ایک افسر نے نشاندہی کی، ''جب والدین پرانی دوستی سے کنارہ کش ہو جائیں تو بچوں کو بھی دستبردار ہو جانا چاہیے۔''

دوست کتنے ہونے چاہئیں؟

حقیقت پر مبنی یہ ہدایات کہ لوگوں سے کنارہ کشی کیسے اختیار کی جائے، ان لوگوں کو شدید پریشان کر دے گی جن کی پرورش اس روایتی تخیل پر ہوئی ہے کہ دوستیاں ہمیشہ قائم رہنے کے لیے ہوتی ہیں۔ لیکن کاروباری طبقے کو، درشتی سے، موردِ الزام ٹھہرانے سے قبل، یہ بات ضروری ہے کہ ہمیں اس بات کا احساس ہو جائے کہ یہ بات، معاشرے کے دیگر طبقوں میں بھی، منافقت کی نقاب کے نیچے چھپی ہوئی ہے۔ وہ پروفیسر جس کی ترقی ڈین کی حیثیت سے ہوئی، فوجی افسر، وہ انجینئر جو پراجیکٹ کا سربراہ بن گیا، عمومی طور پر اسی قسم کا معاشرتی کھیل کھیلتا ہے۔ مزید کہ یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ اس نمونے پر کام کا پھیلاؤ دنیا بھر میں ہو جائے گا اور تنظیم کی صورت اختیار کر لے گا۔ کیونکہ اگر دوستی مفادات اور صلاحیتوں پر مبنی ہو تو دوستی کے رشتے مفادات

کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہونے کے پابند ہیں...... حتیٰ کہ اس معاملے میں سماجی طبقات کی تفریق نہ بھی شامل ہو۔ ایک ایسے معاشرے میں جو تاریخ میں سب سے زیادہ تبدیلیاں لا رہا ہو، یہ بات باعثِ حیرت ہو گی کہ لوگوں کے مفادات، رنگارنگی سے، تبدیل نہ ہوں۔

بلاشبہ آج افراد کی سماجی سرگرمیوں کا بہت ساحصہ تحقیق سے متعلق رویوں سے مشتق ہے...... سماجی دریافت کو انتھک عمل جس میں کوئی فرد نئے دوست تلاش کرتا ہے یا ان دوستوں کا متبادل تلاش کرتا ہے جو (اس کے قریب) موجود نہیں یا جو اس کے مفادات میں شریک نہیں۔ یہ ردّ و بدل لوگوں، بالخصوص تعلیم یافتہ لوگوں، کو مجبور کرتا ہے کہ وہ شہروں کا رخ کریں اور عارضی ملازمتوں کے سلسلے سے مربوط ہو جائیں۔ کیونکہ مشترکہ مفادات اور صلاحیتوں کے حامل افراد کی وہ شناخت جس پر دوستیاں اور تعلقات پروان چڑھ سکیں ایک ایسے معاشرے میں بآسانی ممکن نہیں جہاں مہارتیں سست روی کے ساتھ دستیاب ہوں۔ مہارتوں میں اضافہ صرف اور صرف ایسے مقامات پر ممکن نہیں جہاں پیشہ ورانہ اور کام کرنے والا ماحول ہو بلکہ فرصت کے اضافی لمحات میں بھی ممکن ہیں۔ کسی معاشرے نے شاذ ہی اتنی مطابقت پذیر اور فرصت کے لمحالت کی سرگرمیوں کی وسعت کو اتنا ممکن بنایا ہے۔ کام اور فرصت دونوں امور کے سلسلے میں جتنا تنوع پایا جائے گا، مہارتوں میں اتنا ہی اضافہ ہو گا اور ایسے میں درست دوستوں کو تلاش کرنا اتنا ہی مشکل ہو گا۔

لہٰذا برطانیہ کے پروفیسر سارگینٹ فلورنس (Sargant Florence) نے ایک اندازہ لگایا ہے کہ کم از کم ۱،۰۰۰،۰۰۰ کی آبادی کے ایک پیشہ ور کارکن کو، دلچسپی رکھنے والے، بیس (۲۰) دوستوں کی فراہمی کی ضرورت ہے۔ وہ خاتون جس نے، حکمت عملی کے طور پر، دوستوں کی تلاش کی خاطر عارضی کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا وہ انتہائی دانشمند تھی۔ اس خاتون کو جن افراد کے ساتھ کام پر لگایا گیا تھا ان میں مختلف افراد کے اضافے سے اس نے مشترکہ مفادات اور صلاحیتیں رکھنے والے افراد کی تعداد میں اضافہ کیا۔

ہم لوگ شناسائی کے ایک طویل سلسلے میں سے اپنے دوستوں کا چناؤ کرتے ہیں۔ میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں مائیکل گوریوچ (Gurevitch) کے ایک مطالعے کے دوران مختلف افراد سے سوال کیا گیا وہ گزشتہ ۱۰۰ دنوں میں جتنے افراد کے ساتھ کام کر چکے ہیں ان کی تعداد بتائیں، ہر شخص نے اوسطاً ۵۰۰ افراد کے نام گنوائے۔ ایک سماجی نفسیات دان سٹینلے ملگرام (Stanley Milgram) جنھوں نے بے شمار دلچسپ تجربات اس حوالے سے کیے شناسائی کے سلسلوں سے روابط کیسے پیدا کیے گئے، کہتے ہیں

کہ ہر امریکی کی اوسطاً شناسائی تقریباً ۵۰۰ سے ۱۲۵۰۰ افراد سے ہے۔

تاہم اکثر افراد کے دوستوں کی تعداد بیس سے کم ہی تھی، جیسا کہ پروفیسر فلورنس نے تجویز کیا تھا، سائنسدان کی تعریف ذرا محدود تھی بالخصوص ان افراد کی نسبت جو روزمرہ کے کاموں میں سامنے آجاتے ہیں۔ لنکن، نبراسکا (Nebracka) میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ۳۹ شادی شدہ جوڑوں پر ایک تحقیق کی گئی اور انھیں اپنے دوستوں کا نام گنوانے کا کہا گیا۔ اس تحقیق کا مقدمہ یہ معلوم کرنا تھا کہ خاندان کے لیے دوست تلاش کرنے میں زیادہ مؤثر شوہر ہیں یا ان کی بیگمات۔ یہ بات مشاہدے میں آئی کہ ہر جوڑے نے اوسطاً ۷ دوستیاں کیں...... یہ دوستیاں انفرادی اور شادی شدہ جوڑوں، دونوں پر مشتمل تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہر اوسط جوڑنے دوستوں کی تعداد ۷ سے ۱۴ تک بتائی۔ ان میں سے اکثر دوست غیر مقامی تھے، حقیقت یہ تھی کہ بیگمات نے، اپنے شوہروں کی نسبت، زیادہ غیر مقامی دوست بنائے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شوہر کے مقابلے میں دوستیاں ترک کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔

''ردوبدل'' کے لیے بچوں کی تربیت

آج کے عہد میں غیر دانستہ ہونے اور تعلقات ترک کرنے کی تربیت ابتدائی عمر ہی میں شروع ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ اس بات سے نسلوں کے درمیان بڑے امتیازات کی بہتر نمائندگی ہو جاتی ہے، کیونکہ آج کے بچے اپنی کلاسوں ہی میں ردّوبدل کی اعلیٰ سطح کو دیکھ لیتے ہیں۔ فورڈ فاؤنڈیشن کے ایک ذیلی ادارے ''Educational Facilities Laboratories, Incorporated'' کے مطابق، شہروں میں واقع سکولوں کے لیے یہ بات غیر معمولی نہیں کہ وہ ایک سال میں اپنے طلبہ میں سے نصف کی تبدیلی دیکھیں۔'' اس مظہر کا طلبہ پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔

کتاب ''The Organization Man'' میں ولیئم وہائٹ اس امر کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس طرح کے ردوبدل کا اثر ''اساتذہ پر بھی اتنا شدید ہوتا ہے جتنا طلبہ پر، کیونکہ اساتذہ ایک خاص قسم کے احساس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کامیابی کا ایک احساس جو طلبہ کی صلاحیتوں کو بڑھتا دیکھ کر ہوتا ہے۔'' تاہم یہ مسئلہ اور بھی گھمبیر ہو گیا ہے کیونکہ اساتذہ میں بھی پیشہ ورانہ ردوبدل کی شرح بڑھ گئی ہے۔ یہ بات امریکہ کے ساتھ ساتھ دیگر مقامات پر بھی صادق آتی ہے۔ برطانیہ پر تیار ہونے والی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے: ''آج کل یہ بات غیر معمولی نہیں، حتیٰ کہ گرائمر سکول بھی اس بات پر گامزن ہیں، کہ نصابی سال کے

دوران، ایک ہی مضمون کے لیے، بچے کو دو یا تین اساتذہ تعلیم دیتے ہیں۔ اگر کسی سکول سے اساتذہ کی وفاداری کا معیار کم ہو رہا ہے تو بچوں سے اس بات کا گلہ شکوہ بے جا ہے۔ اگر اساتذہ کی اکثریت کسی بہتر روزگار کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ، کسی بہتر ضلع میں جانے کے لیے تیار ہیں، تو طلبہ کے حوالے سے وابستگی اور غرض کا معاملہ اتنا شدید نہیں''۔ ہم صرف طلبہ کی زندگیوں میں اس تمام تر صورت حال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

یونیورسٹی آف ڈینور (Denver) میں ہیری آر مور (Moore) کے سکولوں کے طلبہ پر کیے گئے مطالعہ میں یہ بات سامنے آئی کہ جو طلبہ ایک سے دس مرتبہ ایک ریاست سے دوسری ریاست منتقل ہوئے ان کے ٹیسٹ کے نمبر ان طلبہ سے زیادہ مختلف نہیں تھے جو ایک ہی سکول اور ریاست میں قیام پذیر رہے۔ لیکن نقل مکانی کرنے والے طلبہ یقینی طور پر سکول میں رضا کارانہ سرگرمیوں...... کلبوں، کھیلوں، طلبہ یونینوں اور غیر نصابی سرگرمیوں سے محروم رہتے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ان لوگوں نے جہاں ممکن ہوا، نئے انسانی رشتوں کی تشکیل سے گریز کیا کیونکہ انھیں کچھ ہی عرصے میں ان رشتوں کو ترک کرنا پڑتا...... گویا ان لوگوں نے اپنی زندگیوں میں لوگوں کے بہاؤ کو کم کر دیا جو ان کی خواہش کے عین مطابق ہی تھا۔

بچوں سے...... اور اس خاص مسئلے میں بڑوں سے بھی......، کتنی رفتار سے یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ انسانی رشتوں کی تشکیل کرتے ہیں اور انھیں ترک کرتے ہیں؟ شاید کوئی مناسب شرح ہونی چاہیے کہ جسے ہمیں بڑھاتے رہنا چاہیے؟ کوئی بھی نہیں جانتا۔ اگر ہم اس تصویر میں دورانیوں کے اختصار کے ساتھ ساتھ تنوع کے عمل کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں...... اس بات کا احساس وادراک کہ ہر انسانی رشتہ ہم سے مختلف روّیے کا تقاضا کرتا ہے۔ تو ایک بات واضح ہو جاتی ہے: ہمارے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ ہم اپنی زندگیوں میں، تیزی سے بڑھتی ہوئی تبدیلیوں اور ان کے تقاضوں سے نبردآزما ہو سکیں، ہمیں اس قابل بھی ہونا چاہیے کہ ہم مطابقت پذیری کے اس معیار پر کام کر سکیں، جو انسانی عہد میں پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

مقامات، اشیاء اور لوگوں کی تبدیلی کے اس تیز رفتار سلسلے میں، آج کے عہد میں لوگوں کے تقاضوں کے مطابق، ہم آہنگ ہونے کے لیے، ہم نے انسانی روّیوں کی پیچیدگی کا اندازہ لگانا شروع کیا۔ ہم لوگ جس سمت میں رواں دواں ہیں اس کا منطقی انجام، یقینی طور پر، ایک ایسے معاشرہ کا قیام ہے جس کی بنیاد عارضی نوعیت کی ملاقاتوں پر ہے، اور ایک منفرد اور نئی قسم کی اخلاقیات جو اس عقیدے پر انحصار کرتی ہے، جسے فورٹ لوڈرڈیل کے ایک معاون نے انتہائی جامع انداز میں بیان کیا، ''کہ آپ ان لوگوں کو دوبارہ نہیں دیکھیں گے''۔ یہ تخیل

حماقت پر مبنی ہوگا کہ ''مستقبل''، موجودہ رواجوں کی، یکسانیت کے ساتھ، بڑھوتری کے علاوہ کچھ اور نہیں اور یہ کہ ہمیں انسانی رشتوں کی ناپائیداری کی حتمی سطح تک پہنچنا ہے۔ لیکن یہ بات حماقت نہیں کہ ہم اس سمت کا تعین کریں جس طرح ہم رواں دواں ہیں۔

اب تک ہم لوگوں میں سے اکثر افراد اس مفروضے پر یقین کرتے ہوئے آگے بڑھے ہیں کہ عارضی تعلقات سطحی قسم کے ہوتے ہیں اور یہ کہ محض طویل المدت تعلقات ہی حقیقی اور باہمی وابستگی میں تبدیل ہوتے ہیں۔ شاید یہ مفروضہ غلط ہے۔ شاید کُلّی اور ''غیر معیاری'' تعلقات کے لیے بھی یہ ممکن ہے کہ وہ اس ناپائیدار ترین معاشرے میں تیزی سے پروان چڑھیں۔ یہ بات بھی ممکن ہے کہ یہی چیز تعلقات استوار کرنے میں تیزی کا باعث ہو اور ''وابستگی'' میں وسعت کا باعث بھی۔ تاہم ذہن میں بار بار آنے والا سوال ابھی قائم ہے: ''کیا فورٹ لوڈرڈیل (Lauderdale) ہی مستقبل ہے؟''

ہم نے اب تک دیکھا ہے کہ ان تین قابل مس اشیا...... افراد، مقامات اور چیزوں۔ کے حوالے سے ردوبدل کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ان غیر محسوس اشیاء کی طرف دیکھیں جو تجربات، ہمارے زیر استعمال معلومات اور ان تنظیمی ڈھانچوں کی تشکیل میں یکساں اہمیت کے حامل ہیں جن میں ہم لوگ رہ رہے ہیں۔

☆☆☆

ساتواں باب

تنظیمیں[1]: آنے والا عارضی نظام

مستقبل سے متعلق جو دیومالائی کہانیاں رائج ہیں وہ (مستقبل کے) انسان کو بڑے بڑے اداروں اور تنظیموں کی مشینوں کے ایک بے بس پرزے کی حیثیت سے متشکل کرتی ہیں۔ اس بھیانک تصویر میں ہر شخص ایک تنگ، ناقابل تبدیل، افسر شاہی کے خرگوش باڑے میں پھنسا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اس خرگوش باڑے کی دیواریں اس شخص کی انفرادیت نچوڑ لیتی ہیں، اس کی شخصیت کچل دیتی ہے اور، نتیجتاً، اسے مطابقت اختیار کرنے یا مرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ چونکہ تنظیمیں اور ادارے وسعت اختیار کر رہے ہیں اور مسلسل تقویت حاصل کر رہے ہیں، لہٰذا اس خاص تصویر کشی کے مطابق مستقبل ہم تمام لوگوں کو مخلوقات میں سے انتہائی حقیر، خام ارادہ اور بے شناخت قسم کے تنظیمی شخص کی حیثیت سے خوفزدہ کر رہا ہے۔

جس قوت کے ساتھ یہ یاسیت بھری پیش گوئی عمومی ذہن کو، بالخصوص نوجوانوں کو اپنی گرفت میں لیتی ہے، اس کا بیش تخمینہ کرنا انتہائی مشکل ہے۔ فلموں، ڈراموں اور کتابوں کے ایک طویل سلسلے، جسے کافکا (Kafka)، اورویل، وہائٹ، مارکیوز (Marcuse) اور ایلُل (Ellul) جیسے شہرۂ آفاق مصنفین نے ترتیب دیا، نے ان کے ذہنوں میں افسر شاہی کا خوف بٹھا دیا ہے۔ امریکہ میں رہنے والا ہر شخص ''جانتا'' ہے کہ یہ بے شناخت افسران ہی ہوتے ہیں جو تمام ڈیجٹ پر مبنی ٹیلی فون نمبرز ایجاد کرتے ہیں جو ایسے کارڈ بھیجتے ہیں جس پر لکھا ہوتا ہے ''اسے تہ مت کریں، گول نہ کریں اور نہ کاٹیں،'' جو بڑی بے دردی سے طلبہ کو انفرادیت سے محروم کر دیتے ہیں اور آپ ان لوگوں سے سٹی ہال میں لڑ بھی نہیں سکتے۔ اس مشینی خونخوار مخلوق کے ہاتھوں نگلے جانے کا خوف افسران بالا کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خود تشخیصی کی خاطر رنگ رلیوں کی محفلیں منعقد کریں اور طلبہ میں احتجاج کا جوش و جذبہ بڑھائیں۔

جو چیز اس تمام موضوع کو جذباتی بنا دیتی ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ تنظیم یا ادارہ ہم سب لوگوں کی

۱۔ یہاں پر لفظ ''تنظیمیں'' معمول کے معنی سے ذرا وسیع تر انداز میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ بڑی بڑی تنظیمیں بھی ہیں جو ادارے چلاتی ہیں یا اداروں کے اندر وقتی منصوبوں پر کام کرتی ہیں۔

زندگیوں کا ناگزیر حصہ ہے۔ اشیاء، مقامات اور لوگوں سے اس کے روابط کی طرح انسان کے تنظیمی تعلقات بھی صورت حال کے مطابق بنیادی اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح انسان کی زندگی کا ہر عمل کسی خاص جغرافیائی مقام پر رونما ہوتا ہے، اسی طرح یہ عمل کسی تنظیمی مقام پر بھی ہوتا ہے، ایک خاص مقام جو انسانی تنظیم کے نہ نظر آنے والے جغرافیے میں واقع ہے۔

لہٰذا اگر قدیم سماجی تنقید نگار ایک منظم، اعلیٰ ترین افسر شاہانہ مستقبل کی درست تصویر کشی میں حق بجانب ہیں تو پہلے سے ہی ہمیں رکاوٹیں حائل کرنے، اپنے آئی بی ایم (IBM) کارڈوں میں سوراخ کرنے اور تنظیمی مشینری کو تباہ کرنے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھالینا چاہیے۔ اگر ہم اپنے فرسودہ خیالات کو بالائے طاق رکھ دیں اور ان کی بجائے صرف حقائق ہی پر توجہ دیں تو ہمیں احساس ہوگا کہ افسر شاہی، وہ خاص نظام جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہم سب کو اپنے وزن کے نیچے دبا رہا ہے، بذات خود بھی تبدیلی کا شکار ہے۔

یہ تنقید نگار جن تنظیموں کو، بغیر سوچے سمجھے، مستقبل کے حوالے سے، بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں ان میں سے کم ہی ایسی تنظیمیں ہیں جن سے، آنے والے وقتوں میں غلبہ پانے کی امید نہیں کیونکہ ہم فتح کا مشاہدہ نہیں کر رہے بلکہ افسر شاہی کا زوال دیکھ رہے ہیں۔ دراصل ہم لوگ ایک ایسے تنظیمی نظام کی آمد دیکھ رہے ہیں جو ایک خاص نہج پر پہنچ کر، افسر شاہی کو نہ صرف چیلنج کرے گا بلکہ اس کی جگہ بھی لے گا۔ یہ مستقبل کی تنظیم ہوگی۔ اور میں اسے ''عارضی نظام'' کا نام دیتا ہوں۔

تنظیموں کے اس نئے سلسلے سے مطابقت اختیار کرنے کے لیے فرد کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بجائے اس کے کہ کسی ایسے مقام پر پہنچا جائے جو غیر متبدل ہو اور جہاں شخصیت کے تباہ ہونے کا خدشہ ہو، فرد خود کو ایک آزاد شخص اور، حرکی تنظیموں کی نوتشکیل شدہ دنیا میں، ایک اجنبی کی حیثیت سے پائے گا۔ اس نامانوس خطے میں اس کی حیثیت متواتر تبدیل ہوتی ہوئی، مایہ کی طرح اور تنوع پر مشتمل ہے۔ اور اس کے تنظیمی روابط، اشیاء، مقامات اور لوگوں سے اس کے تعلقات کی طرح، حیران کن اور، مسلسل بڑھتی ہوئی، رفتار سے تبدیل ہو رہے ہیں۔

کیتھولک، جتھے اور ''کافی'' کے وقفے

پیشتر اس کے کہ ہم عارضی نظم کی عجیب وغریب اصطلاح کا مفہوم سمجھ سکیں، ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ تمام تنظیمیں افسر شاہی سلسلوں پر مشتمل نہیں ہوتیں۔ لوگوں کو منظم کرنے کے دیگر طریقے بھی ہیں۔ میکس ویبر نے نشاندہی کی کہ صنعتی انقلاب کی آمد سے پہلے مغرب میں افسر شاہی انسانی تنظیم سازی کا بڑا ذریعہ نہیں بنا تھا۔

یہ موقع نہیں کہ افسر شاہی کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا جائے، لیکن ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم تین بنیادی حقائق پر توجہ دیں۔ پہلا تو یہ کہ تنظیموں کے اس خاص نظام میں، افرادی قوت کی تقسیم کے سلسلے میں ایک روایتی گنجائش کی سی حیثیت حاصل ہے۔ دوسرے وہ نظام مراتب کی عمودی درجہ بندی میں موزونیت اختیار کرتا ہے جو افسر سے لے کر نچلے درجے کی ملازم تک آ رہی ہے۔ تیسرے یہ کہ، مسٹر ویبر کے مطابق، اس کے تنظیمی مراسم دائمی حیثیت اختیار کرنے کے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔

لہٰذا ہر فرد ایک اہم حیثیت میں بیٹھا ہوا ہے، تقریباً ایک مستحکم ماحول میں ایک مستحکم حیثیت۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ اس کا ادارہ کہاں ختم ہوا اور اگلا کہاں سے شروع ہوا؛ تنظیموں اور ان کے ذیلی اداروں کے مابین خط بڑے واضح انداز میں کھینچ دیے گئے ہیں۔ تنظیم سے منسلک ہونے کے لیے کسی فرد نے، مخصوص معاوضے کے عوض، لگی بندھی ذمہ داریوں کو قبول کیا۔ یہ معاوضے اور ذمہ داریاں ایک طویل عرصے تک ایک ہی جیسی رہیں۔ گویا اس نے فرد سے تعلقات کے، نسبتاً، مستقل جال میں قدم رکھا۔ نہ صرف دیگر لوگوں کے ساتھ (جو ایک طویل عرصے تک اپنی اپنی جگہ برقرار رہنے کا ارادہ رکھتے تھے)۔ بلکہ وہ اس تنظیم اور اس ڈھانچے سے بھی منسلک رہنا چاہتے تھے۔

ان ڈھانچوں میں سے کچھ، دیگر ڈھانچوں کی نسبت دیرپا ہیں۔ کیتھولک گرجا گھر ایک سٹیل فریم کی مانند ہے جو گزشتہ ۲۰۰۰ سال سے قائم ہے، اس کے اندرونی ذیلی ڈھانچے کئی صدیوں سے عملاً ناقابل تبدیل ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں جرمنی کی نازی پارٹی، جو یورپ کو خون سے رنگین کرنے میں بھی کامیاب ہوئی، باقاعدہ تنظیمی حیثیت سے چوتھائی صدی سے کم ہی اپنا وجود برقرار رکھ سکی۔

جس طرح تنظیمیں طویل یا مختصر عرصے کے لیے قائم رہتی ہیں اسی طرح کسی خاص تنظیمی ڈھانچے کے ساتھ کسی فرد کے تعلقات کا سلسلہ چلتا ہے۔ لہٰذا کسی شخص کے کسی خاص ادارے، ڈویژن، سیاسی پارٹی، رجمنٹ، کلب یا کسی یونٹ کے ساتھ وابستگی کی وقت کے تناظر میں، کوئی نہ کوئی ابتداء اور انتہاء ہوتی ہے۔ اس شخص کی عمومی تنظیموں کے ساتھ وابستگی کے سلسلے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ جتھے، ذیلی تنظیمیں، کافی بریک کے گروپ اور اسی طرح کے دیگر بندھن۔ اس کی وابستگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اپنے اوپر ممبر شپ کی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے یا کسی تنظیم میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی وابستگی اس کے دستبردار ہوتے ہی یا نکال دیے جانے کے بعد ختم ہو جاتی ہے، یا جب تنظیم خود شکستگی کا شکار ہو جاتی ہے۔

جب کوئی تنظیم باقاعدہ طور سے ٹوٹ جائے تو یقیناً ایسی ہی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ جب اس کے ارکان عدم دلچسپی کا شکار ہو جائیں اور اکٹھے ہونا چھوڑ دیں۔ لیکن کسی بھی تنظیم کا ایک اور حوالے سے بھی ''اختتام'' ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی تنظیم، بہر حال، انسانی عزائم، امیدوں اور پابندیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ بالفاظ دیگر یہ انسانی کرداروں کا ایک ڈھانچا ہے اور جب از سر نو کی گئی تنظیم سازی کی وجہ سے افراد کے کرداروں کو دوبارہ تفویض اور تقسیم کیا جاتا ہے تو اس تبدیلی کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ پرانی تنظیم ختم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ نئی تنظیم ابھر کر سامنے آئی ہے، اگر یہ تنظیم اپنا پرانا نام برقرار رکھے اور پرانے ارکان کو بھی بحال رکھے تب بھی یہی تصور کیا جائے گا۔ کرداروں کی ترتیب نو ایک نیا ڈھانچا تشکیل دے گی جیسے کسی عمارت کی متحرک دیواروں کی ترتیب نو سے وہ عمارت ایک نئے ڈھانچے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

لہٰذا کسی شخص اور تنظیم کے مابین رشتہ یا تو اس شخص کے تنظیم سے چلے جانے، تنظیم کے خاتمے یا اس تنظیم کی ترتیب نو کے ذریعے تبدیلی سے ختم ہوتا ہے۔ جب مؤخر الذکر تنظیم اپنا وجود برقرار رکھتی ہے تو کوئی فرد جو اس پرانی اور شناسا تنظیم سے اپنا تعلق برقرار رکھتا تھا، لیکن اب اگر اس کا ڈھانچا برقرار نہیں رہا تو یہ شخص اپنا رشتہ اس نئی تنظیم سے برقرار رکھتا ہے جو اس سے سبقت لے جاتی ہے۔

آج کے عہد میں اس بات کی واضح شہادتیں مل جاتی ہیں کہ انسان کے تنظیمی رشتے سکڑتے چلے جا رہے ہیں اور یہ کہ ان رشتوں میں بڑی تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے۔ اور ہم یہ دیکھیں گے کہ اس بظاہر معمولی نظر آنے والی حقیقت سمیت، بہت سی مضبوط قوتیں افسر شاہی کو تباہی کی طرف لے جائیں گی۔

تنظیمی انقلاب

ایک وقت تھا جب تنظیمی ڈھانچے کا جدول...... جسے عموماً تنظیمی ڈھانچا کہتے تھے...... خاص طرز کے بنے ہوئے خانوں پر مشتمل ہوتا تھا جس میں افسر، اور اس تنظیم کے ذیلی اکائیوں کی نشاندہی ہوتی تھی، جس کی ذمہ داری اس پر لاگو ہوتی تھی۔ کسی بھی حیثیت کی افسر شاہی، یا کوئی کارپوریشن، یونیورسٹی یا حکومتی ادارہ اپنا تنظیمی ڈھانچا رکھتا تھا، یہ ڈھانچا مینجروں کو تنظیمی تفصیلات کا ایک مفصل نقشہ فراہم کرتا تھا۔ جب ایک مرتبہ اس قسم کا نقشہ بنالیا جاتا ہے تو یہ اس تنظیم کے قواعد و ضوابط پر مشتمل کتاب کا ایک مستقل حصہ بن جاتا تھا اور اسے آنے والے وقت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ آج تنظیمی خطوط اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں کہ تین ماہ پرانا ایک جدول ''تاریخی'' چیز شمار ہوتی ہے، کوئی جو بحیرۂ مردار کے مرغولے کی مانند ہو۔

تنظیمیں اب اپنے اندرونی ڈھانچے کو ایک لمحے میں تبدیل کر لیتی ہیں اور کبھی کبھار ایک طرح کی عاقبت نا اندیشی سے جس کی وجہ سے حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ ہر ہفتے عنوانات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ملازمتوں کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے، ذمہ داریاں تبدیل ہوتی ہیں۔ وسیع تر تنظیمی ڈھانچوں کو منسوخ کر دیا جاتا ہے، نئی صورت میں تشکیل نو کی جاتی ہے اور نئی ترتیب کے ساتھ دوبارہ متعارف کروایا جاتا ہے۔ راتوں رات نئے ادارے معرض وجود میں آتے ہیں تاکہ دوسرے اداروں میں ضم کر دیے جائیں اور پھر تنظیم نو کی جاتی ہے۔

ردّ و بدل کی یہ ہیجانی کیفیت امریکہ اور یورپ کی صنعت میں ضم کرنے اور دوبارہ ضم کر دینے والوں کے ذریعے آئی ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اس قسم کے ''قابضین'' کی ایک شدید لہر آئی اور بڑے بڑے اجتماعی نوعیت کے ادارے اور متفرق کارپوریٹ ''دیوہیکل'' متعارف ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں بھی اس قسم کی، مساوی قوت کی حامل، چیزیں سامنے آ سکتی ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوبارہ کسی اور کے زیر تصرف آ سکتی ہیں کیونکہ کمپنیاں ضم ہونے کی کوشش کرتی ہیں اور اپنے ذیلی اداروں کو شامل کر دینے کے بعد، ضرر رساں اجزاء سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہیں۔

۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۹ء کے درمیانی عرصہ میں کوئیسٹر کارپوریشن (Questor Corporation) [جو پہلے ڈنہل (Dunhill) انٹرنیشنل انکارپوریٹڈ کے نام سے جانی جاتی تھی] نے آٹھ کمپنیوں کو ضم کیا جبکہ ان میں سے پانچ کو فروخت کیا۔ ایسی بے شمار کمپنیاں ہیں جن کے پاس اسی قسم کی کہانیاں ہیں۔ ایک مینجمنٹ کنسلٹنٹ ایلن جے زکون (Zakon) کے مطابق ''ابھی مزید کاروبار ہونا باقی ہے جو ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے معرض وجود میں آئے گا''۔ جونہی صارف مارکیٹ میں تیزی اور تبدیلی آتی ہے کمپنیوں پر دباؤ آتا ہے کہ وہ بھی، حالات کے مطابق، اپنے اندر تبدیلیاں لے آئیں۔

اس قسم کی کارپوریٹ تبدیلی اور تیزی کی وجہ سے اندرونی تنظیموں میں تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے اور وہ ایسا کرتی ہیں لیکن ان میں تبدیلی کی دیگر وجوہات بھی ہوتی ہیں۔ حالیہ تین سال کے عرصے میں امریکہ کی ۱۰۰ بڑی صنعتی کمپنیوں میں سے ۶۶ نے تنظیمی ڈھانچوں کا اعلان عام کیا۔ دراصل یہ ضرب المثل سے تعلق رکھنے والے ''برفانی تودے'' کی دیدنی صورت ہے۔ تنظیموں کی تنظیم نو جتنی بیان کی جاتی ہے اس کی شرح اس (بیان کردہ) شرح سے زیادہ ہے۔ بہت سی کمپنیاں اپنی تنظیم سازی میں تبدیلیوں کی تفصیلات عام نہیں کرنا چاہتیں۔ مزید یہ کہ ادارے یا ڈویژن یا اس سے نچلی سطح پر ہونے والی چھوٹی یا جزدی تبدیلیوں کو معمولی اور غیر اہم سمجھتے

ہوئے اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ انھیں ریکارڈ میں شمار کیا جائے۔

ایک بڑی مینجمنٹ کنسلٹنگ فرم میک کینسے اینڈ کمپنی (Mckinsey & Company) کے اعلیٰ افسر ڈی آر ڈینئل (Daniel) کہتے ہیں، ''ایک مشیر کی حیثیت سے میری تحقیق ہے کہ بڑی صنعتی کارپوریشنوں میں تنظیمی ردوبدل کے معاملے میں ہر دو سال بعد بڑے پیمانے پر تنظیم نو کی شرح دقیانوسی حیثیت رکھتی ہے۔ گزشتہ سال ہماری فرم نے نجی کارپوریٹ صارفین کی خاطر ۲۰۰ کے لگ بھگ تنظیمی نوعیت کی تحقیقات کیں اور ہماری تحقیقات میں امریکہ سے باہر تنظیمی مسائل زیادہ تعداد میں شامل کیے گئے ہیں۔'' انھوں نے مزید بتایا کہ اس چیز کی پیمائش کے بھی کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ جو کچھ بھی ہو تنظیمی انقلاب کی شدت میں تیزی آ رہی ہے۔

یہ تبدیلیاں اپنی قوت اور وسعت میں بے بہا اضافہ کر رہی ہیں۔ ہاورڈ گریجویٹ سکول آف بزنس ایڈمنسٹریشن (Harvard Graduate School of Busines administration) کے پروفیسر ایل ای گریز کہتے ہیں،: ''چند سال قبل تنظیمی تبدیلیوں کا ہدف کسی چھوٹے ورک گروپ یا کسی ایک ادارے تک محدود تھا...... اب اس تبدیلی کا مرکز کُلی طور پر، کوئی تنظیم ہوتی ہے، جس کی وجہ سے، اعلیٰ مینجروں سمیت، بڑے ڈویژنوں اور ہر سطح پر تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں۔'' یہاں ان کی مراد تنظیمی تبدیلیاں کرنے کے لیے ہر سطح پر کی جانے والی ''انقلابی کاوشیں'' ہیں۔

اگر کسی صنعت میں تنظیم سازی کے لیے ایک ہی مرتبہ تشکیلی ڈھانچے کا جدول کارگر نہیں تو یہی بات بڑی سرکاری ایجنسیوں کے لیے درست شمار کی جائے گی۔ جدید ترین ٹیکنالوجی کی حامل اقوام میں کوئی بھی حکومت ایسی نہیں جس کی کسی اہم وزارت یا ادارے میں حالیہ سالوں میں متواتر تنظیمی تبدیلیاں نہ آئی ہوں۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۵۳ء تک چالیس سالہ عرصے میں، بحران، جنگ اور سماجی انتشار کے باوجود حکومت میں کابینہ کی سطح کے کسی ادارے کا اضافہ نہیں ہوا۔ تاہم ۱۹۵۳ء میں کانگریس نے محکمۂ صحت، تعلیم اور سماجی بہبود تشکیل دیا۔ ۱۹۶۵ء میں مکانات و شہری ترقی کا ادارہ بنا۔ ۱۹۶۷ء میں ذرائع نقل و حمل کا ادارہ بنایا گیا (گویا تیس (۳۰) مختلف ایجنسیوں میں سرانجام دی جانے والی سرگرمیوں کو یکجا کر دیا گیا) اور تقریباً اسی اثنا میں صدرِ مملکت نے محنت اور تجارت کے محکموں کے انضمام کا حکم بھی دے دیا۔

صرف حکومتی ڈھانچے میں ہونے والی تبدیلیاں ہی نمایاں نظر آتی ہیں کیونکہ ان تبدیلیوں کی وجہ سے تمام نچلی ایجنسیوں میں سرگرمیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ واشنگٹن میں اندرونی تشکیلِ نو ایک ذیلی لفظ بن

گیا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں جب جان گارڈنر صحت، تعلیم اور سماجی بہبود کے سیکریٹری بنے تو نیچے سے اوپر تک کی سطح کی تنظیم نو نے اس ادارے کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایجنسیوں، بیورو اور دفاتر کی اس رفتار سے صف بندی کی گئی کہ اس ادارے کے سرکردہ ملازمین ذہنی تھکاوٹ کا شکار ہو گئے۔ (اس تبدیلی کے مخصوص ایام میں اس ادارے کی ایک اعلیٰ عہدیدار، جو میری دوست تھیں، ہر صبح، دفتر جانے سے پہلے، اپنے شوہر کے لیے ایک رقعہ چھوڑ جاتیں، اس رقعہ میں اس ''خاص دن'' کے لیے ان کا ٹیلی فون نمبر لکھا ہوتا تھا۔ تبدیلیاں اتنی تیزی سے ہو رہی تھیں کہ وہ کوئی ایک ٹیلی فون نمبر برقرار نہیں رکھ سکتی تھیں۔ جسے وہ ادارے کی ڈائریکٹری میں درج کر سکیں۔) مسٹر گارڈنر کے بعد آنے والے سیکریٹریوں نے اس تنظیم میں تبدیلیوں کے سلسلے کو جاری رکھا اور ۱۹۶۹ء میں رابرٹ فنچ (Finch) نے اپنی تعیناتی کے محض گیارہ ماہ بعد ہی ایک بڑی تبدیلی کے لیے زور ڈالنا شروع کر دیا، کیونکہ انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ ادارہ اس صورت میں نظامت کرنے کے قابل نہیں رہا جو آج انھیں نظر آ رہی ہے۔

حکومت میں شامل ہونے سے قبل مسٹر گارڈنر نے ''Self-Renewal'' نامی کتاب لکھی جس میں وہ لکھتے ہیں: ''ایک مستقبل شناس منتظم...... تنظیم نو کرتا ہے تاکہ تنظیمی سلسلہ چلانے میں درپیش رکاوٹوں کو دور کیا جاسکے۔ وہ عملے میں تبدیلیاں لے کر آتا ہے۔ وہ ملازمتوں کی تشریح نو کرتا ہے تاکہ انھیں روایتی سطحوں سے بلند کیا جاسکے۔'' ایک اور مقام پر گارڈنر نے حکومتوں کے اندر موجود ''تنظیموں کے بحران'' کی طرف اشارہ کیا ہے اور تجویز دی ہے کہ عوامی اور نجی سطح پر ''بہت سی تنظیموں کا ڈھانچا ایسا ہے جن مسائل کے حل کے لیے مختص ہے جواب موجود ہی نہیں''۔ ان کے مطابق ''از خود۔ تجدیدِ نو کرنے والی تنظیم وہ ہے جو تبدیل ہوتی ضروریات کے ساتھ ساتھ مستقل بنیادوں پر اپنے ڈھانچوں میں تبدیلی لاتی رہے۔

مسٹر گارڈنر کا پیغام تنظیمی زندگی میں ایک مستقل انقلاب کی دعوت دیتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ کہ موجودہ زمانے کی ضروریات پوری کرنے والے مینجر اس بات کا احساس رکھتے ہیں کہ تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی دنیا میں تجدیدِ نو ایک مسلسل عمل کا نام ہے، اور یقیناً ہونا چاہیے، بجائے اس عمل کو زندگی میں ایک بار کیا جانے والا کام قرار دیا جائے۔ اس عمل کا دائرہ کار اب کارپوریشن اور حکومتی ایجنسیوں سے نکل کر باہر جا رہا ہے۔ اسی تناظر میں روزنامہ ''نیویارک ٹائمز'' نے جس روز پلاسٹک، پلائی وڈ اور کاغذ کی صنعت میں انضمام کی تجویز پیش کی، اسی روز برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن (BBC) کی انتظامیہ میں انقلابی تبدیلی کا ذکر بھی کیا، اس کے ساتھ ساتھ کولمبیا یونیورسٹی کے ڈھانچے میں یکسر تبدیلی اور سب سے روایت پسند ادارے نیویارک

میٹروپولیٹن میوزیم کی تنظیم نو کی خبریں بھی شائع کیں۔ اس تمام تر سرگرمی میں جو چیز کارفرما تھی وہ ایک معمولی صلاحیت نہیں تھی بلکہ ایک تاریخی لمحہ تھا۔ تنظیمی تبدیلی...... خودتجدید، جیسے مسٹر گارڈنر نے بتایا، تبدیلی تیز رفتاری کے ردعمل کے طور پر ایک لازمی اور ناگزیر عمل ہے۔

ان تنظیموں میں موجود افراد کے لیے تبدیلی یکسر نئی فضا پیدا کر دیتی ہے جس کے ساتھ نئے مسائل بھی سامنے آتی ہیں۔ تنظیمی نمونوں میں ردوبدل کا مطلب ہے کہ کسی ڈھانچے (کے فرائض اور معاوضے کے مخصوص نظام کے ساتھ) سے فرد کا تعلق تراشیدہ اور وقت کے دورانیے کے لحاظ سے مختصر ہو گیا ہے۔ ہر ہونے والی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اسے خود کی از سر نو سمت بندی کرنی چاہیے۔ آج ایک اوسط شخص کسی ایک ذیلی ڈھانچے، سے دوسرے ڈھانچے کی طرف بھیجا جاتا ہے اور تبدیل کیا جاتا ہے۔ اگر وہ فرد اسی ادارے میں برقرار رہتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کا ادارہ تیزی سے بدلتے ہوئے تنظیمی جدول کی وجہ سے تبدیلی کا شکار ہو گیا ہے لہٰذا اس مجموعی سلسلے میں اس کی حیثیت پہلے جیسی نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس شخص کے تنظیمی روابط پہلے سے کہیں تیز رفتاری سے تبدیل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے اوسط روابط اور رشتے نسبتاً کم پائیدار ہیں اور پہلے کی نسبت، عارضی نوعیت کے ہیں۔

نیا عارضی سلسلہ

ردوبدل کی یہ بلند شرح بڑے ڈرامائی انداز میں ایک علامت کے طور پر بیان کی گئی ہے اور اسے افسران ''پراجیکٹ'' یا ''ٹاسک فورس مینجمنٹ'' کا نام دیتے ہیں۔ یہاں ٹیمیں مختصر مدت کے مخصوص مسائل حل کرنے کے لیے جمع ہوتی ہیں۔ پھر متحرک کھیل کے میدانوں کی طرح منتشر ہو جاتی ہیں اور ان کے انسانی (نوعیت کے) اجزا از سر نو تشکیل پاتے ہیں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان ٹیموں کو چند دن اکٹھے خدمات سرانجام دینے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے اور کبھی یہ سلسلہ چند سالوں پر محیط ہوتا ہے۔ لیکن روایتی افسر شاہی تنظیمی سلسلوں کے اداروں یا ڈویژنوں کے برعکس، جن کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ وہ مستقل نوعیت کے ہیں، پراجیکٹ یا ٹاسک فورس ٹیم اپنے نمونے میں عارضی نوعیت کی ہی ہوتی ہے۔

جب لاک ہیڈ (Lack heed) ایئر کرافٹ کارپوریشن کو ۵۸ بڑے C-5A فوجی ایئر ٹرانسپورٹ طیارے تیار کرنے کا متنازعہ ٹھیکہ ملا تو اس نے صرف اس مقصد کی خاطر ۱۱۰۰۰ افراد پر مشتمل ایک تنظیم تشکیل دی۔ کئی بلین ڈالر کے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے لاک ہیڈ (Lackheed)

کو نہ صرف اپنے ملازمین کا تعاون درکار تھا بلکہ اس نے سینکڑوں ذیلی ٹھیکہ جات والے اداروں سے بھی مدد حاصل کی۔ مجموعی طور پر، ان غیر معمولی طیاروں میں سے ہر ایک طیارے کے لیے درکار ۱۲۰،۰۰۰ پرزوں کی تیاری کے لیے ۶۰۰۰ کمپنیوں کو شامل کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے بنائی گئی لاک ہیڈ تنظیم کی اپنی انتظامیہ اور اس کا اپنا پیچیدہ قسم کا اندرونی ڈھانچا تھا۔

اس معاہدے کے ۲۹ ماہ بعد یعنی مارچ ۱۹۶۹ء کو C-5A کا پہلا تیار شدہ طیارہ ورکشاپ سے باہر آیا۔ ان ۵۸ طیاروں میں سے آخری طیارہ دو سال کے عرصے میں تیار ہونے کی امید تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس مقصد کے حصول کی خاطر تشکیل شدہ تنظیم کی مجوزہ مدت پانچ سال پر محیط تھی۔ ہمیں جو چیزیں یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں وہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہ ایک تلف پذیر تقسیم سامنے آئی ہے...... کاغذ کے لباس یا تلف پذیر ٹشو پیپر کے مساوی کوئی چیز۔

فضائی ٹیکنالوجی سے متعلق صنعتوں میں پراجیکٹ تنظیموں کا رواج وسعت اختیار کر رہا ہے۔ جب ایک سرکردہ تیار کنندہ نے نیشنل ایرونائکس اینڈ سپیس ایجنسی (National Aeronautic and Space Agency) سے ایک بڑا معاہدہ کرنا چاہا تو اس نے کمپنی کے مختلف فعلی ڈویژنوں سے سینکڑوں افراد کی خدمات مستعار لیں۔ حکومت کی طرف سے باقاعدہ بولی کا اعلان کیے جانے سے پہلے ہی اس پراجیکٹ ٹیم نے اعداد و شمار اکٹھا کرنے اور اس کام کے تجزیے کی خاطر ڈیڑھ سال کا عرصہ لگایا۔ جب وقت آیا کہ باقاعدہ بولی تیار کی جائے...... ''جیسے صنعت میں مجوزہ منصوبہ'' کہا جاتا ہے...... تو ''مجوزہ منصوبے سے پہلے تشکیل کردہ ٹیم'' کو برطرف کر دیا گیا اور ان کے فعلی ڈویژنوں میں واپس بھیج دیا گیا۔ اور اس بولی کے لیے ''مجوزہ منصوبہ'' تحریر کرنے کے لیے ایک نئی ٹیم تشکیل دی گئی۔

منصوبہ تحریر کرنے والی ٹیم عموماً چند ہفتوں تک اکٹھا کام کرتی ہے۔ اگر ایک مرتبہ منصوبہ جمع کروایا جائے تو اس ٹیم کو برطرف کر دیا جاتا ہے۔ جب معاہدہ منظور کر لیا جائے (اگر ایسا ہو) تو نئی ٹیمیں تشکیل دی جاتی ہیں تاکہ وہ ٹھیکے کو کامیابی سے ہمکنار کر سکیں اور مطلوبہ چیزوں کو تیار کر سکیں۔ کچھ افراد ایسے ہیں جو اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ کسی کامیاب پراجیکٹ میں شمولیت اختیار کر سکتے ہیں۔ تاہم روایتی طور پر لوگوں کو ملازمت کے چند مراحل ہی میں کام کرنے کے لیے بلایا جا سکتا ہے۔

اگرچہ اس طرح کی تنظیم کو فضائی ٹیکنالوجی کی کمپنیوں کے حوالے سے ہی جانا جاتا ہے تاہم اب یہ

روایتی صنعتوں میں بھی متعارف ہورہی ہیں۔ اس کو ایسے وقت میں بھی تشکیل دیا جاسکتا ہے جب غیر معمولی صورت حال میں کسی کام کی تکمیل مقصود ہو یعنی جب ایک ہی مرتبہ کا معاملہ درکار ہو۔

جریدے ''بزنس ویک'' کے مطابق ''محض چند سالوں میں پراجیکٹ مینجر کا مقام عام سا ہوگیا ہے۔'' بے شک پراجیکٹ مینجمنٹ کو ایک خاص انتظامی فن کی حیثیت حاصل ہے اور امریکہ و یورپ میں مینجروں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو ایک پراجیکٹ سے دوسرے پراجیکٹ، ایک کمپنی سے دوسری کمپنی میں جاتے رہتے ہیں اور کبھی بھی معمول کا یا طویل المیعاد کام نہیں کرتے۔ پراجیکٹ اور ٹاسک فورس مینجمنٹ پر اب کتابیں بھی آنا شروع ہوگئی ہیں۔ ڈیٹن، اوہائیو (Dayton, Ohio) پر واقع یونائیٹڈ سٹیٹس ایئر فورس سسٹمز کمانڈ، پراجیکٹ مینجمنٹ کی خاطر انتظامی افسران کی تربیت کے لیے ایک سکول چلا رہا ہے۔

امریکہ اور امریکہ سے باہر ٹاسک فورس اور دیگر عارضی سلسلوں کے گروپ حکومت اور دیگر بزنس افسر شاہی میں بھی رواج پاتے جارہے ہیں۔ عارضی ٹیمیں، جن کے ارکان کسی ایک مخصوص مسئلے کو حل کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر علیحدہ ہوجاتے ہیں، یہ سائنس کی ایک خصوصیت ہے اور یہ سائنسی طبقے کی حرکی صلاحیت شمار کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کے ارکان، اگر جغرافیائی طور پر نہیں تو، تنظیمی طور پر مسلسل تحرک پذیر رہتے ہیں۔

ٹیلی ڈائن انکارپوریٹڈ (Teledyne incorporated) کے شریک بانی اور یونیورسٹی آف ٹیکساس کے سکول آف بزنس کے موجودہ ڈین جارج کوزمیٹسکی (George Kazmetsky) نے ''معمول کے مطابق'' اور ''معمول سے ہٹ کر'' چلنے والی تنظیموں میں تفریق کی ہے۔ مؤخر الذکر عمومی طور پر ایک خاص قسم کے مسائل پر توجہ دیتی ہیں۔ وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے اعداد و شمار پیش کرتے ہیں کہ ''معمول سے ہٹ کر'' چلنے والی تنظیمیں، جن میں وہ حکومت اور بہت سی جدید ٹیکنالوجی کی حامل کمپنیوں کا شمار بھی کرتے ہیں، اتنی تیز رفتاری سے پروان چڑھ رہی ہیں کہ سال ۲۰۰۱ء تک وہ امریکی کی کل افرادی قوت میں سے ۶۵ فی صد کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔ اس شعبے میں کام کرنے والی تنظیمیں عموماً وہ ہیں جو عارضی ٹیموں اور ٹاسک فورسز پر انحصار کرتی ہیں۔

یہ بات تو بڑے واضح انداز میں کہی جاسکتی ہے کہ کسی خاص مسئلے کے حل کے لیے کسی گروپ کو یکجا کرنا او رمشن کی تکمیل کے بعد اسے برطرف کردینے میں کوئی بات بھی نئی نہیں۔ جو بات نئی ہے وہ شدت ہے، جس سے تنظیمیں اس عارضی نظام سے مطابقت رکھتی ہیں۔ بہت سی بڑی تنظیموں کے مستقل نظر آنے والے ڈھانچے، عموماً اس لیے کہ وہ

تبدیلی کی راہ میں حائل ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اب ان عارضی سلسلوں کی وجہ سے نفوذ پذیر ہوگئے ہیں۔

بظاہر ان عارضی تنظیموں کی بڑھتی ہوئی تعداد غیر اہم نظر آتی ہے تاہم ان کی کارکردگی کا طریقۂ کار تنظیموں کے روایتی نظریے، جو کم و بیش مستقل ڈھانچوں پر مشتمل ہوتا ہے، کو تباہی کی طرف گامزن کیے ہوئے ہے۔ ختم ہوجانے والی تنظیمیں، عارضی ٹیمیں یا کمیٹیاں، مستقل طور پر قائم شدہ ڈھانچوں کا متبادل تو نہیں لیکن وہ انھیں حیران کن حد تک تبدیل کردیتے ہیں اور ان (اداروں) میں سے افراد اور قوت کا اخراج کرلیتے ہیں۔ آج جبکہ فعلی ڈویژن اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں، زیادہ سے زیادہ پراجیکٹ ٹیمیں، ٹاسک فورسز اور اسی طرح کے تنظیمی ڈھانچے انہی کے درمیان تشکیل پاتے ہیں اور پھر ختم ہوجاتے ہیں اور لوگ ان فعلی تنظیموں میں چپکے رہنے کی بجائے بڑی تیزی سے ادھر اُدھر اپنا سلسلہ چلائے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنا ''فعلی ٹھکانہ'' قائم رکھتے ہیں لیکن عارضی ٹیم ارکان کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے کے لیے بار بار اس تعلق کو توڑتے ہیں۔

ہم لوگ جلد ہی یہ بات جان لیں گے کہ یہ عمل جو بار بار دہرایا جارہا ہے متعلقہ لوگوں کی ہمدردیاں تبدیل کردیتا ہے؛ مقتدر افراد کی صفوں کو ہلاتا ہے؛ اور اس شرح میں اضافہ کرتا ہے جس پر کوئی فرد تنظیمی تبدیلی کے لیے مجبور کردیا جاتا ہے۔ تاہم فی الحال اس بات کا ادراک ضروری ہے کہ عارضی تنظیم سازی کا عروج مجموعی معاشرے میں تیز رفتار تبدیلی کا ایک بلاواسطہ اثر ہے۔

جب تک کوئی معاشرہ نسبتاً مستحکم اور غیر متغیر رہتا ہے، اس کے ہاتھوں افراد کو پیش آنے والے مسائل عمومی اور قابلِ پیش گوئی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے ماحول میں تنظیمیں نسبتاً مستقل نوعیت کی ہوتی ہیں لیکن جب تبدیلی کی رفتار تیز ہوجاتی ہے، زیادہ سے زیادہ نئے اور پہلی بار۔ درپیش آنے والے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور روایتی قسم کی تنظیمیں ان نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ناموزوں نظر آتی ہیں وہ ان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھ سکتیں ''Organization for Social and Technical Innovation'' کے صدر ڈاکٹر ڈونلڈ اے شون (Dr. Donald A. Schon) کہتے ہیں کہ جب تک یہ سلسل چلتا رہے ہمیں چاہیے کہ ہم ''از خود ختم کی جانی والی'' تنظیمیں بناتے ہیں...... بہت سے خود مختار، نیم وابستہ یونٹ جو اپنی ضرورت ختم ہونے کے بعد ختم ہوجائیں، فروخت ہوجائیں اور ہمیشہ کے لیے غائب ہوجائیں۔''

وہ روایتی فعلی تنظیمی ڈھانچے جو قابلِ پیش گوئی، عدم نادر الوجود حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بنائے گئے تھے وہ ماحول میں ہونے والی بنیادی تبدیلیوں کا مؤثر مقابلہ کرنے میں ناکام رہے۔ لہٰذا مثالی قسم

کے عارضی ڈھانچے تشکیل دیے جاتے ہیں تاکہ مجموعی تنظیم اپنا وجود برقرار رکھ کر آگے کی طرف گامزن رہے۔ یہ روایت فنِ تعمیر میں معیاریت کی مثال ہے۔ ہم نے معیاریت کو بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ معیاریت، اجزا کی مدت کو کم کرنے کے بعد، کل ڈھانچا کی معیاریت کو مزید دیرپا کردینے کا نام ہے۔ اس بات کا اطلاق تنظیموں پر بھی ہوتا ہے اور اس سے مختصر المدت یا تلف پذیر تنظیمی اجزا کے عروج کو بیان کرنے میں مدد ملتی ہے۔

جوں جوں تیز رفتاری کا سلسلہ جاری رہتا ہے، تنظیموں میں تجدید نو کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ مینجمنٹ کنسلٹنٹ برنارڈ مولر۔ تھائم (Bernard Muller-Thym) کے مطابق نئی ٹیکنالوجی، جس میں بھرپور طریقے سے جدید مینجمنٹ کے اوصاف شامل ہیں، یکسر نئی صورت حال پیدا کردیتی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں۔ ''اس وقت جو چیز ہماری گرفت میں ہے وہ پیداواری صلاحیت ہے جو ذہانت کے ساتھ برقرار ہے، معلومات کے ساتھ برقرار رہے؛ کوئی بھی شخص اگر چاہے تو وہ پورے پلانٹ کی، محض ایک گھنٹے کے وقفے سے ترتیب نو کرسکتا ہے۔'' اور جو بات ایک پلانٹ کے لیے کی جاسکتی ہے وہ پوری کی پوری تنظیم پر صادق آسکتی ہے۔

مختصر یہ کہ جدید ترین صنعتی معاشرے کا تنظیمی جغرافیہ انتہاء درجہ کا حرکی ہونے کا امکان ہے، جس میں اضطراب اور تبدیلی ہو۔ ماحول جتنی تیزی سے تبدیل ہوگا بننے والی تنظیموں (کی بقا) کی مدت اتنی ہی مختصر ہوگی۔ انتظامی ڈھانچے میں، فن تعمیر کے کسی ڈھانچے کی طرح، ہم لوگ طویل المیعاد سلسلے سے عارضی چیزوں کی طرف گامزن ہیں، دائمی سے ناپائیداری کی طرف۔ ہم لوگ افسر شاہی سے عارضی سلسلے کی طرف گامزن ہیں۔

اس طرح تیز رفتار دھکا تنظیم میں اپنا نفوذ کرتا ہے۔ دوام، جو افسر شاہی کا ایک اہم وصف ہے، کھوکھلے پن کا شکار ہے، اور ہم لوگ ایک عجیب وغریب اور درشت نتیجہ پر پہنچتے ہیں: تنظیموں کے ان دیکھے جغرافیے سے انسانی تعلق میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے بالکل ایسے جیسے اس کا چیزوں، مقامات اور ان لوگوں سے تعلق جو تسلسل کے ساتھ تبدیل ہوتے ہوئے تنظیمی ڈھانچوں میں اپنی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ جس طرح نئے خانہ بدوش ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے ہیں، اور کوئی شخص، بڑی تیزی سے، ایک تنظیمی ڈھانچے سے دوسرے تنظیمی ڈھانچے میں جاتا ہے۔

نظام مراتب کی ناکامی

ایک اور چیز وقوع پذیر ہورہی ہے: طاقت سے منسوب تعلقات میں ایک انقلابی تبدیلی۔ نہ صرف بڑی تنظیمیں ان دونوں امور کے لیے مجبور کی جاتی ہیں یعنی اپنے اندرونی ڈھانچا میں تبدیلی لے کر آنا اور عارضی

یونٹس (اکائیاں) قائم کرنا، نہ صرف یہ بلکہ وہ اس بات میں بھی دشواری محسوس کررہے ہیں کہ وہ اپنے روایتی، انتظام نظام مراتب کو قائم رکھ سکیں۔

یہ تجویز کرنا انتہائی رجائیت پسندی پر مبنی ہوگا کہ آج کے عہد میں صنعت یا حکومت میں موجود کارکنان اپنی کمپنی کی انتظامیہ میں بھرپور حصہ لیتے ہیں...... چاہے وہ سرمایہ دارانہ، یا خاص اس مقصد کی خاطر، کسی سوشلسٹ اور کمیونسٹ ممالک میں موجود ہیں۔ تاہم اس بات کی واضح شہادت ملتی ہے کہ افسر شاہی کے وہ نظامِ مراتب، جو ''فیصلے کرنے والوں'' کو عملدرآمد کرنے والوں سے علیحدہ کرتے ہیں، اب تبدیل کیے جارہے ہیں، روک دیے گئے ہیں یا توڑ دیے گئے ہیں۔

میک گل یونیورسٹی (McGill University) کے گریجویٹ سکول آف برنس کے پروفیسر ولیئم ایچ ریڈ (Read) کے مطابق یہ عمل اس صنعت میں دکھائی دیتا ہے جہاں نظام مراتب پر ''ناقابلِ مزاحمت دباؤ'' کا سلسلہ کارفرما ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں، ''تنظیموں کا مرکزی، معیاری اور اہم کام ''اوپر'' اور ''نیچے'' کی بجائے اب ''کسی خاص جانب'' رابطہ کیے ہوئے ہے یعنی، اوسطاً رشتوں میں بھی۔ کیونکہ جو لوگ ''کسی خاص جانب'' رابطہ کیے ہوتے ہیں۔ یعنی، اوسطاً اسی سطح کی تنظیم کی طرف۔ ان کا ردعمل مختلف ہوتا ہے، مختلف دباؤ کے باوجود بھی کام کرتے ہیں، بہ نسبت ان لوگوں کے جنھوں نے مراتب میں اوپر یا نیچے کی جانب رابطہ کرنا ہوتا ہے۔

اس کو مثال کے طور پر پیش کرنے کے لیے آیئے ایک خاص ماحول میں دیکھتے ہیں جس میں افسر شاہی کا ایک روایتی نظام مراتب کا عمل دخل ہوتا ہے۔ جب میں جوان تھا تو میں نے ایک فونڈری میں ہیلپر کی حیثیت سے کام کیا۔ یہاں پر عمارت کی ایک غار نما جگہ پر، ہزاروں افراد گاڑیوں کی کرینک شانٹ بنانے کا کام کرتے تھے۔ یہ سماں عجیب وغریب ہوتا تھا...... دھواں اور کالک سے چہرے سیاہ ہوجاتے تھے، سیاہ گرد سے فرش کالے ہوجاتے تھے اور ہوا مکدر ہوجاتی تھی، سلفر اور جلی ہوئی ریت کی ناگوار اور چبھنے والی بو ناک کے نتھنوں میں سماجاتی تھی۔ ایک چلاتا ہوا شخص سرخ اور گرم ڈھلائی اور مائع کی ہوئی گرم ریت، نیچے موجود شخص کو پکڑاتا تھا۔ پگھلتے ہوئے لوہے کے شعلے، آگ کی زرد چمک اور احمقانہ وبے ہنگم آوازیں: چیختے چلاتے لوگ، زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ، کارخانے میں چیزوں کو کوٹنے کی آوازیں، دبی ہوا کی آواز۔

کسی اجنبی کے لیے یہ افراتفری کا ماحول ثابت ہوگا۔ لیکن جو لوگ اندر موجود ہیں اور کام میں مصروف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر چیز ایک نظم وضبط کے ساتھ چل رہی ہے۔ افسر شاہی کا حکم چل رہا ہے۔ لوگ ایک ہی عمل

بار بار کرتے ہیں۔ ہر صورت حال پر اصولوں کی حکمرانی ہے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ایک عمودی نظام مراتب میں اس کا مقام کون سا ہے، وہ نظام مراتب ادنیٰ اجرت حاصل کرنے والے پیسٹر (Paster) سے ان دیکھے ''ان'' (they) تک چلا جاتا ہے جو ایک اور عمارت میں انتظامی افسران والے کمروں میں بیٹھے ہیں۔

اس وسیع تر چھپریل میں جہاں ہم کام کرتے تھے، ہمیشہ کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہو جاتی تھی۔ کوئی بیئرنگ جل جاتا، بیلٹ ٹوٹ جاتی یا گیئر ٹوٹ جاتا ہے۔ جب کسی شعبے میں ایسا ہو جاتا، تو کام روک دیا جاتا اور حکام بالا کو اضطرابی قسم کے پیغامات، اوپر اور نیچے جانا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس خرابی کے نزدیک کھڑا ہوا شخص اس بات کی نشاندہی اپنے فورمین کو کرے گا۔ فورمین فوراً ہی اپنے پروڈکشن سپروائزر کو اطلاع کرے گا۔ پروڈکشن سپروائزر اس کی اطلاع مینٹیننس (maintenance) سپروائزر کو کرے گا اور مینٹیننس سپروائزر اس کی مرمت کی خاطر عملے کو روانہ کر دے گا۔

اس نظام میں ''معلومات'' کسی محنت کش کے ہاتھوں ''اوپر'' کی طرف یعنی فورمین سے پروڈکشن سپروائزر کی طرف روانہ ہوتی ہیں۔ پروڈکشن سپروائزر اسے ''ایک خاص جانب'' بھیج دیتا ہے، اس شخص کے پاس جو مرتبے میں اس کے مساوی ہے (مینٹیننس سپروائزر) جو اسے ''نیچے'' کی طرف یعنی مرمت کرنے والے کی طرف بھیج دیتا ہے اور اس کا کام چیزوں کو چلانا ہے۔ لہٰذا مرمت ہونے سے پہلے یہ معلومات چار قدم اوپر اور نیچے گئی، جس میں ایک قدم مساوی بھی شامل ہے۔

اس نظام کی بنیاد اس ان کہے مفروضے پر قائم ہے کہ نچلی سطح پر موجود میلا کچیلا، پسینے میں شرابور شخص مضبوط فیصلے نہیں کر سکتا۔ مراتب میں اعلیٰ عہدیدار وہی درست فیصلے یا صوابدیدی اختیارات کے حامل ہیں اور انھیں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اوپر کی سطح پر بیٹھے ہوئے لوگ فیصلے کرتے ہیں؛ اور نچلی سطح کے ملازمین اس پر عملدرآمد کرتے ہیں۔ ملازمین کا ایک گروپ تنظیم کے دماغ کی نمائندگی کرتا ہے اور دوسرا گروپ ہاتھوں کی۔

یہ روایتی افسر شاہی ترتیب، ایک خاص رفتار سے مسائل حل کرنے کے لیے مثالی ہے۔ لیکن جب معاملات تیز تر ہو جائیں، یا مسائل معمول کے مطابق نہ رہیں تو افراتفری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھنا انتہائی آسان ہے کہ ایسا کیوں ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ معاملات زندگی کی تیز رفتاری (خاص طور سے خودکاری کی وجہ سے پیداوار میں تیزی کا رجحان) کا مطلب ہے ''بیکار وقت'' کا گزرتا ہوا ہر لمحہ پیداواری نقصان کا باعث جتنا اب ہے پہلے کبھی

نہیں تھا۔ تاخیر اب انتہائی مہنگی پڑتی ہے۔ معلومات کو پہلے سے کہیں تیز رفتاری سے چلنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ تیزی سے ہوتی ہوئی تبدیلی، جوئی اور غیر متوقع مسائل کی وجہ سے ہوتی ہے، مطلوبہ معلومات کی تعداد میں اضافے کا باعث ہے۔ کسی انوکھے مسئلے سے نبرد آزما ہونے کے لیے مزید معلومات کی ضرورت ہوتی ہے بجائے اس مسئلے کے جسے یا جس نوعیت کے مسئلے کو ہم پہلے حل کر چکے ہیں۔ یہ تیز رفتاری کے ساتھ زیادہ معلومات کے حصول کا تقاضا ہے جو عمودی نوعیت کے ان نظام مراتب کو رد کر رہا ہے جن کا تعلق خاص افسر شاہی سے ہے۔

فونڈری میں ایک تیز رفتار اطلاع پہنچانے کا سلسلہ کارگر ہو سکتا ہے وہ اس صورت میں ممکن ہے کہ اگر کوئی کارکن اس رکاوٹ کی فوری اطلاع بلاواسطہ مینٹیننس سپروائزر یا مرمت کے عملے کو دے سکے، بجائے اس کے کہ وہ خبر پہلے فورمین اور پھر سپروائزر کو دی جائے۔ اس صورت میں چار مرحلوں میں دی جانے والی خبر صرف دو مرحلوں تک محدود رہ جائے گی۔ غرض اس میں ۲۵ سے ۵۰ فی صد کی بچت ہو گی۔ اس میں ایک بات اور واضح ہے کہ جو مرحلے اس میں سے منہا کیے جائیں گے وہ اوپر اور نیچے، یعنی عمودی نوعیت کے مرحلے ہیں۔

آج کے عہد میں اس قسم کی بچت ان منیجروں کے ہاتھ بہترین انداز میں کرنا ممکن ہو جاتا ہے جو تبدیلی کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہتے ہیں۔ وہ چھوٹے راستے جو نظام مراتب کو بالائے طاق رکھ اپنائے جاتے ہیں ان کا اطلاق تیزی سے ہزاروں فیکٹریوں، دفاتر، لیبارٹریوں حتیٰ کہ فوج میں بھی ہونے لگا ہے۔ اس طرح کی چھوٹی تبدیلیوں کا اجتماعی نتیجہ ذرائع ابلاغ کے نظاموں کا عمودی سے بغلی طرف جانا ہے۔ اور اس کا مطلوبہ نتیجہ ابلاغ میں تیزی ہے۔ تاہم یہ افقی یا سطح سلسلہ، کبھی معتبر سمجھے جانے والے نظام مراتب کے لیے ایک دھچکے کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ ''دماغ اور ہاتھ'' دونوں کی تمثیل میں ایک نوکیلا سوراخ ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ عمودی نظام مراتب کا سلسلہ بڑی تیزی سے نظرانداز کیا جا رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ''ہاتھ'' بھی اب فیصلہ کرنے کی صف میں شامل ہونے لگے ہیں۔ جب کوئی محنت کش (اپنے اوپر تعینات) فورمین یا سپروائزر کو نظر انداز کرتے ہوئے، بلاواسطہ، مرمت کرنے والی ٹیم کو بلا لیتا ہے تو وہ ایسا فیصلہ کر رہا ہوتا ہے جو ماضی میں صرف ''اعلیٰ ترین افسران'' کے لیے ہی مختص تھا۔

نظام مراتب کی یہ خاموش، مگر اہم تنزلی نہ صرف افسران بالا کے کمروں میں بلکہ فیکٹری (میں کارکنان) کی سطح پر بھی پائی جاتی ہے اور اس میں ماہرین کی آمد سے شدت بھی آ گئی ہے...... یعنی اپنے شعبوں میں موجود ہر ہر چیز کے وہ ماہرین کہ افسران بالا کو انھیں سمجھنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ منیجروں کو بڑی حد تک

ان ماہرین کی آراء پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ برقیاتی اختراع سے متعلق ماہرین طبیعیات، کمپیوٹر، پروگرامرز، سسٹم ڈیزائنرز، آپریشن ریسر چرز، انجینئرنگ سپیشلسٹ...... اسی طرح کے لوگ فیصلہ سازی کے عمل کو آگے چلائے ہوئے ہیں۔ ایک وقت وہ تھا جب یہ لوگ محض ان افسران بالا سے مشاورت کرتے تھے جنھوں نے خود کو مینجروں کی سطح پر فیصلے کرنے کے لیے مختص کیا ہوا تھا۔ آج مینجر حضرات فیصلہ کرنے کی اجارہ داری سے مبرا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

میک گل (McGill) سے تعلق رکھنے پروفیسر ریڈ (Read) کہتے ہیں کہ معاملات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ ''ماہرین اب حکام بالا کے نظام مراتب میں زیادہ فٹ نہیں بیٹھتے'' اور ''اس بات کا انتظار بھی نہیں کرتے کہ اعلیٰ سطح پر ہونے والا فیصلہ کیا ہے''۔ اب ان کے پاس وقت نہیں کہ فیصلے نظام مراتب سے گھومتے گھماتے نیچے سے اوپر تک جائیں، لہٰذا ''مشیران'' نے مشاورت لینی چھوڑ دی ہے اور اپنے فیصلے خود کرنا شروع کر دیے ہیں۔ عموماً یہ فیصلے کارکنان کی بلاواسطہ مشاورت اور نچلی سطح کے ٹیکنیشنز کی مدد سے کیے جاتے ہیں۔

انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کارپوریشن کے ڈائریکٹر آف پرسونل پلاننگ مسٹر فرینک میٹزگر (Metzger) کہتے ہیں، ''آپ کو نظام مراتب کے ساتھ زیادہ وابستہ ہونے کی ضرورت نہیں، آپ کو ایک اجلاس میں نمائندگی کے لیے نظام مراتب کے پانچ چھ مختلف سطح کے مراتب کی سہولت دستیاب ہونی چاہیے، آپ کو چاہیے کہ آپ نظام مراتب اور تنخواہ کا پیمانہ نظر انداز کرتے ہوئے کام کو نمٹانے کی طرف توجہ مبذول کریں۔''

پروفیسر ریڈ (Read) کے مطابق، ''اس طرح کے حقائق تنظیموں میں سوچنے سمجھنے، عمل کرنے اور فیصلہ کرنے میں ایک لڑکھڑاتی ہوئی تبدیلی کی نمائندگی کرتے ہیں''۔ ممکن ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرنا چاہ رہے ہوں کہ ''اس تبدیل ہوتی ہوئی ٹیکنالوجی میں ابلاغ اور ہم آہنگی سے متعلق مسائل سے نبرد آزما ہونے کے مؤثر طریقے لوگوں اور ان کے فرائض کی نئی ترتیب سے ممکن ہوں، ایک ایسی ترتیب جو روایتی افسر شاہی کی روایت سے ذرا ہٹ کر ہوں۔''

بہت عرصہ ہوا کہ جب افسر شاہی کا نظام مراتب کالعدم قرار دیا گیا، کیونکہ افسر شاہی ان کاموں کے لیے موزوں ہے جن کی انجام دہی کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت ہوتی ہے اور بلاشبہ مستقبل میں بھی کچھ امور افراد ہی کے ہاتھوں سرانجام دیے جائیں گے۔ تاہم کچھ اور ایسے ہیں جو کمپیوٹر اور خودکار مشینوں کے ذریعے بہتر انجام دیے جا سکتے ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ جدید ترین صنعتی معاشروں میں اس طرح کے

بہت سے کام خودکار نظام کے تحت مشینوں سے لیے جائیں گے، اور ان کے لیے افسر شاہانہ تنظیموں ہی کی ضرورت ہے۔ تہذیب پر افسر شاہی کی گرفت کو پہلے کی نسبت مضبوط کیے بغیر، خودکاری اس کو رد کرنے کی راہ ہموار کر رہی ہے۔

جوں جوں مشینیں معمول کے کام پر اپنی گرفت مضبوط تر کرتی چلی جائیں گی، تیز رفتار دھکا ماحول میں اپنے انوکھے پن کی شرح کو بڑھاتا چلا جائے گا، معاشرے (اور اس کی تنظیموں) کی زیادہ سے زیادہ توانائی معمول سے ہٹے ہوئے مسائل کے لیے صرف ہونی چاہیے۔ اس کے لیے تخیل اور تخلیقیت کی ایک خاص شدت کی ضرورت ہے جو افسر شاہی، افراد سے بھرپور تنظیموں، اپنے مستقل ڈھانچوں اور اپنے بھرپور نظام مراتب کے ساتھ بھی، فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا اس نتیجے پر پہنچ جانا حیران کن نہیں کہ آج کے عہد میں جہاں کہیں بھی تنظیمیں تکنیکی یا سماجی تبدیلی کی رو میں بہہ رہی ہیں، جہاں کہیں بھی تحقیق اور ترقی اہمیت کی حامل ہے، جہاں کہیں بھی انسانوں کو پہلی بار پیش آنے والے مسائل کا سامنا ہے، افسر شاہی کے طور طریقوں کا زوال سامنے آیا ہے۔ ان کے سامنے موجود تنظیموں میں انسانی رشتوں اور روابط کا ایک نیا نظام جنم لے رہا ہے۔

اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے ان تنظیموں کو ان افسر شاہانہ طور طریقوں سے نجات حاصل کرنی چاہیے جو ان کی سرگرمیوں کو مسرور کرتی ہیں، جو انھیں نسبتاً کم حساس بنا رہی ہیں اور تبدیلی کے نقطۂ نظر سے ان کے ردعمل کی رفتار کم کر رہی ہیں۔

ڈریکسل (Drexel) انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں معاشیات کے پروفیسر جوزف اے رافیل (Joseph A Raffaele) کے مطابق اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم لوگ ''تکنیکی طور پر ہم سر، محنت کش معاشرے'' کی طرف گامزن ہیں جس میں ''قائد اور اس کے پیچھے چلنے والوں کے درمیان موجود خط مبہم ہو چکا ہے''۔

جدید ترین صنعتی انسان، بجائے ایک مستقل، واضح مقام پر بیٹھنے اور اوپر کی سطح سے نیچے بھیجے گئے احکامات کی، بغیر سوچے سمجھے، بجا آوری کی اس ضرورت کو محسوس کر رہا ہے کہ اسے فیصلہ ساز ذمہ داری سنبھالنی چاہیے...... اور اسے یہ تمام امور ایک ایسی تنظیم میں سرانجام دینے چاہئیں جس میں بڑی تیزی اور باریکی سے تبدیلیاں رونما ہوں اور اس کی بنیاد انتہائی ناپائیدار انسانی رشتوں پر ہو۔ اس سلسلے میں کچھ اور بھی کیا جائے، یہ وہ راویتی، شناسا قسم کی قدیمی افسر شاہی نہیں جس پر، ابھی تک، ہمارے ناول نگار اور تنقید نگار، اپنے پھسڈی اور زنگ آلود نیزے پھینک رہے ہیں۔

افسر شاہی سے ماوریٰ

اگر چہ میکس ویبر (Max Weber) وہ پہلا شخص ہے جس نے افسر شاہی کی تعریف بیان کی اور اس کی کامیابی کی پیش گوئی کی، تو وارن بینس (Warren Bennis) کا نام عمرانیات کی نصابی کتب میں ایسے شخص کے طور پر لکھا جائے گا جس نے بڑے مدلل انداز میں اس کے زوال کی پیش گوئی کی اوران تنظیموں کے خاکے پیش کیے جو اس (افسر شاہی) کے متبادل کے طور پر سامنے آ رہی ہیں۔ عین اس وقت جب افسر شاہی کے خلاف، امریکی کیمپوں اور دیگر مقامات پر، شور وغل اپنے عروج پر تھا، وارن بینس (Bennis) نے ایک سماجی نفسیات دان اور صنعتی انتظامی امور کے پروفیسر کی حیثیت سے، بڑے واضح انداز میں پیش گوئی کی کہ ''اگلے پچیس سے پچاس سالوں میں'' ہم تمام لوگ، ''افسر شاہی کے خاتمے میں شریک ہوں گے۔'' انھوں نے زور دیا کہ ہم سب ''افسر شاہی سے ماوریٰ'' ہو کر چیزوں کو دیکھنا شروع کر دیں۔

لہٰذا بینس مزید کہتے ہیں، ''اگر چہ افسر شاہی کے لیے، ہمدردانہ بنیادوں پر ''بہتر انسانی تعلقات'' اور ''مسیحی اقدار'' کی بہت سی تجاویز پیش کی گئیں، لیکن افسر شاہی تیز رفتار تبدیلی سے ہم آہنگ ہونے کی عدم صلاحیت پر ہی قائم رہی......

مسٹر بینس مزید کہتے ہیں، ''افسر شاہی ایک بلند درجہ مسابقتی، عدم ترمیمی اور مستحکم ماحول میں پھلتی پھولتی ہے، جیسا ماحول اس کے عروج کے زمانے، یعنی صنعتی انقلاب کے وقت تھا۔ مقتدر افراد کا ایک روایتی ڈھانچا، جس میں طاقت چند افراد کے ہاتھوں میں محدود ہوتی...... تھی، اور ہے، جس میں معمول کے مطابق امور کی انجام دہی کے لیے انتہائی ساز گار سماجی انتظامات موجود ہوتے ہیں۔ تاہم ماحول صرف اس صورت میں تبدیل ہو گیا ہے کہ اس نے نظام کو پیچیدہ کر دیا ہے۔ استحکام ختم ہو گیا ہے۔''

ہر عہد اپنی رفتار کے مطابق، تنظیموں کی ایک خاص قسم تشکیل دیتا ہے۔ زرعی تہذیبوں کے ایک طویل دور میں معاشرے نسبتاً کم پائیدار نوعیت کے ہوتے تھے۔ مواصلات اور ذرائع نقل وحمل میں تاخیر معلومات کی رفتار کو بھی سست روی کا شکار کر دیتی ہے۔ فرد کی ذاتی زندگی کی رفتار بھی سست تھی اور تنظیمیں ان امور کے لیے شاذ ہی استعمال کی جاتی تھیں جنھیں ہم تیز رفتار فیصلوں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

صنعتی عہد فرد اور تنظیمی زندگی، دونوں کی شرح رفتار میں اضافے کا باعث بنا۔ دراصل اس خاص وجہ کے تحت ہی افسر شاہی کا وجود ممکن ہوا۔ باوجود اس کے کہ وہ ہمیں سست اور نااہل نظر آتی تھیں، مجموعی طور پر

یہ افسر شاہی، اپنے وجود سے قبل موجود تنظیموں سے بہت اور تیز رفتار فیصلے کرتی تھی۔ اپنے تمام تر اصولوں کے ساتھ، اور خاص ضابطوں کی موجودگی میں، جس میں خاص طور پر یہ نشاندہی کی جاتی تھی کہ مختلف مسائل سے کیسے نبرد آزما ہونا ہے، فیصلے کرنے کی رفتار کو، صنعت کاری کی تیز رفتاری سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

مسٹر ویبر (Weber) اس بات پر توجہ دینے میں خاص دلچسپی رکھتے تھے اور انھوں نے نشاندہی کی کہ ''وہ غیر معمولی رفتار جس سے عوامی اعلانات اور معاشی وسیاسی حقائق کی تشہیر ہوتی ہے وہ انتظامی ردِ عمل کی رفتار بڑھانے کے لیے دباؤ ڈالتے ہیں......'' تاہم ان سے ذرا سی غلطی ہوئی جب انھوں نے کہا، ''اس طرح کے ردِ عمل کا بہتر جواب صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب معاملات کسی سخت افسر جاہی تنظیم کے ہاتھوں میں ہوں۔'' کیونکہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تبدیلی کی رفتار اس قدر تیز ہو چکی ہے کہ افسر شاہی بھی اس سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔ معلومات معاشرے میں اتنی تیزی سے نفوذ کرتی ہیں، ٹیکنالوجی میں شدت سے آنے والی تبدیلیاں اتنی تیزی سے آتی ہیں کہ نئی اور فوری ردِ عمل فراہم کرنے والی تنظیموں کو ہی مستقبل کی صورت گری کرنی ہے۔

پھر جدید ترین صنعتی معاشرے میں تنظیموں کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں؟ مسٹر بینس (Bennis) کے بقول، ''کلیدی لفظ 'عارضی' ہی ہوگا؛ اور ان میں مطابقت پذیر اور تیزی سے تبدیل ہونے والے عارضی نظام۔'' مسائل ٹاسک فورسز کے ذریعے حل کر لیے جائیں گے جو ''نسبتاً'' اجنبی لوگوں پر مشتمل ہوں گی اور پیشہ ورانہ مہارت کے حامل افراد کے گروہ کی نمائندگی کریں گی۔''

اس نظام میں منتظمین اور منیجر مختلف عارضی ٹیموں کے رابطہ کار کی حیثیت سے کام کریں گے۔ یہ لوگ پیشہ ورانہ مہارت کے حامل مختلف افراد کی پیشہ ورانہ زبان سمجھنے میں خصوصیت رکھتے ہوں گے، اور یہ لوگ مختلف گروپوں سے بھی رابطہ کریں گے، ایک گروپ کی زبان کا ترجمہ ومفہوم دوسرے گروپ کو ترسیل کریں گے۔ مسٹر بینس کے نزدیک اس نظام میں لوگ امتیازی حیثیت کے حامل تو ہوں گے لیکن رتبے اور کردار کے حوالے سے عمودی طور پر نہیں بلکہ لچک اور فعلی حیثیت میں، مہارت اور پیشہ ورانہ تربیت کے حوالے سے۔''

وہ (مسٹر بینس) مزید کہتے ہیں، ایک عارضی ٹیم سے دوسری ٹیم کی طرف سرگرمی کی انتہائی تیز رفتار شرح کی وجہ سے ''کام کرنے والے ان گروپوں میں وابستگی کی شرح انتہائی کم ہوگی...... جبکہ لوگوں کے درمیان تعلق اور تفاعل میں مہارتوں کی اہمیت زیادہ ہو جائے گی، پیچیدہ کاموں میں تعاون کی بڑھتی ہوئی رفتار کی وجہ سے، گروپوں میں اتصال کی یکسر کمی واقع ہو جائے گی...... لوگوں کو اپنی اپنی ملازمتوں سے فوری اور شدید تعلق و

وابستگی کا ہنر سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوگی، اور اپنے کام کے حوالے سے پیدا شدہ مضبوط تعلق ترک ہو جانے کا وصف بھی سیکھنا ہوگا۔''

آنے والے عارضی سلسلے کی یہ ایک جھلک ہے مستقبل کی تیز رفتار، معلومات سے بھرپور، حرکی تنظیمیں جو عارضی خلیوں (اکائیوں) اور انتہائی متحرک افراد سے مالا مال ہوں گی۔ مزید یہ کہ اس تصویر سے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ان انسانوں کی چند خصوصیات کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کر سکتے ہیں جو ان نئی تنظیموں میں موجود ہوں گے...... اور جنھیں، کسی حد تک آج کے عہد کی ''نقش اول'' تنظیموں میں بھی موجود ہنا چاہیے۔ جو بات سامنے آئی ہے وہ یہ کہ آج کی صورت حال روایتی تنظیمی شخص سے بالکل مختلف ہے۔ تبدیلی کی بڑھتی ہوئی رفتار اور ماحول میں بڑھتا ہوا انوکھا اور نیا انداز ایک خاص قسم کے تنظیمی سلسلے کا متقاضی ہے اور انھیں ایک نئے شخص کی طلب ہے۔

افسر شاہی کی تین غیر معمولی خصوصیات تھیں، اور ہم نے دیکھا کہ وہ دوام، نظام مراتب اور تقسیم کار تھیں۔ یہ تین خصوصیات ان افراد کو ڈھال لیتی تھیں جو تنظیموں کی سربراہی کرتے تھے۔

دوام...... اس بات کی سند کہ فرد اور تنظیم کے مابین ربط طویل مدت تک کا ہے۔ جو تنظیم کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے قائم ہوا۔ وہ فرد جتنے عرصے تک اس تنظیم میں محیط رہتا ہے، اس کا ماضی اس تنظیم میں اتنی ہی بڑی سرمایہ کاری ثابت ہوتا ہے، اسی مناسبت سے اس تنظیم میں اس کا ذاتی مستقبل اس احساس کے تحت پروان چڑھا کہ تنظیم سے کسی فرد کے تعلقات منقطع ہونے کا عموماً مطلوب معاشی بقا سے روگردانی ہے۔ بہت سے افراد کے لیے معدوم ہونے کی وجہ سے، ملازمت ایک قیمتی شے کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ لہٰذا افسر شاہی سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص ساکن ہو جاتا تھا اور اس کا واضح رجحان معاشی تحفظ کی طرف ہوتا تھا۔ اپنی ملازمت برقرار رکھنے کے لیے وہ تنظیم کے مفادات کے ساتھ ساتھ بہ رضا و رغبت اپنے ذاتی مفادات اور سزایابی کو بھی ذہن میں رکھتا تھا۔

طاقت سے بھرپور نظام مراتب، جن کے ذریعے اختیارات کا سلسلہ چلتا تھا، وہ دباؤ ہوتا تھا جس کے ذریعے کسی ماتحت کو قابو کیا جاتا تھا۔ اس بات کا یقینی احساس کرتے ہوئے کہ ماتحت (شخص) کا تنظیم سے تعلق نسبتاً دائمی ہے (یا اس کی امید کرتے ہوئے) تنظیم سے وابستہ شخص سے اس کی پابندی اور اطاعت کی توقع کی جاتی ہے۔ جزا و سزا مراتب کے سلسلے سے ہوتی ہوئی کسی فرد تک پہنچی، تا کہ وہ فرد جو مرتبے میں خود سے

بالاتر شخص کی طرف دیکھ رہا ہے، اطاعت گزاری کا پابند ہو جائے۔ لہٰذا: تنظیمی پابندی میں راضی برضا رہنے والا شخص...... وہ شخص جو ذاتی سزایابی سے عاری ہو (یا اس شخص میں اتنی ہمت ہی نہ ہو کہ ان چیزوں کو ظاہر کر سکے)۔ اس تنظیم نے اطاعت گزاری ہی کا معاوضہ دیا۔

اور آخر میں یہ بات کہ ایک تنظیمی شخص کو چیزوں کی ترتیب میں اپنا مقام سمجھنے کی ضرورت تھی؛ وہ ایک بہترین مقام پر بیٹھا تھا اور اس نے وہ امور سرانجام دیے جو تنظیمی اصولوں کے عین مطابق تھے اور انہی اصولوں کی پاسداری کے حوالے سے اس کی نگرانی بھی کی جاتی تھی۔ معمول کے مطابق مسائل کا سامنا کرنے کی وجہ سے اس سے معمول کے مطابق ہی جوابات کی توقع کی جاتی تھی۔ آزاد خیالی، تخلیقیت، اور پُر خطر انداز کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی کیونکہ یہ تنظیم اور اس کے اجراء کے لیے درکار پیش گوئی میں مداخلت شمار کی جاتی تھی۔

آج کے ناپختہ عارضی سلسلے انسانی اوصاف کے یکسر مختلف سلسلے کے متقاضی ہیں۔ دائمی سلسلوں کی جگہ پر ہم عارضی سلسلے دیکھتے ہیں...... تنظیموں کے درمیان انتہا درجے کا ردّ و بدل، ان تنظیموں میں کبھی نہ ختم ہونے والی تنظیم سازی اور کام کرنے گروپوں کا قائم ہونا اور پھر ختم ہونا۔ اور یہ بات بھی باعث حیرت نہیں کہ ہم ان تنظیموں اور ان کی ذیلی ڈھانچوں میں تنظیم کے ساتھ ''وفاداری'' کے عنصر کا زوال ہی دیکھ رہے ہیں۔

آج کی امریکی صنعت میں نوجوان انتظامی افسران کے بارے میں لکھتے ہوئے والٹر گوزارڈی (Guzzardi) جونئیر کہتے ہیں: ''جدید عہد کے انسان اور اسی عہد کی تنظیموں کے درمیان معاہدے میڈلیس (Medes) اور اہل فارس کی طرح کے نہیں ہیں۔ یہ (معاہدے) اس لیے نہیں کیے جاتے کہ یہ ہمیشہ برقرار رہیں...... کوئی بھی شخص وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ تنظیم سے اپنے روّیے پر نظر دوڑاتا ہے اور تنظیم کے (اپنے ساتھ) روّیے کا بھی تجزیہ کرتا ہے۔ اگر وہ شخص کسی چیز کو ناپسند کرتا ہے تو وہ اس تنظیم میں تبدیلی لانے کی کوشش کرتا ہے، اگر وہ اس میں تبدیلی نہیں لا سکتا تو وہ اس تنظیم سے کسی اور تنظیم میں چلا جاتا ہے۔'' انتظامی افسران کی بھرتی کرنے والے جارج پک (peck) کہتے ہیں: ''انتظامی امور کے اعلیٰ ترین اور قابل ترین افسران وہ ہیں (جن کا درخواستیں دینے کی غرض سے) بائیو ڈیٹا ہر وقت ان کی میز کی دراز میں موجود ہوتا ہے۔''

وہ وفاداری جو ایک تنظیمی شخص محسوس کرتا تھا اب فنا ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی جگہ اب ہم پیشہ ورانہ وفاداری کو پھلتا پھولتا دیکھ رہے ہیں۔ تمام تکنیکی معاشروں میں اب ہم پیشہ ورانہ، تکنیکی اور دیگر مہارتوں میں بے پناہ اضافہ ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ صرف امریکہ ہی میں ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۹ کے درمیانی عرصہ میں ایسے افراد کی

تعداد میں دگنا اضافہ ہوا ہے اور افرادی قوت کے شعبے میں، دیگر کسی گروپ کی نسبت اس طبقے میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ انفرادی حیثیت سے کام کرنے کی بجائے نئے کاروبار کے لیے قسمت آزمائی کرنے والے آزاد افراد، لاکھوں کی تعداد میں انجینئروں، سائنس دانوں، ماہرین نفسیات، اکاؤنٹنٹ اور دیگر پیشہ ور افراد تنظیموں کی صفوں میں شامل ہوئے ہیں جس کے نتیجہ میں صریحاً منطقی استدلال کی تنسیخ عمل میں آئی۔ مسٹر ویبلن (Veblen) نے پیشہ وروں کی صنعت کاری سے متعلق تحریر کیا۔

لہٰذا جان گارڈنر کہتے ہیں: ''ایک پیشہ ورانہ شخص کی وفاداری اس کے پیشے سے تو ہے تنظیم سے نہیں جو کسی بھی ضرورت کے لمحے اس کے لیے مواقع لے کر آ سکتی ہے۔ کسی بھی مقامی پلانٹ میں موجود کیمسٹ یا الیکٹرانکس انجینئر کا موازنہ اسی پلانٹ میں کام کرنے والے غیر پیشہ ورانہ انتظامی افسر سے کریں۔ وہ شخص جو کیمسٹ ہے سوچتا ہے کہ اس کے دفتر کے ساتھی وہ نہیں جو دفتر میں اس کے ساتھ والے کمروں میں بیٹھے ہیں بلکہ اس ہم پیشہ لوگ ہی اس کے ساتھی ہیں چاہے وہ ملک کے کسی بھی کونے میں موجود نہ ہوں، حتیٰ کہ پوری دنیا میں، مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے اپنے ہم پیشہ و ہم عصر لوگوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات کی وجہ سے، وہ شخص بذات خود انتہائی نقل پذیر واقع ہوا۔ اگر وہ شخص ایک جگہ پر بھی رہتا ہے تو مقامی تنظیم کے ساتھ اس کی وفاداری شاذ ہی کسی حقیقی تنظیمی شخص جیسے معیار کی ہو۔ وہ کبھی بھی ایسی چیزوں پر یقین نہیں رکھتا۔''

''پیشوں کے عروج کا مطلب ہے کہ بڑے پیمانے پر موجود جدید تنظیم میں چیدہ افراد ہی بچ گئے ہیں جو تنظیم کے بارے میں ایک مختلف قسم کا نظریہ رکھتے ہیں......'' جس کے نتیجہ میں اسی نظام میں رہ کر کام کرنے والے یہ لوگ ''ناوابستہ'' ہی شمار کیے جائیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ ''پیشہ'' نامی اصطلاح ایک نئے معنی اختیار کرتی جا رہی ہے۔ جس طرح افسر شاہی کا عمودی نظام مراتب نئی ٹیکنالوجی، نئے علم اور سماجی تبدیلی کے مجموعی اثرات کی وجہ سے ناکارہ ہو گئی اسی طرح افقی نظام مراتب بھی جس نے اب تک انسانی علم کو تقسیم کیا ہوا ہے۔ مہارتوں کے درمیان پرانی سرحدیں اب معدوم ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ لوگوں کو اب تیزی سے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ وہ انوکھے قسم کے مسائل جو ان پر ٹھونسے گئے ہیں ان کا حل صرف اور صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب باریک ضوابط سے ذرا ہٹ کر انھیں حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ایک روایتی افسر اعلیٰ الیکٹریکل انجینئروں کو ایک خانے میں رکھے گا اور ماہرین نفسیات کو دوسرے

میں۔ اگرچہ اپنی اپنی پیشہ ورانہ تنظیموں کے حساب سے، اپنے علم اور مہارت میں بڑی واضح اور امتیازی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ تاہم آج کے عہد میں، فضائی صنعت میں، تعلیم کے میدان میں اور دیگر شعبوں میں بھی، اکثر انجینئروں اور ماہرین نفسیات کو، اکٹھا، عارضی ٹیموں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ نئی تنظیمیں جو، کبھی کبھار عجیب و غریب نظر آنے والے، اس دانشورانہ ادغام کی نمائندگی کرتی ہیں، اب بنیادی پیشوں میں نظر آنا شروع ہو گئی ہیں، اور یہ سلسلہ اب اس قدر فروغ پا چکا ہے کہ اب ہمیں بائیو۔ میتھ میٹیشن، سائیکو...... فارموکولوجسٹ (psycho-pharmacologist)، انجینئر، لائبریرین اور کمپیوٹر۔ میوزیشن (Computer-musician) جیسے پیشے بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ ان شعبوں میں امتیازات ختم نہیں ہوئے؛ بلکہ یہ مزید بہتر ہو گئے ہیں، مزید سرایت پذیر اور ان میں تسلسل کے ساتھ رد و بدل کا سلسلہ جاری ہے۔

اس صورت میں پیشہ ورانہ وفاداریاں بھی مختصر المیعاد وابستگیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں، اور وہ کام جس کی انجام دہی مقصود ہے، اس قسم کا عہد بن گیا ہے جو صرف تنظیم کے لیے مختص ہے۔ مسٹر بینس کے مطابق، پیشہ ورانہ ماہرین اپنی جزا کا سلسلہ مہارتوں کے اندرونی معیارات، پیشہ ورانہ سوسائٹیوں اور اپنے کام کی جبلی تسکین سے حاصل کرتے ہیں۔ دراصل ان کی وابستگی کام سے ہوتی ہے، ملازمت سے نہیں؛ اپنے معیارات سے ہوتی ہے، اپنے سربراہ یا افسر سے نہیں۔ چونکہ ان کے پاس ڈگریاں ہوتی ہے لہٰذا وہ نقل پذیری اختیار کرتے ہیں۔ وہ کمپنی کے اچھے ملازمین نہیں ہوتے؛ وہ غیر دانستہ ہی رہتے ہیں ماسوا ان چیلنج والے ماحول کے جہاں وہ مسائل کے ساتھ کھل کر ''کھیل'' سکیں۔''

مستقبل کے افراد میں سے ہی ایسے فرد موجود ہیں جنھوں نے آج کل کے عارضی سلسلوں میں سے اکثر اسامیوں کو پُر کیا ہوا ہے۔ آج کمپیوٹر کی صنعت میں، تعلیمی ٹیکنالوجی میں، شہری مسائل کے حل کے لیے سسٹمز ٹیکنالوجی کے اطلاق میں، نو وارد اوشنوگرافی (oceanography) کی صنعت میں ماحولیاتی صحت سے منسوب سرکاری ایجنسیوں و دیگر اداروں میں بڑا جذبہ اور تخلیقیت پائی جاتی ہے۔ ان تمام شعبوں میں جو ماضی کی نسبت مستقبل کی زیادہ نمائندہ ہیں، ایک خاص قسم کا جوش اور مہم جویانہ جذبات ہیں جو تحفظ کے احساس سے بھرپور قدامت پرستی اور اس روایت پسندی کے بالکل برعکس ہیں جو ایک تنظیمی شخص سے وابستہ تھے۔

ان عارضی تنظیموں کا یہ نیا جذبہ تنظیم سے وابستہ کسی شخص کی بجائے نیا کاروبار شروع کرنے والے کسی شخص کے زیادہ قریب ہے۔ نیا کاروبار شروع کرنے کا خدشہ مول لینے والا وہ شخص جو شکست سے یا مخالف

نظریے یا مخالفت کی پروا کیے بغیر اپنا کام شروع کرتا ہے، اور وہ خاص طور پر امریکہ میں صنعت کاری کا ایک اوک ہیرو شمار کیا جاتا ہے۔ مسٹر پیریٹو (Pareto) نے نئے کاروبار شروع کرنے والوں کو "مہم جو قسم کی روحیں، جو انوکھے پن کی متلاشی ہیں..... جو کسی بھی تبدیلی پر چونکتی نہیں۔"

ایسا سوچنا کہ نئے کاروبار شروع کرنے والا عہد ختم ہو چکا ہے روایتی فہم و دانش کے علاوہ اور کچھ نہیں، اور یہ کہ اس کی جگہ پر تنظیم سے تعلق رکھنے افراد یا افسر شاہی ہی چل سکتے ہیں۔ تاہم آج کل بڑی تنظیموں کے اندر ہی نیا کاروبار شروع کرنے کا رجحان ہو گیا ہے۔ تبدیلی رخ کے پیچھے جو راز کار فرما ہے۔ مالی فراوانی کے ساتھ خطرات مول لینے کی خواہش نے بھی جنم لیا ہے۔ لوگ ناکامیوں کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہیں کیونکہ وہ یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ وہ ہمیشہ بھوکے ہی رہیں گے۔ لہٰذا ہنٹ فوڈز (Hunt Foods) کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریل ریلیشنز مسٹر چارلس ایلویل (Elwell) کہتے ہیں: "اعلیٰ انتظامی افسران خود کو انفرادی حیثیت میں نئے کاروبار شروع کرنے والا سمجھتے ہیں، جو اپنا علم اور اپنی مہارتیں فروخت کر رہے ہیں۔" مسٹر میکس ویز نے جریدے "فارچون" میں نشاندہی کی ہے: "انتظامی امور میں موجود پیشہ ور شخص کے پاس آزادی کی ایک مضبوط بنیاد ہوتی ہے۔ شاید ایک ٹھوس بنیاد جو ایک چھوٹے کاروباری شخص کو اس کے مالکانہ حقوق میں کبھی بھی حاصل نہیں تھی۔"

لہٰذا ہمیں ان، اداروں میں تشکیل پانے والی تنظیموں سے منسوب شخص کے ابھرنے کا پتا چلتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو اپنی کئی قسم کی وابستگیوں کے ساتھ، بنیادی طور پر ٹ کسی ایک تنظیم سے غیر وابستہ ہی رہتا ہے۔ وہ اپنی تمام تر مہارتوں اور تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ، تنظیم کی طرف سے فراہم کردہ اوزار و آلات کی مدد سے، مسائل کے حل کا خواہش مند رہتا ہے، اور اس کی یہ کاوشیں اسی تنظیم میں موجود عارضی گروپوں کے لیے ہیں۔ لیکن وہ شخص اس وقت تک یہ کام کرتا رہے گا جب تک مسائل اس کی دلچسپی کو اپنی جانب مبذول کرواتے رہیں گے۔ وہ صرف اپنے پیشے اور اپنے مستقبل سے وابستہ و منسلک ہے اور صرف اپنی تکمیل کی خاطر۔

مندرجہ بالا چیزوں کی روشنی میں یہ بات کوئی حادثہ معلوم نہیں ہوتی کہ بڑی بڑی تنظیموں میں اصطلاح "ایسوسی ایٹ" (شریک) مشہور ہو گئی ہے، اب ہمارے پاس "ایسوسی ایٹ مارکیٹنگ ڈائریکٹرز" اور "ریسرچ ایسوسی ایٹس" کی اسامیاں موجود ہیں، حتیٰ کہ سرکاری ایجنسیوں میں "ایسوسی ایٹ ڈائریکٹرز" اور "ایسوسی ایٹ ایڈمنسٹریٹرز" موجود ہیں۔ لفظ ایسوسی ایٹ کا مطلب ہے شریک، ہمسر، بجائے ماتحت کے، اور

اس کا پھیلتا ہوا استعمال عمودی اور نظام مراتب کے انتظامات سے منتقل ہو کر نئے، مزید پہلو دار مواصلاتی نمونوں کی عکاسی کرتا ہے۔

ایک تنظیم سے وابستہ شخص تنظیم کا خدمت گزار ہوتا تھا، ایسوسی ایٹیو شخص اس سے بے پرواہ ہوتا ہے۔ تنظیم سے وابستہ شخص معاشی استحکام کی وجہ سے غیر منقول ہوتا تھا، ایسوسی ایٹیو شخص، بڑی حد تک اسے ایک سطحی چیز سمجھتا ہے۔ تنظیم سے وابستہ شخص خطرات سے خائف تھا، ایسوسی ایٹیو شخص اس کا خیر مقدم کرتا ہے (اس بات کے احساس کے ساتھ کہ مالی طور پر مستحکم اور تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے معاشرے میں ناکامی بھی عارضی ہوتی ہے) تنظیم سے وابستہ شخص مراتب کا پابند ہوگا، تنظیم میں مرتبے اور عزت حاصل کرنے کی خاطر تگ و دو کرے گا۔ جبکہ ایک ایسوسی ایٹس شخص اس کی پروا نہیں کرے گا۔ تنظیم سے وابستہ کوئی شخص ایک لگے بندھے نمونے پر ہی کام کرتا رہے گا، ایسوسی ایٹیو ایک پیچیدہ نمونے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے گا جواز خود تحرک پر مبنی ہوگا۔ تنظیم سے وابستہ شخص نے خود کو معمول کے مطابق مسائل کے لیے مختص کیا ہوا تھا، جو پہلے سے وضع شدہ قوانین اور ضابطوں کے مطابق تھے، جس کی رو سے قدامت پرستی سے روگردانی یا تخلیقیت سے گریز ضروری ہے جبکہ ایسوسی ایٹس شخص، جسے انوکھے قسم کے مسائل کا سامنا ہے، کے لیے جدت کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ تنظیم سے وابستہ شخص کو اپنی انفرادیت کو "ٹیم سے وابستہ" کام کی خاطر ماتحتی کے زمرے میں لانا پڑتا ہے جبکہ ایسوسی ایٹیو (Associative) شخص یہ تصور کرتا ہے کہ ٹیم از خود عارضی ہے۔ وہ اپنی انفرادیت کو کسی خاص وقت کے لیے ماتحتی میں دے سکتا ہے، جس میں اس کی رضا و رغبت شامل ہوتی ہے؛ لیکن یہ دائمی بنیادوں پر مبنی نہیں۔

اس تمام عمل میں ایسوسی ایٹیو شخص اپنے پاس ایک خاص قسم کا علم رکھتا ہے: تنظیم کے ساتھ اس کے تعلقات کا عارضی نوعیت کا ہونا ان بہت سے بندھنوں سے مبرا کرتا ہے جس میں اس کے پیشرو بندھے ہوئے تھے۔ اس حوالے سے عارضی نوعیت کے تعلقات کا ہونا، آزادی کا باعث ہے۔

تاہم تصور کا دوسرا رخ بھی ہے اور وہ شخص اسے بخوبی جانتا ہے۔ کیونکہ باقاعدہ تنظیموں کے ساتھ تعلقات میں تبدیلی غیر رسمی تنظیم اور لوگوں کے ساتھ تعلقات میں بھی ردو بدل لے کر آتی ہے۔ ہر تبدیلی اپنے ساتھ نئی چیز کے سیکھنے کی ضرورت لے کر آتی ہے۔ اس نئے سلسلوں کے اصول سیکھنے چاہئیں، لیکن اصول تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ عارضی سلسلوں کا متعارف ہونا تنظیموں کی مطابقت پذیری میں اضافہ کرتا ہے؛ لیکن یہ افراد

کی مطابقت پذیری کو نقصان پہنچاتا ہے۔ لیکن برطانوی الیکٹرانکس صنعت کے مشاہدے کے بعد ٹام برنز (Tom Burns) نے مستحکم تنظیمی ڈھانچوں کے منیجروں اور تیزی سے تبدیل ہونے والے تنظیمی ڈھانچوں میں موجود افراد میں واضح تضاد پایا اور انھوں نے لکھا، ''عمومی مطابقت پذیری ذاتی تسکین اور ہم آہنگی کی قیمت پر ہی ممکن ہوتی ہے۔ اعلیٰ انتظامی عہدوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی ذاتی پریشانی اور انہی کے ہم عمران افراد، جو اس کی مساوی حیثیت کی پوزیشن پر پہنچ گئے ہیں، میں ایک واضح فرق محسوس کیا گیا۔'' اور مسٹر بینس کہتے ہیں: ''تیز رفتار تبدیلی سے ہم آہنگ ہونا، کام کے عارضی نظاموں میں رہنا، (انتہائی کم وقت میں) ثمر آور تعلقات کی تشکیل۔ اور پھر انھیں یکسر توڑ دینا...... معاشرتی ناطوں میں کھنچاؤ اور نفسیاتی الجھنوں کی پیش گوئی کرتی ہے۔

اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے، دیگر شعبوں کی طرح، مستقبل (ان کے اندازوں کے برعکس) جلد آ رہا ہے۔ کیونکہ کسی فرد کے لیے عارضی سلسلوں کی طرف پیش رفت کا مطلب، اس کی زندگی میں، تنظیمی تعلقات کے ردو بدل میں ذرا تیز رفتاریا ہے۔ لہٰذا انتہائی ناپائیدار معاشرے کے مطالعے میں، ہماری راہ میں ایک اور رکاوٹ حائل ہوگئی۔ یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ تیز رفتاری تنظیموں کے ساتھ ہمارے تعلقات میں تیزی کا باعث ہے بالکل اسی طرح جیسے یہ چیزوں، مقامات اور لوگوں کے ساتھ ہمارے تعلقات قطع کرتی ہے۔ ان تمام تر تعلقات میں غیر معمولی ردّ و بدل اس فرد پر ایک بھاری بھر کم مطابقت پذیر وزن ڈالتا ہے جس کی تعلیم و تربیت سست روی سے چلنے والے سماجی نظام میں ہوئی ہو۔

یہ وہ مقام ہے جہاں مستقبل کے صدمے کا خطرہ موجود ہے۔ یہ خطرہ، جیسا کہ ابھی ہم دیکھیں گے، معلومات کے زمرے میں، تیز رفتار دھکے کے اثر سے اور بھی شدت اختیار کر گیا ہے۔

☆☆☆☆

آٹھواں باب

معلومات: ایک حرکی تخیل

ایک ایسے معاشرے میں جہاں فوری تیار شدہ کھانے، فوری تعلیم حتیٰ کہ فوری آباد ہونے والے شہر روزمرہ کا معمول ہو، کوئی بھی چیز اتنی عجلت میں تیار نہیں کی جاتی اور نہ ہی اتنی بے دردی سے ختم کی جاتی ہے جیسے، فوری تیار کیے جانے والے ایک ماڈل کو کہا جاتا ہے۔ جو تو میں جدید ترین صنعت کاری کی طرف گامزن ہیں ان ''نفسیاتی۔ معاشی'' پیداواروں کی تیاری میں تیزی لے کر آتی ہیں۔ فوری طور پر تیار ہونے والے یہ ماڈل لاکھوں افراد کے ذہنوں اور سوچوں پر ''تاثر'' کا ایک بم بن کر گرتے ہیں۔ اور یہ وہی کچھ ہے جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔

اب سے ایک سال سے بھی کم کا عرصہ ہوا جب ایک کاکنی النسل[1] لڑکی جس کی عرفیت ''ٹو یگی'' تھی، نے ماڈلنگ کا پہلا کام کیا، دنیا بھر کے لاکھوں افراد نے اس لڑکی کا عکسی تخیل اپنے ذہنوں میں محفوظ کرلیا۔ شربتی آنکھوں، سنہرے بالوں والی معصوم سی ''ٹو یگی''، جو ذرا ہچکچاہٹ کے ساتھ گفتگو کرتی، نرم و نازک ٹانگوں سے ٹہلتی، اٹھلاتی ۱۹۶۷ء میں ماڈلنگ کے لیے وارد ہوئی، اس کا دلکش چہرہ اور پھرتیلا بدن جلد ہی برطانیہ، امریکہ، فرانس، اٹلی اور دیگر ممالک کے جریدوں کے سرورق کی زینت بن گیا۔ راتوں رات ''ٹو یگی'' نامی آئی لیشز (eyelashes) مسکارے، خوشبوئیں اور کپڑے فیکٹریوں سے تیار ہو کر آنے لگے۔ ناقدین اس کی سماجی اہمیت کے بارے میں زور و شور سے گفتگو کرنے لگے۔ خبر نگار اس سے متعلق خبریں اس انداز سے نشر کرتے کہ جو (انداز) امن معاہدے یا پوپ کے چناؤ کے لیے ہونے والے الیکشن کے لیے مختص ہے۔

تاہم اب ہمارے ذہنوں سے ''ٹو یگی'' کا تخیل، خاصی حد تک، مٹ چکا ہے اور وہ اب عوام کی نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ حقیقت نے خود اس کی کہی ہوئی بات کو درست ثابت کر دیا، ''میں چھ مہینے بعد

۱۔ مشرقی لندن سے تعلق رکھنے والی خاص نسل کے لوگ۔

یہاں نہیں ہوں گی''۔ کیونکہ تخیل بھی بڑی تیزی سے ناپائیدار ہوتے جا رہے ہیں...... یہ تخیل صرف ماڈلوں، کھلاڑیوں یا تفریح فراہم کرنے والی شخصیات ہی تک محدود نہیں۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا جب میں نے ایک انتہائی ذہین لڑکی سے سوال کیا کہ کیا اس کے اور اس کی ہم جماعتوں کے ذہنوں میں ''ہیروز'' ہیں۔ میں نے پوچھا، ''مثال کے طور پر، کیا آپ جان گلین (John Glenn) کو ہیرو تسلیم کرتی ہیں؟'' (کہیں قارئین بھول نہ جائیں، گلین پہلا امریکی خلانورد جس نے مدار میں چکر لگایا)۔ اس لڑکی کا جواب حیران کن تھا، ''نہیں''! ،وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔''

پہلے پہل میں یہ سمجھا کہ وہ لڑکی یہ کہنا چاہ رہی ہے کہ چالیس کے پیٹے کا کوئی شخص ہیرو بننے کے لیے موزوں نہیں۔ فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ میں غلط سمجھ رہا تھا۔ اس کے کہنے کا مقصد تھا کہ گلین کے کارناموں کو گزرے بہت عرصہ ہو گیا اور اب وہ دلچسپی کے قابل نہیں رہے۔ (جان گلین کا تاریخ ساز خلائی سفر فروری ۱۹۶۲ء کا تھا)۔ آج جان گلین عوامی توجہ کا مرکز نہیں رہے نتیجتاً ان کا (عکسی) تاثر زائل ہو گیا ہے۔

ٹو یگی، بیٹلز (Beatles)، جان گلین، Billie Sol Estes، Bob Dylan، جیک روبی، نارمن میلر، Eichmann، ژاں پال سارتر، Georgi Malen Kov، Jacqueline Kennedy۔ غرض اس ہم عصر تاریخ میں بہت سی شخصیات گزر گئی ہیں۔ حقیقی افراد جنھیں ذرائع ابلاغ نے بڑے شاندار اور بہتر انداز میں پیش کیا گیا، اسی لیے یہ لوگ لاکھوں افراد کے ذہنوں میں نقش ہو گئے، ان میں اکثر ایسے افراد ہیں جو ان شخصیات سے کبھی نہیں ملے، ان سے کبھی گفتگو نہیں کی اور ذاتی طور پر ان سے کبھی ملاقات نہیں کی۔ ایسی شخصیات ان لوگوں کی زندگی میں ان لوگوں جیسی (اور کبھی کبھار زیادہ بھی) اہمیت حاصل کر لیتی ہیں جن سے وہ ذاتی طور پر مل چکے ہوتے ہیں۔

ہم ان ''نمائندہ لوگوں'' سے ایسے ہی تعلقات استوار کر لیتے ہیں جیسے ہم اپنے دوستوں، پڑوسیوں اور دفتر کے ساتھیوں سے کرتے ہیں۔ ہماری زندگیوں میں حقیقی، ذاتی نوعیت پر مبنی افراد اور رشتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ان افراد سے رشتوں کا اوسط دورانیہ کم سے کم ہوتا جا رہا ہے یہی صورت حال ان ''نمائندہ لوگوں'' سے تعلقات کی ہے جو ہمارے ذہنوں اور ہماری سوچوں میں موجود رہتے ہیں۔

ان لوگوں کے ذہن میں موجود رہنے کی شرح دنیا میں تبدیلی کی حقیقی شرح سے متاثر ہوتی ہے۔ جیسے ہم سیاست میں دیکھتے ہیں کہ ۱۹۲۲ء سے برطانوی وزارت عظمیٰ کی تبدیلی، ابتدائی دور حکومت ۱۷۲۱ء سے

۱۹۲۲ء سے ۱۳ فی صد زیادہ ہے۔ کھیل کے میدان میں ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل ہیوی ویٹ باکسنگ چیمپئن شپ، ہمارے والد کی جوانی کے ایام [1] کی نسبت دگنی رفتار سے تبدیل ہوتی ہے۔ تیز رفتاری سے چلتے ہوئے واقعات شخصیات کی بھی شہرت کے زمرے میں بڑی تیزی سے اثر ڈالتے ہیں اور ذہنوں میں موجود پرانے تاثرات، نئے تاثرات بنانے کی غرض سے محو ہو جاتے ہیں۔

یہی بات افسانوی کرداروں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کیونکہ یہ کردار بھی کتابوں کے صفحات، ٹیلی وژن سکرینوں، تھیٹروں، فلموں اور جریدوں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں کسی سابقہ نسل کے پاس اتنی تعداد میں افسانوی کردار موجود نہیں تھے۔ ذرائع ابلاغ پر تبصرہ کرتے ہوئے تاریخ دان مارشل فشوک رائلی (Marshall Fishwick wryly) کہتے ہیں: ''ابھی ہم سپر ہیرو، کیپٹن نائس (Captain Nice) اور مسٹر ٹیریفک (Terrific) کے عادی نہیں ہوئے ہوتے کہ وہ ہماری ٹیلی وژن سکرینوں سے ہمیشہ کے لیے، غائب ہو جاتے ہیں''۔

یہ نمائندہ لوگ، چاہے وہ جیتے جاگتے لوگ ہوں یا افسانوی، ہماری زندگیوں میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، ہمارے روّیوں کے لیے مثالی لوگ پیش کرتے ہیں، جو ہمارے لیے مختلف صورت حال اور کردار ادا کرتے ہیں جن سے ہم اپنی اپنی زندگیوں کے بارے میں نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ ہم شعوری یا لاشعوری طور پر ان کی سرگرمیوں سے سبق اخذ کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم ان کی فتح اور آزمائشوں سے سیکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے لیے اس بات کو ممکن بناتے ہیں کہ ہم لوگ مختلف کرداروں یا طرز زندگی کے لیے کوششیں کریں، بغیر ان نتائج اور ردعمل کو بھگتنے کے جو عملی زندگی میں تجربات کی صورت میں ہمارے سامنے آ سکتے ہیں۔ ان نمائندہ لوگوں کا بڑی تیزی سے ہمارے سامنے سے ''گزرنا'' بہت سے حقیقی لوگوں کی شخصیت میں موجود عدم استحکام کو سنوارنے میں مدد دیتا ہے، اور ان لوگوں کے لیے بھی تقویت کا باعث ہو سکتا ہے جو ایک موزوں طرز زندگی تلاش کرنے میں مشکلات کا شکار ہیں۔

تاہم یہ ''نمائندہ'' لوگ ایک دوسرے سے مبرا اور آزاد نہیں ہوتے۔ وہ لوگ اپنے کردار ایک وسیع، پیچیدہ طریقے سے منظم شدہ ''عوامی ڈرامے'' کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ ایک شاندار کتاب ''Symbolic Leaders'' کے مصنف اور ماہر عمرانیات اورن کلیپ (Orrin Klapp) کے مطابق

---

(۱) ۱۸۸۲ء اور ۱۹۳۲ء کا درمیانی دور، جب یہ چیمپئن شپ ۵ سال کے عرصے کے لیے رہی، اس کے بعد یہ اوسط ۴،۲ سال ہوئی اور پھر ۲،۳ سال۔

ان لوگوں کے یہ کردار ذرائع ابلاغ کی نئی ٹیکنالوجی کی پیداوار ہیں۔ یہ عوامی ڈرامہ جس میں ماڈل سٹیج پر آتے ہیں اور دیگر ماڈل، بڑی تیزی سے ان کی جگہ لیتے ہیں، مسٹر کلیپ کے مطابق اس کا اثر قیادت کو مزید ''غیر مستحکم'' بناتا ہے، جو، بصورت دیگر، ایسی نہ ہوتی۔ اتفاقات، ناواقف صورت حال، غلطیاں، مقابلے، سیکنڈل، تفریح کے لیے مختص محفلیں اور سیاسی گھن چکر۔ فیشن خاص رفتار سے آتے اور چلے جاتے ہیں۔ امریکہ جیسے ملک میں عوامی ڈرامے میں بڑی وسعت ہے، جس میں نئے چہرے روزانہ ابھرتے ہیں، کسی شو میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ مقابلہ ہوتا ہے، عموماً کچھ بھی ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔'' مسٹر کلیپ مزید کہتے ہیں، ''ہم جس چیز کا مشاہدہ کررہے ہیں وہ علامتی لیڈروں کا تیزی سے بدلنا ہے''۔

تاہم اس بات کو ایک مضبوط بیان میں بدلا جاسکتا ہے: جو کچھ ہورہا ہے وہ حقیقی لوگوں کا یا افسانوی لوگوں کا رد و بدل نہیں ہے بلکہ ہمارے ذہنوں میں تاثر اور تاثر سے بننے والے ڈھانچوں کا بدلنا ہے۔ حقیقت پر مبنی ان تاثرات کے ساتھ ہمارے تعلقات، جس پر ہم اپنے رویوں کی بنیاد رکھتے ہیں، وہ، اوسطاً، مزید ناپائیدار ہوتے جارہے ہیں۔ معاشرے میں موجود معلومات کے نظام میں بڑے پیمانے پر اکھاڑ پچھاڑ ہورہی ہے۔ وہ خیالات اور ضابطے جن پر رہ کر ہم سوچتے ہیں۔ وہ بڑے حیران کن انداز اور تیز رفتاری سے تبدیل ہورہے ہیں۔ ہم اس شرح میں اسی رفتار سے اضافہ کررہے ہیں جس رفتار سے ہم حقیقت پر مبنی تاثرات قائم کرتے ہیں اور انھیں فراموش کرتے ہیں۔

ٹوپگی اور کے۔میسنز (K-MESONS)

ہر شخص کے دماغ میں اس دنیا کا ایک ذہنی نمونہ موجود ہے ...... بیرونی حقیقت کی موضوعاتی نمائندگی۔ اس نمونے میں لاکھوں تخیل محفوظ ہوں گے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے آسمان پر موجود بادلوں کی ذہنی تصویر، یا یہ معاشرے میں چیزوں کی ترتیب کا تجریدی استخراج ہے۔ ہم اس ذہنی ماڈل کو ایک شاندار سٹور سمجھ سکتے ہیں، ایک عکسی ''تجارتی منڈی'' جس میں ہم ٹوپگی، چارلس ڈی گولے (Charles De Gaulle) یا کیسوئس کلے (Cassius Clay) کی ذہنی تصاویر محفوظ کرتے اور وہ بھی جامع قضیوں کے ساتھ جیسے ''انسان بنیادی طور پر اچھا ہے'' و دیگر ملحدانہ خیالات وغیرہ۔

ہر شخص کا ذہنی ماڈل کچھ نہ کچھ ایسے تخیلات رکھتا ہوگا جو حقیقت کے قریب ہوں اس کے ساتھ ساتھ کچھ عکس ایسے بھی ہوں گے جو مسخ شدہ اور ناقص ہیں۔ لیکن کسی شخص کو عمل کرنے کے لیے، حتیٰ کہ گزارہ کرنے

کے لیے، اس ماڈل کی حقیقت سے کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہونی چاہیے، جیسے کہ کتاب "Society and knowledge" کے مصنف وی گورڈن چائلڈ (V. Gordan Childe) نے لکھا، ''بیرونی دنیا کی ہر باز تخلیق، جسے تشکیل دیا گیا اور کسی تاریخی معاشرے سے عمل کی ضرورت کے تحت اخذ کیا گیا، کو کسی نہ کسی حد تک اس حقیقت سے مطابقت رکھنی چاہیے۔ ورنہ وہ معاشرہ خود کو برقرار نہیں رکھ سکے گا؛ اس کے افراد، اگر غلط قضیوں سے تطابق کی کوشش کریں گے، تو وہ سادہ اور چھوٹے مقاصد کے حصول میں بھی ناکام رہیں گے حتیٰ کہ وہ بیرونی دنیا سے غذا اور تحفظ کی اشیاء کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکیں گے''۔

حقیقت کے لیے ماڈل کیس بھی شخص کی ذاتی کاوش نہیں ہوتی۔ اگر اس کے بہت سے تخیل براہِ راست مشاہدے پر مبنی ہوتے ہیں، تو ان میں سے بہت سے تخیل ذرائع ابلاغ اور ارد گرد موجود افراد کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس ماڈل میں صداقت کی شرح، کسی حد تک، معاشرے میں موجود علم کی عمومی شرح کی عکاسی کرتی ہے۔ چونکہ تجربات اور سائنسی تحقیق معاشرے میں معیاری اور درست علم کا نفوذ کرتے ہیں لہٰذا نئے خیالات، سوچ کا نیا انداز، فرسودہ خیالات اور رائج خیالات پر غالب آتے ہیں، ان سے تکرار کرتے ہیں اور انھیں تبدیل کرتے ہیں۔

اگر معاشرہ کسی جگہ جامد ہوجائے تو کسی فرد پر اپنے، ذہن میں موجود، تخیل کو تازہ کرنے کے لیے دباؤ کم ہوتا تاکہ وہ (معاشرے میں) دستیاب جدید علوم سے ہم آہنگ ہوسکیں۔ جب تک وہ معاشرہ، جس میں کوئی فرد رہ رہا ہے، مستحکم ہے یا سست روی سے تبدیل ہورہا ہے، وہ تخیل بھی آہستگی سے تبدیل ہوسکتا ہے جس پر اس کا روّیہ انحصار کرتا ہے۔ لیکن تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے معاشرے میں، تیز رفتار اور پیچیدہ تبدیلی سے ہم آہنگ ہونے کے لیے فرد کو اپنے ذہن میں موجود تخیل کے ذخیرے کی طرف ہی لوٹنا ہوگا اور وہ بھی اس شرح کے ساتھ جو تبدیلی کی رفتار سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس کے ماڈل کو تازہ ہوتا رہنا چاہیے۔ وہ فرد جس حد تک اس میں ناکام رہے گا، اس کے تبدیل ہونے والے روّیے ناموزوں ہوتے چلے جائیں گے؛ وہ بہت تیزی سے ناکامی کی طرف جاتا ہوا اور غیر مؤثر ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا کسی فرد پر، عمومی رفتار سے مطابقت رکھنے کے لیے شدید دباؤ ہے۔

آج کے عہد میں ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں تبدیلی اتنی تیز رفتاری اور درشت انداز میں ہورہی ہے کہ کل سچ آج کے انسانوں میں تبدیل ہوجاتا ہے اور معاشرے میں موجود انتہا درجے کی مہارت

رکھنے والے اور ذہین ترین افراد بھی نئے علوم سے مطابقت رکھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں..... چاہے وہ ترقی انتہائی سادہ سے شعبوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ برکلے میں یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کے ماہر حیوانیات ڈاکٹر روڈولف ٹوہلر (Dr. RudolphStohler) اس بات کی شکایت کرتے ہیں، ''آپ ان چیزوں کے بارے میں بھی ممکنہ حد تک نہیں جان سکتے جن کے بارے میں آپ جاننا چاہتے ہیں۔ واشنگٹن کی سمتھ سونین انسٹی ٹیوشن (Smithsonian institution) میں اوشنوگرافی (Oceanography) کے چیف ڈاکٹر آئی ای ویلن (Dr.I.E. Wallon) کہتے ہیں، ''میں نے اپنے کام کا ۲۵ سے ۵۰ فی حصہ یہ جاننے میں گزارا کہ کیا کچھ تازہ ترین ہو رہا ہے۔'' طبیعیات کے شعبے میں نوبل انعام حاصل کرنے والے ڈاکٹر ایمیلیو سیگرے (Dr. Emilio Segre) کہتے ہیں: ''صرف 'کے۔میسنز' (K-mesons) پر ہی تمام کے تمام اخبارات کو دیکھنا ایک ناممکن چیز نظر آتی ہے۔'' ایک اور اوشنوگرافر[1] (Oceanographer) ڈاکٹر آرتھر سٹمپ (Dr. Arthur Stump) اس بات کو تسلیم کرتے ہیں: ''مجھے اس کا درست جواب معلوم نہیں، تاوقتیکہ ہم ہر قسم کی اشاعت پر دس سال کے لیے پابندی نہ لگا دیں۔''

نیا علم، پرانے علوم کو، یا تو وسعت بخشتا ہے یا اسے متروک کر دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ ان لوگوں کو، جن کے لیے یہ بامقصد ہوتا ہے، مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے ذہنوں میں اس کی ازسرنو عکاسی کریں۔ یہ نیا علم انھیں اس بات پر بھی مجبور کرتا ہے کہ وہ آج اس چیز کو دوبارہ سیکھیں جو وہ کل جانتے تھے۔ لہٰذا یارک یونیورسٹی کے وائس چانسلر لارڈ جیمز کہتے ہیں، ''میں نے ۱۹۳۱ء میں آکسفورڈ سے کیمسٹری میں پہلی ڈگری حاصل کی''، پھر آکسفور۔ یونیورسٹی میں کیمسٹری کے امتحانات میں دیے گئے امتحانی پرچوں کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں، ''مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں نہ صرف ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتا بلکہ میں کبھی بھی ان کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ ان سوالات میں سے پوچھے گئے دو تہائی سوالات ایسے ہیں جن میں پوچھی گئی معلومات کا اس وقت وجود ہی نہیں تھا جب میں نے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی تھی۔'' اور فیڈرل کمیونیکیشنز کمیشن کے سرکردہ ایجوکیشنل براڈ کاسٹنگ سپیشلسٹ ڈاکٹر رابرٹ ہلیارڈ (Dr. Robert Hilliared) اس بات پر مزید زور دیتے ہیں: ''جس شرح سے علم میں اضافہ ہو رہا ہے اس کی رو سے کوئی بچہ اگر آج پیدا ہوتا ہے تو اس کے گریجویشن کرنے کے وقت تک دنیا میں موجود علم اور معلومات میں چار گنا اضافہ

---

(۱) ماہر بحری جغرافیہ۔

ہو جائے گا، جب اس بچے کی عمر ۵۰ سال ہوگی تو علم کا یہ اضافہ ۳۲ گنا ہوگا اور، اس کے وقت پیدائش کے بعد، دنیا میں موجود تمام چیزوں کے بارے میں ۹۷ فی صد معلومات حاصل ہو چکی ہوں گی۔''

''علم'' کی یہ تعریفیں ناکافی ہیں اور یہ کہ اس قسم کے اعداد و شمار یقینی طور پر خطرناک ہیں، اس بات میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ علم کی یہ بڑھتی ہوئی لہر ہمیں پیچیدہ تخصص پر مجبور کرتی ہے اور ہمارے ذہن میں موجود تمام تر تخیلات کو، تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی، شرح کے مطابق دہرانے پر اکساتی ہے۔ یہ حوالہ صرف جسمانی اجزاء یا جینیاتی ڈھانچے کی سائنسی معلومات کے اخراج تک ہی محدود نہیں، اس کا اطلاق علم کے ان مختلف شعبوں پر بھی ہوتا ہے جن کے اثرات لاکھوں افراد کی روزمرہ زندگی پر ہوتے ہیں۔

فرائڈ سے منسوب لہر

جدید علم کا بیشتر حصہ، کسی بھی خطے میں موجود، عمومی دلچسپیوں سے یقینی طور پر دور ہے۔ وہ اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اور نہ ہی متاثر ہوتا ہے کہ زینون (Xenon) جیسی غیر مؤثر گیس بھی مرکب بنا سکتی ہے۔ ایک ایسا عمل جس کے بارے میں اب تک کیمیا دانوں کو یقین کامل تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ علم جدید ترین ٹیکنالوجی سے مزین ہو اور اس شخص پر اس کا اثر مرتب ہو، اس وقت تک، وہ اس (علم) سے غفلت برت سکتا ہے۔ جبکہ دیگر امور سے متعلق جدید علم اس کی غرض و غایت سے بلاواسطہ منسوب ہیں جیسے اس کی ملازمت، سیاست، اس کی خاندانی زندگی حتیٰ کہ اس کا جنسی روّیہ۔

اس کی ایک تکلیف دہ مثال والدین کی وہ الجھن ہے جس میں آج کل وہ گرفتار ہیں اور اس کی وجہ، تواتر سے ہونے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں، معاشرے میں موجود بچے کے ذہن میں ابھرنے والے عکس اور بچوں کی پرورش سے متعلق نظریات ہیں۔

مثال کے طور پر صدی کے آخری حصے میں امریکہ میں رائج نظریہ عام سائنسی فکر پر مبنی تھا کہ روّیے موروثی برتری پر ہی مبنی ہوتے ہیں۔ وہ مائیں جنھوں نے کبھی بھی ڈارون یا سپنسر کا نام نہیں سنا تھا اپنے بچوں کی پرورش اس انداز سے کرتی تھیں جیسے ان سوچنے والوں کے آفاقی خیالات تھے۔ بھونڈے اور سادہ خیالات، جو سینہ بہ سینہ چلا کرتے تھے اور اس میں لاکھوں عام انسانوں کی توثیق شامل تھی یعنی ''بُرے بچے بُرے خاندان ہی کی پیداوار ہیں''، اور یہ کہ ''جرم وراثت میں منتقل ہوتا ہے،'' وغیرہ۔

صدی کی ابتدائی دہائیوں میں یہ روّیے ''شعورِ ماحولیات'' کے ابھرنے سے پسِ پشت چلے گئے۔

یہ یقین ہونا کہ ماحول شخصیت کی تعمیر کرتا ہے اور ابتدائی سال اہم ترین ہوتے ہیں، اس بات کے احساس سے بچے کی ایک نئی تصویر ابھر کر سامنے آ گئی۔ واٹسن (Watson) اور پیولو (Pavlov) کے تصورات عوام میں مقبول ہونے لگے۔ ماؤں نے نئے رویے کا اظہار کرنا شروع کر دیا، بچوں کے تقاضے پر دودھ پلانے سے انکار کرنے لگیں، جب وہ روتے تو گود میں نہ لیتیں، وقت سے پہلے ہی دودھ پلانا چھڑوا دیتیں تاکہ طویل انحصاری سے گریز کیا جا سکے۔ یونائیٹڈ سٹیٹس چلڈرن بیورو (United states childrenBureau) نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۵۱ء کے درمیانی عرصے میں ایک کتابچہ ''انفینٹ کیئر'' (Infant Care) نے نصیحت کیے جانے والدین کا موازنہ کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ دودھ چھڑانے، انگوٹھا چوسنے اور رفع حاجت کی تربیت دینے میں واضح فرق ہے۔ اس مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ ۱۹۳۰ء کی دہائی کے اختتام تک بچے کے بارے میں ایک اور تخیل پروان چڑھ چکا تھا۔ فرائڈ کے تصورات ایک لہر کی طرح ابھر کر سامنے آئے اور بچوں کی پرورش طور طریقوں کو یکسر تبدیل کر دیا۔ اچانک ماؤں نے ''معصوم بچوں کے حقوق'' اور ''زبانی مسرت'' کی ضرورت سے متعلق سننا شروع کر دیا۔ رواداری کا رواج عام ہوا۔

جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ فرائڈ کے دیے ہوئے بچے کا ''تخیل'' ڈیٹن (Dayton)، ڈوبیوک (Dubuque) اور ڈپلاس (Daplas) میں والدین کے رویّوں کو بھی تبدیل کر رہا ہے اور ماہرِ تحلیل نفسی کا تخیل بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ ماہرین تحلیل نفسی ثقافتی ہیرو بن گئے ہیں۔ فلمیں، ٹیلی وژن کے مسودے، ناول اور مختلف جریدوں کی کہانیاں ان لوگوں کو دانا اور ہمدرد شخصیات کی حیثیت سے پیش کر رہی تھیں، گویا وہ جادوئی اثرات کے حامل ہیں اور متاثرہ افراد کی شخصیات کی تعمیر نو کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں فلم ''Spellbound'' ریلیز ہونے کے بعد، ۵۰ کی دہائی کے آخر تک ذرائع ابلاغ ماہر تجزیہ نفسی کو مثبت انداز میں پیش کرتے رہے ہیں۔

لیکن ۶۰ کی دہائی کے وسط میں اسے (ماہر تجزیہ نفسی) کو ایک مزاحیہ کردار میں تبدیل کر دیا گیا۔ پیٹر سیلرز (Peter Sellers) نے فلم ''What's new pussycat?'' نے اکثر مریضوں سے بھی زیادہ ایک ''ماہر تجزیہ نفسی'' کو پیش کیا ہے اور ماہر تجزیہ نفسی کے ''لطیفے'' نہ صرف نیویارک اور کیلی فورنیا کی اشرافیہ میں سنے جانے لگے بلکہ عوام بھی ان سے محظوظ ہونے لگے، یہ سب کچھ انہی ذرائع ابلاغ کا مرہون منت ہے جس نے اس سے پہلے ماہر تجزیہ نفسی کی داستان کو بڑے بہتر اور نمایاں انداز میں پیش کیا تھا۔

ماہر تجزیہ نفسی کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں بننے والے اس تخیل میں یہ تبدیلی (عوامی تخیل معاشرے میں موجود لوگوں کے اوسط نجی تخیل کے علاوہ کچھ اور نہیں) تحقیق کے شعبے میں تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے۔ کیونکہ ایسے شواہد سامنے آ رہے تھے کہ تحلیل نفسی کے ذریعے علاج اب اس معیار کا نہیں رہا جیسا کہ اس سے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے خاص طور پر کرداری علوم اور نفسیاتی دوا سازی کے حوالے سے، اس بات سے فرائڈ کے نظریے سے وابستہ بہت سے معالجین کے طریقہ ہائے کار دقیانوسی نظر آنے لگے۔ عین اسی وقت نظریۂ تعلم کے شعبے میں تحقیق کی ایک لہر آ گئی اور بچوں کی پرورش کے سلسلے میں ایک نیا اضافہ سامنے آیا اور اس مرتبہ یہ سلسلہ نو-کرداریت کی طرف گامزن ہوا۔

اس پیش رفت کی ہر سطح پر عمومی ذہنی تخیل کے مجموعے پر متضاد تخیل کے مجموعہ کا حملہ ہوا۔ وہ افراد ان میں سے ایک مجموعے کے حامل تھے، ان پر رپورٹوں، مضامین، دستاویزی فلموں، مقتدر افراد، دوستوں، رشتہ داروں حتیٰ کہ معمولی شناسائی والے لوگوں کی طرف سے نصیحتوں اور تجاویز کی بھرمار ہوئی، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے متضاد نظریات قبول کر لیے تھے۔ وہ ماں جو اپنے بچے کی پرورش کے دوران دو مرتبہ انہی مقتدر افراد کی طرف متوجہ ہوئی، اسے اس کے نتیجے میں، حقیقت سے اخذ شدہ، مختلف نوعیت کا مشورہ ملا۔ جبکہ ماضی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے بچوں کی پرورش کے طریقے کئی صدیوں تک یکساں ہی رہے، زمانۂ حال اور مستقبل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے، زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح، بچوں کی پرورش کا طریقہ بھی ایک ایسا میدان بن گیا جہاں تخیل کی لگاتار لہریں، جن میں سے اکثر سائنسی تحقیق کی پیداوار ہیں، آپس میں، جنگ کرتی ہیں۔

اس طرح نیا علم پرانے کو تبدیل کر دیتا ہے۔ ذرائع ابلاغ فوری طور پر اور بڑے مؤثر انداز میں نئے تخیلات کی نشر و اشاعت کرتے ہیں، اور عام افراد، جو ہمیشہ پیچیدہ تر سماجی ماحول سے مطابقت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ واقعات- جو تحقیق سے بالکل ہٹ کر ہیں- ہمارے پرانے تخیلاتی ڈھانچے کو لگاتار ضربیں لگاتا ہے۔ ہماری توجہ کی سکرین سے بڑی تیزی سے گزرتے ہوئے، یہ واقعات، پرانے تخیل کو ختم کرتے ہوئے نئے تخیلات کو جنم دیتے ہیں۔ سیاہ فام لوگوں کے اقلیتی محلوں میں آزادی کے لیے چلائی جانے والی مہم اور فسادات کے بعد کوئی مرضیاتی شخص ہی اس دیرینہ نظریے پر قائم رہ سکتا ہے کہ سیاہ فام لوگ وہ ''ہنستے کھیلتے'' بچے ہیں جو اپنی غربت پر قانع ہیں۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کی

غیر یقینی فتح کے بعد کتنے ایسے افراد ہیں جو اس تصور پر قائم رہیں کہ یہودی (اپنے چہرے کا دوسرا) گال آگے کر دینے والے، امن پسند لوگ یا میدان جنگ کے بزدل لوگ ہیں؟

تعلیم کے شعبے میں، سیاست میں، معاشی نظریہ میں، دوا سازی میں، بین الاقوامی تعلقات میں نئے تخیلات کی یکے بعد دیگرے، لہریں ہمارے ذہنوں کو متاثر کرتی ہیں اور ذہنوں میں موجود، حقیقت پر مبنی تخیلات کو متزلزل کرتی ہیں۔ تخیلات کی بمباری کا نتیجہ پرانے تخیلات کا تیزی سے متروک ہونا ہے، دانشورانہ نظریات وخیالات کی تیز آمد اور ''علم'' کی بھی ناپائیداری کی ایک نئی اور عمیق حس ہے۔

''سب سے زیادہ بکنے والی کتاب'' کا طوفان

معاشرے میں ناپائیداری کی عکاسی مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ اس کی ایک ڈرامائی مثال علم کی بھرمار کا، علم کی حامل ایک روایتی چیز، کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ چونکہ علم وافر اور نسبتاً کم پائیدار ہوگیا ہے۔ ہمارے سامنے اب مضبوط، ٹھوس اور چمڑے سے آراستہ جلد سازی موجود نہیں، جسے بعد میں کپڑے اور بعد میں موٹے کاغذ سے تبدیل کردیا گیا۔ کتاب بھی اپنے اندر موجود معلومات کی طرح ناپائیدار ہوگئی ہے۔ ایک دہائی قبل لائبریری ٹیکنالوجی کی ایک سرکردہ شخصیت، کمیونیکیشن ڈیزائنر سول کورنبرگ (Sol Cornberg) نے اعلان کیا تھا کہ عنقریب مطالعہ معلومات کے حصول کا صرف اور صرف بنیادی سطح کا ذریعہ رہ جائے گا، اور انھوں نے یہ بھی پیش گوئی کی کہ ''مطالعہ اور تحریر کرنا دقیانوسی مہارتیں شمار کی جائیں گی''۔ (یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ سول کورنبرگ کی بیگم ناول نگار ہیں)۔

وہ درست کہتے ہیں یا نہیں ایک حقیقت سامنے آئی ہے: علم سے بے پناہ وسعت آجانے کی وجہ سے یہ بات بڑے مدلل انداز میں کہی جاسکتی ہے کہ ہر کتاب (اس کتاب سمیت) معلوم چیزوں کے ایک چھوٹے سے جز کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ پھر کاغذی جلدوں کے انقلاب، یعنی سستے ایڈیشنز کی ہر جگہ دستیابی نے کتاب کے نادر ہونے کے وصف کو کم کردیا عین اس وقت جب علم کے تیزی سے متروک ہونے کے عمل نے اس کی طویل المدت علمی حیثیت کم کردی ہے۔ لہٰذا امریکہ میں کاغذی جلد کی حامل کوئی کتاب بیک وقت ۱۰۰۰۰۰ بک سٹالوں پر رکھی جاتی ہے تاکہ اسے محض ۳۰ دن بعد آنے والی کتب کی اشاعت کے سیلاب سے قبل ہی فروخت کردیا جائے۔ یوں کسی کتاب نے ماہانہ جریدے کی سی ناپائیدار حیثیت اختیار کرلی ہے۔ بلاشبہ یہ بات بھی درست ہے کہ بہت سی کتب ''ایک بار چھپنے والے'' جریدے سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی درست ہے کہ کسی کتاب - حتیٰ کہ کسی مقبول عام کتاب - کے لیے بھی عوامی دلچسپی کی شرح مدت ''سکڑتی'' جارہی ہے اور اس کی مثال یوں ہے کہ ''نیویارک ٹائمز'' کی لسٹ کے مطابق سب سے زیادہ بکنے والی کتب کی مدت میں تیزی سے کمی آرہی ہے۔ ہر سال یہ عدم تواتر کا شکار ہوتی ہیں اور صرف چند کتب ہی خلاف توقع بکتی ہیں۔ اگر ہم اس موضوع پر دستیاب ابتدائی چار سالوں، ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء کے اعداد وشمار پر نظر دوڑائیں اور اس کا موازنہ ٹھیک دس سال بعد کے چار سالوں، ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء کے اعداد وشمار سے کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ابتدائی چار سالوں میں اوسطاً سب سے زیادہ بکنے والی کتاب کا دورانیہ ۱۸،۸ ہفتے تھا جبکہ ٹھیک دس سال بعد یہ دورانیہ کم ہوکر ۱۵،۷ ہفتے رہ گیا تھا۔ لہٰذا دس سال بعد ''سب سے زیادہ بکنے والی'' کتاب کا دورانیہ تقریباً ۱/۶ کم ہوگیا تھا۔

ہمیں اس قسم کے رجحان اسی وقت سمجھ میں آسکتے ہیں جب ہم اس میں پنہاں حقیقت کو سمجھ سکیں۔ ہم ایک ایسے تاریخی مرحلے سے گزر رہے ہیں جو انسان کی نفسیات کو یکسر تبدیل کردے گا۔ کیونکہ تمام تر چیزوں میں، میک اپ کی اشیا سے لے کر علم کائنات تک، ٹو یگی کی طرح کے ماڈل سے لے کر ٹیکنالوجی کے بے مثال کارناموں تک، بیرونی دنیا میں ہونے والی تبدیلی کی رفتار کے نتیجے میں، حقیقت سے متعلق ہمارے ذہنی تخیل بھی مختصر المدت اور ناپائیدار ہوتے جارہے ہیں۔ ہم لوگ اپنے نظریات اور تخیلات کو تیز سے تیز تر رفتار سے تشکیل دے رہے ہیں اور انھیں استعمال کررہے ہیں۔ علم بھی، لوگوں، مقامات اور چیزوں کی طرح تلف پذیر ہوتا جارہا ہے۔

تیارشدہ پیغام

اگر حقیقت سے متعلق ہمارے اندرونی تخیلات بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں تو اس کی ایک منطقی وجہ اس شرح میں اضافہ ہے جس سے تخیل بھرے پیغامات ہماری حسیات کو بھیجے جاتے ہیں۔ سائنسی طور پر اس بات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کم ہی کی گئی ہے لیکن اس بات کے شواہد ملے ہیں کہ ہم کسی فرد کے ''حصول تخیل'' کو تحریک دینے کے لیے اس کے تکشف میں اضافہ کررہے ہیں۔

ایسا کیوں ہے، یہ جاننے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تخیل کے بنیادی ذرائع کا تجزیہ کریں۔ ہمارے ذہن کے خانوں میں محفوظ ہونے والے ہزاروں (تخیلاتی) ماڈل کہاں سے آئے ہیں؟ بیرونی ماحول ہمارے لیے تحرک کا کام کرتا ہے۔ ہمارے جسم کے باہر مختلف پیغامات تیار ہورہے ہیں۔ آواز کی

لہریں، روشنی کی لہریں وغیرہ۔ ہمارے حسی اعضا سے ٹکراتے ہیں۔ ایک مرتبہ موصولی کے بعد یہ پیغامات، ایک پراسرار عمل کے ذریعے حقیقی پیغامات یعنی تخیل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

موصول ہونے والے یہ پیغامات مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ کچھ کو ''بے قاعدہ'' کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص سڑک کے کنارے ٹہلتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک پتا ہوا سے اُڑ کر فٹ پاتھ پر آ گرا ہے وہ اپنے حسیاتی سلسلے میں اس منظر کو موصول کرتا ہے۔ وہ سرسراہٹ کی آواز سنتا ہے۔ وہ اس حرکت کو دیکھتا ہے اور سبزے کو محسوس کرتا ہے۔ اسے ہوا بھی محسوس ہوتی ہے۔ حسیات کے ذریعے یہ پیغامات موصول ہونے کے بعد وہ شخص ایک ذہنی تخیل بنا لیتا ہے۔ ہم ان حسیاتی اشاروں کو ہی پیغامات کا نام دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ پیغام کسی بھی دو اور کسی بھی حوالے سے، انسان کا بنایا ہوا نہیں تھا۔ یہ کسی کی طرف سے ڈیزائن کیا ہوا نہیں تھا اور اس کا مقصد کسی کو بھی پیغام کی ترسیل نہیں تھا اور انسان کو اس کو سمجھنے کا انحصار بلا واسطہ کسی سماجی ضابطے۔ سماجی طور پر تسلیم شدہ اشارے اور تعریفیں۔ پر نہیں تھا۔ ہم تمام لوگ ان چیزوں کے گھیرے میں ہیں اور ان واقعات میں حصہ لیتے ہیں۔ جب اس قسم کی چیزیں ہماری حسیات کی پہنچ میں وقوع پذیر ہوتی ہیں، ہم ان سے بے ضابطہ پیغامات وصول کر سکتے ہیں اور ان پیغامات کو ذہنی تخیل میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فرد کے ذہن کے خانوں میں موجود تخیلات کا کچھ حصہ اسی طرح کے بے ضابطہ پیغامات سے اخذ کیا جاتا ہے۔

لیکن ہم بیرونی دنیا سے باضابطہ پیغامات بھی وصول کرتے ہیں۔ باضابطہ پیغامات وہ ہوتے ہیں جو اپنے معنی کے لیے سماجی دستور پر انحصار کرتے ہیں۔ تمام کی تمام زبانیں، چاہے وہ الفاظ پر مشتمل ہوں یا حرکات پر، ڈھول کی تھاپ پر یا ناچ کی تال پر، خط تصور میں لکھا ہوا، تصویری علامات یا کسی تار کو ملانے کی ترتیب سے، یہ سب چیزیں باضابطہ حیثیت کی حامل ہیں۔ اس طرح کی زبان میں ترسیل شدہ پیغامات باضابطہ حیثیت رکھتے ہیں۔

ہم بڑی احتیاط سے یہ بات اخذ کر سکتے ہیں کہ معاشرے وسعت اختیار کر چکے ہیں اور پیچیدہ بن گئے ہیں، ایک شخص سے دوسرے شخص تک تخیل کی ترسیل کے لیے پیدا ہونے والے ضابطوں کی تعداد، عمومی شخص کو موصول ہونے والے بے ضابطہ پیغامات کی شرح، باضابطہ پیغامات کی شرح کے حق میں کمی کا شکار ہوگئی ہے۔ بالالفاظ دیگر ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ آج ہمارے تخیل کا زیادہ تر حصہ انسان کے بنائے ہوئے پیغامات

سے مشتق ہے بجائے ذاتی مشاہدے پر مبنی ''بے ضابطہ'' واقعات کے۔

مزید یہ کہ ہم باضابطہ پیغامات میں ہونے والی ایک دقیق لیکن اہم تبدیلی کو بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ ماضی کے زرعی معاشرے میں بسنے والے ان پڑھ دیہاتی کے لیے موصول ہونے والے پیغامات ''عمومی'' نوعیت کے یا ''از خود کرو'' کا پیغام لے کر آ رہے ہوں۔ وہ کسان سطحی حیثیت کی گھریلو گپ شپ، ہنسی مذق، آتش بازی یا مے خانے سے متعلق گفتگو، پکڑ دھکڑ، شکایات، شیخی بھگارنا، بچگانہ گفتگو (اور اسی طرح، جانوروں سے متعلق گفتگو) وغیرہ میں مصروف ہو سکتا ہے۔ اس طرح اس کو موصول ہونے والے باضابطہ پیغامات کی نوعیت وضع ہوگئی، اور اس طرح کے ابلاغ کی ایک اور خصوصیت اس کا ڈھیلا ڈھالا، بے ڈھنگا، بڑ بولا یا غیر ترمیم شدہ معیار ہے۔

موصول ہونے والے اس پیغام کا موازنہ جدید صنعتی معاشرے کے ایک شہری کو موصول ہونے والے باضابطہ پیغاموں سے کریں۔ مذکورہ بالا چیزوں کے علاوہ اسے ایسے پیغامات بھی موصول ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ذرائع ابلاغ سے۔ جنھیں ماہرین ذرائع ابلاغ بڑی مہارت سے ترتیب دیتے ہیں۔ وہ خبریں سنتا ہے، وہ بڑی توجہ سے لکھے گئے ڈرامے دیکھتا ہے، نشریات دیکھتا ہے، فلمیں دیکھتا ہے وہ موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے (ابلاغ کی انتہائی منظم شکل)، کبھی کبھار تقاریر بھی سنتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ کچھ ایسے کام بھی کرتا ہے جو اس کے کسان آباو اجداد نہیں کر سکے: وہ مطالعہ کرتا ہے۔ روزانہ ہزاروں الفاظ کا، جن کی بڑی احتیاط سے ادارت کی گئی ہے۔

گویا صنعتی انقلاب، جو اپنے ساتھ ذرائع ابلاغ کی جدید ترین صورت لے کر آیا، نے عام شخص کو موصول ہونے والے پیغامات کی نوعیت کو یکسر تبدیل کر دیا۔ ماحول سے وصول ہونے والے بے ضابطہ پیغامات کے ساتھ، اپنے اردگرد موجود افراد سے باضابطہ لیکن اتفاقی حیثیت کے پیغامات کی موجودگی میں اب اس فرد نے خاصی تعداد میں باضابطہ لیکن پہلے سے تیار شدہ پیغامات بھی وصول کرنا شروع کر دیے ہیں۔

یہ تیار شدہ پیغامات اتفاقیہ یا ''از خود کرو'' نوعیت کے پیغامات سے ایک اہم حوالے کی وجہ سے مختلف ہیں: ڈھیلے ڈھالے یا لاپروائی کے انداز سے ترتیب دیے جانے کی بجائے، یہ تیار شدہ چیز زیادہ ٹھوس، منجمد اور نسبتاً کم بوجھل ہیں۔ یہ انتہائی بامقصد، پہلے سے تیار شدہ ہوتے ہیں تاکہ غیر ضروری تکرار سے گریز کیا جا سکے، انھیں بڑے شعوری انداز سے ڈیزائن کیا جاتا ہے تاکہ معلوماتی مواد کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جا سکے۔

ماہرین ذرائع ابلاغ کی رائے میں یہ پیغامات ''معلومات سے بھرپور'' ہوتے ہیں۔

اس اہم ترین، لیکن عموماً نظر انداز شدہ حقیقت کا مشاہدہ کوئی بھی شخص ایسے کر سکتا ہے کہ وہ عام حیثیت کی حامل گھریلو گفتگو کے ۵۰۰ الفاظ (باضابطہ لیکن اتفاقی حیثیت کے) ریکارڈ کرنے کی زحمت کرے اور اس کا موازنہ اخبار کے ۵۰۰ الفاظ یا کسی فلم کے الفاظ (باضابطہ لیکن تیار شدہ) سے کرے۔ اتفاقی گفتگو تکرار، وقفوں اور تعطل کا شکار ہوگی۔ خیالات کو بار بار دہرایا جاتا ہے، عموماً یکساں الفاظ کے ساتھ اگر ایسا نہیں تو ان میں معمولی فرق ہوتا ہے۔

اس کے مقابلے میں کسی اخبار کے ۵۰۰ الفاظ یا کسی فلم کے ڈائیلاگ کی بڑی احتیاط کے ساتھ ادارت کی جاتی ہے اور انھیں ترتیب دیا جاتا ہے۔ یہ نسبتاً غیر تکرار شدہ خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ عمومی گفتگو کی نسبت ''صرف'' کی رو سے درست ہوتے ہیں اور اگر انھیں زبانی پیش کیا جائے تو یہ زیادہ بہتر انداز میں سمجھ آ سکتے ہیں۔ ان میں سے فالتو چیزوں کی تراش خراش ہو چکی ہوتی ہے۔ مدیر، مصنف، ڈائریکٹر۔ ہر شخص نے ان ''نگرانی میں تیار ہونے والے'' پیغامات کی پیداوار میں شمولیت اختیار کی، ''کہانی کو بہتر بنانے'' کے لیے جان ماری یا ''تیز رفتار عمل'' کو جاری کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی کوئی حادثہ نہیں کہ کتابیں، فلمیں، ٹیلی وژن کے ڈرامے کو ''تیز رفتار مہم جوئی''، ''تیز مطالعہ''، یا 'بے جان، دم سادھے' نما چیزیں کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی پبلشر یا فلمی پرڈیوسر اپنے کام کو ''مکرر'' یا ''بوجھل اور غیر ضروری'' کہنے کی جسارت نہیں کرے گا۔

لہٰذا جیسے ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبارات، جریدے اور ناول معاشرے میں پھیلتے ہیں، اسی تناسب سے کسی فرد کو موصول ہونے والے تیار شدہ پیغامات کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے (اور بے ضابطہ اور باضابطہ اتفاقی پیغامات کی تعداد میں کمی ہوتی ہے)، ہمیں ایک اہم تبدیلی نظر آتی ہے: کسی فرد کو موصول ہونے والے ''تخیل پر مبنی'' پیغامات کی اوسط رفتار میں متواتر اضافہ۔ باضابطہ معلومات کا وہ سمندر جو اسے گھیرے ہوئے ہے، ایک نئی ترنگ کے ساتھ اس کی حیات سے ٹکرانا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ چیز روزمرہ کے معاملات میں غفلت کی حس کو سنوارنے میں مدد دیتی ہے۔ لیکن اگر صنعتی ترقی کا انحصار ذرائع ابلاغ کی تیزی پر ہے تو جدید ترین صنعتی ترقی کا سفر اس عمل کو تیز تر کرنے کی شدید کوششوں کا مرہون منت ہے۔ باضابطہ معلومات کی لہریں موجِ شکستہ میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور تیز سے تیز تر رفتار سے ایک جھلک کی طرح ہم سے ٹکراتی ہیں، جیسے وہ ہمارے اعصابی نظام میں داخل ہونے کی خواہاں ہوں۔

موزارٹ سرگرمِ عمل

آج ہم امریکہ میں بالغان کے ہاتھوں، اخبارات کے مطالعے میں صرف ہونے والا اوسط وقت ۵۲ منٹ یومیہ ہے۔ جو شخص اخبارات کے مطالعے کے لیے تقریباً ایک گھنٹہ صرف کرتا ہے وہ شخص جریدے، کتب، اشارے، اشتہاری بورڈ، کھانے کی ترکیبیں، ہدایات، ڈبوں پر درج ہدایات ''تیار ناشتوں'' کے پیچھے اشتہارات وغیرہ پڑھنے میں بھی اپنا وقت صرف کرتا ہے۔ مطبوعہ چیزوں سے گھرا ہوا یہ شخص ۱۰۰۰۰ سے ۲۰۰۰۰ ادارت شدہ الفاظ یومیہ ''اپنے اندر ڈالتا'' ہے، یہ الفاظ ان الفاظ اور مطبوعہ چیزوں کا ایک حصہ ہیں جو اس کے سامنے آتے ہیں۔ یہی شخص شاید، ایک گھنٹہ یا سوا گھنٹہ یومیہ ریڈیو سننے پر صرف کرتا ہے۔ اگر اس کے پاس FM ریسیور ہے تو شاید اس سے زیادہ۔ اگر وہ شخص خبریں، اشتہارات، رواں تبصرے یا اسی طرح کے پروگرام سنتا ہے تو وہ اس عرصہ میں تقریباً ۱۱۰۰۰، تیار شدہ الفاظ سنتا ہے۔ وہ شخص ٹیلی وژن سننے میں بھی کئی گھنٹے گزارتا ہے۔ ان میں مزید ۱۰۰۰۰ الفاظ کا اضافہ کر لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بڑی احتیاط سے ترتیب شدہ، انتہائی بامقصد بصری چیزیں۔[۱]

بلاشبہ کوئی چیز بھی اتنی بامقصد نہیں جتنے اشتہارات ہیں اور آج ایک اوسط امریکی مرد کم از کم ۵۶۰ اشتہارات پر مبنی پیغامات یومیہ کی زد میں آتا ہے۔ تاہم ان ۵۶۰ اشتہارات میں سے وہ صرف ۷۶ ہی پر توجہ مبذول کرتا ہے، نتیجتاً وہ ۴۸۴ اشتہارات پر مبنی پیغامات یومیہ کا راستہ اس لیے روک دیتا ہے کہ وہ اپنی توجہ دیگر کاموں کی طرف مبذول کر سکے۔

یہ تمام چیزیں اس شخص کی حیات کے مقابلے میں تیار شدہ پیغامات کے دباؤ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے۔ تخیل تشکیل دینے والے پیغامات کو تیز رفتاری سے نشر کرنے کی کوشش میں ذرائع ابلاغ سے منسلک لوگ، فنکار اور دیگر افراد اس بات کی شعوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ ابلاغ سے منسلک ایک لمحے کی بھی تشہیر بڑی مقدار میں معلومات اور جذباتی مواد کی حامل ہو۔ لہٰذا ہم معلومات کو ٹھوس اور جامع بنانے کے لیے علامت نگاری کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے رجحان کو دیکھ رہے ہیں۔ آج اشتہاری دنیا سے وابستہ لوگ، ایک مقررہ اور محدود وقت میں کسی فرد کے ذہن میں زیادہ سے زیادہ پیغامات کی رسائی کے لیے فنون کی علامتی تکنیک کا بھرپور طریقے سے استعمال کر رہے ہیں۔ ذرا اس ''شیر'' کا تو تصور کریں جس کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھایا گیا ہے۔ یہ ایک ہی لفظ ہے جو لوگوں کے بصری تخیل میں ترسیل کیا گیا ہے جو بچپن

ہی سے اختیار، رفتار اور طاقت سے منسوب ہے۔ اشتہارات پر مشتمل تجارتی جریدے جیسے "Printer's Ink" کے صفحات تخیل کے بہاؤ کو تیز تر کرنے کے لیے سمعی و بصری علامت نگاری کے استعمال کے لیے دقیق تکنیکی مضامین سے بھرے ہوتے ہیں۔ بے شک آج بہت سے فنکار اشتہارات سے منسلک افراد سے تخیل کو تیز تر کرنے کی جدید تکنیک سیکھ سکتے ہیں۔

اگر اشتہارات سے منسلک لوگ، جو ریڈیو اور ٹیلی وژن پر دستیاب وقت کے ہر سیکنڈ کی ادائیگی کرتے ہیں اور جو جریدوں اور اخبارات پر لوگوں کی منتشر توجہ مبذول کرانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں، وہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تخیلات کی ترسیل کی کوشش میں مصروف ہیں، اس بات کے شواہد بھی ملے ہیں کہ عوام میں سے بہت سے افراد یہ بھی چاہتے ہیں کہ انھیں موصول ہونے والے پیغامات اور تخیلات کی شرح میں بھی اضافہ ہو۔ اس بات سے کالج کے طلبہ، تاجر انتظامیہ، سیاست دانوں اور دیگر افراد کو تیزی سے پڑھائے جانے والے کورسز کی مظہری کامیابی کی عکاسی ہوتی ہے۔ تیزی سے کورسز پڑھانے والے ایک سرکردہ سکول کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی بھی شخص کی ادخالی صلاحیت میں تین گنا اضافہ کر سکتا ہے اور کچھ پڑھنے والے اپنی اس صلاحیت کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ وہ عملاً ہزاروں الفاظ فی منٹ کے حساب سے پڑھ سکتے ہیں۔ ایک ایسا دعویٰ جو مطالعہ کرنے والے ماہرین کے نزدیک متنازعہ ہے۔ اس طرح کی رفتار ممکن ہے یا نہیں، حقیقت یہ ہے کہ ابلاغ کی رفتار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مصروف ترین افراد زیادہ سے زیادہ ممکنہ معلومات کے حصول کے لیے روزانہ ایک شدید جنگ لڑتے ہیں۔ تیز رفتاری سے مطالعہ کرنا، یقینی طور پر، ان کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔

تاہم ابلاغ میں تیزی کا تحرک، کسی طرح بھی اشتہارات یا مطبوعہ لفظ تک محدود نہیں۔ پیغامات کے مواد کو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی خواہش "American institutes fo Research" کے ان ماہرین نفسیات کے تجربات کی وضاحت ہے۔ جنھوں نے ریکارڈ شدہ لیکچرز کو عمومی رفتار سے بڑھا کر (سامعین کے سامنے) پیش کیا اور پھر سامعین کی صلاحیت ٹیسٹ کی۔ ان کا مقصد: اس بات کا کھوج لگانا تھا کہ اگر لیکچرز تیزی سے دیے جائیں تو طلبہ زیادہ سیکھتے ہیں یا نہیں۔

معلومات کے بہاؤ میں تیزی لانے کا یہی عزم سپلٹ سکرین (Split Screen) اور ''ایک سے زائد سکرینوں'' (Multi Screen) پر مشتمل فلمی سکرین پر دکھائے جانے والی فلموں کی دھن سے ظاہر ہوتا

ہے۔ مانٹریال میں ہونے والے عالمی میلے میں مختلف پویلئن میں بیٹھے ہوئے ناظرین کے سامنے روایتی فلمی سکرین نہیں تھی کہ جس پر ترتیب کے ساتھ بصری جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں بلکہ ان کے سامنے دو، تین یا پانچ سکرینیں تھیں جو بیک وقت، ناظرین کے لیے پیغام کی ترسیل کا کام کر رہی تھیں۔ ان سکرینوں پر ایک ہی وقت میں مختلف کہانیاں چل رہی ہوتی ہیں، جو ماضی کے کسی فلم بین کے برعکس، ناظر سے اس صلاحیت کی توقع کر رہی ہوتی ہیں کہ وہ ایک ہی وقت میں بہت سے پیغامات وصول کرے یا مختلف پیغامات کی چھانٹی کرے یا انھیں روکے تا کہ پیغامات کے ادخال کی شرح کو مناسب حد میں رکھا جائے۔

جریدے ''لائف'' میں شائع ہونے والے ایک مضمون: "A Film Revolution to Blitz Man's Mind" میں مضمون نگار نے تجربے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''ایک وقت میں چھ یا سات تصاویر کو دیکھنا، بیس منٹ میں پوری فلم کے برابر مواد کے دیکھے جانے سے ذہنی تفریح اور (ذہن میں چیزیں) ٹھونسنے کا عمل ہوتا ہے۔'' ایک اور مقام پر وہ تجویز دیتے ہیں کہ ''ایک سے زائد سکرینوں پر دکھائی دینے والی فلم دراصل ''ایک لمحے میں وقت کو کثیف کر دیتی ہے۔''

موسیقی میں بھی اس تیز رفتار دھکے کا وجود دیکھنے میں آ رہا ہے۔ کچھ عرصہ قبل سان فرانسسکو میں منعقد ہونے والی، موسیقاروں اور کمپیوٹر ماہرین کی کانفرنس میں انکشاف کیا گیا کہ کئی صدیوں سے موسیقی ''ایک مقررہ وقت میں فراہم کردہ سمعی مواد میں اضافہ کرنے'' کے مرحلے سے گزر رہے تھے اور اس بات کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ آج موسیقار موزارٹ (Mozart)، بیچ (Bach) اور ہیڈن (Haydn) طرز کی موسیقی اور دھنیں بجاتے ہیں جس کی تال کی رفتار، اس رفتار سے ذرا تیز ہوتی ہے جو موسیقی کی دھن ترتیب دیتے وقت تھی۔ اب ''موزارٹ'' موسیقی کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے۔

نیم خواندہ شیکسپیئر

اگر حقیقت پر مبنی ہمارے تخیلات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں اور تخیل ترسیل کرنے والی مشینری بھی تیزی سے کام کر رہی ہے تو ایک متوازی تبدیلی ان ضابطوں کو بھی تبدیل کر رہی ہے جنھیں ہم استعمال کرتے ہیں اور زبان بھی افراتفری کا شکار ہے۔ ایک لغت نویس سٹوارٹ برگ فلیگزنر (Stuart Berg Flexner) جو "Random House Dictionary of the English Language" کے مدیر بھی ہیں، کے مطابق: ''جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں وہ آج کے عہد میں بڑی تیزی سے تبدیل

ہو رہے ہیں نہ صرف عوامی اور صوتیانہ سطح پر بلکہ ہر سطح پر۔ وہ عمل جس کے ذریعے الفاظ شامل ہوتے ہیں اور متروک ہوتے ہیں، اس میں بڑی تیزی آ گئی ہے۔ یہ بات صرف انگریزی ہی پر صادق نہیں آتی بلکہ فرانسیسی، روسی اور جاپانی زبانوں کے لیے بھی درست ہے۔''

فلیگزنر نے اس بات کو ایک خوبصورت تجویز کے طور پر پیش کیا ہے کہ آج کی انگریزی زبان میں قابل استعمال ۴۵۰۰۰۰ الفاظ میں سے صرف ۲۵۰۰۰۰ الفاظ ایسے ہوں گے جو ولیم شیکسپیئر کے لیے قابل فہم ہوں۔ اگر آج شیکسپیئر مجسم صورت میں لندن یا نیویارک میں آ جائیں تو وہ ہمارے ذخیرۂ الفاظ میں سے، اوسطاً ۹ میں سے ۵ الفاظ ہی سمجھ پائیں گے۔ وہ شاعر نیم خواندہ تصور کیا جائے گا۔

یہ چیز اس بات کی دلیل ہے کہ اگر شیکسپیئر کے عہد میں زبان میں اتنے ہی الفاظ ہوتے جتنے آج ہیں تو تقریباً ۲۰۰۰۰۰ الفاظ۔ شاید اس سے بھی زیادہ۔ صدیوں کے اس سفر میں متروک ہو چکے اور ان کی جگہ نئے الفاظ در آئے ہیں۔ فلیگزنر مزید قیاس کرتے ہیں کہ اس ردو بدل کا ۳/۱ صرف گزشتہ پچاس سالوں میں ہوا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس زبان سے ترک ہونے والے الفاظ کی شرح اس کے ابتدائی عہد، ۱۵۶۴ سے ۱۹۱۴ء کے مقابلے میں تین گنا ہے۔

ردّ و بدل کی یہ تیزی سے بڑھتی ہوئی شرح ماحول سے متعلق چیزوں، طریقوں اور صفات میں تبدیلی کی غمازی کرتی ہے۔ کچھ نئے الفاظ صارفین کی تیار شدہ اشیا اور ٹیکنالوجی کی دنیا سے براہ راست آتے ہیں مثال کے طور پر "Fast-back" (وہ ٹکر روک کار جس کے پچھلے بمپر اور باڈی پر حفاظتی شیٹ لگی ہو) "Wash and wear" (وہ کپڑا جسے دھونے کے بعد استری کی ضرورت یا تو بالکل نہ ہو یا معمولی نوعیت کی ہو)، "Flash cute" (کیمرے پر فٹ ہونے والی آٹومیٹک فلیش گن جس کے چار بلب ہوتے ہیں جو باری باری جلتے ہیں) جیسے الفاظ حالیہ سالوں ہی میں اشتہارات کی دنیا سے زبان میں داخل ہوئے۔ دیگر الفاظ خبروں کی شہ سرخیوں سے وارد ہوئے۔ "Sit-in" (سیاہ فام افراد کا بطور احتجاج ایسی سیٹوں اور مقامات پر دھرنا دینا ان کے لیے ممنوع تھے، اس کام کو مہم کے طور پر کیا گیا)۔ "Swim-in" (حالات سے باخبر رہنا، شمولیت کرنا) جیسے الفاظ شہری حقوق کی (امریکی) مہم کا حصہ تھے اور وہیں سے زبان میں داخل ہوئے۔ "Teach-in" (بطور احتجاج طویل لیکچرز کا سلسلہ) کا لفظ ویت نام کی جنگ کے خلاف مہم کے دوران سامنے آیا، "Be-in" (معاملات میں شمولیت، اور یہ بھی "Sit-in" مہم کا حصہ تھا) اور "Love-in" (غیر انسانی رویوں کو ختم

کرنے اور باہمی محبت کے فروغ کے لیے ہپیوں کا اجتماع) جیسے الفاظ ہپیوں کی ذیلی ثقافت سے وارد ہوئے۔ ایل ایس ڈی (LSD) کا نشہ کرنے والے "Acidhead" (ایل ایس ڈی کے نشے میں مخمور شخص یا یہ نشہ کرنے والا) اور "psychedelic" (نشے کے ذریعے ذہنی وسعت واستطاعت کو بڑھانا) جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور انہی لوگوں کی وساطت سے یہ الفاظ زبان کا حصہ بنے۔

عوامی اور صوتیانہ سطح پر ردو بدل کی شرح اتنی تیز ہے کہ اس نے زبان میں نئے الفاظ شامل کرنے کی خاطر، لغت نویسوں کو اپنے معیارات تبدیل کرنے پر مجبور کیا ہے۔ فلیگزنر کہتے ہیں ''۱۹۵۴ء میں، جب میں نے "Dictionary of American Slang" پر کام کرنا شروع کیا تو میں کسی نئے لفظ کو اس وقت تک لغت میں شامل نہیں کرتا تھا جب تک گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں اس لفظ کے تین استعمال میرے سامنے نہ آ جاتے۔ آج اس طرح کا معیار قائم کرنا ناممکن ہے۔ کسی فن کی طرح، زبان بھی فیشن کی سی صورت اختیار کر گئی ہے۔ مثال کے طور پر صوتیانہ اصطلاحات میں سے "Fab" اور "Gear" ایک سال سے کم عرصہ تک ہی برقرار رہیں۔ یہ اصطلاحات نوخیز لڑکوں کے ذخیرۂ الفاظ میں ۱۹۶۶ء میں داخل ہوئیں، ۱۹۶۷ء میں یہ متروک ہو چکی تھیں۔ اب آپ صوتیانہ الفاظ کے لیے وقت کا معیار مقرر نہیں کر سکتے۔

نئے الفاظ کے تیزی کے ساتھ متعارف ہونے اور پھر متروک ہونے میں جو حقیقت کارفرما ہے وہ وسیع تر استعمال کے لیے زبان میں شامل ہونے والے الفاظ کی حیران کن رفتار ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آخر میں اور ۱۹۶۰ء کی دہائی کے شروع میں کسی بھی شخص کو ایسی راہ مل جاتی تھی جس کی مدد سے وہ پیشہ ورانہ زبان سے تعلق رکھنے والے عالمانہ قسم کے، الفاظ جیسے "Rubric" (سرخی، عنوان) یا "Subsumed" (تعمیم شدہ) جیسے الفاظ کو اداروں کے جریدوں سے حاصل کیا گیا، پھر نسبتاً کم اشاعت والے جریدوں جیسے "New York Review of Books or Commentary" میں انھیں استعمال کیا گیا، پھر جریدے "Esquire" کے لیے اسے چنا گیا، جس کی اس وقت تعداد اشاعت ۸۰۰۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰۰۰ تک تھی اور آخر میں جریدوں ''ٹائم''، ''نیوز ویک'' اور دیگر بڑے جریدوں کے ذریعے عوام میں پھیلایا گیا۔ آج یہ عمل تیز رفتاری سے کیا جاتا ہے۔ بڑے جریدوں کے مدیر اب ذخیرۂ الفاظ وسطی سطح کے حامل جریدوں یا اشاعت سے نہیں لیتے، وہ جریدے بھی اب یہ الفاظ عالمانہ سطح کی اشاعتوں سے لیتے ہیں تاکہ وہ ان معاملات میں سر فہرست رہ سکیں۔

جب سوسان سونٹگ (Susan Sontag) نے لفظ "Camp" اٹھایا اور اس لفظ کو ۱۹۶۴ء کے آخر میں "Partism Review" نامی جریدے میں ایک مضمون میں بنیاد کے طور پر استعمال کیا تو ''ٹائم'' نامی جریدے نے اس لفظ پر ایک مضمون مختص کرنے اور اسے حیات نو بخشنے میں صرف چند ہفتوں کا عرصہ لگایا۔ مزید چند ہفتوں کے عرصے میں یہ اصطلاح اخبارات اور ذرائع ابلاغ میں عام ہوگئی۔ آج یہ لفظ عملاً متروک ہو چکا ہے۔ اسی طرح ایک اور لفظ "Teenybopper" (وہ نوعمر لڑکی جو فیشن اور پوپ موسیقی کی دلدادہ ہو) تیزی سے استعمال میں آیا اور بہت جلد متروک ہو گیا۔

زبان (کے الفاظ) میں ردو بدل کی ایک اور اہم مثال لفظ "Negro" (سیاہ فام) سے منسوب معنی کی تبدیلی میں دیکھنے میں آیا۔ کئی سال تک سیاہ فام امریکی ہی نسل پرستی کے معنوں میں استعمال ہوتے رہے۔ روشن خیال سفید فام لوگوں نے اپنے بچوں کو لفظ "Negro" (سیاہ فام) کا استعمال بتایا اور انھیں لفظ "N" کو بڑے حروف میں لکھنے کی تاکید کی۔ کچھ ہی عرصے بعد "Stokely carmichael" نے گرین وڈ، مسی سپی میں، جون ۱۹۶۶ء کے عرصے میں ''بلیک پاور'' کے دستور کا اعلامیہ جاری کیا اور ''سیاہ'' کا لفظ نسلی انصاف کی تحریک کے دوران سیاہ فام اور سفید فام، دونوں اقوام میں فخر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس صورت حال کے پیش نظر، روشن خیال سفید فام لوگ ایک عرصے تک تذبذب کا شکار رہے کہ لفظ "Negro" استعمال کیا جائے یا "Black"۔ جب لفظ "Black" کو نئے معنی و مفہوم کے ساتھ استعمال کیا گیا تو ذرائع ابلاغ میں بھی اس لفظ کا عام استعمال ہونے لگا۔ چند مہینوں کے اندر ہی لفظ "Black" رائج ہو گیا اور "Negro" متروک ہو گیا۔

الفاظ کے پھیلاؤ کے او رمعاملات بھی ریکارڈ پر ہیں، لغت نویس فلیگزنر کے مطابق:
اور ''(موسیقی کے مشہور گروپ) "The Beatles" اپنی شہرت کے عروج میں کسی بھی پسندیدہ لفظ کو چن لیتے، ریکارڈ میں جاری کر دیتے اور ایک مہینے کے اندر وہ زبان کا حصہ بن جاتا۔ ایک وقت تھا جب NASA کے پچاس افراد سے زیادہ، لفظ "A-Ok" استعمال نہیں کرتے تھے لیکن جب ٹیلی وژن پر نشر ہونے والی ایک (رواں) خلائی پرواز کے دوران خلا باز نے یہ لفظ استعمال کیا تو یہ لفظ ایک ہی دن میں زبان کا حصہ بن گیا۔ یہی بات خلا بازی سے متعلق دیگر اصطلاحات کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے جیسے "Sputnik" یا "All Systems go" وغیرہ''۔

نئے لفظ جیسے ہی داخل ہوتے ہیں پرانے متروک ہو جاتے ہیں۔ آج کے دور میں ایک برہنہ لڑکی کی تصویر "Pin-up" (دیوار پر لٹکائے جانے کے قابل، یعنی اہمیت کی حامل) یا "Cheesecake shot" (انتہائی پرکشش تصویر خصوصاً شہوانی) قسم کی چیز نہیں بلکہ ایک ''تفریحی چیز'' بن گئی ہے۔ "Hep" (تازہ ترین اطلاعات) کا لفظ "Hip" سے تبدیل ہو گیا ہے، "Hipster" کی جگہ "Hippie" نے لے لی ہے۔ "Go-go" کا لفظ حیران کن رفتار سے زبان میں داخل ہوا لیکن اب یہ لفظ انہی لوگوں کے ساتھ غائب ہو گیا جو اس سے ....

زبان میں ہونے والا ردو بدل ابلاغ کے غیر لفظی ذرائع پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے غیر مروج اشارات ہوتے ہیں جس طرح غیر مروج لفظ ہوتے ہیں۔ انگوٹھے کو اوپر یا نیچے کرنا، انگوٹھے کا ناک کی طرف اشارہ جو بچے کسی کو شرم دلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں، ہاتھ کا گلے کے پیچھے کی طرف کرنا، گلا کاٹنے کا اشارہ ہے۔ وہ ماہرین جو اشاروں کی زبان میں ہونے والی پیش رفت پر نظر رکھے ہوتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ (اشاروں کی زبان) بھی بڑی تیزی سے تبدیلی کا شکار ہے۔

چند اشارے کنائے ایسے تھے جنھیں ہم تقریباً اخلاق سوز سمجھتے تھے، اب معاشرے میں جنسی اقدار کے تبدیل ہونے سے قابل قبول ہو گئے ہیں۔ وہ چند اشارے جنھیں پہلے محدود افراد ہی استعمال کرتے تھے، اب ان کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ مسٹر فلیگزنر نے اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ نئے اشاروں کے رائج ہونے کی ایک مثال رد کرنے اور مبارزت کرنے کے لیے استعمال ہونے والا اشارہ ہے۔ مکے کو بلند کر کے موڑا جاتا ہے۔ شاید ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں امریکا میں اطالوی فلموں کی مقبولیت اس اشارے کے رائج ہونے کا موجب بنی۔ اسی طرح انگلی اٹھا کر دکھانا...... خود کو ترقی دینے کا اشارہ...... پہلے کی نسبت اب تکریم کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر اشارے کنائے یا تو عملاً ختم ہو گئے ہیں یا ان کے یکسر مختلف متبادل سامنے آ گئے ہیں۔ انگوٹھے یا انگلی سے گول دائرہ بنانے کا مطلب ہے کہ تمام بالکل صحیح جا رہا ہے، اب یہ نشان متروک ہوتا جا رہا ہے، چرچل کا بنایا ہوا "V" کا نشان فتح کی علامت سمجھا جاتا تھا لیکن اب احتجاج کرنے والے اسے امن قائم کرنے کی خاطر استعمال کرتے ہیں لہٰذا اب اس کا مطلب ''امن'' لیا جاتا ہے نہ کہ فتح۔''

ایک وہ وقت تھا جب کوئی شخص معاشرے میں رائج زبان سیکھتا تھا اور پھر اس کا استعمال کرتا تھا اور

ذرا سی تبدیلیوں کے ساتھ، یہ سلسلہ جاری وساری رہتا تھا۔ اس کے سیکھے ہوئے ہر لفظ یا اشارے کے ساتھ اس کا تعلق دیر پا ہوتا تھا۔ آج کے عہد میں، حیران کن حد تک، یہ بات موجود نہیں۔

مصوری: کعبی مصور اور حرکیاتی مصور

اشارے کنایوں کی طرح مصوری بھی غیر لفظی اظہار کا ذریعہ ہے اور تخیل کی ترسیل کا ابتدائی ذریعہ ہے۔ اس میں ناپائیداری کے شواہد سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم مصوری کے ہر مکتب فکر کو الفاظ پر مشتمل ایک زبان کی حیثیت سے تصور کریں تو پھر ہم الفاظ کا متبادل نہیں دیکھ رہے بلکہ مکمل زبان کی تبدیلی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ماضی میں کوئی شخص اپنی زندگی میں مصوری کے شعبے میں فن کی بنیادی تبدیلی کا شاذ ہی مشاہدہ کرتا تھا۔ کوئی بھی اسلوب یا مکتب فکر، ایک اصول کے طور پر، نسلوں تک قائم رہتا تھا۔ آج مصوری میں ردوبدل کی رفتار منظر کو مکدر کر دینے والی سی صورت ہوتی ہے۔ ناظر کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ کسی مکتب فکر کو پروان چڑھتا دیکھے اور اس کی زبان سیکھے اور وہ بھی اس اسلوب کے ختم سے پہلے۔

انیسویں صدی کے آخری ربع میں اس تبدیلی کے سلسلے کی آخری کڑی ''تاثریت'' ہے۔ یہ ایک ایسے وقت میں آئی جب صنعتی ترقی کی زبردست لہر کا آغاز ہوا جس کے بعد روزمرہ کے چلن میں واضح فرق نظر آیا۔ ''تمام تر باتوں سے ہٹ کر یہ بات سامنے آئی کہ تکنیکی ترقی اور وہ طریقۂ کار جس کے ذریعے اس شرح رفتار پر زور دیا جا رہا ہے وہ مرضیاتی نظر آتی ہے خاص طور پر جب اس کا موازنہ، فن وثقافت کے شعبے میں، تاریخ کے ابتدائی ایام سے کیا جاتا ہے''۔ فن کے اسلوب سے متعلق یہ مشاہدات ماہر تاریخ فنون آرنلڈ ہوسر (Arnold Houser) کے ہیں۔'' کیونکہ ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی نہ صرف فیشن میں تیزی سے تبدیلی لاتی ہے بلکہ جمالیاتی ذوق کے معیارات بھی تبدیل کر دیتی ہے۔ روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کا تیزی اور تواتر کے ساتھ تبدیل ہونا اور ان کی جگہ نئی چیزوں کا آجانا.......... اس رفتار کو از سر نو ترتیب دیتا ہے جس سے فلسفیانہ اور فنون لطیفہ کی چیزیں تبدیل ہوتی ہیں......۔''

اگر ہم ۱۸۷۵ء سے ۱۹۱۰ء کے درمیانی عرصے میں تاثریت کے دور کو دیکھیں تو ہمیں اس کے عروج کا عرصہ تقریباً ۳۵ سالوں پر محیط نظر آئے گا۔ اس وقت سے لے کر اب تک کوئی بھی مکتب فکر یا اسلوب، مستقبلیت سے فاؤسٹ تک، کعبیت (cubism) سے ورائے حقیقت پسندی تک، اتنے طویل عرصے تک کوئی بھی اپنا (بھرپور) وجود برقرار نہ رکھ سکا۔ یکے بعد دیگرے اسلوب برطرف کر دیے گئے۔ بیسویں صدی

میں سب سے دیرپا مکتب فکر تجریدی علامیت نے اپنا عروج تقریباً ۲۰ سال تک قائم رکھا یعنی ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۰ء تک اس کے بعد آنے والے مکتب فکر بڑی تیز رفتاری سے آئے۔ ''پوپ'' پانچ سال تک قائم رہا، ''اوپ'' صرف دو یا تین سال تک عوام کی توجہ مبذول کر سکا، اس کے بعد ''حرکی مصوری'' کا ابھر کر سامنے آنا مناسب اور بروقت تھا۔

خیالی صورتوں کے مظاہر سے متعلق یہ ردوبدل صرف نیویارک اور سان فرانسسکو تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس کا دائرہ کار پیرس، روم، سٹاک ہوم اور لندن میں بھی نظر آیا۔ جہاں مصور بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا Robert Hughes نے جریدے ''نیوسوسائٹی'' میں تحریر کیا: ''نئے مصوروں کا خیر مقدم کرنا اب برطانیہ کا سالانہ ''کھیل'' بن گیا ہے.......... انگریزی مصوری میں سالانہ کی بنیاد پر نیا اسلوب متعارف کروانے کا جوش وجذبہ پروان چڑھ گیا ہے۔ ایک احساس مسرت اور تقریباً اختتامی خیال کی تجدید۔''

تاہم وہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ یہ توقع رکھنا کہ ہر آنے والا سال ایک نیا طرز اور مصوروں کی نئی کھیپ لے کر آئے گا، ''موجودہ صورت حال کی مضحکہ خیز نقالی ہے۔ آج کے دور کے پیش رو افراد کی تعداد میں تیزی سے ردوبدل۔''

اگر مصوری کے مکاتیب فکر کو زبانوں سے منسلک کر دیا جائے تو مصوری کے انفرادی کاموں کو الفاظ سے تشبیہ دی جائے گی۔ اگر ہم اس ترتیب محل کو بدل ڈالیں تو مصوری کے شعبے میں ہمیں ایسی ہی صورت حال نظر آئے گی جیسی کسی زبان کے الفاظ میں۔ یہاں (زبان کے معاملے میں) ''الفاظ''۔ یعنی مصوری کے انفرادی کام...... استعمال میں آ رہے ہیں اور پھر ذخیرۂ الفاظ سے بڑی تیزی کے ساتھ خارج ہو رہے ہیں۔ انفرادی کام آرٹ گیلریوں یا کسی جریدے کے صفحات کی صورت ہمارے شعور کے سامنے ایک جھلک کی طرح گزرتے ہیں، جب ہم انھیں دوبارہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ غائب ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ کام بھی عملاً ہمارے سامنے سے غائب ہو جاتا ہے۔ کبھی تو وہ فن یا ایسی تعمیرات ہوتی ہیں جو نازک اجزا سے بنی ہوتی ہیں جو ایک خاص عرصہ گزر جانے کے بعد گر جاتی ہیں۔

موجودہ عہد میں مصوری کی دنیا میں پیدا ہونے والی غلط فہمی کی وجہ اس پہچان میں ثقافتی ترقی کی ناکامی ہے کہ خواص کی حکمرانی اور دوام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار بنگھمٹن، نیویارک کی سٹیٹ یونیورسٹی کے سنٹر فار انٹیگر یٹو سٹڈیز (Integrative Studies) کے سربراہ مصور اور نیم

سماجی سائنسدان جان میک ہیل (John McHale) نے کیا اور "The Plastic Parthenon" نامی
ایک زوردار مضمون میں نشاندہی کی، ''مصورانہ اور ادبی پرکھ کے روایتی اصول...... دوام، بے مثلیت اور چیدہ
تخلیقات کی دیرپا آفاقیت پر زیادہ زور دیتے تھے۔'' وہ مزید کہتے ہیں کہ اس طرح کے جمالیاتی معیارات،
ہاتھ سے بنائے گئے سامان اور ذوق سے متعلق خواص تک محدود تھے۔ تاہم یہ معیارات، ''کسی طرح بھی ہمیں
اس قابل نہیں بناتے کہ اپنی موجودہ صورت حال سے مناسب طریقے سے جڑ جائیں جس میں بڑی تعداد میں
مصنوعہ اشیا پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی گردش ہوتی ہے اور وہ استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں یکسر مختلف ہیں یا ان
میں معمولی فرق ہے۔ مختلف حوالوں سے یہ استعمال کے قابل ہیں، بدل پذیر ہیں اور ان میں کسی انوکھی ''قدر'' یا
خلقی ''سچائی'' کا فقدان ہے۔''

مسٹر میک ہیل (McHale) کا خیال ہے کہ آج کے مصور کسی بھی خاص چیز کے لیے کام کرتے
ہیں اور نہ ہی اس نظریے کو سنجیدگی سے لیتے ہیں کہ دوام ایک وصف کی حیثیت رکھتا ہے، وہ مزید کہتے ہیں
''مصوری کا مستقبل اب اس معیار پر قائم نہیں کہ دوام پر مبنی شاہکار تصویر کشی کی جائے۔'' بلکہ مصور اب
قلیل المیعاد کام کی طرف گامزن ہیں۔ مسٹر میک ہیل نتیجہ اخذ کرتے ہیں: ''انسان کی حالت میں ہونے والی
تیز رفتار تبدیلیاں علامتی تخیل کے ایک متواتر سلسلے کی متقاضی ہیں جو اس لگاتار تبدیلی، تیز رفتار اثرات اور
متروک پن کے تقاضوں کو پورا کر سکیں، ہمیں تمثال کے ایک بدل پذیر اور صرف شدنی قسم کے سلسلے کی
ضرورت ہے۔''

کوئی بھی شخص مسٹر میک ہیل کے اس اعتراض سے اختلاف کر سکتا ہے کہ مصوری میں ناپائیداری
پسندیدہ ہے۔ شاید دوام سے نجات ایک تدبیراتی غلطی ہے۔ یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے مصور
صاحبان ہومیو پیتھک طرز کا جادو کر رہے ہیں جو ابتدائی دور کے انسان کی طرح اس قوت سے خائف تھے جسے
وہ بیان نہیں کر سکتے تھے، اور صرف سادہ طریقے سے اس کی نقالی کرتے ہوئے اس پر قابو پانے کی کوشش
کر رہے ہیں۔ معاصرانہ مصوری کی طرف اس کا رویہ جو عارضی ہو، ناپائیداری ایک، تسکین ناپذیر حقیقت کے
طور پر برقرار ہے، ایک سماجی اور تاریخی صلاحیت جو ہمارے عہد کے لیے اتنی ضروری ہے کہ اسے فراموش نہیں
کیا جا سکتا اور یہ بات بھی واضح ہے کہ مصور اس کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔

مصوری میں ناپائیداری کے پیچھے کارفرما عوامل کی عکاسی مصوری کے ناپائیدار ترین کام ''ہیپننگ''

(Happening) سے ہوتی ہے۔ ایلن کیپرو (Allan Kaprow) جنھیں اس اسلوب کو متعارف
کروانے والی شخصیت سمجھا جاتا ہے، نے اس کا تعلق اس تلف پذیر ثقافت سے جوڑا ہے جس میں ہم رہتے
ہیں۔ اس اسلوب کے محرکین کے نزدیک "Happening" کی بہترین تصویر کشی اور نمائش صرف اور صرف
ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے۔ "Happening" مصوری کی دنیا کا کلینیکس ٹشو پیپر ہے۔

اگر ایسا ہے تو حرکی مصوری کو معیاریت کی جمالیاتی تجسیم سمجھا جا سکتا ہے۔ حرکی مصوری یا مجسمے
رینگتے ہیں، سیٹی بجاتے ہیں، کراہتے ہیں، جھولتے ہیں، اکڑتے ہیں، لہراتے یا تھرتھراتے ہیں، ان کی
روشنیاں جگمگاتی ہیں، ان کے مقناطیسی فیتے گھومتے ہیں، ان کے پلاسٹک، سٹیل، شیشے اور کارپر کے اجزا ایک
منظم شدہ، تاہم کبھی کبھار خفیہ اسلوب کے سریع الزوال نمونوں میں خود کو ترتیب اور از سرنو ترتیب دیتے
رہتے ہیں۔ یہاں پر ''وائرنگ'' اور ''کنکشن'' کے عوامل اس ڈھانچے کے نسبتاً کم ناپائیدار حصے ہیں، جس
طرح جان لٹل وڈ فن پلیس (Joan Littlewood's Fun Palace) پر کرینیں اور سروس ٹاورز بنائے
جاتے ہیں تاکہ معیاری اجزا کی کسی خاص ترتیب کو قائم رکھا جائے۔ تاہم حرکی مصوری کا مقصد زیادہ سے زیادہ
تغیر پذیری اور ناپائیداری کی تشکیل ہے۔ جین کلے (Jean Clay) نے اس بات کی نشاندہی کی کہ مصوری
کے روایتی کام میں ''اجزا کا ان کے کل کے ساتھ رشتہ ہمیشہ کے لیے بندھ جاتا ہے، اور حرکی مصوری میں
اسلوب کا توازن بہاؤ میں ہوتا ہے۔''

آج بہت سے مصور انجینئروں اور سائنسدانوں کے ساتھ مل کر اس لیے کام کر رہے ہیں کہ جدید
تکنیکی مراحل کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے یعنی معاشرے میں تیز رفتار دھکے کی علامیت۔ فرانس
سے تعلق رکھنے والے فن مصوری کے تنقید نگار فرینکیسل (Francastel) لکھتے ہیں، ''رفتار ایک ایسا مسئلہ بن
گئی ہے جس کے بارے میں لوگوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو اور مسلسل حرکت ہر شخص کا دیرینہ تجربہ۔'' مصوری
اس نئی حقیقت ہی کی نمائندگی کرتی ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ فرانس، برطانیہ، امریکا، سکاٹ لینڈ، سویڈن، اسرائیل یا کسی بھی ملک سے
تعلق رکھنے والے مصور حرکی مصوری کر رہے ہیں۔ اس وصف کو شاید سب سے بہتر ایک اسرائیلی حرکی مصور
یاکوو ایگم (Yaccov Agam) نے بیان کیا ہے جو کہتے ہیں: ''ہماری صورت حال، تین مہینے قبل والی
صورت سے مختلف ہے، اور مزید تین لمحوں میں ہماری صورت حال مختلف ہو جائے گی...... میں اس طرز نظر کو

پلاسٹک نما اظہاریہ دینے کی کوشش کرتا ہوں ایک بصری طرز نظر جس کا وجود نہیں۔ یہ تخیل ابھرتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے لیکن کوئی چیز برقرار نہیں رہتی''۔

ان کوششوں کا عروج ان نئے اور حقیقی ''فن کدوں'' کی تعمیر ہے۔ جن کی مکمل فضا نائٹ کلبوں جیسی ہو جس میں آنے والے ایک ایسے ماحول میں داخل ہو جائیں جہاں روشنی، رنگ اور آوازیں ان کے نمونوں کو تواتر سے تبدیل کر دے۔ گویا ''داخل ہونے والا'' حرکی فن کی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ یہاں پر بھی ڈھانچہ یعنی عمارت، کل کا سب سے دائمی حصہ ہے جبکہ اس کا اندرونی حصہ حساس قسم کے ادخال سے تعلق رکھتا ہے۔ چاہے کوئی شخص اسے تفریح سمجھے یا نہیں اس بات کا انحصار فرد پر ہے، شاید، لیکن ان سرگرمیوں کی مجموعی سمت واضح ہے۔ کسی زبان کی طرح، مصوری میں بھی ناپائیداری کی طرف جا رہے ہیں۔ تخیل کے علامتی عمل کے ساتھ انسان کے رشتے ناپائیدار سے ناپائیدار تر ہوتے جا رہے ہیں۔

اعصابی سرمایہ کاری

واقعات بڑی تیزی سے ہمارے قریب سے گزر جاتے ہیں، ہمیں اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنے مفروضات کا از سر نو جائزہ لیں۔ حقیقت سے متعلق بننے والے ہمارے گزشتہ تخیلات۔ تحقیق انسان اور فطرت سے متعلق پرانے نظریات کو ڈگمگا دیتی ہے۔ خیالات بڑی تیز رفتاری کے ساتھ آتے اور جاتے ہیں (ایک ایسی رفتار جو کم از کم سائنس کے شعبے میں، ایک صدی قبل کی رفتار سے ۲۰ سے ۱۰۰ گنا زیادہ تصور کی جاتی ہے) تخیلات سے بھرپور پیغامات ہماری حسیات پر ضرب لگاتے ہیں۔ اسی دوران زبان اور مصوری، وہ ضابطے جن کے ذریعے ہم تخیل سے بھرپور پیغامات ایک دوسرے تک منتقل کرتے ہیں، بھی خود کو بڑی تیزی سے تبدیل کر رہے ہیں۔

یہ تمام باتیں ہمیں غیر تبدیل شدہ نہیں چھوڑ سکتیں۔ اور نہ ہی چھوڑتی ہیں۔ یہ اس شرح میں اضافہ کر دیتے ہیں جس پر کسی فرد کو اپنے تخیل کے ''حصول'' میں تیزی لانی چاہیے اگر اسے تبدیل ہوتے ہوئے ماحول کے ساتھ کامیابی سے مطابقت کرنا ہے۔ حقیقی طور پر کوئی بھی شخص یہ نہیں جانتا کہ ہم باہر کی دنیا سے اشارے اپنے تخیل میں کس طرح شامل کرتے ہیں۔ تاہم نفسیات اور اطلاعیاتی سائنسی علوم اس بات پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں کہ جب کوئی تخیل پیدا ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ اس بات کا آغاز کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ذہنی ماڈل بہت سے پیچیدہ ترین تخیل سے مربوط ڈھانچوں میں ترتیب دیا جاتا ہے اور یہ کہ اس کے نتیجے میں،

درجہ بندی کے بہت سے اصولوں کے تحت بہت سے نئے تخیل ان ڈھانچوں میں بھر دیے جاتے ہیں۔ اسی مناسبت سے، دیگر تخیلات کے ساتھ ساتھ ایک نو تشکیل شدہ تصور بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ بڑے اور مشمولہ عام تصورات کے ساتھ ساتھ چھوٹے اور محدود نتائج بھی ترتیب میں لگ جاتے ہیں۔ اس تخیل کی موافقت ریکارڈ میں پہلے سے موجود تخیلات سے کی جاتی ہے (یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ایک مخصوص دماغی نظام کی موجودگی کے شواہد موجود ہیں جو موافقت چیک کرنے کے اس نظام کو جاری رکھے ہوئے ہے)۔ اس تخیل کی مناسبت سے ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ آیا یہ ہمارے مقاصد کے مطابق ہے یا یہ مطابقت سے بہت دور ہے لہٰذا ہمارے لیے غیر ضروری ہے۔ ہر تخیل کی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ کہ یہ ہمارے لیے ''اچھا'' یا ''برا'' ہے؟ بالآخر ہم اس نئے تخیل کے ساتھ جو کچھ مزید کرتے ہیں، ہم اس کی صداقت بھی پرکھتے ہیں۔ ہم یہ بھی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس پر کتنا یقین رکھنا ہے۔ کیا یہ حقیقت کی صحیح عکاسی ہے؟ کیا یہ قابل یقین ہے؟ کیا اسے ہمارے عمل کی بنیاد ہونا چاہیے؟

ایک نیا تخیل جو مواد کے حوالے سے کہیں اور فٹ ہوتا ہے، اور جو وہاں پہلے سے موجود تخیل سے موافقت رکھتا ہے۔ ہمیں ذرا دشواری دیتا ہے۔ لیکن اگر جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، تخیل مماثلت رکھتا ہے، اگر یہ موافقت رکھتا ہے یا یہ غیر معیاری ہے، تاہم یہ ہمارے سابقہ استدلال کی رو میں ہی بہہ رہا ہو، تو ذہنی ماڈل کو اسے زبردستی دہرانا پڑے گا۔ تخیل کی ایک بڑی تعداد کو از سر نو درجہ بندی کرنی پڑتی ہے، گھلنا ملنا پڑتا ہے، دوبارہ تبدیل ہونا پڑتا ہے تاوقتیکہ ایک مناسب انضمام نہ ہو جائے۔ کبھی کبھار تخیل کے ڈھانچوں کے حامل مکمل گروہوں کو ٹوٹنا پڑتا ہے اور پھر اپنی تعمیر نو کرنی ہوتی ہے۔ انتہا درجے کے معاملات میں اس کامل ماڈل کی بنیادی شکل کا مکمل معائنہ کروانا پڑتا ہے۔

لہٰذا ذہنی ماڈل کو تخیلات پر مبنی ایک لائبریری کے طور پر ہی نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ ایک جیتی جاگتی موجودہ شے کے طور پر دیکھنا چاہیے جو توانائی اور سرگرمیوں سے بھرپور ہے۔ یہ کوئی ''ماحصل'' چیز نہیں ہے جسے ہم باہر کی دنیا سے بڑی سست روی سے حاصل کر لیں۔ بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے ہم بڑی مستعدی سے لحمہ بہ لحمہ تعمیر اور تعمیر نو کرتے ہیں۔ بیرونی دنیا کو، بڑے چاق و چوبند طریقے سے، اپنے حواس سے چھانتے ہوئے، اپنی ضروریات اور خواہشات سے متعلق معلومات کے لیے چھان بین کرتے ہوئے، ہم لوگ ترتیب نو اور تازہ کرنے کے ایک مسلسل عمل میں مصروف ہوتے ہیں۔

اگر کسی نہج پر پہنچ کر بہت سے تخیل بوسیدگی کا شکار ہوتے ہیں اور فراموشی کی لامحدود وسعت میں گر جاتے ہیں۔ دیگر اس نظام میں داخل ہونے سے پہلے اس مرحلے سے گزرتے ہیں اور پھر ریکارڈ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم ان تخیلات کو بحال کر رہے ہیں، انھیں ''استعمال'' میں لا رہے ہیں اور پھر اپنے ریکارڈ میں واپس لا رہے ہیں، شاید کسی مختلف جگہ پر۔ ہم مسلسل ان تخیلات کا موازنہ کر رہے ہیں، انھیں ربط میں لا رہے ہیں، نئے طریقوں سے ان کے حوالے ملا رہے ہیں اور پھر انھیں نئے مقام پر رکھ رہے ہیں۔ ''ذہنی سرگرمی'' سے یہی کچھ مراد ہے اور کسی پٹھے کی سرگرمی کی طرح یہ بھی ایک قسم کا کام ہے۔ اس نظام کو چلتا رہنے دینے کے لیے معیاری قسم کی توانائی کی ضرورت ہے۔

معاشرے میں وسعت اختیار کرتی ہوئی تبدیلی اس خلا کو بڑھا دیتی ہے کہ جو کچھ ہم یقین کرتے ہیں اور جو حقیقت ہے، موجود تخیلات اور حقیقت کے درمیان انھوں نے منعکس ہونا ہوتا ہے۔ جب یہ خلا متوازن قسم کا ہوتا ہے تو ہم تبدیلی کے ساتھ، بڑے منطقی انداز میں ہم آہنگ ہو سکتے ہیں، ہم نئے حالات میں بڑی دانشمندی سے اپنے ردعمل کا اظہار کر سکتے ہیں، حقیقت پر ہماری گرفت ہوتی ہے۔ جب یہ خلا خاصا وسیع ہو جاتا ہے تو ہم خود کو ہم آہنگ ہونے سے قاصر محسوس کرنے لگتے ہیں، ہم نامناسب انداز میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں ہم غیر اثر پذیر، پیچھے ہٹنے والے یا محض خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی آخری انتہا پر، جب یہ خلا خاصا وسیع ہو جاتا ہے تو ہم دماغی عارضے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔

اپنے مطابقت پذیرانہ توازن کو برقرار رکھنے کے لیے اس خلا کو کارکردگی کے قابل رہنے کے لیے ہم لوگ اپنے تخیل کو تازہ رکھنے کی جدوجہد کرتے ہیں، اسے روزمرہ کی پیشرفت سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ہم حقیقت کو پھر سے جان سکیں۔ لہٰذا ہمارے باہر موجود تیز رفتار دھکا مطابقت پذیر فرد کے لیے مناسب رفتار مہیا کر سکے۔ تخیل پیدا کرنے کے نظام جیسے عارضی ہوں ان کی کارکردگی تیز سے تیز تر ہو رہی ہے۔

اس سے پیدا ہونے والے نتائج کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ کیونکہ جب بھی ہم کسی تخیل کی تقسیم سازی کرتے ہیں ہم اپنے ذہن میں موجود خاص قسم کے تنظیمی نمونے میں ایک خاص قسم کی، شاید قابل پیائش توانائی کی سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ سیکھنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہے، اور ازسرنو سیکھنے کے لیے مزید توانائی کی

ضرورت ہے۔ ییل (Yale) سے تعلق رکھنے والے ہیرولڈ ڈی لیس ویل (Harold D Lasswell) کہتے ہیں ''سیکھنے سے متعلق جتنی بھی تحقیقات ہیں وہ اس نظریے کی تصدیق کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ ''توانائیاں گزشتہ سیکھی ہوئی چیزوں کی تائید کی پابند ہیں۔ اور یہ کہ ماضی میں سیکھی ہوئی چیزوں کو کھولنے کے لیے بھی نئی توانائیوں کی ضرورت ہے.......... علم الاعصاب کی سطح پر کوئی بھی ترقی یافتہ نظام سیل کے مادے، برقیاتی رو اور کیمیائی عناصر شامل کرتا ہوا نظر آتا ہے..... فیصلے کی گھڑی میں..... جسمانی نظام فکس شدہ اقسام اور توانائیوں کی شاندار سرمایہ کاری کی نمائندگی کرتا ہے.........'' مختصر سے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے: ازسرنو سیکھنے میں قیمتیں شامل ہوتی ہیں یا ہماری اصطلاح میں تخیل کی ازسرنو درجہ بندی۔

تعلیم کو جاری رکھنے کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہوئے، ازسرنو تربیت سے متعلق عمومی بحث و مباحثہ میں یہ مفروضہ کارفرما ہے کہ تعلیم نو سے متعلق یہ مفروضہ ہے کہ انسان کی توانائیاں لامحدود ہیں۔ ابھی تک یہ مفروضہ ہی ہے، حقیقت نہیں ہے اور یہ ایسا مفروضہ ہے جسے انتہائی گہری سائنسی جانچ پڑتال کی ضرورت ہے۔ تخیل کی تشکیل کا عمل اور اس میں درجہ بندی، ایک ایسا جسمانی محمل ہے جس کا انحصار عصبی خلیوں اور جسمانی کیمیکلز کی محدود خصوصیات سے ہے۔ عصبی نظام میں، جیسا کہ اب سمجھا جاتا ہے، تمام تر تصورتوں میں، تخیل کی پیداوار کی مقدار اور رفتار میں ایسی خلقی حدود ہیں جنھیں کوئی فرد پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتا ہے۔ ان حدود سے ٹکرانے سے قبل کوئی بھی فرد اپنے اندرونی تخیلات کو کتنی تیزی سے اور کتنے تواتر سے دہرا سکتا ہے؟

کوئی بھی نہیں جانتا۔ بات کچھ یوں ہے کہ اس کی حدود، موجودہ ضرورت کی نسبت اتنی پھیلی ہوئی ہیں کہ اس طرح کے مایوس کن مفروضے بعید از جواز ہیں۔ تاہم ایک اہم حقیقت ہماری توجہ مبذول کرواتی ہے: بیرونی دنیا میں تبدیلی کی رفتار کو بڑھا کر، ہم کسی فرد کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ہر گزرتے لمحے اپنی کائنات سے متعلق سیکھنے اور دوبارہ سیکھنے کے عمل کو جاری رکھے۔ یہ بات اعصابی نظام پر ایک نیا دباؤ ڈالتی ہے۔ ماضی سے تعلق رکھنے والے لوگ، جو نسبتاً پائیدار قسم کے ماحول سے مطابقت رکھتے تھے، وہ اپنے اندرونی خیالات سے دیرپا قسم کے تعلقات قائم رکھتے تھے جن کی نوعیت ''جو ہے جہاں ہے'' قسم کی ہوتی تھی۔ ہم لوگ جو انتہائی ناپائیدار قسم کے معاشرے کی طرف گامزن ہیں، ان تعلقات کو تراشنے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔ جس طرح ہم چیزوں، مقامات، لوگوں اور تنظیموں سے انتہائی تیزی سے تعلقات استوار اور منقطع کرتے ہیں، اسی طرح ہمیں حقیقت سے متعلق اپنے خیالات، دنیا سے متعلق اپنے ذہنی تخیلات کو، چھوٹے سے چھوٹے وقفوں

میں تبدیل کرتے رہنا چاہیے۔

لہٰذا ناپائیداری، جو انسانی تعلقات کا زور آزما "مخفف" ہے، صرف بیرونی دنیا ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کا عکس ہمارے اندر بھی ہے۔ بیرونی دنیا میں موجود نئی دریافتیں، نئی ٹیکنالوجی اور نیا سماجی نظم و ضبط ہماری زندگیوں میں ردوبدل کی بڑھتی ہوئی شرح کی صورت ہماری دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ تعلقات کے چھوٹے سے چھوٹے دورانیے۔ وہ روزمرہ کی زندگی میں تیز رفتار چلن پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ مطابقت پذیری کے ایک نئے معیار کا تقاضا کرتے ہیں اور وہ اس امکانی طور پر غارت گر سماجی بیماری کے لیے سٹیج سجا رہے ہیں جسے "مستقبل کا صدمہ/دھچکا" کہتے ہیں۔

☆☆☆

تیسرا حصّہ

نُدرت

نواں باب

سائنسی خط مستویر

ہم ایک نیا معاشرہ تشکیل دے رہے ہیں۔ ایک تبدیل شدہ معاشرہ نہیں، نہ ہی وسیع تر اور ہمارے موجودہ معاشرے کی کوئی متاثر کن صورت، صرف ایک نیا معاشرہ۔

اس سادہ سی تمہید سے ابھی ہمارے شعور کو کچوکے لگنا شروع نہیں ہوئے جب تک ہم اس کو سمجھ نہ پائیں، ہم آنے والے کل سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں ضائع کر دیں گے۔

کوئی بھی انقلاب اداروں اور طاقت سے منسوب رشتوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔ آج جدید ترین ٹیکنالوجی کی حامل اقوام میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ برلن، نیویارک، تورن [1] اور ٹوکیو میں طلبہ نے اپنے ڈین اور چانسلروں کو اغوا کیا، بہت سے مصروف اور مشہور تعلیمی اداروں کو مکمل بند کیا اور حکومتوں کا تختہ الٹنے کی دھمکی بھی دی۔ جب نیویارک، واشنگٹن اور شکاگو کے (اقلیتی) باڑوں میں جائیداد کے قدیمی قوانین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جارہی تھی تو پولیس خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ جنسی سرگرمیوں کی متعین حدود کو پامال کیا جاتا ہے۔ ہڑتالوں، توانائی کے ذرائع بند کر کے اور ہنگامہ آرائی کر کے بڑے بڑے شہروں کی زندگی مفلوج کی جاتی ہے۔ طاقت کے بین الاقوامی گٹھ جوڑ متزلزل کیے جاتے ہیں۔ معاشی و سیاسی قائدین، خفیہ طریقے سے کانپتے ہیں۔ اس خوف سے نہیں کہ کمیونسٹ (یا سرمایہ دار) انقلابی انھیں اکھاڑ پھینکیں گے بلکہ یہ سارے کا سارا نظام ہی کنٹرول سے باہر ہوتا جارہا ہے۔

یہ تمام غیر متنازعہ نشانیاں ایک بیمار سماجی ڈھانچے کی طرف اشارہ کرتی ہیں، ایک ایسا معاشرہ جو اپنے انتہائی بنیادی امور بھی ایک منظم انداز میں بجا نہیں لاسکتا۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو انقلابی تبدیلی کے کرب سے گزر رہا ہے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں میں کمیونسٹ لوگ ''سرمایہ داری کے عمومی بحران'' سے متعلق گفتگو کرتے تھے۔ تاہم یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کہ ان کی سوچ چھوٹی تھی۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ

---

(۱) اٹلی کا شمال مغربی شہر۔

سرمایہ داری کا بحران نہیں ہے بلکہ سیاسی تناظر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، خود صنعتی معاشرے کا بحران ہے۔

ہم لوگ بیک وقت نوجوانوں کے انقلاب، جنسی انقلاب، نسلی انقلاب، آبادکاری کے انقلاب اور تاریخ کے سب سے تیز رفتار اور گہرائی کے حامل، ٹیکنالوجی کے انقلاب کا سامنا کر رہے ہیں۔ ہم صنعت کاری کے عمومی بحران کے عہد میں رہ رہے ہیں۔ اگر ایک اصطلاح کی صورت میں کہا جائے تو ہم جدید ترین صنعتی انقلاب کے دور سے گزر رہے ہیں۔

اگر اس حقیقت کو مکمل طور پر سمجھنے میں ناکامی موجودہ عہد کو سمجھنے کی صلاحیت میں کمزوری پر دلالت کرتی ہے تو یہ دیگر حالات میں، دانشمند افراد کو حماقت کی طرف لے جاتی ہے، خاص طور پر جب وہ مستقبل کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بات انھیں سیدھے سادھے خطوط پر سوچتے رہنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ موجودہ دور میں افسر شاہی کی کارکردگی دیکھتے ہوئے، سادہ لوح افراد خیال کرتے ہیں کہ آنے والے دور میں افسر شاہی مزید پھلے پھولے گی۔ اس طرح کے خطط منصوبے، مستقبل کے بارے میں بہت کچھ کہے جانے یا لکھے جانے والے مواد کی عکاسی کرتے ہیں اور اس بات سے، خاص طور پر غلط چیزوں کے بارے میں سوچنے پر ہماری توجہ مرتکز ہوتی ہے۔

انقلاب کا سامنا کرنے کے لیے بھی تخیل کی ضرورت ہوتی ہے، چونکہ انقلاب بھی سیدھے خطوط پر اپنا سفر جاری نہیں رکھتا بلکہ یہ جھٹکا کھاتا ہے، گھومتا ہے اور پیچھے کی طرف آتا ہے۔ یہ مقدار یہ چھلانگوں اور منطقی تنسیخ کی صورت اختیار کرتا ہے لہٰذا صرف اس قضیے کو قبول کرنے سے کہ ہم معاشی تکنیکی ترقی کے یکسر نئے مرحلے سے گزر رہے ہیں ...... یعنی جدید ترین صنعتی ترقی کا مرحلہ ...... ہم اپنے عہد کو سمجھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ صرف اس انقلابی قضیے کو تسلیم کرتے ہوئے ہم اپنے تخیلات کو آزاد کر سکتے ہیں تاکہ ہم مستقبل پر اپنی گرفت مضبوط کر سکیں۔

انقلاب جدت پر دلالت کرتا ہے، یہ ایسے لاتعداد افراد کی زندگیوں میں جدت اور نئے پن کا سیلاب لے کر آتا ہے جن کا سامنا غیر مانوس اداروں اور ''پہلی مرتبہ'' کے تجربے سے ہوتا ہے۔ ہماری ذاتی زندگی میں گہرائی کے ساتھ رسائی کیے ہوئے اور مستقبل میں لاتعداد تبدیلیوں کا بیڑہ اٹھاتے ہوئے یہ تبدیلیاں ہمارے خاندانی ڈھانچوں اور جنسی رویوں کو تبدیل کر دیں گی یہ بوڑھے اور نوجوان افراد کے درمیان قائم روایتی رشتوں کو بھی ختم کریں گی اور پیسے و کامیابی کے اعتبار سے قائم ہماری اقدار کو بھی بالائے طاق رکھیں گی۔ یہ کام، کھیل اور تعلیم کو، حیران کن حد تک، تبدیل کر دیں گی۔ اور یہ سب کچھ ایک مخصوص، باوقار اور خوفناک قسم کی سائنسی ترقی کے بل بوتے پر ہوگا۔

اگر نئے معاشرے کو سمجھنے کے لیے ناپائیداری پہلی چابی ہے تو ندرت دوسری۔ مستقبل عجیب و غریب قسم کے واقعات کے لامتناہی سلسلے، سنسنی خیز دریافتوں، نامعقول قسم کے تضادات اور انتہا درجے کے انوکھے پن اور ندرت پر مبنی مخمصوں پر مشتمل ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ جدید ترین صنعتی ترقی کے حامل معاشروں کے بہت سے ارکان کبھی بھی اس معاملے میں ''سکھ کا سانس'' نہیں لیں گے۔ کسی سمندری مسافر کی طرح جو کسی اجنبی ملک میں محض اس غرض سے رہائش اختیار کرتا ہے کہ اس ملک سے متعلق جان سکے، ایک مرتبہ وہاں مطابقت اختیار کرنے کے بعد، اسے یہ خیال آتا ہے کہ اسے وہاں سے چلے جانا چاہیے، اور پھر دوسرے میں، ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ہم کسی ''اجنبی دیس میں، اجنبی لوگ'' ہیں۔

جدید ترین صنعتی انقلاب بھوک، بیماری، جہالت اور درندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ مزید یہ کہ سیدھے سادھے راستے پر چلنے والے مفکرین کی، سادگی پر مبنی، پیش گوئیوں کے باوجود، جدید ترین صنعتی ترقی انسان کو محدود نہیں کرے گی اور نہ ہی اسے اجاڑ اور دردناک قسم کی یکسانیت تک محدود کرے گی۔ اس کے برعکس یہ ذاتی ترقی و نشوونما، مہم جوئی اور تفریح کے نئے مواقع پیدا کرے گی۔ یہ رنگارنگی سے بھرپور ہوگی اور انفرادیت کے لیے حیران کن حد تک کھلی ہوگی۔ مسئلہ یہ نہیں کہ کوئی بھی انسان گروہ بندی اور معیاریت میں گزارہ کر سکتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آیا وہ آزادی میں گزارہ کر سکتا ہے۔

تاہم اس سارے معاملے کے لیے انسان نے ندرت سے بھرپور ایسے ماحول میں پہلے کبھی گزارہ نہیں کیا۔ زندگی کے تیزی سے بڑھتے ہوئے چلن کے ساتھ اس صورت میں گزارہ کرنا جب صورت حال اور مواقع شناسا ہوں، ایک بات ہے اور یہ گزارہ اس صورت میں کرنا جب ناشناسا، عجیب و غریب یا انہونی قسم کا موقع اور ماحول ہو، دوسری بات ہے۔ ندرت کی قوتوں کو کھلا چھوڑ کر ہم کسی انسان کو غیر معمولی اور ناقابل پیش گوئی صورت حال کے خلاف کام کرنے کے لیے کاری ضرب لگاتے ہیں اور ایسا کرنے سے ہم مطابقت پذیری کے مسائل کو نئی اور خطرناک سطح تک لے جاتے ہیں کیونکہ ناپائیداری اور ندرت کا ایک دھماکا خیز ملاپ ہے۔

اگر یہ سب کچھ مشکوک ہے تو آیئے ہم ان چند ندرتوں کو غور سے دیکھتے ہیں جو ہمارے سٹور (ریکارڈ) میں پڑی ہیں اس تمام تر تخیل کے ساتھ جس پر ہم دسترس رکھتے ہیں منطقی ذہانت کو ملا کر ہم خود کو، بڑی مضبوطی سے، مستقبل میں داخل کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنے میں کبھی کبھار ہو جانے والی غلطی کا خوف نہ کریں۔ تخیل صرف اس وقت آزاد ہو سکتا ہے جب غلطی کے خوف کو عارضی طور پر بالائے طاق رکھا جائے۔ مزید یہ کہ مستقبل کے

بارے میں سوچتے ہوئے بہتر ہے کہ بہادری کی طرف ہی غلطی کی جائے بجائے احتیاط کی طرف کے۔

ایک شخص اس بات کو حیرت سے دیکھ رہا ہے کہ دوسرا شخص ان افراد کے بارے میں سننا اور جاننا پسند کر رہا ہے جو ابھی سے مستقبل کی تشکیل میں لگے ہوئے ہیں۔ سنو! جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی کچھ تحقیقات اس بات کا انتظار کر رہی ہیں کہ وہ ایک دھماکے کی صورت ان لیبارٹریوں اور فیکٹریوں سے نکلیں۔

نیا اطلانتہ [1]

"Scripps institution of eanograppy" کے "Marine physical Laboratory" کے سربراہ ڈاکٹر ایف این سپیس (Psiess) کہتے ہیں، ''پچاس سال کے اندر اندر انسان سمندر کے اوپر اور سمندر کے اندر پہنچ جائے گا۔ اس پر قبضہ کرنے کے لیے اور سیارے (زمین کے اس حصے کو تفریح کے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے، معدنیات نکالنے کے لیے، فضلات کو تلف کرنے کے لیے، عسکری و ذرائع نقل و حمل کے لیے اور بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر، رہائشی مقاصد کے لیے۔

اس سیارے کا دو تہائی حصہ سمندر پر مشتمل ہے۔ اور زمین کے قطعہ میں سے صرف ۵ فی صد ایسا ہے جس کا بھرپور نقشہ بنایا گیا ہے۔ تاہم پانی کے نیچے کا یہ علاقہ تیل، گیس، کوئلہ، ہیروں، سلفر، کوبالٹ، یورینیم، ٹن، فاسفیٹ اور دیگر معدنیات سے مالا مال ہے۔ اس میں کثیر مقدار میں مچھلی اور پودے پائے جاتے ہیں۔

ابھی ان خزانوں کو دریافت کرنا اور بڑے پیمانے پر انھیں استعمال کرنے کا مرحلہ باقی ہے۔ آج صرف امریکا میں، سٹینڈرڈ آئل اور یونین کاربائیڈ سمیت ۶۰۰ کمپنیاں ایسی ہیں جو خود کو، زیر سمندر، بڑے پیمانے پر، ان قسم کے خزانوں کی تاریخی کھوج کے لیے تیار کر رہی ہیں۔

اس دوڑ میں ہر سال اضافہ ہوتا رہے گا۔ اور اس کا معاشرے پر گہرا اثر ہوگا۔ سمندر کی تہ اور اس پر موجود بحری حیات کا ''مالک'' کون ہے؟ چونکہ سمندری کھوج اب ممکن ہوگئی ہے اور اس میں معاشی مفاد بھی ہے لہٰذا ہم امید رکھتے ہیں کہ اگلا مرحلہ اقوام میں وسائل کی مناسب تقسیم ہی ہوگا۔ اس مرحلے کے آغاز سے قبل ہی جاپانی سمندر کی تہ سے ۰۰۰۰۰۰۰ ٹن سالانہ کی شرح سے کوئلہ نکال رہے ہیں، ملیشیا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ سمندر سے ٹن (Tin) نکال رہے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب اقوام زیر سمندر رقبوں کی ملکیت کی خاطر جنگ کریں گے۔ ہم وسائل کے لحاظ سے کمزور اقوام میں صنعت کاری کی شرح میں تبدیلی کے آثار بھی دیکھ رہے ہیں۔

(۱) اطلانتہ بحر اوقیانوس کا ایک افسانوی جزیرہ ہے، جس کا ذکر سب سے پہلے افلاطون نے کیا تھا۔

تکنیکی طور پر سمندر سے پیداوار حاصل کرنے کے لیے، ندرت پر مبنی صنعتیں معرض وجود میں آئیں گی۔ دیگر کمپنیاں سمندروں میں کام کرنے کے لیے جدید ترین اور مہنگے ترین آلات بنائیں گے۔ انتہائی گہرائی میں کام کرنے کے لیے ریسرچ کرافٹ، امدادی سب میرین (Submarine)، مچھلیوں کی افزائش اور نگرانی کے لیے الیکٹرانک آلات، ان شعبوں میں آلات کے متروک ہونے اور ان کے استعمال ختم ہونے کی شرح انتہائی تیز ہوگی۔ مسابقت کی جدوجہد جدت میں بھی تیزی کا باعث ہوگی۔

ثقافتی طور پر ہم زبان میں تیزی سے نئے الفاظ کے اضافے کی توقع رکھتے ہیں۔ "Aqua-culture" (آبی کاشت) سمندر سے حاصل ہونے والی غذائی پیداوار۔ یہ لفظ ''زراعت'' کے ساتھ اپنی جگہ بنا لے گا۔ لفظ ''پانی'' جو اپنے علامتی اور جذباتی وابستگیوں کے ساتھ خوف کی علامت بنا ہوا ہے، وہ یکسر نیا مفہوم اختیار کرے گا۔ شاعری، مصوری، فلم اور دیگر فنون میں نئی علامات کے ساتھ نئے الفاظ آ جائیں گے۔ سمندری حیات کی علامت نگاری گرافک اور صنعتی ڈیزائنوں کا حصہ بن جائیں گے۔ فیشن بھی سمندر کا محتاج ہوگا۔ نئے کپڑے (کے اجزا) نئی پلاسٹک اور دیگر عناصر بھی دریافت ہوں گے۔ بیماری کے علاج یا ذہنی کیفیات کی تبدیلی کے لیے نئی ادویات دریافت ہوں گی۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ غذائی ضروریات کے لیے سمندروں پر انحصار کرنے سے لاکھوں افراد کی غذا بھی تبدیل ہو جائے گی۔ ایک ایسی تبدیلی جو اپنے ساتھ لاتعداد انجانی چیزیں لیے ہوئے ہے۔

جب اس معاشرہ زراعت کی بجائے ''آبی زراعت'' پر انحصار کرنا شروع ہو جائے گا تو لوگوں میں توانائی کے معیار، مقصد کی تکمیل کی خواہش، اور صرف ان کے حیاتیاتی کیمیا، ان کے قد اور وزن کی اوسط، ان کی شرح بلوغت، ان کی مدت حیات اور ان کی نمایاں بیماریوں ہی کی بات نہیں بلکہ ان کے نفسیاتی ردعمل میں بھی کسی طرح کی تبدیلی آئے گی؟

سمندر سے وسائل کے حصول کے ساتھ ہی ایک نئے جذبے کا آغاز بھی ہو جائے گا۔ ایک ایسا طرز زندگی جس میں ابتدائی کھوجیوں کے لیے مہم جوئی، خطرات، فوری مالی فوائد یا شہرت کی نئی راہیں کھل جائیں گی۔ اس کے بعد جوں جوں انسان براعظموں کی مناسبت سے مختلف سمندری علاقوں میں آباد کاری کرنا شروع کر دے گا اور اس کی رسائی سمندر کے گہرے سے گہرے مقام تک ہو جائے گی تو اس کام کی ابتدا کرنے والے افراد اور پھر ان کی جانشینی کرنے والے ایسے افراد ہوں گے جو سمندر کے نیچے شہر جو ہسپتالوں، ہوٹلوں اور مکانات سے آراستہ ہوں گے۔

اگر یہ سب کچھ بہت دور نظر آتا ہے تو یہ بات بڑے سنجیدہ طریقے سے کہی جا سکتی ہے کہ جنرل الیکٹرک کمپنی (GE) سے تعلق رکھنے والے ایک سائنس دان ڈاکٹر والٹر ایل روب (Robb) نے سمندر کی تہ میں ایک موش (یورپ کا اکال جانور) کو، کافی عرصہ تک زندہ رکھا، اسے ایک بکس میں بند کر کے پانی میں رکھا گیا جو ایک مصنوعی گلپھڑے پر مبنی تھا۔ ایک مصنوعی جھلی جو ارد گرد موجود پانی سے ہوا جذب کرتی ہے اور پانی کو اندر داخل نہیں ہونے دیتی۔ اس طرح کی جھلیاں، اس بکس کے اوپر کی جانب، نیچے اور دو اطراف میں لگائی گئیں، اس بکس کے اندر موش کو بند کر کے پانی میں رکھ دیا گیا۔ اس قسم کے "گلپھڑوں" کے بغیر وہ جانور دم گھٹنے سے مر جاتا، اس جھلی کی مدد سے وہ پانی کے نیچے سانس لینے کے قابل ہوا، جنرل الیکٹرک کمپنی کے دعویٰ کی رو سے اس طرح کی جھلیاں، سمندر کی تہ میں موجود تجرباتی سٹیشنوں میں موجود افراد کے لیے ہوا کی فراہمی کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ ایسی جھلیوں کی تعمیر زیر سمندر مکانات، ہوٹلوں یا دیگر ڈھانچوں میں ہو سکتی ہے۔ حتیٰ کہ......کون جانتا ہے؟......انسانی جسم میں بھی۔

انسانوں میں سرجری کے ذریعے گلپھڑے کی پیوندکاری سے متعلق قدیم سائنسی، افسانوی مفروضات، اب اتنے بعید از قیاس نہیں لگتے جتنے کبھی لگتے تھے۔ ہم لوگ سمندر میں کام کرنے کے لیے ماہرین تخلیق کر سکتے ہیں (شاید ان کی افزائش بھی کر سکتے ہیں) ایسے مرد و خواتین جو نہ صرف ذہنی طور پر بلکہ جسمانی طور پر بھی سمندر کے اندر کام کر سکتے ہوں، کھیل سکتے ہوں پیار محبت اور جنسی سرگرمیاں بھی سرانجام دے سکتے ہوں اگر ہم زیر سمندر محاذ میں کامیابی کے لیے، عجلت پر مبنی ڈرامائی ہتھکنڈے استعمال نہ بھی کریں، تب بھی ایسا لگتا ہے کہ سمندروں میں سرگرمیوں کے آغاز سے نہ صرف نئی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کا آغاز ہوگا بلکہ نئے طرز بود و باش، سمندر سے مشتق ذیلی ثقافتوں اور شاید نئے مذہبی فرقوں یا تصوف کے نئے سلسلوں کا آغاز ہو جس سے ہم سمندر کی زندگی سے بہرہ مند ہو سکیں۔

ضرورت اس چیز کی ہے کہ ان مفروضات کو اتنا دور نہ دھکیلا جائے تاہم اس بات کا احساس ہو جانا چاہیے کہ وہ نئے اور انوکھے ماحول جو انسان کے سامنے آنے والے ہیں، اپنے ساتھ رنگ و خوبی کا تبدیل شدہ شعور، نئی حسیات، نئے جذبات اور سوچ و احساس کی نئی راہیں لے کر آئیں گے۔ مزید یہ کہ سمندر پر قبضہ، جس کی پہلی قسط ہم ۲۰۰۰ء[1] سے پہلے ہی دیکھ لیں گے، ان سائنسی......تکنیکی رواجوں کے سلسلے میں سے ایک ہے

(۱) یاد رہے کہ یہ کتاب ۱۹۷۰ء میں لکھی گئی تھی۔

جو آگے کی طرف گامزن ہیں۔ یہ تمام سلسلے انوکھے قسم کے سماجی اور نفسیاتی استدلال سے بھرپور ہیں۔

سورج کی روشنی اور شخصیت

سمندروں پر قبضے کا بلاواسطہ تعلق درست موسمی پیش گوئی اور بالآخر ماحولیاتی کنٹرول میں بہتری سے ہے۔ ہم جسے موسم کہتے ہیں وہ بڑی حد تک، سورج، ہوا اور سمندر کے تفاعل کا دوسرا نام ہے۔ سمندری لہروں کے معائنے، کھاری پن اور دیگر عوامل کی نگرانی کرنے سے، فضا میں موسمی نگرانی کے سیٹلائٹ نصب کرنے سے ہم موسمی پیش گوئی کی صلاحیت میں زبردست اضافہ کر سکتے ہیں۔ "American Association for the Advancement of Science" کے سابقہ پریذیڈنٹ ڈاکٹر والٹر اور رابرٹس کے مطابق "ہم تمام دنیا کے موسم کو ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط تک، مسلسل زیر مشاہدہ لا سکتے ہیں۔ اور وہ بھی مناسب اخراجات کے ساتھ اور اس صلاحیت کے حصول سے ہم طوفان، تیز ہواؤں، خشک سالی اور دھند کے بارے میں بہتر پیش گوئی کر سکتے ہیں اور تباہی سے بچنے کی تدابیر متعین کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم آج کی علمی ترقی میں پنہاں اور چوری چھپے ہونے والی ایک عجیب و غریب قوت کو بھی دیکھ رہے ہیں اور وہ ہے جنگی تدابیر کے لیے صلاحیتوں کا حصول۔ چند اور مضبوط اقوام کی برتری کے لیے مطلوبہ موسم کا حاصل کیا جانا تاکہ دشمن اور شاید تماشائیوں کو بھی نقصان پہنچایا جا سکے۔"

ایک سائنسی افسانوی کہانی "The Weather Man" میں تھیوڈور ایل تھامس نے ایک ایسی دنیا کا منظر پیش کیا ہے جس میں مرکزی سیاسی ادارہ ایک "موسمی کونسل" ہے۔ اس کونسل میں مختلف اقوام کے نمائندگان موسمی پالیسی تشکیل دیتے ہیں اور موسم میں رد و بدل کر کے لوگوں پر کنٹرول کرتے ہیں، کسی جگہ قحط کی صورت حال پیدا کر کے تو دوسری جگہ طوفان لا کر وہ لوگوں پر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ موسم پر اس طرح کی دسترس سے ابھی ہم کوسوں دور ہیں۔ لیکن اس بات میں کوئی قدغن نہیں کہ اب وہ زمانہ چلا گیا جب انسان کو اسی موسم پر اکتفا کرنا پڑتا تھا جیسا کہ قدرت نے اس کے لیے متعین کیا تھا۔ "American Meteorological Society" کے بلند و بانگ الفاظ کی رو سے: موسم میں تغیر و تبدیلی آج ایک حقیقت کا روپ دھار گئی ہے"۔

یہ تاریخ کی ایک فیصلہ کن گھڑی کی نمائندگی کرتی ہے اور انسان کو ایسا ہتھیار فراہم کرتی ہے جو زراعت، ذرائع ابلاغ اور تفریح کو یکسر تبدیل کر سکے۔ اس معاملے کو انتہائی احتیاط سے برتنے کی ضرورت ہے کیونکہ موسموں پر کنٹرول کی یہ صلاحیت انسان کی تباہ کاریوں کا موجب بھی ہو سکتی ہے۔ زمین کا موسمی نظام

ایک مکمل ''کل'' ہے، کسی ایک مقام پر ایک چھوٹی سی تبدیلی کسی دوسرے مقام پر بھاری نقصانات کا موجب ہو سکتی ہے۔ حتیٰ کہ کسی جارحانہ عزم کے بغیر بھی، اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ ایک براعظم میں قحط پر قابو پانے کی کوشش کسی دوسرے براعظم میں طوفان گرد و باد کا باعث بن سکتی ہے۔

اس کے علاوہ موسمی تغیر شدید قسم کے انجانے، سماجی...... نفسیاتی نتائج بھی لا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم میں سے لاکھوں افراد سورج کی روشنی کے لیے ترستے ہیں، ریاست فلوریڈا، کیلی فورنیا اور بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں میں نقل مکانی کرنے والوں کی کثیر تعداد اس بات کی واضح نشاندہی کرتی ہے۔ ہم لوگ اپنی مرضی کے مطابق سورج کی روشنی...... یا کم از کم اس کی نقل...... تیار کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیں گے۔ ''نیشنل ایروناٹکس اینڈ سپیس (National Aeronautics and Space) کی انتظامیہ ایک ایسے قوی الہیکل خلائی مدار میں فٹ کیے جانے والے آئینے کی تیاری سے متعلق سوچ رہی ہے جو سورج کی روشنی کو زمین کے تاریک علاقوں کی طرف منعکس کر سکے۔ NASA کے ایک اعلیٰ عہدیدار جارج ای مؤیلر (George E.Mueller) نے کانگریس کے سامنے اس بات کا اعادہ کیا کہ امریکا ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط تک سورج کی روشنی کو منعکس کرنے والے سیٹلائٹ نصب کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ (اس ٹیکنالوجی میں مزید ترقی کرنے کے بعد ایسے سیٹلائٹ نصب کرنا ناممکن نہیں ہوگا جو مخصوص علاقوں میں سورج کی روشنی کی ترسیل کو روک دیں، کم از کم ان علاقوں کو نیم تاریکی میں ڈالا جا سکتا ہے)۔

روشنی...... اندھیرے کا یہ چکر انسانی حیاتیاتی آہنگ سے وابستہ ہے، اور وہ ایسے انداز سے جو ابھی تک مبہم ہے۔ کوئی بھی شخص مدار میں فٹ کیے جانے والے سورج۔ آئینوں کا تصور کر سکتا ہے جنھیں زراعت، حتیٰ کہ نفسیاتی مقاصد میں استعمال کرنے کے لیے روشنی کے اوقات میں تبدیلی لا کر بروئے کار لایا جا سکے گا۔ مثال کے طور پر سکینڈے نیویا میں طویل المدت دن متعارف کروانے سے، اس خاص قسم کی ثقافت اور شخصی خصوصیات کا دائرہ کار بڑھایا جا سکے گا جو ابھی تک اسی خطے کا خاصہ ہیں۔ اگر اس مسئلے کو نیم سنجیدگی سے دیکھا جائے تو ہم سوچتے ہیں کہ "Ingmar Bergman's Broading Art" کی صورت حال کیا ہوگی اگر سٹاک ہوم کی مخصوص اور مسلسل رہنے والی تاریکی ختم ہو جائے گی؟ کیا "The Seventh Seal" یا "Winter Light" کسی اور آب و ہوا میں پنہاں ہو جائے گی؟

موسم کی تبدیلی کی اس بڑھتی ہوئی صلاحیت، توانائی کے نئے ذرائع کی ترقی، نئے معدنیات (ان

میں سے کچھ اپنی خصوصیات میں ورائے حقیقت قسم کے ہیں) نئے ذرائع نقل، نئی غذائیں (نہ صرف سمندر سے حاصل کردہ، بلکہ بڑے آب کاشت سے وابستہ کارخانوں سے)۔ یہ تمام چیزیں آئندہ آنے والی تیز رفتار تبدیلیوں اور ان کی نوعیت کا ایک اشارہ ہے۔

ڈولفن کی آواز

کیرل کیپک (Karel Capek) کے شاندار لیکن کم شہرت یافتہ ناول ''وار ودھ دی نیوٹس'' (War with the Newts) میں انسان تہذیب کی تباہی مختلف انواع و اقسام کی سمندر[1] (Salamander) کو پالنے کی کوشش کے ذریعے کرتا ہے۔ آج دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ، انسان جانوروں اور مچھلیوں کو ایسے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے جو کیپک (Capek) کو ہنسنے پر مجبور کر دیں۔ تربیت یافتہ کبوتروں کو دوا ساز فیکٹریوں میں، دوا سازی کے مقام پر ناقص گولیوں کی شناخت اور انھیں وہاں سے ہٹانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ یوکرین میں روسی سائنسدانوں نے مچھلی کی ایک خاص قسم کو پمپنگ سٹیشنوں کے فلٹروں میں کائی صاف کرنے پر مامور کر دیا ہے۔ ڈولفن کی تربیت کی جا رہی ہے کہ وہ کیلی فورنیا کے ساحل پر ''پانی کے کرتبوں'' کے لیے اوزار کی ترسیل کریں اور اس مخصوص علاقے میں شارک کی آمد کو روک سکیں۔ دیگر ڈولفن کو تربیت دی جا رہی ہے کہ اسی علاقے سے ملحقہ علاقوں میں موجود کانوں کا کھوج لگائیں، گویا انھیں، انسان کی بجائے، خودکشی کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ ایک ایسا استعمال جو بین النوع اقدار میں ہیجان پیدا کر سکتا ہے۔

انسان اور ڈولفن کے درمیان ابلاغ سے متعلق تحقیق انتہائی فائدہ مند ہو سکتی ہے اگر، اور جب، انسان اضافی زمینی زندگی سے اپنا تعلق جوڑتا ہے۔ ایک ایسا امکان جس کو سرکردہ ماہر فلکیات تقریباً ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اسی دوران ڈولفن سے متعلق تحقیق کچھ نئے انکشافات سامنے لا رہی ہے، اس خاص حوالے سے، جیسے انسان کے حیاتی اعضا دیگر جانوروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ ان بیرونی حدود میں سے چند کا تعین کرتی ہے جس میں انسانی اعضا کام کرتے ہیں۔ جذبات، رویے اور وہ شعور جو دستیاب نہیں اور اس کی وجہ اس کا حیاتیاتی ڈھانچا ہے جس کا تجزیہ بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی وضاحت بھی ہو سکتی ہے۔

تاہم جانوروں کی دستیاب نوع ہی ہیں جن پر ہم نے کام کرنا ہے۔ مصنفین کی ایک خاص تعداد ایسی ہے جس نے تجویز پیش کی ہے کہ ان خاص مقاصد کے لیے جانوروں کی نئی نسلوں کی پرورش کی جائے۔

(۱) چھپکلی جیسی بغیر کھپرے والی جنس میں سے کوئی ایک جو خشکی اور تری دونوں میں رہتی ہے۔

سر جارج تھامسن نوٹ کرتے ہیں ''جنیات کے ترقی کرتے ہوئے علم کی موجودگی میں بلا شبہ جنگلی نوع میں بڑے پیمانے پر بہتری لائی جا سکتی ہے''۔ آرتھر کلارک نے اس بات کے امکان کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ہم اپنے پالتو جانوروں کی ذہانت میں اضافہ کر سکتے ہیں یا ایسے جانوروں کا ارتقا کر سکتے ہیں جو موجودہ جانوروں کے مقابلے میں، بہتر ذہنی استعداد کے مالک ہوں''۔ ہم یہ صلاحیت حاصل کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں کہ ریموٹ کنٹرول کے ذریعے جانور کے ردعمل کو کنٹرول کیا جا سکے۔ ڈاکٹر جوز ایم آر ڈیلگاڈو (Dr.Jose M.R. Delgado) نے جانوروں میں انسانی صلاحیتوں کی موجودگی کے خوفناک تجربات کے ایک سلسلے میں بیل کی کھوپڑی میں الیکٹروڈز (electrodes) نصب کر دیے۔ سرخ جھنڈا لہرا کر اسے اشتعال دلایا گیا۔ جانور نے جب تیزی سے دوڑنا شروع کیا تو انھوں نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے ایک چھوٹے سے ٹرانسمیٹر سے نکلنے والے اشارے کی مدد سے اس ٹریک کے درمیان سے ہٹا کر، عمومی چال کے ساتھ ایک طرف کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا۔

چاہے ہم اپنی خدمت کے لیے مخصوص جانوروں کی افزائش کریں یا گھریلو روبوٹس پر انحصار کرنے والے جانوروں کی خدمات حاصل کریں جو زندگی کی سائنس اور جسمانی سائنس کے درمیان جاری ناہموار دوڑ کا حصہ ہوں۔ ہمیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مشینوں کا بنانا سستا رہے گا، بجائے اس کے کہ ہم جانوروں کی تربیت کریں۔ تاہم حیاتیاتی سائنس اتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ یہ توازن ہماری زندگیوں میں ہی قائم ہو جائے گا اور یہ بات بھی طے ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب ہم اپنی مشینوں کی تعداد میں اضافہ کرنا شروع کر دیں گے۔

حیاتیاتی فیکٹری

جانوروں کی پرورش اور انھیں تربیت دینا انتہائی مہنگا ہو سکتا ہے لیکن کیا ہوا اگر ہم بیکٹیریا، وائرس اور دیگر خورد بینی جانداروں کی ارتقائی سطح تک پہنچ جائیں؟ یہاں پر ہم جانداروں کو ان کی بنیادی سطح پر، سدھار سکتے ہیں ایسے ہی جیسے ہم کسی گھوڑے کو سدھارتے ہیں۔ اس اصول پر مبنی ایک نئی سائنس آج کل تیزی سے ابھر رہی ہے اور اس کا عزم کہ وہ صنعت کو ہماری سوچ کے مطابق تبدیل کر دے گی۔

یونیورسٹی آف وسکونسن (Wisconsin) کے ایک حیاتی کیمیا دان مارون جے جانسن کہتے ہیں، ''ماقبل از تاریخ میں ہمارے آباؤ اجداد نے مختلف پودوں اور جانوروں کی افزائش کی لیکن اس وقت کے دور

تک خورد بینی جانوروں کی افزائش نہیں ہو سکی کیونکہ انسان ان کے وجود سے ناواقف تھا''۔ آج وہ ان کے وجود سے واقف ہے اور وہ انھیں وٹامنز، ایزائم، ضد حیاتیہ ادویات، سٹرک ایسڈ اور دیگر مفید مرکبات۔ سال ۲۰۰۰ء تک، اگر غذائی ضروریات بدستور شدت اختیار کرتی رہیں۔ ماہرین حیاتیات جانوروں، اور پھر انسانوں کی غذائی ضروریات کے لیے جرثوموں کی آبیاری کا کام شروع کر چکے ہوں گے۔

سویڈن کی اُپسالا (Uppsala) یونیورسٹی میں مجھے موقع ملا کہ میں اس بات کو نوبل انعام یافتہ حیاتی کیمیا دان آرنے ٹسیلیس (Arne Tiselius) جو اس وقت نوبل فاؤنڈیشن کے صدر ہیں، کے سامنے رکھ سکوں، میں نے دریافت کیا، ''کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک دن ہم حیاتیاتی مشینیں بنالیں گے۔ ایسے نظام جو پیداواری مقاصد کے لیے استعمال میں لائے جا سکتے ہوں اور وہ نہ تو پلاسٹک یا دھات کے بنے ہوں بلکہ جاندار ہوں؟'' ان کا جواب بالکل حتمی تو نہیں تھا لیکن صاف صاف تھا: ''ہم پہلے ہی وہاں پہنچ چکے ہیں۔ صنعت کاری کا تابناک مستقبل حیاتیات کا ہی مرہون منت ہوگا۔ دراصل جنگ (عظیم دوم) کے بعد سے جاپان کی ٹیکنالوجی میں ترقی کی سب سے شاندار چیز اس کی بحری جہازوں کی صنعت نہیں ہے بلکہ خرد حیاتیات ہے۔ اس وقت جاپان خرد حیاتیات پر مبنی صنعت کاری میں دنیا کی عظیم ترین قوت...... ان کی غذا اور غذائی صنعت کا بیشتر حصہ ان مراحل پر مشتمل ہے جن میں بیکٹیریا کا استعمال ہے۔ اب وہ ہر قسم کی مفید اشیا کی پیداوار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایمائنو ایسڈ۔ آج سویڈن میں ہر شخص خرد حیاتیات میں ہماری پوزیشن مستحکم کرنے کی بات کرتا ہے۔

مسٹر ٹسیلیس (Tiselius) نے مزید بتایا، ''آپ دیکھتے ہیں کہ صرف بیکٹیریا اور وائرس ہی کے زمروں میں سوچنے کی ضرورت نہیں...... عمومی طور پر صنعتی مراحل کی بنیاد انسان کے بنائے ہوئے مراحل ہیں۔ آپ سٹیل کی تیاری لوہے کی تہ کی کوئلے سے متبادل کے طور پر بھی کر سکتے ہیں۔ ذرا پلاسٹک کی صنعتوں پر توجہ دیں، مصنوعی پیداوار دراصل پٹرولیئم سے تیار کی جا رہی ہیں۔ تاہم یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ آج بھی کیمیا اور کیمیائی ٹیکنالوجی میں شاندار ترقی کے ساتھ صنعت میں پیدا ہونے والی کوئی بھی غذائی چیز کسانوں کی پیداوار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔'' اس شعبے میں اور اس کے علاوہ بھی بہت سے شعبوں میں قدرت انسان سے برتر ہے، حتیٰ کہ ماہر ترین کیمیائی انجینئروں اور محققین سے بھی زیادہ۔ اب اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ جب ہم بتدریج یہ جاننا شروع کر دیں کہ قدرت چیزیں کیسے بناتی ہے اور ہم قدرت کی نقل کر سکتے ہیں، تو ہمارے پاس بالکل

مختلف نوعیت کے مراحل ہو جائیں گے۔ یہ بات بالکل مختلف نوعیت کی صنعتوں کی بنیاد پر رکھ دیں گی۔ ایک قسم کی حیاتی، تکنیکی فیکٹری، ایک حیاتیاتی ٹیکنالوجی۔ سبز پودے فضا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ اور سورج کی مدد سے نشاستہ بناتے ہیں۔ یہ ایک کارگر مشین ہے...... سبز پتہ بھی ایک شاندار مشین ہے۔ ہم اس کے بارے میں دو یا تین سال قبل کی نسبت زیادہ جانتے ہیں لیکن ابھی تک ہم اس قابل نہیں ہوتے کہ ہم اس کی نقل بنا سکیں، قدرت کے پاس اس قسم کی بہت مشینیں ہیں۔''

اس طرح کے نظاموں سے فائدہ اٹھانا چاہیے بجائے یہ کہ چیزوں کی تیاری کیمیائی طریقے سے کی جائے۔ اس کے نتیجے میں ہم ان کی پیداوار میں خصوصیت حاصل کر سکتے ہیں۔

حیاتیاتی اجزا کو مشینوں میں استعمال کرنے سے متعلق تصور کیا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر کمپیوٹروں میں۔ مسٹر ٹسلیئس (Tiselius) نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا، ''یہ بات بھی واضح ہے کہ کمپیوٹر بھی کسی حد تک ہمارے ذہنوں کی نقالی ہیں۔ اگر ہم ایک مرتبہ یہ بات جان لیں کہ کمپیوٹر کس طرح کام کرتا ہے تو میں اس بات پر حیران ہوں گا کہ ہم حیاتیاتی کمپیوٹر بنانے میں کامیاب کیوں نہ ہو جائیں گے...... اس طرح کا کمپیوٹر اپنے اندر الیکٹرانک اجزا لیے ہوئے ہو سکتا ہے جس کا ماڈل حقیقی دماغ کے مطابق بنایا گیا ہو۔ اور مستقبل میں کسی نہج پر پہنچ کر یہ بات بھی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ حیاتیاتی اجزا ابھی اس مشین کا حصہ ہو سکتے ہیں''۔ شاید اسی قسم کے خیالات نے فرانسیسی ماہر معاشیات اور منصوبہ ساز ژاں فوراسٹی (Jean Fourasitie) کو صریحاً یہ بات کہنے پر مجبور کر دیا: ''انسان اب اس راستے پر گامزن ہو گیا ہے کہ وہ جاندار ٹشو کو جسمانی نظام کی کارکردگی میں ضم کر دے...... مستقبل قریب میں ہم ایسی مشینیں بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے جو بیک وقت دھاتی اور جاندار مادوں پر مشتمل ہوں گی......'' اس صورت حال کی روشنی میں وہ کہتے ہیں، ''انسانی جسم بھی ایک نئے معنی اختیار کر لے گا۔''

پہلے سے ڈیزائن شدہ جسم

کسی سیارے کے جغرافیے کی طرح، انسانی جسم نے اب تک، انسانی تجربات کے حوالے سے ایک خاص نقطے کی ہی نمائندگی کی ہے اور وہ ہے ''موجود'' صورت حال۔ آج کے عہد میں ہم بڑی تیزی سے اس وقت کی طرف بڑھ رہے ہیں جب انسانی جسم ''موجود'' یا ''طے شدہ'' قسم کا نہیں رہے گا۔ کچھ ہی عرصے بعد انسان اس قابل ہو گا کہ وہ نہ صرف انفرادی اجسام کی، بلکہ پوری نسل کی ''تشکیل نو'' کر سکے گا۔

۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر جے ڈی واٹسن اور ڈاکٹر ایف ایچ سی کرک نے ڈی این اے (DNA) مالیکیول کی تشریح و وضاحت پر نوبل انعام حاصل کیا۔ اس کے بعد سے جینیات میں ترقی کی رفتار حیران کن حد تک تیز ہو گئی ہے۔ سالماتی حیاتیات اب لیبارٹریوں سے دھماکے کی صورت باہر آنے والی ہے۔ نیا جینیاتی علم ہمیں اس قابل بنا دے گا کہ وہ انسانی وراثتی نظام میں ردوبدل کی صورت پیدا کر سکیں اور نسبوں (genes) میں جوڑ توڑ کر سکیں تا کہ انسان کی یکسر نئی صورت سامنے آ سکے۔

ان تمام ممکنہ چیزوں میں سے شاندار بات یہ ہے کہ انسان اس قابل ہو جائے گا کہ وہ اپنی حیاتیاتی کاربن کاپیاں بنا لے۔ ایک خاص عمل جس کا نام ''کلوننگ'' ہے، کے ذریعے یہ ممکن ہو گا کہ کسی بالغ سیل کے مرکزے سے ایک نیا عضویہ تیار کیا جا سکے جس کے اندر وہی نسبی اور جبلی خصوصیات ہوں جو مرکزے کے خلیے میں موجود ہوں۔ اس کے نتیجے میں نکلنے والی انسانی ''کاپی'' اس مرکزے۔ دہندہ کی طرز پر ہی زندگی گزارنا شروع کر دے گی، اگرچہ ثقافتی تفریق اس کلون کی شخصیت یا جسمانی نشوونما میں فرق ڈال سکتی ہے۔

کلوننگ کی مدد سے یہ ممکن ہو گا کہ لوگ خود کو دوبارہ پیدا ہوتے دیکھیں۔ اس دنیا کو اپنے ہی جڑواں شخص سے بھر دیں۔ دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ کلوننگ اس پرانے تنازع کو مٹانے میں کامیاب ہو جائے گی جو انتہائی پرانے دور سے ''قدرت'' بمقابلہ ''قدرت'' یا ''وراثت'' بمقابلہ ''ماحول'' کے عنوان سے چلا آ رہا ہے۔ اس مسئلے کا حل دونوں کے کردار کی ادائیگی اور اسے عزم کے ساتھ، انسانی ذہانت کی ترقی میں ایک اہم سنگ میل ہو گا۔ فلسفیانہ مفروضوں پر مبنی تمام لائبریریاں، ایک ہی چوٹ کے ساتھ غیر متعلقہ قرار دی جا سکتی ہیں۔ اس سوال کا جواب نفسیات، اخلاقی فلسفے اور دیگر شعبوں میں تیز رفتار اور معیاری ترقی کی نئی راہیں کھول دے گا۔

مگر کلوننگ نسل انسانی کے لیے انہونی قسم کی پیچیدگیاں بھی پیدا کر سکتا ہے۔ یہ بات انتہائی خوش کن ہو گی کہ البرٹ آئن سٹائن خود اپنی کاپی دنیا کے سامنے پیش کرے۔ لیکن اڈولف ہٹلر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا کلون کو باضابطہ کرنے کے بھی کوئی قوانین ہوں گے۔ نوبل انعام یافتہ سائنس دان جوشوا لیڈر برگ (Joshua Lederberg) ایک سائنس دان جو بڑی سنجیدگی سے اپنی سماجی ذمہ داری قبول کرتے ہیں، اس بات کو قرین قیاس سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ جو اپنی نقل یا اپنا نقش ثانی بنانا پسند کریں گے ان میں سے اکثر افراد خود پرست ہوں گے اور ان لوگوں کی طرح کا دوسرا شخص بھی خود پرست ہو گا۔

اگرچہ خود پرستی ثقافتی طور پر، نہ کہ حیاتیاتی طور پر، منتقل ہوتی ہے، پھر بھی دیگر خوفناک مشکلات اپنی

جگہ موجود ہیں۔ لہٰذا لیڈر برگ ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ آیا اگر انسانی کلوننگ کی اجازت دے دی جائے تو کس نہج تک پہنچ کر متنازعہ صورت حال اختیار نہیں کرے گی۔ انھوں نے بتایا ''میں نے یہ اصطلاح اسی صورت میں استعمال کی ہے جیسی نیوکلیائی قوت میں استعمال ہوئی ہے۔ یہ متنازعہ صورت اس وقت اختیار کرے گی اگر ایسا کرنے میں کوئی مثبت فائدہ ہو..... اس بات کا تعلق ذرائع ابلاغ کی کارکردگی سے ہے۔ خاص طور پر تعلیمی خطوط پر کہ آیا وہ واضح قسم کی نسلی نوع سے پہلے ہے یا نہیں۔ عصبیاتی ہارڈ ویئر کی مماثلت، شاید ان مماثل شخصیات کے لیے اس بات کی آسانی پیدا کر دے کہ وہ تکنیکی اور دیگر وجدانی چیزوں کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کریں۔''

کلوننگ کا مرحلہ کتنی دور ہے؟ لیڈر برگ کہتے ہیں، ''کلوننگ کا کام جل تھلیوں (Amphibia) میں پہلے ہی ہو چکا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس وقت یہ کام ممالیہ (mammals) جانوروں میں کر رہا ہو۔ اگر اس قسم کی کوئی بات سامنے آ گئی تو یہ میرے لیے حیران کن نہیں ہوگا اور کب کسی میں جرأت ہوگی کہ کوئی اس تجربے کو انسان پر آزمائے، مجھے اس بات کا ذرا سا بھی اندازہ نہیں ہے لیکن میں وقت کا تعین کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اب سے تقریباً پندرہ سال بعد، جی پندرہ سال کے اندر اندر''۔

انہی پندرہ سالوں میں سائنس دان یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ جسم کے مختلف اعضا نشوونما پاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ان اعضا کی بہتر سے بہتر نشوونما کے لیے تجربے شروع کر دیں گے۔ لیڈر برگ کہتے ہیں، ''ایسی چیزیں جیسے ''دماغ کا حجم'' اور مختلف حیاتی صلاحیتیں، انھیں بلاواسطہ نشو کو کنٹرول کرنے والے سلسلے کے زیر نگین دے دیا جائے گا..... میرا خیال ہے یہ (مرحلہ) بالکل قریب ہے''۔

ایک عام شخص کو یہ بات سمجھنے میں وقت کا سامنا ہوگا کہ سائنس دانوں کے طبقے میں صرف لیڈر برگ ہی واحد حیران والا شخص نہیں۔ حیاتیاتی انقلاب سے متعلق اس کے خدشات میں اس کے بہت سے ہم عصر بھی شامل ہیں۔ جدید حیاتیات کے حوالے سے جو اخلاقی، شائستگی پر مبنی اور سیاسی سوالات اٹھائے جاتے ہیں وہ دماغ کو چکرا دیتے ہیں۔ کون زندہ رہے گا اور کون وفات پائے گا؟ انسان کیا ہے؟ ان شعبوں میں تحقیق کو کون کنٹرول کرے گا؟ نئی تحقیقات کا اطلاق کس طرح ہوگا؟ کیا ہمیں ان خطرات و خدشات کو نہیں افشا کر دینا چاہیے تھا جن کے لیے انسان بالکل بھی تیار نہیں؟ دنیا کے بہت سے سرکردہ سائنس دانوں کے مطابق گھڑی ایک ''حیاتیاتی ہیروشیما'' کی خبر دے رہی ہے۔

مثال کے طور پر ذرا ان حیاتیاتی کارناموں کے استدلال کے بارے میں سوچیں جنھیں ''پیدائشی

ٹیکنالوجی'' کیا جاتا ہے۔ واشنگٹن سٹیٹ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے بین الاقوامی تکریم کے مالک ڈاکٹر ای ایس ای حافظ (Dr. E.S.E.Hafez) نے بازتخلیق سے متعلق اپنے ایسے کام کی بنیاد پر، کہ جس پر وہ خود بھی حیران ہیں، اعلانیہ طور پر یہ بات کہی کہ دس سے پندرہ سال کے اندر اندر ایک خاتون اس قابل ہو جائے گی کہ وہ ایک چھوٹا منجمد جنین (Embryo) خریدے، اسے اپنے ڈاکٹر کے پاس لے جائے، اسے اپنی بیضہ دانی میں رکھوا لے، اسے نو ماہ تک رکھا رہنے دے اور پھر اسے جنم دے، جیسے اس کا جرثومہ اس کے جسم میں ہی پیدا ہوا ہو۔ اس حوالے سے جنین کی فروخت اس گارنٹی کے ساتھ ہوگی کہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ کسی موروثی نقص سے پاک ہوگا۔ خریدنے والے کو بچے کی آنکھوں کی رنگت، اس کے بالوں، اس کی جنس، بلوغت کے وقت اس کے ممکنہ سائز اور اس کی ذہانت کے معیار سے متعلق پیشگی معلومات فراہم کر دی جائیں گی۔

بلاشبہ کسی نہج پر پہنچ کر یہ بھی ممکن ہوگا کہ یہ تمام مرحلہ کسی خاتون کی بیضہ دانی سے باہر ہی انجام دیا جا سکے۔ بچوں کی پیدائش کے لیے حمل کا مرحلہ، ان کی افزائش اور (پیدائش تک) نشوونما کا سارا مرحلہ انسانی جسم کے باہر ہی ہو۔ یہ واضح طور پر محض (چند) سالوں کا یہی معاملہ ہے کہ بولوگنا (Bologna) کے ڈاکٹر Deniele Petrucci امریکہ اور روس سے تعلق رکھنے والے دیگر سائنس دان اس بات کو ممکن بنا لیں گے کہ خواتین حمل کی بے آرامی کے بغیر ہی بچوں کو جنم دے سکیں گی۔

اس طرح کی دریافتوں کا عملی اطلاق ہمیں "Brave New World" اور "Astounding Science Fiction" کی یاد دلاتا ہے۔ لہٰذا اپنے تخیلات کی رو میں بہتے ہوئے، ڈاکٹر حافظ کہتے ہیں سیاروں کی آبادکاری کے لیے بارآور قسم کے انسانی انڈے بہتر نتائج دے سکتے ہیں۔ سیارے مارز (Mars) میں بالغ افراد کو بھیجنے کی بجائے ہم اس طرح کے خلیوں کا بھرا ہوا چھوٹا ڈبا بھیج سکتے ہیں اور انھیں شہری رقبوں کے سائز کی انسانی آبادی میں پھیلا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر حافظ کا کہنا ہے ''جب آپ یہ دیکھیں گے کہ لاؤنچ پیڈ سے ہر پونڈ (وزن) کے لحاظ سے ایندھن پر کتنا خرچہ آتا ہے، تو خلائی جہاز پر کیوں بالغ مرد یا عورتوں کو بھیجا جائے؟ اس کی بجائے کیوں نہ چھوٹے چھوٹے جنینوں کو خلائی جہاز پر سوار کیا جائے اور وہ بھی ماہرین حیاتیات کی زیر نگرانی..... جب ہم خلائی جہازوں کے حصوں اور پرزوں کو چھوٹے سے چھوٹا کر سکتے ہیں تو کیوں نہ سواریوں کو؟''

تاہم مدار میں اس طرح کی ترقی ہونے سے پیشتر پیدائش کی اس نئی ٹیکنالوجی کے اثرات ہماری

زمین پر ہوں گے جو جینیات، ممتا، محبت، بچوں کی پرورش اور تعلیم سے متعلق ہمارے روایتی نظریات کو یکسر تبدیل کر دے گی۔ خاندان کے مستقبل سے متعلق بحث ومباحث جن کا تعلق صرف ایک گولی (Pill) سے ہی ہے، ان حیاتیاتی مخلوق سے ہی وابستہ ہو کر رہ جائے گا جو لیبارٹریوں میں پروان چڑھ رہی ہے۔ وہ اخلاقی اور جذباتی اقدار جو ہماری راہ میں حائل ہوتی ہیں، آنے والی دہائی میں ان کی صورت حال پریشان کن ہوگی۔

ماہرین حیاتیات کے مابین علم اصلاح انسانی سے متعلق مسائل اور اخلاقی معاملات سے متعلق متنازعہ قسم کی بحث کا سلسلہ پہلے ہی جاری ہے۔ کیا ہمیں ایک بہتر نسل کی آبیاری کی کوشش کرنی چاہیے؟ اگر ایسا ہے تو ''بہتر'' کی واضح ترین تعریف کیا ہے؟ اور یہ فیصلہ کون کرے گا؟ اس طرح کے سوالات نئے نہیں ہیں۔ تاہم عنقریب دستیاب ہونے والی تکنیک اس دلیل کی روایتی حدود کو پاش پاش کر دیں گی۔ ہم نوع انسانی کی بازافزائش کے بارے میں تصور کر سکتے ہیں، اس کسان کی طرح نہیں جو بڑی آہستگی اور بڑی محنت کے ساتھ اپنے گلے کو پروان چڑھاتا ہے بلکہ ایک مصور کی طرح جو ناشناسا قسم کے، بے شمار رنگوں، شکلوں اور صورتوں کے ایک لامتناہی سلسلے کا اطلاق کرتا ہے۔

کینٹکی کے ایک چھوٹے سے قصبے Hazard کے مضافات میں، اور "Route 80" سے ذرا فاصلے پر ایک خوبصورت وادی ہے جو "Valley of Troublesome Creek" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس چھوٹے سے طبقے کے درمیان ایک خاندان بھی رہائش پذیر ہے جس کے افراد، کئی نسلوں سے ایک عارضے میں گرفتار ہیں: نیلے رنگ کی جلد۔ یونیورسٹی آف کینٹکی کالج آف میڈیسن کے ڈاکٹر "Madison Cowein" جنھوں نے اس خاندان کا مسلسل مشاہدہ کیا اور اس خاندان کی کہانی بھی لکھی، کے مطابق نیلے رنگ کی جلد کے حامل یہ لوگ باقی تمام معاملات میں معمول کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں اور مکمل صحت مند ہیں۔ ان کی جلد کا یہ رنگ ایک نادر قسم کے خامروں (Enzyme) کی کمی کی وجہ سے ہے اور یہ کمی ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہو رہی ہے۔

جینیات سے متعلق ہمارے نئے اور تیزی سے بڑھتے ہوئے علم کی روشنی میں ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم نیلی جلد والے لوگوں کی نئی نوع یا نسل کی افزائش کر سکیں...... یا اس خاص مقصد کی خاطر سبز، ارغوانی یا مالٹئی رنگ کے لوگ۔ ایک ایسی دنیا جو ابھی نسلیت کے اخلاقی فقدان سے گزر رہی ہے، یہ ایک ایسی سوچ ہے جس پر توجہ دی جا سکتی ہے۔ کیا ہمیں ایک ایسی دنیا کے قیام کی کوشش کرنی چاہیے جس میں تمام لوگوں

کی جلد کا رنگ ایک جیسا ہو؟ اگر ہم یہ کرنا چاہتے ہیں تو بلاشبہ ہمارے پاس اس کی عملداری کے لیے تکنیکی سہولیات ہونی چاہئیں یا اس کی بجائے ہمیں موجود تنوع سے زیادہ تنوع پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ نوع کے مجموعی نظریے کو کیا ہوگا؟ جسمانی خوبصورتی کے معیارات کا کیا ہوگا؟ کمتری یا برتری کے خیالات کا کیا ہوگا؟

ہم ایک ایسے وقت کی طرف رواں دواں ہیں جب ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم برتر اور کمتر دونوں قسم کی نسلوں کی افزائش کر سکیں۔ تھیوڈور جے گورڈن (Theodore J. Gordon) نے جریدے "The Future" میں یوں تحریر کیا ہے، ''کسی نوع کی افزائش کی صلاحیت حاصل کر لینے کے بعد، مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ ہم ایسی نوع تیار کریں گے جس کی بنیاد ''تمام انسان برابر ہیں'' یا ہم نسلی تفاوت پر مشتمل کوئی نوع تیار کریں گے؟ مستقبل سے تعلق رکھنے والی نسلیں اعلیٰ گروپ سے تعلق رکھنے والی ہو سکتی ہیں، DNA کو کنٹرول کرنے والے، تابعدار غلام، کھیلوں کے لیے خاص قسم کے کھلاڑی، تحقیقی سائنس دان جن کا آئی کیو (IQ) لیول ۲۰۰ ہو اور چھوٹا جسم ہو......'' ہمارے پاس یہ صلاحیت ہوگی کہ ہم پس ماندہ ذہن کی مالک نسلیں تیار کریں یا ماہرین ریاضی کی۔

ہمارے پاس یہ استعداد بھی ہوگی کہ ہم ایسے بچے تیار کر سکیں جن کا انتہائی غیر معمولی وجدان ہو یا قوت سماعت ہو، تبدیل ہوتی خوشبو یا بو کو سونگھنے کی انتہائی غیر معمولی صلاحیت اور ان کے غیر معمولی پٹھے ہوں یا ان میں موسیقی کی غیر معمولی صلاحیت ہو۔ ہمارے اندر یہ صلاحیت بھی پیدا ہو جائے گی کہ ہم جنسی سرگرمی کے لیے غیر معمولی شخصیات تیار کر سکیں، ایسی لڑکیاں جو غیر معمولی پستانوں کی مالک ہوں (اور شاید ان کی تعداد بھی معیاری تعداد (۲) سے بڑھ سکتی ہے) اور بے شمار ایسی خصوصیات جو ابتدائی دور کے ہم شکل انسان میں پائی جاتی تھیں۔

نتیجتاً مسائل سائنسی یا تکنیک پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان کی بنیاد اخلاقی یا سیاسی نوعیت کی ہے...... پسند اور پسند کا معیار...... بڑی نزاکت کا حامل ہے۔ مشہور سائنسی افسانہ طراز ولیئم ٹین (Willian Tenn) نے جینیاتی ردوبدل کے امکانات اور مشکلات سے متعلق ایک مرتبہ کہا ''اس بات کی امید کرتے ہوئے کہ کوئی بھی آمر، خودسر قسم کا منصوبہ ساز یا مطلق العنان قسم کا شخص مستقبل کی نسل کے لیے جینیاتی چناؤ کرے گا، ذرا سوچیں کہ پھر کون ہے جو یہ کام کرے گا؟ نہ ہی والدین، یقینی طور پر...... وہ لوگ اس مسئلے کو اپنے شناسا اور پڑوس میں واقع، سند یافتہ ماہرِ تعمیر نسبہ کے پاس لے جائیں گے۔

''مجھے یہ بات بھی ناگزیری نظر آتی ہے کہ تعمیرات نسبہ کے لیے مسابقی سکول بھی موجود ہوں

گے...... عملی طور پر کام کرنے والے لوگ والدین کو اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ ایسے بچے پیدا کریں جو معاشرے کی موجودہ ضروریات اور تقاضے پورے کریں۔ پیرویان مستقبلیت تجویز دیں گے کہ ایسے بچوں کی افزائش کی جائے جو ثقافت میں موزوں ترین مقام حاصل کر سکیں کیونکہ اس میں بیس سال کے دوران واضح تغیر آ جائے گا، رومانیت پسند لوگ اس بات پر زور دیں گے کہ ہر بچے کو کم از کم ایک وصف کے ساتھ پروان چڑھایا جائے، فطرت پرست افراد تجویز دیں گے کہ ایسے افراد کی افزائش کی جائے جو جینیاتی طور پر متوازن ہوں اور ہر طریقے سے توازن میں کامل ہوں...... انسانی جسم کے سٹائل، انسانی کپڑوں کے سٹائل کی طرح انوکھی حیثیت اختیار کر لے گا، یا وہ اس ڈیزائن پر تشکیل دیا جائے گا جس طرح جینیاتی ڈیزائن کنندگان اسے ڈیزائن کریں گے، وہ بھی ایسے ڈیزائن کے ساتھ جو رائج الوقت ہو۔

اس غیر سنجیدہ معاملے میں کچھ سنجیدہ معاملات بھی پنہاں ہیں جنھیں امکانات کی بہتات کے ساتھ مزید گھمبیر بنایا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے مضحکہ خیز ہیں کہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ Hieronymus Bosch کے کینوس سے ہمارے اوپر چھلانگ لگاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی اس بات کا حوالہ دیا گیا ہے کہ ایسے انسانوں کی افزائش کی جائے جن کے گلپھڑے ہوں یا پانی کے اندر کے ماحول میں رہنے کے لیے گلپھڑوں کی پیوندکاری کی جائے۔ لندن میں بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرین حیاتیات کی ایک میٹنگ میں جے. جی. ایس ہالڈین نے خلانوردی کے لیے نئے اور اعلیٰ ترین درجے کے انسانوں کی افزائش کے امکانات کی تفصیل پیش کی۔ انھوں نے اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا ''اضافی ارضی ماحول میں واضح طور پر غیر معمولی چیزیں، کشش ثقل، درجہ حرارت، ہوا کے دباؤ، ہوا کے مرکبات اور شعاع ریزی میں پائے جانے والے فرق ہیں...... یہ بات بھی واضح ہے کہ نسبتاً کم کشش ثقل والے علاقے میں کسی انسان کی بجائے ایک لنگور زیادہ مطابقت پذیر ثابت ہو سکتا ہے خاص طور پر خلائی جہاز سیارچوں یا شاید چاند کی سرزمین کے لیے۔ ایک خاص قسم کا (پلیٹیر ائن) بندر جس کی گرفت پذیر دُم ہے، وہ بھی ان کاموں کے لیے موزوں ہے۔ جین کی پیوندکاری ہی اس بات کا امکان پیدا کرے گی کہ اس قسم کی خصوصیات انسانی جسم میں داخل کی جا سکیں''۔

اس میٹنگ میں موجود سائنس دانوں کی زیادہ تر توجہ اخلاقی پہلوؤں اور حیاتی انقلاب کے خدشات تک محدود رہی، کسی شخص نے بھی Haldane کی اس تجویز کو چیلنج نہیں کیا کہ ہم ایک نہ ایک دن ایسے انسان بنا لیں گے جن کی دم ہو گی۔ بلاشبہ لیڈر برگ نے صرف اس بات پر توجہ دی ہے کہ انہی مقاصد کے حصول کے

لیے غیر جینیاتی طریقے بھی ہیں۔ ''ہم تجربات کے بعد انسان کے اندر فعلیاتی اور جینی تبدیلیاں کر رہے ہیں اور یہ تبدیلیاں مشینوں کے نعم البدل کے طور پر انسان کو استعمال کرنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔'' لیڈر برگ بات کو مزید بڑھاتے ہوتے کہتے ہیں، ''اگر ہمیں ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جس کی ٹانگیں نہ ہوں تو ہمیں اس کی افزائش کی ضرورت نہیں، ہم انھیں کاٹ کر پھینک سکتے ہیں، اگر ہمیں ایسے شخص کی ضرورت ہے جس کی دم ہو تو ہم اس دم کی پیوندکاری کی راہ نکال لیں گے۔''

سائنس دانوں اور دانشوروں کی ایک اور میٹنگ میں ڈاکٹر رابرٹ سنیشمر (Sinsheimer) جو Calltech سے تعلق رکھنے والے ماہر حیاتی طبیعیات ہیں، نے بڑے واضح انداز میں چیلنج کیا: ''انسان کے لیے قدرت کے قدیمی مجوزہ نمونوں میں مداخلت کیسے کریں گے؟ کیا آپ اپنے بچے کی جنسی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کریں گے؟ یہ بالکل آپ کی خواہش کے مطابق ہو گی۔ کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کا بیٹا چھ فٹ لمبا ہو۔ سات فٹ؟ یا آٹھ فٹ؟ آپ کو کیا چیز پریشان کرتی ہے؟ الرجی، مٹاپا، ورم مفاصل؟ ان پر بڑی آسانی سے قابو پایا جا سکے گا کیونکہ کینسر، ذیابیطس Phenylketonuria[1] کے لیے جینیاتی تھراپی کا سہارا لیا جائے گا۔ مناسب مقدار میں مناسب DNA فراہم کیا جائے گا۔ وائرس اور خوردنی جراثیم سے پھیلنے والی بیماریاں آسانی سے ختم کی جا سکیں گی۔ حتیٰ کہ زمانہ قبل از معلوم سے آتے ہوئے، نشوونما، بلوغت اور بڑھاپے کے سلسلے ہمارے ڈیزائنوں کا موضوع ہوں گے۔ ہمیں عمر کی مدت اور اس کی حدود کا علم نہیں۔ آپ کتنا عرصہ زندہ رہنا چاہتے ہیں؟

چلیں اس کے حاضرین اسے سمجھنے میں غلطی کر لیں، مسٹر سنیشمر دریافت کرتے ہیں ''کیا اس طرح کے تغیرات اور تبدیلیاں LCD کے نشے کی طرح نہیں ہیں یا کسی خراب آئینے میں نظر آنے والا کوئی منظر؟ کوئی چیز بھی ان صلاحیتوں کی عکاسی نہیں کرتے جو کچھ ہم اب جانتے ہیں، یہ تشکیلات اس صورت میں نہیں ہو سکتیں جس طرح کوئی پیش بینی کرتا ہے، لیکن ایسا کرنا ممکن ہے، انھیں عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے، بجائے دیر کرنے کے جلد ہی ایسا کرنا ممکن ہے۔''

نہ صرف یہ کہ اس طرح کی حیران کن چیزوں کو حقیقت کا روپ دیا جا سکتا ہے، بلکہ ان سے منسوب غیر معمولی چیزوں کو بھی۔ باوجود اس اخلاقی اور اہم سوال کے کہ انھیں ایسا تیار کیا جانا چاہیے، حقیقت اپنی جگہ عیاں

---

(۱) پیدائشی تحولی عارضہ۔

ہے کہ سائنسی تجسس از خود ہمارے معاشرے کی ایک بھرپور قوت ہے۔ Rocke feller Institute کے ڈاکٹر روبن ڈی ہوچکس (Hotchkiss) کے الفاظ میں: ''ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اس بہترین توازن کے حامل اور دوررس نتائج کے حامل اس نظام سے ہیجانی کیفیت سی محسوس کریں گے جو کسی فرد کو ان صلاحیتوں کا حامل بنا دیتا ہے۔ تاہم مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ایسا ہونا چاہیے یا ایسا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جذبہ ایثار، نجی منافع اور عدم شناسائی (جہالت) کے ملاپ سے ایک راستہ بنایا جائے گا''۔ اس فہرست میں، جدید تر حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے، سیاسی اختلافات اور معتدل قسم کی عدم دلچسپی کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ "Institute of Development Biology of the Soviet Academy of Sciences" کی ریسرچ لیبارٹری کے نگران اعلیٰ ڈاکٹر اے نیفخ (Neyfakh) بغیر کسی خوف کے اس بات کی پیش گوئی کرتے ہیں کہ دنیا بہت جلد ہی، اسلحہ کی دوڑ کی مانند، ایک جینیاتی مماثل و مساوی قسم کی چیز دیکھے گی۔ ان کے دلائل کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ سرمایہ دارانہ قوتیں ''دماغی صلاحیتوں کی دوڑ'' میں مصروف ہیں۔ ''اخراج الرجال کی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے ''ردعمل کی صلاحیت رکھنے والی'' کوئی بھی حکومت ذہین افراد اور خصوصی صلاحیتوں کے حامل افراد کے حصول کے لیے جینیاتی انجینئرنگ کا اطلاق کریں گے۔ چونکہ یہ سب کچھ ان کی منشا کے بغیر ہوگا لہٰذا جینیات کے حوالے سے ایک بین الاقوامی دوڑ ناگزیر ہے اور اگر ایسا ہے تو روس کو مقابلے میں کودنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔

مشہور روسی فلسفی A. Petropanlovsky کی طرف سے، اس قسم کی دوڑ کے لیے رضامندی بلکہ جوش و جذبہ دکھائے جانے کی وجہ سے ہے، اپنے اوپر تنقید کیے جانے کے بعد مسٹر Neyfakh نے نئی حیاتیات کے فوری اطلاق سے ہونے والی ممکنہ تباہ کاریوں کو یہ کہہ کر نظرانداز کر دیا سائنسی ترقی کو روکنا ممکن نہیں۔ اگر Neyfakh کی سیاسی منطق کوئی ایسی چیز ہے جس کی خواہش کی جائے، تو سرد جنگ کے عزائم کو جینیاتی (تجربات کے) جواز کے لیے پیش کرنا انتہائی خوفناک ہے۔

مختصراً یہ کہ یہ کہنا کسی بھی قسم کے خوف و خدشے سے خالی ہے کہ جب تک مخصوص قسم کے اقدامات نہ اٹھائے جائیں، اگر کوئی چیز کی جا سکتی ہے تو کوئی نہ کوئی شخص، کسی نہ کسی جگہ پر اسے سرانجام دے گا۔ اس بات کی نوعیت کہ کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اور کیا کچھ کیا جائے گا کسی ایک چیز سے ماورا ہے جس کے ساتھ رہنے کے لیے انسان نفسیاتی یا اخلاقی طور پر تیار نہیں۔

ناپائیدار عضو

ہم بڑی ثابت قدمی سے اس قسم کے حقائق کا سامنا کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم تبدیلی کی رفتار کی پہچان کرنے سے ہٹ دھرمی کے ساتھ انکار کرتے ہیں۔ مستقبل سے روگردانی ہمارے اندر اچھا احساس پیدا کرتی ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ جدید ترین سائنسی تحقیق سے قریب ترین تعلق رکھتے ہیں وہ بھی ایسی حقیقتوں پر شاذ ہی اعتبار کریں گے بلکہ وہ لوگ تو اس رفتار کے بارے میں پس تخمینہ کریں گے جس سے مستقبل ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر رچرڈ جے کلیلولینڈ نے ماہرین پیوندکاریٔ عضو کی ایک کانفرنس منعقدہ ۱۹۶۷ء میں بتایا کہ انسانی دل کی پیوندکاری کا پہلا آپریشن پانچ سال کے اندر اندر ہو جائے گا۔ اس سال کے شروع ہونے سے قبل ہی ڈاکٹر کرسچیان بارنارڈ (Christiaan Barnard) نے "Louis Washkansky" نامی ۵۵ سالہ شخص کا کامیاب آپریشن کیا اور اس کے بعد مختلف افراد کے آپریشنز کا سلسلہ چل نکلا اور یہ بازگشت دنیا کے شعور پر دھماکوں کی طرح پڑیں۔ اسی دوران گردوں کی پیوندکاری کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جگر، لبلبہ اور بینہ دانی کی کامیاب پیوندکاری کی رپورٹیں بھی آئی ہیں۔

طبی ترقی میں اس طرح کی بڑھتی ہوئی رفتار سے ہماری سوچوں میں اور بیمار کی تیمارداری سے بنیادی قسم کی تبدیلیاں آنی چاہئیں۔ انتہائی اہم قسم کے نئے قانونی، اخلاقی اور فلسفیانہ معاملات اٹھتے ہیں۔ مثال کے طور پر، موت کیا ہے؟ کیا ہمارے روایتی یقین کے مطابق موت اس وقت وقوع پذیر ہوتی ہے جب دل دھڑکنا بند ہو جاتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہسپتال اب اس بات سے شناسا ہو چکے ہیں کہ جدید ترین طبی سہولیات کی مدد سے مریضوں کو کیسے زندہ رکھا جا سکتا ہے لیکن ان کا وجود بے ہوش سبزیوں کی طرح ہی ہوتا ہے۔ کسی ایسے شخص کو موت کے منہ میں اس لیے لے جانے کے لیے کہ اس کے جسم سے ایک صحت مند عضو حاصل کر کے اس شخص کے جسم میں لگا دیا جائے جس کی صحت یابی کی پیش گوئی کر دی گئی ہو، اخلاقی اقدار کیا کہتی ہیں؟

کسی راہنما اصول یا پیشگی مثالوں کی عدم دستیابی کی صورت میں، ہم اخلاقی یا قانونی پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ طبی طبقات میں عجیب و غریب قسم کی افواہیں گردش کرتی ہیں۔ "The New York Times" اور "Komsomolskaya Pravda" جیسے دو اخبارات ''بلیک مارکیٹ میں موجود سرجنز کو غیر قانونی طور پر انسانی اعضا کی فراہمی کے لیے ان انسانوں کے ممکنہ قتل کے بارے میں لکھا ہے خاص طور پر ان مریضوں کے لیے جو اپنے لیے درکار دل، جگر، لبلبہ کی قدرتی طور سے فراہمی کا انتظار نہیں کر سکتے۔'' واشنگٹن

میں "National Academy of Sciences" نے "Russell Sage Foundations" سے ملنے والی امداد کے تعاون سے حیاتیات میں جدید ترین ترقی اور اس سے پیدا ہونے والے سماجی پالیسی کے معاملات پر ایک مطالبہ شروع کیا۔ "Russell Sage" ہی کے زیر اہتمام سٹینفورڈ (Stanford) کے مقام پر منعقدہ ایک مذاکرے میں پیوندکاری میں استعمال ہونے والے اعضا کے لیے بینک کی تشکیل کے طریقۂ کار، اعضا کی مارکیٹ کی معاشیات اور اعضا کی دستیابی میں طبقات یا نسلی تفریق جیسے موضوعات پر بحث کی گئی۔

آدم خور جسموں یا لاش کو پیوندکاری کے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے امکانات، ایک خوفناک قسم کے موضوع کی حیثیت سے، مصنوعی اعضا کے شعبے میں عجلت اور اس کی ضرورت کا تقاضا کر کے تبدیلی کے چلن میں تیزی لاتے ہیں۔ دل، جگر یا تلی کے پلاسٹک یا الیکٹرانک نعم البدل (چاہے انھیں غیرضروری طور پر بنایا جائے، جب ہم یہ سیکھ لیں کہ ان مجروح شدہ اعضا یا بدن کے کسی قطع شدہ حصے کی افزائش کیسے ممکن ہے، نئے اعضا کی نشو ونما جیسے چھپکلی کے جسم میں نئی دم ابھر آتی ہے)۔

ناکارہ انسانی جسموں کے لیے فاضل اعضا کی فراہمی کو ممکن بنانے کی مہم شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ پروفیسر لیڈر برگ کہتے ہیں، ''مناسب قیمت پر ایک مصنوعی دل کی دستیابی چند عارضی (تجربات کی) ناکامیوں کی دوری کے فاصلے پر ہے۔'' گلاسکو کی "University of Strathchyte" کے بائیوانجینئرنگ گروپ سے تعلق رکھنے والے پروفیسر آر ایم کینیڈی کو اس بات کا یقین ہے کہ ۱۹۸۴ء تک ٹشوز اور اعضا کی مصنوعی پیوندکاری عام ہو جائے گی۔'' کچھ اعضا کے لیے یہ مجوزہ تاریخ کچھ اعضا کے لیے بڑے محتاط انداز میں کہی گئی ہے۔ عارضہ قلب میں مبتلا ۱۳۰۰۰ سے زائد امریکی۔ جن میں ایک سپریم کورٹ کے جسٹس بھی شامل ہیں۔ اس وجہ سے زندگی کے ایام گزار رہے ہیں کیونکہ ان کے جسموں میں پیس میکر (Pace maker)۔ ایک ایسا آلہ جو دل کو دھڑکانے کے لیے بجلی کے معمولی جھٹکے فراہم کرتا ہے۔[1]

اس کے علاوہ ۱۰۰۰۰ مریض ایسے ہیں جنھیں ابتدائی طور پر، دل کے مصنوعی والو (Valves)

---

(۱) کچھ عرصہ قبل Midwest کے ایک بڑے ہسپتال میں، رات کے وسطی پہر میں، ایک مریض کو لایا گیا اسے بڑی شدت سے ہچکیاں آ رہی تھیں، ایک منٹ میں تقریباً ساٹھ۔ یہ معلوم ہوا کہ مریض ان افراد میں سے تھا جنھیں ابتدائی طور پر pacemaker لگایا گیا تھا۔ اس pacemaker کی تار ڈھیلی ہو گئی اور بجائے دل دھڑکانے کے اس کے سینے کو چھونا شروع کر دیا۔ اس تار کے جھٹکے ہچکیاں پیدا کر رہے تھے۔ بڑی تیزی سے عمل کرتے ہوئے عملے کے ایک فرد نے مریض کے سینے میں pacemaker کے قریب سوئی کے ذریعے ایک تار داخل کر دیا اور اس تار کو ہسپتال کی Plumbing سے پیوست کر دیا۔ ہچکیاں رک گئیں اور ڈاکٹروں کو آپریشن کے ذریعے درستگی کا موقع مل گیا آنے والے کل کی دوائی کا پیشگی مزہ؟

لگائے گئے ہیں جو ڈیکرون (dacron) نامی مصنوعی ریشے سے بنائے گئے تھے۔ نصب کیے جانے والے آلات سماعت، مصنوعی گردے، شریانیں، کولھے کے جوڑ، پھیپھڑے، آنکھوں کے حلقے اور دیگر اعضا ابھی تجربات کے مرحلے میں ہیں۔ چند دہائیاں گزرنے سے قبل ہی ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم مریضوں کے جسموں میں چھوٹے چھوٹے، اسپرین کے حجم کے سنسر نصب کر سکیں جو فشار خون، نبض، سانس اور دیگر نظاموں کی نگرانی کر سکیں، اور چھوٹے چھوٹے ٹرانسمیٹر بھی نصب کیے جا سکیں گے جو کسی خرابی کی صورت میں کوئی اشارہ دے دیا کریں گے۔ اس طرح کے اشارے بہت بڑے تشخیصی کمپیوٹر سنٹروں سے منسلک ہوں گے۔ جن سے مستقبل کی ادویات منسوب ہوں گی۔ ہم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اپنے ساتھ ایک چھوٹی سی پلیٹینیم پلیٹ اور سکے کے حجم کا "Stimulator" رکھتے ہوں گے جسے ریڑھ کی ہڈی سے پیوستہ کیا ہوگا۔ ایک چھوٹے سے ریڈیو نما آلے کو ''آن'' اور ''آف'' کرنے سے ہم اس قابل ہوں گے کہ "Stimulators" کو حرکت میں لا کر درد ختم کر دیں۔ درد کنٹرول کرنے کے اس طریقۂ کار پر ابتدائی کام "Caseinstitute of Technology" میں جاری و ساری ہے۔ عارضۂ قلب میں گرفتار کچھ مریض ایسے ہیں جو پہلے ہی پش بٹن pain killers استعمال کر رہے ہیں۔

اس طرح کی ترقی اور پیشرفت، بڑے پیمانے پر، بائیوانجینئرنگ کی صنعت، طبی، الیکٹرانک آلات کی مرمت کے مراکز، نئے تکنیکی پیشوں اور صحت سے متعلق نئے نظاموں کو جنم دے گی۔ اس طرح متوقع عمر، بیمہ پالیسیوں کے جدولوں میں یقینی تبدیلی آئے گی اور انسان کی ظاہری حالت میں اہم تغیرات آ جائیں گے۔ ایک عمومی شخص کے لیے سرجری کا خوف کم ہو جائے گا، پیوندکاری معمول بن جائے گا۔ انسانی جسم ''معیاری'' سے ''کل'' کی حفاظت کا کام، ہم اوسط انسانی عمر میں دو یا تین دہائیوں کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ تاہم جب تک ہم اس قابل نہیں ہو جاتے کہ موجودہ دماغ کے مقابلے میں ترقی یافتہ ذہن تیار کر لیں، اس وقت تک یہ تاریخ کی عظیم ستم ظریفی ہی نظر آتی ہے۔ آکسفورڈ میں طب کے پروفیسر سر جارج پکرنگ (Sir George Pickering) نے وارننگ دی ہے کہ جب تک ہم ان کی کڑی نگرانی نہیں کریں گے'' وہ لوگ جن کے اعلیٰ و ارفع ذہن ہیں وہ اس سرزمین کا تیزی سے بڑھتا ہوا حصہ بنتے چلے جائیں گے اور مجھے یہ کام انتہائی خوفناک محسوس ہو رہا ہے۔'' اسی طرح کی خوفناک کیفیات ہی ہمیں دماغ سے متعلق تیز تر تحقیق کی طرف لے جائیں گی۔ نتیجتاً یہی چیز معاشرے میں بنیادی تبدیلیاں لے کر آئیں گی۔

آج ہم ایسے ہارٹ والو(Valves)یا دل کی دھڑکن کو برقرار رکھنے والے مصنوعی آلات بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جو اصل جیسے ہی ہوں اور وہ اصل اعضا کا نعم البدل ثابت ہوں۔ اور ہم یہ بھی کوشش کرتے کہ یہ اپنے عمل میں بھی انہی کی برابری کریں۔ جب تک ہم بنیادی مسائل پر قابو نہ پالیں اس وقت تک ہم پلاسٹک کے بنے ہوئے شریان کبیر(Aortas)لوگوں کے جسموں میں پیوست نہیں کر سکتے تاوقتیکہ ان کے اصل شریان کبیر کام کرنا چھوڑ دیں۔ ہم خصوصی طور پر ڈیزائن شدہ وہ اعضا پیوست کریں گے جو اصل سے بھی بہتر ہوں اس کے بعد ہم اس مرحلے کی طرف بڑھیں گے کہ ایسے اعضا پیوست کریں جو استعمال کنندہ کو ان صلاحیتوں سے نوازیں جو ان میں پہلے مفقود تھیں۔ جیسے جینیاتی انجینئرنگ اس عہد و پیمان کے ساتھ آگے بڑھتی ہے کہ وہ ''اعلیٰ ترین'' افراد کی افزائش کرے گی، اسی طرح اعضا سے منسلک ٹیکنالوجی اس امکان کو پیدا کرے گی کہ وہ افراد کو اضافی خصوصیت کے حامل پھیپھڑے یا دل فراہم کرے، ایسے افراد جن میں ایسا اعصابی نظام ہو جو حساسیت میں شدت پیدا کر سکے، محبت کرنے والے ایسے افراد جن میں شدت کے ساتھ جنسی صلاحیت کی حامل اعصابی مشینری ہو۔ مختصراً یہ کہ ہم نہ صرف محفوظ زندگی سے بھرپور مشینری کی پیوند کاری کریں گے بلکہ ایسی مشینری جو حساسیت میں بھی شدید تر ہو...... تاکہ موڈ، حالتوں، کیفیتوں یا وجدانی صورتوں کے امکان کو بھی بہتر بنایا جا سکے جواب تک ہم سے دور ہیں۔

ان تمام تر صورتوں کی موجودگی میں ''انسانیت'' سے منسوب ہماری تعریفوں کا کیا ہوگا؟ پروٹو پلازم اور ٹرانسسٹر کے حصوں کا کیا ہوگا؟ یہ کیسے کیسے امکانات کے در وا کرے گا؟ یہ کام، کھیل، جنس، دانش یا جمالیاتی ردعمل پر حدود مقرر کرے گا؟ جب جسم تبدیل ہو جائے گا تو ذہن کو کیا ہوگا؟ ایسے سوالات کو مزید موخر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انسان اور مشین کا یہ ادغام جسے ''سائی بورگ'' کہا جاتا ہے۔ اب لوگوں کے خیالات اور اندازوں سے بھی قریب تر ہے۔

ہمارے درمیان موجود سائی بورگ

آج کے دور میں پیس میکر(pace maker)یا پلاسٹک کی شریان کبیر کے حامل شخص واضح طور پر ایک انسان ہی ہے۔ اس کے جسم کا یہ بے جان حصہ اس کی شخصیت اور شعور کے حوالوں سے غیر اہم ہے۔ لیکن جونہی مشینی تناسب میں اضافہ ہوگا تو خود کی آگہی اور اندرونی تجربات کا کیا ہوگا؟ اگر ہم یہ قیاس کر لیں کہ شعور اور ذہانت کا مرکز دماغ ہے اور جسم کا کوئی اور عضو اس کی شخصیت پر اتنا اثر انداز نہیں ہوتا تو پھر ایک غیر مجسم دماغ کا تصور آسان ہوگا۔ ایسا دماغ جو ہاتھ، پاؤں، ریڑھ کی ہڈی یا دیگر اعضا کے بغیر ہو۔ ایک خودی، ایک شخصیت اور

شعور کی تجسیم۔ پھر یہ ممکن ہوگا کہ انسانی دماغ کو مصنوعی حساسیت کے آلات، اثر قبول کرنے والے آلات اور شائر کنندہ آلات کے ایک سیٹ سے منسلک کر دیا جائے اور تاروں اور پلاسٹک کے اس گنجلک کو انسان کہا جائے۔

یہ سارے کا سارا سلسلہ قدیم دور سے تعلق رکھنے والے اس مفروضے سے ملتا جلتا نظر آتا ہے جو ان فرشتوں سے منسوب ہے جو سوئی کی نوک پر چل سکتے تھے، تاہم انسان۔ مشین ادغام کی طرف ابتدائی قدم اٹھائے جا چکے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ قدم کسی واحد نادان سائنسدان نے نہیں اٹھایا بلکہ ہزاروں کی تعداد میں، اعلیٰ تربیت یافتہ انجینئروں، ریاضی دانوں، ماہرین حیاتیات، سرجنوں، کیمیا دانوں، ماہرین علم الاعصاب اور ماہرین ذرائع ابلاغ کی طرف سے اٹھایا گیا ہے۔

ڈاکٹر ڈبلیو جی والٹر کے بنائے ہوئے مشینی ''کچھوے'' ایسی مشینیں ہیں جو ایسے انداز اور ردعمل کا اظہار کرتے ہیں گویا وہ نفسیاتی طور پر پرکھ کر کام کرتے ہوں۔ یہ کچھوے روبوٹس کی نسل کے ابتدائی نمونے تھے جن کا آغاز "Perceptron" سے ہوا تھا جو جدید ترین روبوٹ وانڈرر(Wanderer) کی طرح سیکھ سکتا تھا (اور سمجھ بھی سکتا تھا) یہ ایک ایسا روبوٹ ہے جو کسی علاقے کی سیاحت کر سکتا ہے، اس خطے کے عکس بھی اپنی یادداشت میں سما سکتا ہے اور کچھ آپریشنوں میں بھی شامل ہو سکتا ہے، جن کا کسی حد تک موازنہ "Contemplative Speculation" اور "Fantasy" سے کیا جا سکتا ہے۔ راس ایشبی (Ross Asbby)، ایچ ڈی بلاک(H.D.Block)فرینک روزنبلیٹ(Frank Rosenblatt)اور دیگر سائنسدان اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ مشینیں اپنی غلطیوں سے سیکھ سکتی ہیں، اپنی کارکردگی کو بہتر بنا سکتی ہیں اور کچھ مخصوص چیزوں کے سیکھنے میں انسانی طلبہ سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ کارنیل یونیورسٹی(Cornell University)میں Applied Mathematics کے پروفیسر مسٹر بلاک کہتے ہیں: ''میرا خیال ہے کہ کوئی ایک کام بھی ایسا نہیں کہ جس کا نام آپ لیں اور کوئی مشین......اصولی طور پر...... اس کو سرانجام نہ دے سکے۔ اگر آپ کسی کام کی وضاحت کریں جسے کوئی انسان سرانجام دے سکے، تو پھر ایک مشین بھی، کم از کم نظریے کی حد تک، اسے سرانجام دے سکتی ہے۔ تاہم لفظی ابلاغ کے لیے یہ بات درست نہیں۔'' اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دانش پر صرف انسانی اجارہ داری نہیں۔

رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود روبوٹ پر کام کرنے والے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے روبوٹ بنانے والوں کے سرکردہ ناقدین سے اجتماعی طور پر حظ اٹھایا، RAND

کارپوریشن نامی کمپنی کے کمپیوٹر سائنسدان، جن کا نام ہولبرٹ ایل ڈریفن تھا، نے اس بات پر دلالت کرتے ہوئے کہ کمپیوٹر کبھی بھی انسانی ذہانت کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ایک طویل مضمون لکھا جس میں انھوں نے ان لوگوں کو شدید تنقید اور مزاح کا نشانہ بنایا جو ان سے اختلاف رائے رکھتے تھے۔ دیگر نکات کے ساتھ ساتھ انھوں نے کہا ''شطرنج کا کوئی پروگرام غیر پیشہ ورانہ کھلاڑی سے بھی مقابلہ نہیں کر سکتا''۔ اس پس منظر میں وہ یہ کہتا ہوا نظر آ رہا ہے کہ کوئی بھی ایسا نہیں کرے گا۔ صرف دو سال بعد ہی MIT کے ایک گریجویشن کلاس کے طالب علم رچرڈ گرین بلیٹ (Richard Greenblatt) نے شطرنج سے متعلق ایک کمپیوٹر پروگرام تشکیل دیا اور اس نے ڈریفس (Dreyfus) کو میچ کا چیلنج دے دیا اور اسے یہ تسکین ہوئی کہ اس پروگرام نے ڈریفس کو شکست فاش دی جو تحقیق کرنے والوں کو ''مصنوعی دانش'' کے حامل قرار دے رہے تھے۔

"Robotology" جیسے ایک اور مختلف شعبے میں بھی ترقی اپنے زوروں پر ہے۔ ڈزنی لینڈ پر موجود ٹیکنیشنز نے کمپیوٹر سے کنٹرول کیے جانے والے ''انسان نما'' بنائے ہیں جو اپنے ہاتھ اور پیر ہلا سکتے ہیں، منہ چڑا سکتے ہیں، ہنس سکتے ہیں، گھور سکتے ہیں، خوف پیدا کر سکتے ہیں، محظوظ ہو سکتے ہیں اور بہت سے جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ایک رپورٹر کے مطابق پلاسٹک کے بنے ہوئے یہ روبوٹ، ''سب کچھ کرتے ہیں، صرف ان کے جسموں سے خون نہیں نکلتا''، یہ روبوٹ لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں، آلات موسیقی بجاتے ہیں، پستول سے فائر کرتے ہیں اور انسانی جسم سے اتنی مماثلت رکھتے ہیں کہ یہاں سیر کے لیے آنے والے خوف سے چلا اٹھتے ہیں، پیچھے ہٹ جاتے ہیں یا پھر ایسے ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں گویا وہ اصل انسانوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان روبوٹوں کو ایسے مقام پر رکھنے کا مقصد معمولی ہی ہے، لیکن ان کی بنیادی ٹیکنالوجی انتہائی پیچیدہ اور جدید ہے۔ اس ٹیکنالوجی کا دارومدار اس علم پر ہے جو خلائی پروگرام سے لیا گیا ہے اور اس علم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

اس بات کی اصولی طور پر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم ان ابتدائی اور معمولی قسم کے روبوٹس سے آگے کیوں نہیں بڑھ سکے کہ ہم ایسی انسان نما مشینیں بنا سکیں جو مختلف النوع قسم کے رویوں کی حامل ہوں ان میں انسانی غلطی کا خدشہ بھی موجود ہو اور ان میں چن لینے کی صلاحیت بھی موجود ہو۔ مختصراً یہ کہ ان کے رویوں کے حوالے سے انھیں انسانوں سے ممیز کرنا انتہائی مشکل ہو ماسوائے پیچیدہ اور خصوصی قسم کے ٹیسٹوں کے ذریعے۔ اس مقام پر ہمیں ایک انوکھی قسم کی صورت حال کا سامنا ہوگا اور ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے ہوائی کمپنی کے ریزرویشن آفس میں کاؤنٹر کے پیچھے جو خوبصورت اور مسکراتی ہوئی لڑکی دکھائی دے رہی ہے یہ کوئی حقیقی

انسان ہے یا انتہائی جدید روبوٹ ہے۔[۱]

تاہم مماثل یہ ہے کہ وہ خاتون دونوں (چیزوں پر مشتمل) ہوگی۔

مشین اور انسان کی ہم زیستی کی ایک صورت کا دھچکا، مشینوں سے ابلاغ میں عدم اصلیت میں اضافہ کر کے شدید تر کیا جا سکتا ہے۔ عوامی سطح پر شائع ہونے والے ایسے کاموں کا مقصد انسانوں اور کمپیوٹروں کے درمیان تفاعل کو بہتر بنانا ہے۔ لیکن اس بات سے یکسر ہٹ کر روسی اور امریکی سائنسدان ایسے تجربے کر رہے ہیں کہ ایسے سراغ رساں آلات کی پیوندکاری کی جا سکے جو اعصابی نظام سے پیغامات اور اشارے لے کر قطع شدہ عضو تک لے جا سکیں۔ پھر ان اشاروں کی شدت کو بڑھا کر مصنوعی عضو کو حرکت دینے کے کام آئے گی لہٰذا اس مشین کو بلاواسطہ اور حیاتی طور انسانی اعصابی نظام سے جوڑ دیا جائے گا۔ اس انسان کو اپنی خواہشات سے متعلق سوچنا نہیں پڑے گا: حتیٰ کہ غیر رضاکارانہ اشارے و کنائے بھی قابل ترسیل ہوں گے۔ مشین کے ردعمل کی حرکت بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے کسی انسان کے ہاتھ، آنکھ یا پاؤں کی۔

مشہور ناول نگار، شاعر اور پائیلٹ Antoine de saint-Exupery نے اپنے ناول "Flight to Arras" میں لکھا ہے کہ جنگ عظیم دوم کے دوران وہ جنگی جہاز کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہچکولے کھا رہے تھے، ''آکسیجن ٹیوب، گرم ہوتے ہوئے آلات، اور وہ ٹیوبز جن کے ذریعے عملے کے اراکین کے درمیان رابطہ ہوتا تھا، وہ ماسک جس کے ذریعے میں سانس لے رہا تھا، میں اس ربڑ ٹیوب کے سہارے اس جہاز سے جڑا ہوا تھا جو کسی ناف کی طرح ناگزیر تھی۔ میرے جسم کے ساتھ اعضا شامل کر دیے گئے اور وہ میرے اور میرے دل کے ساتھ رابطہ کا کام کر رہے تھے..........'' ہم لوگ اس عہد کی نسبت خاصا آگے آ گئے ہیں۔ خلائی حیاتیات بغیر کسی روک ٹوک کے اس طرف گامزن ہے جب ایک خلانورد نہ صرف ایک کیپسول میں بند ہو جائے گا بلکہ الفاظ کے صحیح معنوں میں وہ اس کا حصہ بن جائے گا۔

---

(۱) اس صورت حال سے نیم ظریفانہ اور نیم سنجیدہ قسم کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ جن کی بنیاد انسان اور مشینوں کے تعلقات پر ہوتی ہے اور اس میں جذباتی، حتیٰ کہ جنسی تعلقات بھی زیر بحث آتے ہیں۔ کارنیل یونیورسٹی کے پروفیسر بلاک یہ تصور کرتے ہیں انسان اور مشین کے مابین جنسی تعلقات بھی اب بعید از قیاس نہیں ہیں۔ اس باب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ انسان اپنے استعمال میں آنے والی مشینوں سے بھی محبت کرنے لگتا ہے لہٰذا ''ان مشینوں کو محبت اور جذبات'' کی رو سے زیر استعمال لانے کے لیے ہمیں ''اخلاقی'' جواز اور سوالات کی طرف دیکھنا ہوگا۔ ان معاملات پر سنجیدگی سے غور کرنے کے امور کے حوالے سے برطانوی جریدے "Journal of the philosophy of Sciece"، شمارہ ۱۸، ۱۹۶۷، صفحات ۳۹ تا ۵۱ دیکھیے۔

اس کا ایک مقصد تو اس (خلائی) جہاز کو ایک خود کفیل کائنات بتانا ہے جس میں کائی یا سمندری بوٹیوں کو غذا کے طور پر لگایا جائے، جسم کے فاضل مادوں سے پانی حاصل کیا جائے، اس فضا میں، پیشاب کی وجہ سے شامل ہونے والی امونیا سے ہوا کو حاصل کیا جائے وغیرہ۔ باز پیداوار کی صلاحیت رکھنے والی اس دنیا میں، انسان مائیکرو ایکالوجی (خرد۔ ماحولیاتی) کے اس جاری سلسلے کا ایک حصہ ہے جو اس وسیع کائنات میں پھیلی ہوئی ہے۔ لہٰذا تھیوڈور گورڈن (Theodore Gordon) جو کتاب "The Future" کے مصنف ہیں اور بذات خود ایک سرکردہ خلائی انجینئر ہیں، لکھتے ہیں ''شاید مشینوں کی صورت میں زندگی سے سہارا لینا آسان ہو بجائے ایک خلانورد کے۔ اسے درون وریدی طریقے سے غذا پہنچائی جا سکتی ہے ایک مایہ کی صورت میں غذا کی ترسیل کے ذریعے جسے اس سے دور دباؤ کی ٹیکنالوجی کے استعمال سے محفوظ رکھا گیا ہو۔ جسم سے فاضل مادوں سے پانی کے حصول کو ایک مصنوعی قسم کے گردے کی تیاری کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہو جو خلائی جہاز میں ہی فٹ کر دیا گیا ہو۔ شاید نیند کو الیکٹرانک طریقے سے پورا کیا جائے...... تاکہ اس کے metabolism کو کم کیا جائے......'' Und so weiter! ایک ایک کر کے انسانی جسم کی کارکردگی ایک دوسرے میں بنتی چلی جائے گی اور اس کیپسول کی کارکردگی پر انحصار کرتی چلی جائے گی اور اس کا حصہ بنتی جائے گی۔

تاہم اس طرح کے کام کی وسعت کا خلا سے باہر پایا جانا ضروری نہیں، یہ زور دہ زندگی کا، اسی مادر سیارے میں ہی، حصہ بن جائے گا۔ یہ انسانی دماغ کا کمپیوٹر کے ساتھ بلا واسطہ ملاپ ہے۔ اپنے جسمانی ڈھانچے سے علیحدہ ہٹ کر۔ شاید ایسا ہو کہ مستقبل سے تعلق رکھنے والے کمپیوٹر کے حیاتیاتی اجزا انسانی دماغ کا روپ (بہروپ) اختیار کر لیں۔ انسانی (اور مشینی) ذہانت کو بڑھائے جانے کا امکان، اور وہ بھی ان کو عضوی طور پر یکجا کرنے سے، بے شمار حیران کن امکانات کے در وا کر دے گا، یہ بات اتنی حیرت انگیز ہوگی کہ واشنگٹن میں واقع Naval Research Laboratory کے ڈائریکٹر ڈاکٹر آر ایم تیج نے اعلانیہ ایسے نظام پر بحث و تمحیص کی ہے جس میں خودکار طور پر انسانی خیالات کمپیوٹر کے سٹوریج یونٹ میں اکٹھے ہو جائیں گے تاکہ مشین کے ذریعے فیصلہ کرنے کو ممکن بنایا جائے۔ کچھ سال قبل RAND کارپوریشن کے ایک مطالعے میں شرکا سے جب یہ پوچھا گیا کہ اس طرح کی پیشرفت کب ہوگی تو ان کے جوابات ''۱۹۹۰ء'' سے لے کر ''کبھی نہیں'' تک تھے۔ لیکن ممکنہ تاریخ ۲۰۲۰ء ٹھہری۔ یعنی آج کے لڑکپن کی عمر کے افراد کی زندگی ہی میں۔

اسی اثنا میں بے شمار ذرائع سے ہونے والی تحقیق ہم زیستگی کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک

یادگار قسم کے شاندار، خوفزدہ کر دینے والے اور دانشورانہ انداز میں بیدار کرنے والے تجربے میں کلیولینڈ (Cleveland) کے Metropolitan General Hospital میں Neurosurgery کے ڈائریکٹر پروفیسر رابرٹ وائٹ نے اس بات کی تصدیق کی کہ کسی شخص کی وفات کے بعد اس کے دماغ کو باقی ماندہ جسم سے علیحدہ کر کے زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ اس تجربے کو ایک زبردست مضمون میں، اوریانا فلاسی (Oriana Fallaci) نے بیان کیا ہے، انھوں نے دیکھا کہ اعصابی سرجنوں کی ایک ٹیم نے ایک Rhesus بندر کے جسم سے دماغ نکالا اور اس دماغ کو ایک اور بندر، جس کا جسم دماغ کے نکالے جانے کی وجہ سے خود میں نہا چکا تھا، کے سر میں پیوست کر دیا اور اسے زندہ رکھا۔

اس میڈیکل ٹیم کے ایک ممبر ڈاکٹر لیو میزوپسٹ (Leo Massopust) جو ماہر علم الاعصاب ہیں کہتے ہیں ''دماغ کی کارکردگی اس وقت بہتر ہوتی ہے۔ جب جسم اس کے ساتھ نہ ہو، بجائے اس صورت کے جب اس کے ساتھ جسم ہو...... اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ مجھے تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ اپنی حسیات کے بغیر وہ تیزی سے سوچ سکتا ہے۔ کسی طرح کی سوچ میں نہیں تصور کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک یادداشت ہے، ان خیالات اور سوچوں کا ایک سٹور اور ان کا ردعمل، جب اس کے ساتھ جسم وابستہ تھا، وہ مزید نشوونما نہیں پا سکتا کیونکہ اس کے پاس تجربات کا سلسلہ نہیں، تاہم یہ بھی ایک نیا تجربہ تھا''۔

دماغ پانچ گھنٹے تک زندہ رہا، اگر اسے (مزید) تحقیق کے مقاصد کے لیے استعمال کیا جانا ہوتا تو یہ مزید زندہ رہ سکتا تھا۔ پروفیسر وائٹ نے بڑی کامیابی سے دیگر دماغ کئی روز تک زندہ رکھے اور وہ بھی مشین کے ذریعے، بجائے خون میں نہائے ہوئے ایک بندر کے۔ انھوں نے اوریانا فلاسی کو بتایا ''میرا خیال نہیں کہ ہم نے وہ مقصد حاصل کر لیا جو ہم سوچ رہے تھے، یعنی جہاں سے آپ انسانوں کو روبوٹ بنا ڈالیں یا ایک مؤدب بھیڑ (Sheep)۔ تاہم...... ایسا ہو سکتا ہے ایسا ناممکن نہیں۔ اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم کسی شخص کے سر کو دیگر انسان کے دھڑ پر رکھ سکتے ہیں، اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم کسی شخص کے دماغ کو علیحدہ کر سکتے ہیں اور اس سے پیوستہ جسم کو بغیر اس کے کام کرنے پر مجبور کیا جائے...... میرے لیے سائنسی افسانہ طرازی اور سائنس میں بہت زیادہ فاصلہ نہیں...... ہم آئن سٹائن کے دماغ کو زندہ کر کے اسے معمول کے مطابق استعمال کر سکتے ہیں۔''

پروفیسر وائٹ مزید دلائل دیتے ہوئے کہتے ہیں ہم نہ صرف ایک انسان کا سر دوسرے انسان کے کاندھوں پر رکھ سکتے ہیں، ہم نہ صرف کسی سر یا دماغ کو ''زندہ'' اور عمل کرتا ہوا رکھ سکتے ہیں، بلکہ یہ تمام کام

''موجودہ اور دستیاب تکنیک'' سے بھی ہوسکتا ہے۔ پروفیسر اس بات کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں، ''جاپانی وہ پہلی قوم ہے جو [کسی علیحدہ شدہ دماغ کو زندہ رکھ سکے] میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ ابھی تک میں اس مخمصے سے باہر نہیں آیا: ایسا کرنا درست ہے یا نہیں''؟ ایک کٹر کیتھولک کی حیثیت سے ڈاکٹر وائٹ اپنے کام کے فلسفیانہ اور اخلاقی پہلوؤں کی وجہ سے پریشان ہیں۔

جوں جوں دماغی سرجری کے ماہرین اور ماہرین علم الاعصاب آگے بڑھ رہے ہیں، حیاتیاتی انجینئر اور ریاضی دان، ماہرین ابلاغ اور روبوٹ بنانے والے جدید سے جدید تر ہوتے چلے جارہے ہیں، خلائی انسان اور ان کا کیپسول ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر آرہا ہے مشینیں حیاتیاتی اجزا کی تجسیم کرتی چلی جارہی ہیں، انسان سنسرز (Sensors) اور مشینی آلات سے مزین ہوتے چلے جارہے ہیں اور ''ہم زیستی'' کا عمل آگے بڑھتا چلا جارہا ہے۔ ایسے میں کام مرتکز ہوتا ہے۔ تاہم ان میں سب سے بڑا کارنامہ نہ تو اجزا کی پیوندکاری ہے یا ہم زیستی (Symbiosis) یا زیرآب انجینئرنگ۔ یہ نہ تو ٹیکنالوجی ہے اور نہ ہی سائنس۔

اس تمام صورت حال میں سب سے بڑا عجوبہ نسل کی آسودہ خاطر قسم کی بازسمت بندی ہے، تیز رفتاری کی اس حقیقت کی مزاحمت کی عدم رضامندی لہٰذا انسان بڑی تیزی سے ایک ان دیکھی کائنات میں چلا جاتا ہے۔ معاشی ...... ٹیکنیکل ترقی کی بالکل نئی راہ، جس میں انسان کو اس بات کا یقین واطمینان ہوتا ہے کہ ''انسانی فطرت کو دوام ہے'' یا یہ کہ ''پائیداری واپس آئے گی۔'' وہ انسانی تاریخ کے سب سے شدید انقلاب میں لڑکھڑاتا گھوم رہا ہے، بڑبڑاتا ہوا، اور ایک مشہور لیکن فریب نظر کے حامل ماہر عمرانیات کے الفاظ کی رو سے جدید ترین ترقی کے مراحل ...... تقریباً مکمل ہوچکے ہیں''۔ وہ صرف مستقبل کا تصور کرنے سے گریزاں ہے۔

تبدیلی سے انکار

۱۸۶۵ء میں ایک اخبار کے مدیر نے اپنے قارئین کو بتایا ''باخبر لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ تاروں کے ذریعے آواز کی ترسیل ناممکن ہے اور کیا ایسا کرنا ممکن ہوگا، اس چیز کا کوئی عملی فائدہ نہیں ہوگا''۔ محض ایک دہائی بعد ہی مسٹر گراہم بیل کی لیبارٹری سے ٹیلی فون ایجاد ہوکر نکلا اور دنیا کو تبدیل کرکے رکھ دیا۔

خاص اسی دن رائٹ (Wright) برادران نے پرواز کی، اخبارات نے اس خبر کو شائع نہیں کیا کیونکہ ان اخبارات کے مہذب، مستحکم اور زمینی حقائق کو تسلیم کرنے والے مدیران خود کو یہ یقین نہیں دلا سکے کہ ایسا ہوگیا ہے۔ بالآخر ایک مشہور امریکی خلانورد سائنس نیوکومب (Simon Nwecomb) نے جلد ہی دنیا

کو یقین دلایا ''معلوم عناصر، مشینوں کی معلوم قسم، معلوم قوت اور ناممکن ملاپ، کسی عملی مشین میں یکجا ہوسکتے ہیں۔ جس کے ذریعے انسان طویل فاصلوں تک پرواز کرسکتا ہے''۔ اس واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد ایک اور ماہر نے عام اعلان کیا، ''یہ سوچنا دماغی کمزوری کے علاوہ کچھ نہیں کہ گھوڑے کے بغیر بگھی سے کوئی چیز حاصل ہوجائے گی۔'' چھ سال بعد، ایک لاکھویں، مسٹر فورڈ نے پیداواری سلسلہ تشکیل دے دیا۔ اور اس کے بعد عظیم ردرفورڈ نے ایٹم دریافت کیا اور انھوں نے ۱۹۳۳ء میں یہ اعلان کیا کہ ایٹم (جوہر) کا نیوکلیس (مرکزہ) کبھی بھی اس سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ نو سال بعد: پہلا سلسلہ وار ردعمل۔

بارہا انسانی دماغ ...... بشمول اعلیٰ درجے کا سائنسی دماغ ...... نے خود کو مستقبل کی انوکھی ممکنات سے بے بہرہ کرلیا اور وقتی بازیقینی حاصل کرنے کے لیے اپنے متعلقہ شعبے تک محدود کرلیا، محض اس لیے کہ تیز رفتار دھکے سے بری طرح کچل دیا جائے۔

یہ بات استدلال سے خالی نہیں کہ تمام تر سائنسی یا ٹیکنالوجی کی ترقی جس پر اب تک بحث ہوچکی ہے وہ لازمی طور پر عملی جامہ پہن لے گی۔ اس بات کا امکان اور استدلال بھی کم ہے کہ یہ تمام کام موجودہ وقت اور اس صدی کے اختتام تک مکمل ہوجائے۔ اس بات میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ کچھ لوگ ''رو بہ ولادت'' کی کیفیت میں مارے جائیں گے۔ کچھ لوگ اندھیری گزرگاہ کی نمائندگی کریں گے۔ دیگر افراد لیبارٹری میں کامیاب ہوں گے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے غیر افادی قرار دیے جائیں گے تاہم یہ سب کچھ غیر اہم ہے کیونکہ اگر ان میں سے کوئی بھی پیش رفت نہیں ہوتی تو مزید ابتر صورت حال پیدا ہوگی۔

ہم نے کمپیوٹر انقلاب پر ابھی تک بات چیت نہیں کی اور اس سے جنم لینے والی دوررس تبدیلیوں کو بھی نہیں چھیڑا جو ان کے بعد ضرور پیدا ہوتی ہیں۔ ہم نے اس دھچکے کے نتیجے میں مدار میں ہونے والے اثرات پر بھی شاذ ہی بحث کی ہے۔ ایک ایسا مہاتی کام جو نئی صدی کے شروع ہونے سے پہلے ہی ہماری زندگیوں اور رویوں میں ایسی بنیادی تبدیلیاں لاسکتا ہے جن کے بارے میں پیش گوئی کرنا بھی محال ہے۔ (کیا صورت حال پیدا ہوا اگر کوئی خلانورد یا خلائی جہاز، تیزی سے بڑھتے ہوئے اور موت سے وابستہ خرد عضو کے ساتھ زمین پر واپس آجائے؟) ہم نے اب تک لیزر (Laser) اور ہالوگراف (Holograph) سے متعلق بھی کچھ نہیں کہا، ذاتی اور ذرائع ابلاغ سے منسلک نئے اور طاقتور اوزار، جرائم اور جاسوسی کی نئی ٹیکنالوجی، ذرائع نقل وحمل اور تعمیرات کی نئی ٹیکنالوجی، کیمیائی اور حیاتیاتی جنگ کے نئے طور طریقوں سے متعلق بڑھتا ہوا خوف، شمسی

توانائی کا درخشاں عہد، ٹیسٹ ٹیوب میں زندگی کی متوقع دریافت، تعلیم کے نئے طریقے اور آلات، اور دیگر شعبوں سے متعلق لامحدود فہرست کہ جن شعبوں میں دوررس نتائج پر مشتمل تبدیلیاں ہوا چاہتی ہیں۔

آنے والی دہائیوں میں ان تمام شعبوں میں ترقی راکٹ فائر کیے جانے کے ایک سلسلے کی مانند ہوگی جو ہمیں ماضی سے باہر نکالے گی اور نئے معاشرے میں ہمارا نفوذ کر دیں گے۔ اور یہ معاشرہ کسی جامد حالت میں فوراً نہیں بیٹھ جائے گا۔ معاشرہ بھی تھرتھرائے گا، پھٹے گا اور دھاڑے گا کیونکہ اسے بھی مضبوط ترین قوت کی تبدیلی کے جھٹکے لگیں گے۔ اس فرد کے لیے جو اپنے عہد میں رہنا پسند کرے گا، مستقبل کا حصہ بننا چاہے گا جدید ترین صنعتی انقلاب تبدیلی سے باز نہیں رہنے دے گا۔ یہ اسے شناسا ماضی کی طرف لوٹنے نہیں دے گا۔ یہ اسے ناپائیداری اور جدت کے انتہائی محرک آمیزے کی طرح ہی رکھے گا۔

معاشرے کے پارچہ میں رفتار اور ندرت کا یہ قوی انجکشن ہمیں مجبور کرے گا کہ ہم نہ صرف شناسا صورت حال، واقعات اور اخلاقی الجھاؤ سے ہم آہنگی اختیار کریں بلکہ انتہائی تیز رفتاری سے ان کیفیتوں سے بھی ہم آہنگ ہوں جو ہمارے لیے قطعی طور پر ناشناسا ''پہلی بار وقوع پذیر ہونے والی کیفیتیں'' حیران کن، ناساعد اور ناقابل پیش گوئی ہیں۔

یہ صورت حال کسی بھی معاشرے میں آباد لوگوں کی روزمرہ زندگی کے ان شناسا اور ناشناسا عناصر کے درمیان موجود توازن کو بڑے واضح انداز میں تبدیل کر دے گی، معمول کے مطابق اور غیر معمولی چیزوں، قابل پیش بنی اور ناقابل پیش بنی چیزوں میں بھی واضح تبدیلی آئے گی۔ روزمرہ کی زندگی سے متعلق ان دو عناصر کے درمیان تعلق کو معاشرے کی ''شرح ندرت'' کہا جا سکتا ہے اور جوں ہی نئے پن یا ندرت کا یہ معیار بڑھتا ہے ہماری زندگی کا کم سے کم حصہ معمول کے مطابق ہم آہنگی کرنے کا روادار نظر آتا ہے۔ بیزاری اور تھکان میں اضافہ ہوتا ہے، یاسیت بھی بڑھ جاتی ہے، ہماری مہارت کی حس میں زوال آتا ہے۔ ماحول میں انتشار پھیلتا ہے اور پھر انسانی کنٹرول سے باہر چلا جاتا ہے۔

نیتجتاً دو سماجی قوتوں کا ادغام ہو جاتا ہے: ناپائیداری کی طرف گامزن سرعت و حرکت باز قوت اختیار کر لیتی ہے اور شرح ندرت میں اضافے کے ساتھ قوت کے حساب سے خطرناک ترین ہو جاتی ہے۔ اور نہ صرف جیسا کہ ہم دیکھیں گے، یہ ندرت بننے والے معاشرے کی صرف تکنیکی انتظامات میں پائی جاتی ہے، اپنے سماجی انتظامات میں بھی ہم ان سے، ناشناسا اور عجیب و غریب صورت حال کی پیش گوئی کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

دسواں باب

''تجربات'' کرنے والے

سال ۲۰۰۰ء، بحران عظیم [1] کی نسبت ہمارے زیادہ قریب ہے، تاہم دنیا بھر کے ماہرین معاشیات، اس تاریخی تباہی سے خوفزدہ، ماضی کے رویوں میں جامد دکھائی دیتے ہیں۔ ماہرین معاشیات حتیٰ کہ وہ بھی جو انقلاب کی زبان بولتے ہیں، خاص دقیانوسی مخلوق ہیں۔ اگر ایسا ممکن ہو کہ ان کے دماغوں میں موجود معیشت کے اجتماعی تاثر کا جائزہ لیا جائے، مثال کے طور پر ۲۰۲۵ء کا تو یہ تقریباً ۱۹۷۰ء جیسا ہی محسوس ہوگا۔ تقریباً ویسا ہی۔

سیدھے خطوط پر قائم رہتے ہوئے ماہرین معاشیات کو کیمونزم اور سرمایہ دارانہ نظام کا نعم البدل تلاش کرنے میں دشواری پیش آئی۔ بڑے پیمانے پر تنظیموں کی نشو و نما اور بڑھوتری میں انھیں قدامت پر مبنی افسر شاہی کی وسعت کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ ٹیکنالوجی کی ترقی کی سادہ اور معلوم چیز کی غیر انقلابی وسعت سمجھتے ہیں۔ تنگ دستی میں جنم لینے والے، محدود وسائل میں سوچ بچار کے عادی یہ لوگ بمشکل ہی کسی ایسے معاشرے کا تصور کر سکتے ہیں جس میں بنیادی مادی ضروریات پوری ہو جائیں۔ ان لوگوں کے عدم تصور کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب یہ لوگ ٹیکنالوجی کی ترقی کے بارے میں سوچتے ہیں تو ان کا مرکز و محور معاشی سرگرمی اور ان کے ذرائع ہی ہوتے ہیں تاہم جدید ترین صنعتی انقلاب ان کے مقاصد کو چیلنج بھی کرتا ہے۔ یہ ان کی پیداوار کی صرف ''کیسے'' کو تبدیل کرنے کے خدشے کا اظہار نہیں کرتی بلکہ ''کیوں'' کو بھی زیر بحث لاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ اس بات سے معاشرتی سرگرمی کے مقاصد میں سراسر تبدیلی آنے کا امکان ہے۔

اس طرح کی اکھاڑ پچھاڑ سے قبل آج کی معاشیات کے جدید ترین آلات و وسائل بھی بے بس نظر آتے تھے۔ درآمد اور پیداوار کے جدول، معاشی نمونے...... تجزیوں کے تمام تر لوازمات جو ماہرین معاشیات لاگو کرتے ہیں وہ بیرونی قوتوں کی گرفت میں نہیں آتے...... سیاسی، سماجی، سماجی اور اخلاقی قوتیں...... جو ہمارے سامنے چند دہائیوں ہی میں معاشی زندگی کو یکسر تبدیل کر دیں گی۔ ایک ایسا معاشرہ جو نفسیاتی تکمیل پر

---

(۱) ۱۹۳۰ء کا بحران عظیم۔

زیادہ زور دیتا ہے اس میں ''پیداوار'' یا ''کارکردگی'' کا کیا معنی و مفہوم ہوں گے؟ اس معیشت کا کیا بنے گا جب ،جیسا کہ دیکھنے میں آیا ہے، جائیداد کا مکمل تصور بے معنویت تک محدود ہو جائے؟ معیشتیں کس طرح متاثر ہوں گی جب قومی سطح سے بالا پلاننگ، ٹیکس کے نظام اور نگران ایجنسیاں اپنے عروج پر ہوں یا معیشت، ایسی ''گھریلو صنعت'' کی طرف لوٹ جائے جس کی بنیاد جدید ترین سائبرنیٹک ٹیکنالوجی پر ہو؟ اور پھر سب سے اہم بات، کیا ہو جب، ایک معاشی مقصد کے طور پر ''پیداوار'' کی جگہ ''عدم پیداوار'' لے لے اور جب GNP کی حیثیت کو مقدس قرار دیا جانا بند کر دیا جائے؟

صرف دقیانوسی معاشی سوچ سے باہر نکل کر ہی اور ان امکانات کا تجزیہ کرنے کے بعد ہی ہم آنے والے کل کے لیے تیاری کر سکتے ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی وہ مرکزی حیثیت حاصل نہیں جتنی اقدار کی تبدیلی کو حاصل ہے جسے، ممکنہ حد تک، جدید ترین صنعتی انقلاب کے ساتھ رہنا ہے۔

کم یابی کے حالات کی موجودگی میں انسان یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی فوری مادی ضروریات کو پورا کرے۔ آج فراوانی کے ان حالات میں ہم معیشت کی ترتیب نو کر رہے ہیں تا کہ وہ انسانی ضروریات کے نئے معیار سے نبرد آزما ہو سکے۔ مادی تسکین فراہم کرنے والے ایک نظام سے اب ہم بڑی تیزی سے ایسی معیشت کی آبیاری کی طرف جا رہے ہیں جو نفسی تسکین کے لیے ترتیب دیا گیا ہو۔ ''نفسیات آرائی'' کے اس عمل کو جو جدید ترین صنعتی انقلاب کا مرکزی نظریہ ہے، ماہرین معاشیات نے یکسر نظرانداز کر دیا ہے۔ تاہم یہ ایک انوکھی، حیرانی سے بھرپور معیشت کی صورت میں منتج ہو گی جس کا کسی بھی شخص کو تجربہ نہیں ہو گا۔ اس سے پیدا شدہ معاملات بیسویں صدی کے عظیم تضاد میں کمی واقع کر دیں گے، سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان تضاد نسبتاً کم اہلیت اختیار کر جائے گا۔ کیونکہ یہ معاملات معاشی یا سیاسی اصولوں سے دور رہ جائیں گے۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے یہ معاملات دانش، انسانی اعضا کی اس صلاحیت تک محدود ہوں گے جو فریب کی حقیقت سے ممتاز کرتے ہیں۔

نفسی کیک مکس

اس دریافت سے بہت سا جوش وابستہ ہے کہ جب کہ ٹیکنالوجی سے بھرپور معاشرہ صنعتی ترقی کی ایک خاص منزل تک پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنی توانائیاں خدمتوں کی پیداوار میں لگا دیتا ہے جو کہ اشیا کی پیداوار سے یکسر مختلف ہے۔ بہت سے ماہرین ''خدمات'' میں مستقبل کی لہر دیکھتے ہیں۔ وہ لوگ یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ

چیزوں کی تیاری جلد ہی خدمات کی فراہمی کے آنے سے فرسودہ ہو جائے گی، خاص طور پر صنعتی اقوام میں...... یہ پیش گوئی حالیہ صورت حال میں درست ثابت ہوتی نظر آ رہی ہے۔

تاہم ماہرین معاشیات نے یہ کیا ہے کہ ایک گنجلک سوال پوچھا ہے۔ معیشت کیا رخ اختیار کرے گی؟ خدمات کی فراہمی کے بعد کیا کچھ ہو گا؟

جدید ٹیکنالوجی کی حامل اقوام کو آنے والے سالوں میں اپنے وسائل اپنے ماحول کی بحالی اور ''معیار زندگی'' کو بہتر بنانے میں صرف کرنے چاہئیں۔ آلودگی کے خلاف جنگ، جمالیاتی فرسودگی، ہجوم، شور اور گردان کی بہت سی توانائیوں کو سلب کر لے گا۔ لیکن ان عوامی مال و اسباب کے ساتھ ساتھ ہم نجی استعمال کے لیے پیداوار کے معیار میں معمولی اور باریک تبدیلی لا سکتے ہیں۔

خدمات کے شعبے کی تیزی سے افزائش سے پیدا ہونے والے جوش نے پیشہ ورانہ توجہ دوسری طرف منتقل کر دی ہے جو مستقبل میں مال (کی تیاری) اور خدمات دونوں پر اثر انداز ہو گی۔ یہی تبدیلی معیشت کی اگلی ترقی پر مبنی مہم کی طرف لے جائے گی، ایک ایسے عجیب شعبے کی افزائش جس کی بنیاد ''صنعت کا تجربہ'' کہلا سکتا ہے۔ کیونکہ خدمات کی فراہمی کے بعد کے مرحلے کی کنجی تمام تر پیداوار کی نفسیات آرائی میں ہے جس کی ابتدا (مال کی) تیاری سے ہوتی ہے۔

آج کے عہد میں ٹیکنالوجی سے بھرپور معاشروں میں اور بالخصوص امریکا میں، ایک عجیب سی حقیقت یہ ہے کہ مال کی پیداوار، صارف کے نفسیاتی پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھ کر بنائی جاتی ہے۔ تیار کنندہ اپنی بنیادی پیداوار میں ''نفسی وزن'' بھی ڈال دیتے ہیں اور صارف بخوشی اس غیر لمسی فائدے کے لیے اضافی قیمت ادا کرنے پر رضامند ہو جاتا ہے۔

اس کی ایک شاندار مثال گھریلو استعمال کی اشیا یا خودکار مشینری تیار کرنے والے ہیں جو بٹن، گولے یا ڈائل ہیں جو کسی چیز یا ڈیش بورڈ پکڑنے کے کام آتے ہیں، اگرچہ ان کی بظاہر کوئی حیثیت نظر نہیں آتی۔ تیار کنندہ اس بات کو جان گیا ہے کہ کل پرزوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، وہ بھی ایک خاص حد تک، مشین چلانے والے کو ایک پیچیدہ اوزار کنٹرول کرنے کے لیے ایک زائد مہارت کا احساس دلاتی ہے۔ یہ نفسیاتی تسکین پیداوار کے ڈیزائن میں شامل کر دی جاتی ہے۔

اس کے برعکس، صارف کو دستیاب نفسی مفاد کو برقرار رکھنے کے لیے تردد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایک بڑی

امریکی غذائی پیداوار کی کمپنی نے بہت فخر کے ساتھ، محنت سے چھٹکارے کے لیے، صرف پانی کی آمیزش سے تیار ہونے والا کیک مکس (Cake Mix) متعارف کرایا۔ اس کمپنی کو حیرت اس وقت ہوئی جب خواتین نے اس چیز کو رد کر دیا۔ صرف اس وجہ سے کہ انھیں اس مکسچر میں پانی کے ساتھ ساتھ انڈہ بھی ملانا پڑتا تھا۔ فیکٹری نے اس میں انڈے کا پاؤڈر شامل کر کے گھریلو خواتین کے کام کو سادہ ترین کر دیا اور اسے کیک بنانے کے مرحلے میں ''احساس تخلیق'' کی شرکت سے بھی محروم رکھا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد فیکٹری نے انڈے کے پاؤڈر کی آمیزش کا سلسلہ ختم کر دیا اور خواتین بخوشی، اپنے گھر میں، انڈے اس مکسچر میں شامل کرنے لگیں۔ ایک مرتبہ پھر اس پیداوار کو نفسی مفاد فراہم کرنے کے لیے تبدیل کر دیا گیا۔

اس طرح کی مثالیں تقریباً ہر بڑی صنعت میں پائی جاتی ہیں صابن سے سگریٹ تک اور برتن دھونے کے پاؤڈر سے ڈائٹ (شوگر فری) کولا تک۔ ڈاکٹر ایمانوئیل ڈیمبی (Emanuel Demby) جو "Motivational Programmers incorporated" کے پریذیڈنٹ ہیں، یہ ایک تحقیقی کمپنی ہے جو امریکا اور یورپ میں کام کر رہی ہے اور اسے جنرل الیکٹرک (GE)، کالٹیکس Caltex اور آئی بی ایم (IMB) جیسی بڑی کمپنیوں نے متعارف کروایا ہے، کہتے ہیں ''مال کی تیاری میں نفسیاتی عوامل کی انجینئرنگ مستقبل کی پیداوار کا ایک معیاری نشان ہوگا۔ نہ صرف صارفین کے استعمال میں آنے والی اشیا میں بلکہ صنعتی سامان میں بھی۔

''آج کے دور میں تیار ہونے والی کرینیں اور بھاری مشینیں بھی اس اصول کی پاسداری کرتی ہیں۔ ان میں ڈرائیور کے بیٹھنے کی نشست گاہ بہت آرام دہ اور خوبصورت ہوتی ہیں جیسے اکیسویں صدی کے لیے تیار کی گئی کوئی چیز۔ یہ کام کیٹر پلر (Caterpillar) انٹرنیشنل ہارویسٹر (International Harvester) اور فرگوسن (Forguson) تمام کمپنیاں کرتی ہیں، کیوں؟ یہ بڑی دیوہیکل مشینیں بہتر کھدائی یا بہتر کارکردگی کا مظاہرہ اس لیے نہیں کرتیں کہ ان کی نشست گاہیں جمالیاتی طور پر بہتر بنائی گئی ہیں بلکہ یہ کام اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ ٹھیکہ دار انھیں خریدتا ہے وہ اس چیز کو پسند کرتا ہے جو افراد ان پر کام کرتے ہیں وہ بھی انھیں پسند کرتے ہیں۔ ٹھیکہ دار سے خریدنے والے بھی اس چیز کو پسند کرتے ہیں حتیٰ کہ مٹی اٹھا کر لے جانے والے آلات کی تیاری کے لیے بھی ان غیر افادی امور پر توجہ دی جانے لگی ہے۔ یعنی نفسیاتی پہلو۔''

مسٹر ڈیمبی (Demby) اس بات پر مزید زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیار کنندگان اپنی توجہ ان

الجھنوں کو دور کرنے پر مرکوز کر رہے ہیں جو بہت سی اشیا کے استعمال سے وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر نیپکنز (Napkins) تیار کرنے والے جانتے ہیں کہ خواتین کو یہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ جب وہ اسے پھینکیں گی تو ان کا فلش (سسٹم) بند ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ بتاتے ہیں، ''ایک نئی تیار کردہ چیز متعارف کرائی گئی ہے جو فوری طور پر پانی میں گھل جاتی ہے۔ اگرچہ یہ اپنا بنیادی کام بہتر انداز میں نہیں کرتی تاہم یہ اپنے ساتھ منسوب کچھ پریشانی دور کر دیتی ہے، اگر اس بات پر غور کیا جائے تو یہ نفسیاتی انجینئرنگ ہے''۔

متمول قسم کے صارفین اس بات کے متمنی بھی ہیں اور اس قابل بھی ہیں کہ اس طرح کی بہترین چیزوں کی قیمت ادا کر سکیں۔ جوں جوں تلف پذیر چیزوں کی تعداد اور شرح میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، لوگ بڑی تیزی سے قیمت کے معاملے سے بے بہرہ ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ان کا تمام انحصار ''معیار'' پر ہے۔ بہت سی اشیا کے معاملے میں معیار کا پیمانہ اب بھی اس کی کارکردگی، اس کا دیرپا ہونا اور اس کے اجزا کے روایتی پیمانوں تک محدود ہے۔ لیکن پیداوار کی ان اقسام کے لیے اس طرح کی تفریق کو عملی طور پر جانچنا محال ہے۔ ایک صارف کے لیے برانڈ ''اے'' کی چیزوں کو برانڈ ''بی'' سے ممتاز کرنا مشکل ہے۔ تاوقتیکہ وہ کمپنی بڑے زور و شور کے ساتھ یہ اعلان کرے کہ کوئی ایک چیز دوسری سے بہتر ہے۔

یہ تناقضہ اس وقت اپنی حیثیت کھو دیتا ہے جب پیداوار کا نفسی پہلو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ اگرچہ یہ دیگر معاملات میں مماثل ہوں لیکن ایک پیداوار کا دوسری پیداوار سے نفسیاتی فرق موجود ہوتا ہے۔ اشتہار کنندگان اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر پیداوار کو ایک واضح اور علیحدہ تخیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ یہ تخیل عملی ہوتا ہے: وہ صارف کے حوالے سے کسی نہ کسی ضرورت کو پورا کر رہا ہوتا ہے۔ تاہم ضرورت نفسیاتی ہے بجائے اس کے افادی ہونے کے۔ لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''معیار'' جیسی اصطلاح کا حوالہ ماحولی مزاج ہے، اس سے منسوب معیار...... اس کے اثرات اور اس پیداوار کی نفسیاتی تعبیریں۔

جوں جوں صارف کی بنیادی مادی ضروریات پوری کر دی جاتی ہیں تو بھرپور طریقے سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس صارف کی ذاتی نوعیت کی ضروریات کی چیزوں جیسے خوبصورتی، اثر و نفوذ، انفرادیت اور حسیاتی لطف وغیرہ کا بھی خیال رکھا جائے۔ پیداواری شعبہ نفسیاتی امتیاز اور تسکین کی شعوری تکمیل کے لیے تمام تر وسائل کا استعمال کرے گا۔ اشیا کی پیداوار میں نفسی عنصر بڑی تیزی سے اہمیت اختیار کر جائے گا۔

فضا میں ''خدمت گزار باندیاں''

یہ معیشت کی نفسیات آرائی کی طرف پہلا قدم ہے۔ اگلہ مرحلہ خدمات کے نفسی عنصر کی وسعت ہے۔
یہاں پر ہم پھر سے ایک قابل پیش گوئی سمت میں رواں دواں ہیں جیسا کہ ہوائی سفر کا معاملہ ہے۔
ایک دور تھا جب (جہاز پر) پرواز کرنا صرف ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے کا مقصد لیے ہوئے تھا۔
تھوڑا ہی عرصہ ہوا جب ہوائی کمپنیوں نے خوبصورت ایئر ہوسٹسز، کھانے پینے کی چیزوں، آرام دہ ماحول اور طیارے کے اندر فلموں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ (Trans World Airlines (TWA نے حال ہی میں اس مرحلے کو ایک قدم مزید بڑھا دیا اور اس نے امریکا کے بڑے شہروں کے درمیان ایک نئی آفر کی جسے ''بیرونی ماحول'' کہا جا سکتا ہے۔

TWA کے مسافروں کو اب یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق ایک جیٹ طیارے کا انتخاب کر سکیں جس پر کھانے پینے کی اشیا، موسیقی، جریدے اور فلمیں حتیٰ کہ ایئر ہوسٹس کی سکرٹ بھی فرانسیسی طرز کی ہوگی۔ مسافروں کو یہ سہولت بھی دی گئی ہے کہ وہ ''اطالوی'' (Roman) پرواز پسند کریں جس میں میزبان خواتین روایتی "Togas" میں ملبوس ہوں گی۔ مسافر اپنی پسند کے مطابق "Manhattam Penthouse" پرواز کا انتخاب بھی کرتا ہے یا وہ ''روایتی انگریزی'' پرواز میں بھی سفر کر سکتا ہے جس میں ایئر ہوسٹس "Serving Wenches" یا ''خدمت گزار باندیاں'' کہلاتی ہیں اور طیارے کے منقش پردے ایسے ہیں جیسے کسی برطانوی شراب خانے کے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ TWA، فضائی نقل و حمل کے حوالے سے بڑے پیمانے پر ٹکٹوں کی فروخت نہیں کر رہی لیکن وہ مسافروں کو ایک ''نفسیاتی پیکیج'' فراہم کر رہی ہے۔ ہم فضائی کمپنیوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کچھ ہی عرصے بعد طیارے کے اندر لائٹوں اور ملٹی میڈیا کا ایسا انتظام کریں گے جس سے مکمل طور پر لیکن عارضی ایسا ماحول بن سکے جو مسافروں کو ایک تھیٹر کا احساس دے۔
دراصل یہ تجربہ، جلد ہی، تھیٹر سے بھی بالا ہو سکتا ہے۔ برطانیہ سے تعلق رکھنے والی "British Overseas Airways Corporation" نے حال ہی میں مستقبل کی سمت ایک قدم بڑھایا جب اس کمپنی نے کنوارے امریکی مسافروں کو ''سائنسی طریقے سے منتخب شدہ'' انجانی لڑکی کے ساتھ لندن میں ملاقات کا اہتمام کیا۔ اگر کسی وجہ سے کمپیوٹر کے ذریعے چیدہ ملاقات نہ ہو سکے تو متبادل ملاقات کا اہتمام کیا جاتا

ہے۔ مزید یہ کہ ایک پارٹی کا اہتمام کیا جائے گا جس میں دونوں جنسوں سے تعلق رکھنے والے، مختلف عمر کے افراد کو مدعو کیا جائے گا تاکہ وہ مسافر جسے مختلف کلبوں اور ریستورانوں کا دورہ بھی کروایا جائے گا، کسی طرح بھی تنہائی کا شکار نہ ہو۔ یہ پروگرام جس کا نام ''لندن کی خوبصورت کنواری لڑکیاں'' تھا اس وقت بند کیا گیا جب اس سرکاری ہوائی کمپنی کو برطانوی پارلیمان کی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ باوجود اس کے ہم صارفین کی خدمت کے لیے مختص شعبوں میں بہت سے رنگارنگ پروگراموں کے ذریعے نفسیاتی چاشنی کی پیش گوئی کر سکتے ہیں اور وہ بھی خردہ فروشی سے منسلک شعبوں میں۔
کوئی بھی شخص جو نیوپورٹ بیچ، کیلی فورنیا میں جدید ترین اور عالیشان شاپنگ سنٹر، نیوپورٹ سنٹر (Newport Centre) میں گھوم کر آیا ہو، وہ اس سنٹر کی تعمیر میں شامل، ڈیزائن کے ان جمالیاتی اور نفسیاتی پہلوؤں سے ضرور متاثر ہوا ہوگا۔ سفید رنگ کے طویل ستون اور محرابیں نیلے آسمان، فواروں، مجسموں اور بڑی احتیاط سے بنائی گئی طلاکاری، پوپ آرٹ سے مزین کھیلنے کا میدان، اور ایک بڑی، جاپانی، ونڈ بیل (Windbell) یہاں شاپنگ کرنے والوں کے لیے فرحت اور بشاشت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ یہ اس جگہ کا فرحت بخش ماحول ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کی شائستگی بھی ہے جو یہاں شاپنگ کرنے کو زندگی کا ایک شاندار تجربہ بنا دیتی ہے۔ کوئی بھی شخص مستقبل میں خردہ فروش سٹوروں پر بھی انہی اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، شاندار قسم کی تبدیلیوں اور تیاریوں کی امید رکھ سکتا ہے۔ ہم لوگ ''عملی'' ضرورت سے بالاتر ہو کر خدمات کو، چاہے وہ شاپنگ ہو، کھانا پینا ہو، یا صرف اور صرف بال کٹوانا، ایک ''پہلے سے تیار شدہ'' تجربے کی صورت میں لے آئیں گے۔
جب ہم بال کٹوانے جائیں گے تو ہم فلمیں دیکھیں گے یا موسیقی سے لطف اندوز ہوں گے، اور کسی بیوٹی پارلر میں خواتین کے سر پر فٹ ہونے والا میکانکی خود اس خاتون کے بال سکھانے کے علاوہ بھی کوئی کام کرے گا۔ اس خاتون کے دماغ میں الیکٹرانک لہریں بھیجنے کے عمل سے شاید یہ اس کی خیال آفرینی پر بھی اثر انداز ہو۔
بینکار اور بروکر، پراپرٹی کا کام کرنے والے اور بیمہ کمپنیاں انتہائی احتیاط سے چیدہ پردے، موسیقی، کلوز سرکٹ ٹیلی وژن، تیار شدہ ذائقے اور خوشبوئیں اور اس کے ساتھ ساتھ جدید ترین مکس میڈیا، آلات موسیقی کا سہارا لیں گی تاکہ اس نفسیاتی کیفیت کو مزید خوشگوار بنا سکیں جو عمومی سودا کاری کے دوران دیکھنے میں آتی ہے۔ صارف کو کوئی بھی ایسی اہم خدمت فراہم نہیں کروائی جائے گی تاوقتیکہ کرداری انجینئروں کی ٹیمیں

اس کی نفسی افادیت کا جائزہ نہ لے لیں۔

تجرباتی صنعتیں

موجودہ عہد کی ان سادہ سی وضاحتوں سے بالاتر رہ کر ہم ایسی بہت سی صنعتوں کی انقلابی وسعت دیکھیں گے۔ جن کی کل پیداوار نہ تو تیار شدہ مال واسباب پر ہے، نہ عام خدمات پر بلکہ ''پہلے سے تیار کردہ تجربات'' پر۔ تجربات کی یہ صنعت جدید ترین صنعت کاری کا ستون ثابت ہوگی، دراصل یہ خدمات کی فراہمی سے مابعد کی معیشت کی بنیاد ہے۔

جوں جوں بڑھتی ہوئی فراوانی اور ناپائیداری بے دردی کے ساتھ ''ملکیت'' کی دیرینہ خواہش کو ختم کرتی جا رہی ہے صارفین تجربات کو ایسے ہی جمع کرنا شروع ہو گئے ہیں جیسے وہ شعوری طور پر بڑی لگن کے ساتھ چیزوں کو جمع کرتے تھے۔ آج کے دور میں، جیسا کہ ہوائی کمپنی کی مثال ثابت کرتی ہے چند روایتی خدمات کے لوازمہ کے طور پر تجربات فروخت کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تجربہ کیک کے اوپر موجود شیریں آمیزہ ہے۔ تاہم جیسے جیسے ہم مستقبل کی طرف بڑھتے ہیں زیادہ سے زیادہ تجربات اپنی ہی خصوصیات کے بل بوتے پر فروخت ہوں گے کہ جیسے وہ ''چیزیں'' ہی ہوں۔

یہ سب کچھ مستقبل میں ہوا چاہتا ہے۔ بہت سی صنعتوں میں نظر آنے والی، اضافی شرح پیداوار کے لیے یہ چیز اہمیت کی حامل ہے، خاص طور پر وہ صنعتیں جو ہمیشہ سے، یا کم سے کم جزوی طور پر اپنی ہی بقا کے لیے، تجربات کی ''پیداوار'' میں مصروف ہیں۔ فنون اس کی بہترین مثال ہیں۔ ''ثقافتی صنعت'' کا ایک بڑا حصہ مخصوص قسم کے نفسیاتی تجربات کی تخلیق یا پیشکش میں مصروف ہے۔ آج ہمیں فن کی بنیاد پر مبنی ''تجربے کی صنعتیں'' دیکھنے کو ملتی ہیں جن کا وجود، خاص طور پر، ٹیکنالوجی سے بھرپور معاشروں میں پایا جاتا ہے۔ یہی بات مشاغل، بڑے پیمانے پر تفریحی سرگرمیوں، تعلیم اور بے شمار نفسی خدمات پر بھی صادق آتی ہے۔ یہ تمام عوامل ''تجرباتی پیداوار'' کا بھرپور جزو ہیں۔

جب کلب میڈ ٹیرینی (Club Mediterranee) نامی کمپنی چھٹیاں گزارنے کا ایسا پیکیج پیش کرتی ہے جس میں کسی فرانسیسی سیکریٹری کو دھوپ سے لطف اندوز ہونے یا جنسی سرگرمی کے لیے Tahiti یا اسرائیل لے جایا جاتا ہے تو یہ کمپنی اس سیکریٹری کے لیے اتنی ہی احتیاط اور نظم وضبط کے ساتھ ترتیب دیتی ہے جتنی Renault کمپنی کاریں بناتے وقت کرتی ہے۔ اس کے اشتہارات اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتے

ہیں لہٰذا "New York Times Magazine" میں شائع ہونے والے دو صفحات پر مشتمل مضمون کا عنوان یہ تھا: ''۳۰۰ مرد اور خواتین کو لیں، انھیں ایک بیگانے جزیرے پر لے جائیں اور انھیں ہر قسم کے سماجی دباؤ سے آزاد کر دیں۔'' فرانس سے تعلق رکھنے والی کمپنی Club Mediterranee دنیا بھر میں، چھٹیاں گزارنے کے ۳۴ مقامات میں اپنا دائرہ کار پھیلائے ہوئے ہے۔

بعینہ بگ سر (Big Sur) کیلی فورنیا میں واقع "Esalen Institute" اختتام ہفتہ پر ''جسم سے متعلق آگہی'' اور ''غیر لفظی ابلاغ'' جیسے موضوعات پر سیمیناروں کا اہتمام کرتا ہے۔ اس کی فیس ۷۰ ڈالر فی کس یا ۱۸۰ ڈالر میں پانچ ورکشاپ مقرر کی گئی ہے۔ اس سیمینار کا مقصد صرف تعلیم دینا نہیں بلکہ اپنے کھاتے پیتے صارفین کو ذاتی تجربات کا موقع فراہم کرنا بھی ہوتا ہے...... یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جس سے قارئین گھٹیا قسم کا مطلب بھی لے سکتے ہیں جیسے جنسی سرگرمی یا LSD کا نشہ۔ گروپ تھراپی اور حساسیت کی تربیتی نشستیں اس پیکیج کے تجربات کا حصہ ہیں اور کلاسوں کا سلسلہ بھی اسی طرح ترتیب دیا جاتا ہے۔ لہٰذا Arthur Murray یا Fred Astaire نامی سٹوڈیو میں جدید رقص سیکھنے کی غرض سے جانا طلبہ میں ایسے ہنر پیدا کرنے کا سبب ہوگا جو مستقبل میں اس کے لیے تفریح کا باعث ہوگا، اس کے علاوہ یہ ہنر ایک کنوارے یا کنواری کی حیثیت سے کسی بھی جگہ ایک خوشگوار تجربے سے بہرہ مند کر دے گا۔ کسی چیز کے سیکھنے کا تجربہ ایک صارف کے لیے اپنی جگہ پر باعث کشش ہے۔

تاہم یہ تمام تر چیزیں اشارہ دیتی ہیں کہ مستقبل میں تجربات سے بھرپور صنعت اور نفسیاتی کارپوریشنیں یا تنظیمیں ہی بالادست رہیں گی۔

تیار کردہ ماحولیات

تجربات سے منسوب پیداوار کا ایک اہم درجہ ایسے مصنوعی ماحول پر مشتمل ہے جو صارف کو مہم جوئی، خطرے، جنسی گدگدی یا کسی دیگر لطف کا مزہ دیں لیکن اس کی حقیقی زندگی یا شہرت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ لہٰذا کمپیوٹر ماہرین، روبوٹ بنانے والے ڈیزائن بنانے والے، تاریخ دان اور عجائب گھروں کے ماہرین جمع ہو کر، جدید ترین ٹیکنالوجی سے دستیاب سہولیات کی حدود وقیود میں رہ، ایسے تجرباتی محصورے بنالیں گے جو قدیم روم کے جاہ وجلال، ملکۂ برطانیہ کے دربار کی حشمت اور اٹھارھویں صدی کی جاپانی رقاصاؤں کے ''گیشا گھروں'' کی جنسیت اور اسی طرح کی چیزوں کی باز تخلیق کریں گے۔ ان تفریحی محصوروں میں داخل ہونے

والے صارفین اپنے روزمرہ کے کپڑے (اور اشیا ضروریات) وہیں پر ہی چھوڑ دیں گے اور قدیم روایتی لباس زیب تن کریں گے اور ایک نظم و ترتیب سے مرصع سرگرمیوں سے گزریں گے جو انھیں اس خاص لطف سے آشنا کریں گے جو اصل صورت حال میں ہوتا ہے۔ یعنی غیر مصنوعی..... حقیقت کو اسی طرح محسوس ہونا چاہیے۔ ان لوگوں کو دعوت دی جائے گی کہ وہ ماضی میں رہیں یا شاید مستقبل میں۔

اس طرح کے تجربات کی پیشکش انسان کی سوچ سے قریب تر ہے۔ یہ بات واضح انداز میں مصوری میں موجود شراکتی تکنیک میں پہلے ہی پیش کردی گئی ہے لہٰذا وہ ''وقوعہ'' جس میں حاضرین یا ان کے کچھ ارکان حصہ لیں مستقبل کی ان تشکیلات کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہی بات باقاعدہ اور معمول کے کاموں پر بھی صادق آتی ہے۔ جب نیویارک میں "Dionysus in69" نامی ڈرامہ سٹیج کیا گیا تو ایک تنقید نگار نے اس ڈرامے نگار "Richard Schechner" کے نظریات پر ان الفاظ میں تنقید کی، ''تھیٹر نے سامعین کو روایتی انداز میں کہا، ''بیٹھ جاؤ میں تمھیں کہانی سناتا ہوں، اس نے ایسا کیوں نہیں کہا' کھڑے ہو جاؤ اور ہم کھیل شروع کرتے ہیں؟'' Schechner کا کام، ذرا کمزور اندازوں میں Euripides پر انحصار کرتا ہے، جبکہ سامعین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ Dionysus کی رسوم میں شریک ہو کر رقص کریں۔

مصوروں نے بھی اب کامل ''ماحول'' تخلیق کرنا شروع کردیا ہے۔ مصوری کا ایسا انداز جس میں سامعین واقعی چلتے پھرتے ہیں اور اس میں چیزیں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ سویڈن میں Moderna Museet نامی ادارے نے ایک نمائش کا انعقاد کیا جس میں ایک پیپر ماشی[1] (Paper Mache) خاتون "Hon" بنائی گئی، اس تصور میں بنائے گئے ایک مخصوص راستے (سوراخ) سے سامعین اندر داخل ہوتے تھے۔ اگر اس کے اندر چلے جائیں تو وہاں پر ڈھلانیں، سیڑھیاں، چمک دار روشنیاں، عجیب و غریب آوازیں اور ''بوتل توڑنے جیسی مشینیں'' وغیرہ۔ امریکا اور یورپ میں درجنوں ایسے عجائب گھر اور گیلریاں ہیں جو اس قسم کے ماحول کی عکاسی کرتی ہیں۔ Time magazine میں مصوری کے ناقد کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا مقصد دیکھنے والے پر ''خبطی منظروں، مافوق الفطرت آوازوں اور دیگر دنیاوی احساسات، جس میں بے وزن ہونے کا احساس سے اچھلنے کودنے اور نفسیاتی واہموں، حملہ آور ہونا وغیرہ۔ وہ مصور اور فنکار جو انھیں تخلیق کرتے ہیں حقیقتاً ''تجرباتی انجینئر'' ہیں۔

(۱) مختلف اقسام کے کاغذوں سے بنایا گیا مواد جسے ڈھال کر مختلف چیزیں بناتے ہیں۔

لوئر مین ہیٹن (Lower Manhattan) میں فیکٹریوں اور سٹوروں سے بھری ہوئی ایک سڑک پر بظاہر خستہ حال نظر آنے والی ایک عمارت میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا یہ حصہ ''شراکتی الیکٹرانک سٹوڈیو'' تھا جہاں فی گھنٹہ کے حساب سے، مہمانوں کو سفید رنگ کے چمکدار، اونچی چھت والے کمرے میں داخل کیا جاتا ہے، جہاں پہنچ کر وہ اپنے روایتی کپڑے اتار کر، نیم شفاف چوغے پہن لیتے ہیں اور بڑے آرام دہ، سفید رنگ کے چبوتروں پر پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتے ہیں۔ خوبصورت مرد و خواتین ''گائیڈ'' جو نیم شفاف چوغوں میں ملبوس ہوتے ہیں، ہر مہمان کو ایک سٹیریوفونک ہیڈ سیٹ، نقاب میں سے دیکھا جانے والا آلہ اور وقت کے ساتھ ساتھ، غبارے، عکس بین، آلات موسیقی، پلاسٹک کے تکیے، آئینے، کرسٹل، مٹھائیاں، فلمی سلائیڈ (Slide) اور پروجیکٹر۔ لوک اور راک (Rock) موسیقی، جس میں ٹی وی کے اشتہارات، سڑکوں کا شور اور مارشل میکلوہن (Marshall Mcluhan) کا یا ان سے متعلق کوئی لیکچر کانوں میں گونجتا ہے۔ جوں جوں موسیقی کی آواز بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مہمان اور گائیڈ چبوترے پر اور ان چبوتروں کو ملانے والے راستوں پر رقص کرنا شروع کردیتے ہیں۔ اس کمرے کی چھت سے مشینوں کے ذریعے بلبلوں کی بارش ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ میزبان خواتین فضا میں مختلف قسم کی خوشبوئیں بکھیرنا شروع کردیتی ہیں۔ روشنیاں رنگ بدلتی ہیں اور مہمان گائیڈ اور دیواروں پر مختلف عکس دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ماحول سرد سے گرم، دوستانہ اور پھر نیم شہوانی ہو جاتا ہے۔

فنکارانہ اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے تفریحی ہال ابھی ابتدائی مراحل میں ہے لیکن آنے والے وقت میں ۲۵۰۰۰۰۰ ڈالر کی لاگت سے بننے والا ماحولیاتی تفریحی کمپلیکس ہے اور اس کے بنانے والے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس کی تعمیر کی باتیں کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا فنکارانہ معیار جیسا بھی ہو لیکن اس نقطے جیسے تجربات مستقبل میں جدید ترین محصورہ نما عمارتوں کی تعمیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ آج کے نوجوان مصور، فنکار اور ماحولیات میں سرمایہ کاری کرنے والے، آنے والے وقت میں نفسی۔ گروہ بنانے سے متعلق تحقیق اور تجربے کرنے میں مصروف ہیں۔

جیتا جاگتا ماحول

اس تحقیق سے حاصل ہونے والا علم شاندار قسم کی مصنوعی تشکیلات کی تعمیر کے اسباب پیدا کرے گا۔ لیکن یہ پیچیدہ قسم کے جیتے جاگتے ماحول کی طرف بھی لے جائے گا۔ جن کا مقصد صارف کو انتہائی اہمیت کے

حامل خطرات اور انعامات کی طرف لے جاتا ہے۔ آج کے دور میں ''افریقی سفاری'' اس کی ایک پھیکی مثال ہے۔ مثال کے طور پر مستقبل میں تجربات ترتیب دینے والے ایسے جوا خانے بنائیں گے۔ جس میں صارفین پیسوں کے لیے نہیں بلکہ تجرباتی طور پر اخراجات کرنے کے لیے آیا کریں گے۔ مثلاً اگر وہ جیت جاتا ہے تو ایک خوبرو اور راضی برضا لڑکی کے ساتھ ملاقات اور اگر وہ ہار جاتا ہے تو ایک دن کی قید تنہائی۔ جیسے جیسے شرط پر لگائی گئی رقم میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اس کے بدلے میں ''ادائیگیوں'' اور سزاؤں میں تبدیلی آتی چلی جائے گی۔

کسی ہارنے والے کو (پہلے سے طے شدہ معاہدے کے تحت) جیتنے والے کے گھر کئی روز تک ملازم کی حیثیت سے کام کرنا پڑ سکتا ہے۔ جیتنے والے کو یہ سہولت فراہم کی جاسکتی ہے کہ دس منٹ تک، بلا معاوضہ اس کے دماغ کی مکمل چھان بین کی جاسکتی ہے۔ کسی کھلاڑی کو یہ خطرہ بھی ہوسکتا ہے کہ (ہارنے کے بعد) اسے جسمانی سزا (کوڑے مارنا، مارنا پیٹنا) بھی دی جاسکتی ہے یا اسی کے مساوی ذہنی اذیت دی جاسکتی ہے۔ ایک دن کی طوالت پر مشتمل کسی ایسے کام کی شرکت جس میں جیتنے والوں کو اس بات کی مہلت دی جائے گی کہ وہ اپنے جارحانہ عزائم اور نفرتوں کا اظہار کرسکیں اور وہ بھی ہارنے والے پر چیختے اور چلانے سے، گھورنے یا چہرے کے تاثرات سے، غلیظ زبان استعمال کر کے یا ہارنے والے کی عزت نفس پر حملہ کر کے۔

بڑی رقم لگانے والے اگر اس بات کی ضرورت محسوس کریں گے تو وہ کسی آنے والی تاریخ کے لیے بلا معاوضہ، دل یا پھیپھڑے کی پیوندکاری کی شرط جیت سکتے ہیں۔ ہارنے والے کو اپنے ایک گردے سے ہاتھ دھونے ہوں گے۔ اس طرح کے انعامات اور سزائیں شدت اور اہتمام کے ساتھ لاگو کی جائیں گی۔ تجرباتی ڈیزائنرز Kraft-Ebing یا Marquis de sade کے صفحات سے تخیلات حاصل کریں گے۔ صرف تخیلات، ٹیکنالوجی کی صلاحیت اور، عمومی طور پر لچک دار، اخلاقی حدود و قیود ان ممکنات کو کم کرسکتی ہیں۔ جوا خانوں کے تجرباتی شہر لاس ویگاس یا ڈیوول (Deauville) کی چکا چوند کو مات کردیں گے اور وہ مشترکہ طور پر کسی خاص جگہ پر بھی کام جاری رکھ سکتے ہیں اور ڈزنی لینڈ (Disneyland)، The World's Fair کیپ کینیڈی The Mayo Clinic اور مکاؤ (Macao) کے ہونکی۔ ٹونکس (Honky-tonks) کی سی شہرت حاصل کرسکتے ہیں۔ (۱)

(۱) تجرباتی جوا اور اس کے فلسفیانہ اطلاق کے بارے میں بہترین اور تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لیے ارجنٹینا کے فلسفی لکھاری Torge Luis Borges کی کتاب "The Lottery in Babylon" کا مطالعہ کریں۔ ان کا یہ مختصر کام ان کے نثری مجموعے "Labyrinths" میں مل سکتا ہے۔

ایک مرتبہ پھر موجودہ عہد میں ہونے والی پیش رفت مستقبل کی عکاسی کرتی ہیں۔ لہٰذا بہت سے امریکی ٹیلی وژن پروگرام جیسے "The Dating Game" اپنے جیتنے والوں کو تجرباتی انعامات سے نوازتے ہیں۔ اس مقابلے کے بارے میں سویڈن کی پارلیمان میں بحث بھی ہوچکی ہے۔ اس مقابلے میں ایک فحش نگار جریدے نے اپنے ایک قاری کو Majorca میں اپنی ایک سرکردہ ماڈل کے ساتھ، ایک ہفتے کے تفریحی دورے پر بھیجا۔ برطانوی پارلیمان میں کنزرویٹیو پارٹی سے تعلق رکھنے والے ایک رکن نے اسے چیلنج کردیا، تاہم جب وزیر خزانہ Gunnar Strang نے وضاحت کی کہ یہ معاملہ ٹیکس ادائیگی کے زمرے میں آتا ہے تو اس پارلیمانی رکن کی تشفی ہوئی۔

نقلی یا ''غیر نقلی'' تجربات بھی اس طریقے سے جڑ جائیں گے کہ وہ حقیقت پر انسان کی گرفت کو چیلنج کردیں گے۔ Ray Bradbury کے ایک شگفتہ ناول "Fahrenheit 451" میں دیہات سے تعلق رکھنے والے جوڑے، بڑی جدوجہد سے، پیسے بچاتے ہیں تاکہ وہ اس قابل ہوجائیں کہ وہ three-wall یا four wall ویڈیو سیٹ خرید سکیں جس سے وہ ٹیلی نشر کیے جانے والے نفسی ڈرامے کی تیاری کرسکیں۔ وہ کئی ہفتوں یا مہینوں جاری رہنے والے تھیٹروں میں شریک کردار ادا کرنے لگتے ہیں۔ ان کہانیوں میں ان کی شرکت انتہائی گہری ہے۔ دراصل ہم اس قسم کی متعامل فلموں کی حقیقی ترقی کی طرف چلنا شروع ہوگئے ہیں اور یہ سارا عمل ذرائع ابلاغ کی جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے ہورہا ہے۔ نقلی اور ''اصلی'' کے ادغام سے اس طرح کی تجرباتی پیداوار کی شرح اور تنوع میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔

لیکن آنے والے کل کے نفسی۔ گروہ کسی فرد کو صرف تجربات ہی فروخت نہیں کریں گے۔ وہ تجربات کا ایک سلسلہ ہوگا اور اتنا منظم ہوگا کہ ایک دوسرے کے ساتھ ان کی قربت ان لوگوں میں زندگی کا رنگ، ہم آہنگی یا تقابل بھر دے گی جو اس سے محروم ہیں۔ ایک دوسرے کی ترقی اور بہتری کے لیے حسن، جوش وولولہ، خطرہ یا لطف انگیز حساسیت کی فراہمی کا اہتمام کیا جائے گا۔ اس طرح کے تجرباتی سلسلوں اور تسلسل کو متعارف کروانے سے نفسی گروہ (جو دماغی صحت کے طبقاتی مراکز کے ساتھ مل کر کام کررہے ہوں) ان لوگوں کو جزوی ڈھانچے فراہم کریں گے جن کی زندگیاں انتشار سے بھرپور ہیں یا منظم نہیں۔ اس کے جواب میں وہ کہیں گے: ''آئیں اپنی زندگی (کا ایک حصہ) اپنے لیے ہی ترتیب دیتے ہیں۔'' آنے والے کل کی اس ناپائیدار اور تیزی سے تبدیل ہوتی دنیا میں یہ تناسب بہت سے متمنی افراد کو اس طرف کھینچ لائے گا۔

مستقبل میں پیش کیے جانے والے تیار شدہ تجربات اوسط صارف کے تصور سے بالا ہو جائیں گے اور ماحول کو ندرت کی انتہا تک پہنچا دیں گے۔ کمپنیاں ایک دوسرے سے سبقت کی کوشش کریں گی تاکہ غیر معمولی اور لوگوں کو خاص تمناؤں کے مطابق تجربات پیش کیے جائیں۔ ان میں سے کچھ تجربات یقینی طور پر جیسا کہ سویڈن کی نامور ماڈلوں والا معاملہ...... وسیع تر معاشرتی قبولیت کی حدود سے بھی تجاوز کر جائیں گے۔ عوام کو ان سہولتوں کی پیش کش کے لیے خفیہ قسم کے، غیر قانونی، نفسی گروہ کی خدمات حاصل کرنا ہوں گی۔ اس بات سے تجربے میں ''غیر قانونی'' ہم جوئی میں اضافہ ہو جائے گا۔ (ایک قدیم تجرباتی صنعت نے، روایتی طور پر خفیہ طریقے سے جسم فروشی کا کام شروع کیا۔ تجربے کی صنعت سے بہت سی غیر قانونی سرگرمیاں بھی وابستہ ہو جاتی ہیں۔ تاہم اکثر معاملات میں یہ تمام چیزیں تخیل میں کمی اور تکنیکی وسائل میں فقدان کو ظاہر کرتی ہیں جس کا ازالہ مستقبل میں ہو جائے گا۔ تاہم یہ تمام باتیں معاشرے میں موجود ان تمام امکانات کے مقابلے میں معمولی ہیں جو ۲۰۰۰ء تک یا اس سے قبل روبوٹ، جدید ترین کمپیوٹروں، شخصیت تبدیل کر دینے والی ادویات، دماغ کو تحرک دینے والی سرگرمیوں اور اسی طرح کی تکنیکی اشیا سے مزین ہو جائیں گی)۔

عجیب و غریب تجربات کا یہ تنوع جو صارف کے سامنے آتا ہے وہ تجربات ڈیزائن کرنے والوں کا کام ہے جو معاشرے میں موجود انتہائی تخلیقی افراد کی صفوں سے چنے جائیں گے۔ اس پیشے کا مشن یہ ہوگا ''اگر آپ حقیقی معنوں میں خدمت نہیں کر سکتے، تو کوئی مناسب نعم البدل تلاش کر لیں، اگر آپ (صرف) اچھے ہیں تو صارف کو کبھی بھی فرق محسوس نہیں ہوگا!'' حقیقی اور غیر حقیقی چیزوں کے درمیان لکیر کا یہ دھندلا پن، سنگین مسائل کی صورت میں، معاشرے کے لیے رکاوٹ کا باعث ہے، لیکن یہ ''نفسی خدمات کی صنعتوں'' اور ''نفسی۔ گروہوں'' کی تشکیل میں کبھی بھی رکاوٹ کا باعث نہیں بنے گا نہ ہی ان کی تشکیل کے مرحلے کو ست کر دے گا۔ دنیا کو بہتر طریقے سے جانتے والی تنظیمیں ایسے شاندار ڈزنی لینڈ بنائیں گی جن کی اقسام، سطح، پیمانہ اور جذباتی قوت ہمارے تخیل اور تصورات سے باہر ہوگی۔

لہٰذا ہم جدید ترین صنعتی معیشت اور مستقبل کی ''خدمات'' فراہم کرنی والی معیشت کے مابعد کا کچھ تصور اپنے ذہنوں میں لا سکتے ہیں۔ زراعت اور اشیا کی تیاری معیشت کی غیر متغیر چیزیں بن جائیں گی، جن میں کم سے کم افراد کی کھپت ہوتی ہے۔ خود کار مشینوں کے سہارے سے اشیا کی پیداوار نسبتاً آسان اور سادہ ہوگی۔ نئے مال کی تیاری اور انھیں مضبوط تر، چمکیلے اور جذبات سے بھرپور نفسیاتی تضمین سے مزین کرنے سے آنے والے کل کی بہترین اور باا ثر (نئے) کاروبار شروع کرنے والوں کی اختراع پسندی چیلنج ہو جائے گا۔

آنے والے کل کا ''خدمات فراہم کرنے والا'' شعبہ بڑی وسعت اختیار کرے گا اور ایک مرتبہ پھر نفسیاتی انعامات کارپوریٹ وقت، توانائی اور سرمایے کی بڑھتی ہوئی شرح کی حیثیت سے اپنا مقام بنالیں گے۔ سرمایہ کارانہ خدمات جیسے مشترکہ فنڈ تجرباتی جوئے کے عناصر متعارف کروا سکتے ہیں تاکہ اضافی تفریح کے ساتھ ساتھ اپنے شراکت داروں کو ادائیگیاں کی جا سکیں۔ بیمہ کمپنیاں نہ صرف اموات کی صورت میں ادائیگیاں کریں گی بلکہ کسی رنڈوے یا بیوہ کو شریک حیات سے محروم ہونے کے بعد ان کی دیکھ بھال کا انتظام بھی کر سکتے ہیں انھیں زبیں مہیا کر سکتی ہیں، نفسیاتی مشاورت کر سکتی ہیں اور دیگر حوالوں سے بھی معاونت کر سکتی ہیں۔ اپنے صارفین کے متعلق تفصیلی معلومات کی موجودگی میں، یہ کمپنیاں اپنے ایسے صارف کو، کمپیوٹرائزڈ سہولیات کے ساتھ، نیا جیون ساتھی تلاش کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ خدمات کی نوعیت اور دائرہ کار وسیع تر ہو جائے گا۔ غرض یہ کہ تیار ہونے والی اشیا کے ہر قدم یا جزو کے نفسیاتی پہلوؤں پر توجہ دی جائے گی۔

اور آخر میں، ہم لوگ تجرباتی شعبوں میں پہلے سے موجود کمپنیوں کی تعداد میں ناقابل مزاحمت اضافہ دیکھیں گے اس کے ساتھ ساتھ، منافع یا بلا منافع نوعیت کی حامل نئی کمپنیوں کی تشکیل میں اضافہ ہوگا تاکہ وہ ترتیب شدہ اور تیار شدہ تجربات کو ڈیزائن کر سکیں، ان کی پیکنگ کر سکیں اور ان کی تقسیم کاری کر سکیں۔ فنون کے پھیلاؤ میں اضافہ ہوگا رسکن (Ruskin) یا مورس (Morris) بنا ''صنعت'' کے مرہون منت ہونے مترادف ہوگا۔ نفسی کارکن گروہ اور دیگر کاروباری لوگ، بڑی تعداد میں اداکاروں، ڈائریکٹروں، موسیقاروں اور ڈیزائنوں کی خدمات حاصل کر لیں گی۔ تفریحی صنعتوں میں بھی اضافہ ہوگا کیونکہ تفریح کی نوعیت بھی تجرباتی معنوں میں تبدیل ہو جائے گی۔ تعلیم، جو پہلے ہی انتہائی وسعت اختیار کر جائے گی، کلیدی تجرباتی صنعت بن جائے گی اور یہ طلبہ میں علم اور اقدار کی تعلیم کے لیے تجرباتی تکنیک اختیار کر لے گی۔ ابلاغ اور کمپیوٹر کی صنعتیں اپنی مشینوں اور سافٹ ویئر کی فروخت کی تجرباتی پیداوار کو بڑی منڈیوں کے لیے ناگزیر سمجھیں گی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ صنعتیں جو کسی نہ کسی طرح خود کو کرداری ٹیکنالوجی یا ان صنعتوں سے منسوب کر لیں گی جو ٹھوس اشیا کی پیداوار اور روایتی خدمات کی فراہمی کی سہولیات فراہم کرتی ہیں، دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کریں گی۔ نتیجتاً تجربات کو تیار کرنے والے معیشت کے بنیادی...... اگر بنیادی نہ بھی ہو...... شعبے کو تشکیل دیں گے۔ نفسیات آرائی کا عمل مکمل ہو جائے گا۔

معقولیت کی معیشت

سٹین فورڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے "Long Range Planning Service" کی ایک رپورٹ کے مطابق مستقبل کی معیشت کا نچوڑ ''افراد اور گروہوں کی اندرونی اور مادی ضروریات پر توجہ مرکوز کرنے پر ہوگا'' یہی انسٹی ٹیوٹ تجویز پیش کرتا ہے کہ یہ نیا مرکز ومحور نہ صرف صارف کی طلب سے بڑھے گا بلکہ ''بقا'' کے لیے معیشت کی اپنی ضرورت کے تحت بھی اس میں اضافہ ہوگا۔ ''ایک ایسی قوم میں جہاں تمام تر ضروری مادی ضروریات پیداواری صلاحیت کے تین چوتھائی یا نصف سے پوری کی جاسکتی ہیں، معیشت کو پھلتا پھولتا رکھنے کے لیے بنیادی ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔''

یہ ہر قسم کے دباؤ کا سمٹاؤ ہے...... صارف کی طرف سے بھی اور ان کی طرف سے بھی جو معیشت کو ترقی کرتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ تکنیکی طور پر ترقی یافتہ معاشروں کو مستقبل کی تجرباتی پیداوار کی طرف لے جاتی ہے۔

اس سمت میں کیا جانے والا سفر تاخیر کا شکار ہوسکتا ہے۔ دنیا بھر میں غربت کے ستائے ہوئے لوگ فارغ ہوکر ایک طرف نہیں بیٹھیں گے کیونکہ اس دنیا کے چند لوگ نفسیاتی طور پر خود۔ لطف اندوزی کا سامان پیدا کرنے کی راہیں استوار کردیں گے۔ یہ بات کسی ایک گروپ کے لیے اخلاقی طور پر مزاحمت کا باعث بن سکتی ہے جو خود کو نفسیاتی طور پر تسکین دینا چاہتا ہے، عجیب وغریب اور مخصوص لذتوں سے خود کو محفوظ کرنا چاہتا ہے، جبکہ بنی نوع انسان کی اکثریت مفلوق الحال ہے یا بھوک ونگ کا شکار ہے۔ ٹیکنالوجی کے حامل معاشرے تجربات متعارف کروانے کے عمل کو موثر کرسکتے ہیں، اپنی روایتی پیداوار میں اضافہ کرکے، ایک خاص وقت تک، پرانی طرز کی معیشت کو برقرار رکھ سکتے ہیں، ماحولیات کے معیار کو کنٹرول کرنے کے لیے وسائل میں ردوبدل کرسکتے ہیں اور اس کے بعد غربت کے تدارک اور بیرونی امداد پر مبنی پروگراموں کا اطلاق کرسکتے ہیں۔

پیداوار کی زیادتی پر قابو پاکر اور پھر اس (کام) سے چھٹکارا پاکر فیکٹریوں کو رواں دواں رکھا جاسکتا ہے، زرعی وسائل سے حاصل ہونے والی چیزوں کو استعمال میں لاکر کوئی معاشرہ مادی ضروریات میں کمی کے معاملے پر اپنی توجہ مرکوز کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس دنیا سے بھوک وافلاس ختم کرنے کے لیے چلائی جانے والی پچاس سالہ مہم، شاید کوئی بہترین اخلاقی جواز پیدا نہ کرسکے لیکن وہ ایسے معاشروں کو خریدنے میں کامیاب ہوجائیں جو مستقبل کی معیشت میں آسان منتقلی کے منتظر ہیں۔

اس طرح کا وقفہ ہمیں موقع فراہم کرسکتا ہے کہ ہم تجرباتی پیداوار کے فلسفیانہ اور نفسیاتی پہلوؤں پر غور کرسکیں۔ اگر صارف حقیقی اور مصنوعی چیز میں واضح فرق محسوس نہیں کرسکتا۔ اگر کسی کی زندگی کا تمام تر پھیلاؤ کاروباری نقطۂ نظر سے طے شدہ ہے تو ہم دم بخود کرنے والی پیچیدگی کے نفسیاتی...... معاشی مسائل میں گرفتار ہوجائیں گے۔ یہ مسائل ہمارے انتہائی بنیادی قسم کے نظریات کے لیے چیلنج ہیں، نہ صرف جمہوریت یا معاشیات سے متعلق نظریات بلکہ منطق اور معقولیت سے متعلق نظریات کے لیے بھی۔

ہمارے عہد کا ایک بے استفسار سوال ہماری زندگیوں میں خیالی اور عدم خیالی تجربات کے درمیان توازن سے متعلق ہے۔ ہم سے پہلے کی کوئی نسل ان خیالی قسم کے تجربات کے دسویں حصے سے بھی نہیں گزری تھی جن سے ہم یا ہمارے بچے آج کے عہد میں گزر رہے ہیں اور کسی بھی جگہ پر کوئی شخص ایسا نہیں جو اپنی شخصیت پر پڑنے والے اثرات میں واضح تبدیلی کا حقیقی طور پر تصور کرسکے۔ ہمارے بچے، ہماری نسبت، جلد بلوغت تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہر دس سال بعد بلوغت کی عمر میں چار سے چھ ماہ تک کمی واقع ہوجاتی ہے۔ آبادی میں بھی بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ، ٹیلی وژن اور معلومات کے لامتناہی سلسلے کی وجہ سے، متوقع وقت سے پہلے ہی دانش کی منزل پالیتے ہیں۔ لیکن اگر حقیقی تجربات کی شرح خیالی تجربات سے تجاویز کرجاتی ہے تو جذبات کی نشوونما کا کیا ہوگا؟ کیا خیال آرائی (خیالی چیزوں کی عملی تشکیل) کی طرف اٹھایا گیا قدم جذباتی بلوغت میں اہم کردار ادا کرتا ہے؟ یا حقیقتاً، یہ اس میں خرابی پیدا کرتا ہے؟

اور اس وقت کیا ہوتا ہے جب کسی نئے مقصد کی تلاش میں سرگرداں کوئی معیشت، اپنی ہی غرض و غایت کی لیے تجربات کی پیداوار کے مرحلے میں سنجیدگی سے داخل ہونا شروع کردیتی ہے، ایسے تجربات جو خیالی اور غیر خیالی، مصنوعی اور حقیقی میں فرق کو مکدر کردیتے ہیں؟ معقولیت کی بہت سی تعریفوں میں سے ایک یہ ہے غیر حقیقی میں سے حقیقت کے اظہار کی صلاحیت۔ کیا ہمیں ایک نئی تعریف کی ضرورت ہے؟

ہمیں ان مسائل پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے...... اور حتیٰ کہ اگر ہم توجہ کریں بھی سہی۔ تو بالآخر خدمات، پیداوار پر غالب آجائیں گی اور تجرباتی پیداوار خدمات پر غلبہ پالے گی۔ تجرباتی شعبے کی بڑھوتری فراوانی کا ناگزیر نتیجہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ انسان کی بنیادی مادی ضروریات نئی اور جدید سہولیات سے آراستہ، مسرت اور تسکین کی راہیں استوار کرتی ہیں۔ ہم ایک کھوکھلی قسم کی معیشت سے ''نفسی'' معیشت کی طرف سفر کررہے ہیں کیونکہ کھوکھلا پن ہی ہے جس کی تسلی وتشفی کرنی ہے۔

اس کے علاوہ ہم ایک ایسے معاشرے کے قیام کی طرف تیزی سے سفر کر رہے ہیں جس میں مقاصد اشیا، مادی تعمیرات تیز رفتاری کے ساتھ ناپائیداری کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ نہ صرف انسان کے ان کے ساتھ تعلقات میں بلکہ چیزیں بھی یہی حیثیت اختیار کر رہی ہیں۔ اور صورت حال یہ ہے کہ صرف تجربات ہی ایسی پیداوار ہیں جنھیں اگر صارف ایک مرتبہ خرید ے تو وہ اس سے چھینے نہیں جا سکتے اور نہ ہی انھیں ناقابل واپسی سوڈا یوپ بوتلوں، یا ریزر بلیڈوں کی طرح تلف کیا جا سکتا ہے۔

جاپانیوں کی قدیم اخلاقیات ہمیشہ پنپتی رہیں گی۔ خدمت کے طور پر پیش کیا جانے والا ہر طرف یا ڈونگا، اپنے ساتھ اضافی معنی لیے ہوئے ہے، ان میں سے ہر چیز اپنے ساتھ علامتی یا رواجی اہمیت لیے ہوئے ہے۔ تیار شدہ اشیا کی نفسیات آرائی کی طرف قدم ہمیں اس سمت میں لے کر جاتا ہے، لیکن یہ ناپائیداری کی جانب بڑھتے ہوئے اس تیز رفتار دھچکے سے ٹکراتا ہے جو اشیا کو فنا پذیر بناتا ہے۔ لہٰذا ہم اس بات میں آسانی محسوس کریں گے کہ اپنی خدمات کو، اپنی پیداوار کی نسبت، علامتی اہمیت سے آراستہ کریں۔ اور آخر میں یہ بات کہ ہم خدمات کی معیشت کے شعبے میں، آج کے عہد کے ماہرین معاشیات کے تصور سے بھی بالا سطح پر، ترقی کر جائیں گے، اور ہم تاریخ میں اس پہلی ثقافت کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔ جس نے جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے، انتہائی ناپائیدار، لیکن دوام کی حامل پیداوار تیار کی: انسانی تجربہ۔

☆☆☆

گیارھواں باب

شکستہ خاندان

ندرت کا وہ سیلاب جو ہم سے ٹکرایا چاہتا ہے وہ یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں سے ہوتا ہوا فیکٹریوں اور دفاتر تک، منڈیوں، بازاروں اور ذرائع ابلاغ سے ہوتا ہوا ہمارے سماجی تعلقات اور طبقات سے گھروں تک پھیل جائے گا۔ ہماری نجی زندگیوں میں اپنا نفوذ کرتے ہوئے، یہ خاندانی زندگی پر انوکھا قسم کا کچھاؤ پیدا کرے گا۔

خاندان کو معاشرے کا بڑا ''شاک ایبز درور'' (دھچکا برداشت کرنے والا) بھی کہا گیا ہے۔ ایک ایسا مقام دنیا سے لڑنے کے بعد زخمی اور شکستہ واپس آتا ہے، اس تیز رفتار گردشی ماحول میں واحد مستحکم مقام۔ جدید ترین صنعتی انقلاب کے آغاز سے یہ ''شاک ابزرور'' اپنے چند دھچکوں کا شکار ہو گیا۔

سماجی ناقدین خاندان کے بارے میں عملی اور معاشرتی قیاس آرائی کرتے ہیں۔ کتاب "The coming world transformation" کے مصنف فرڈینڈ لنڈ برگ کہتے ہیں کہ خاندان کا نظام مکمل معدومیت کے قریب ہے۔" ایک نفسیاتی تجزیہ نگار ولیئم وولف کے بقول'' بچے کی پرورش کے ابتدائی ایک یا دو سالوں کے علاوہ خاندان کا تصور ختم ہو گیا ہے (آنے والے وقتوں میں) خاندان کا یہی کام ہوگا۔'' قنوطیت پسند لوگ ہمیں بتاتے ہیں کہ خاندان فراموشی کی طرف گامزن ہے۔ لیکن بہت کم لوگ یہ بتا پائیں گے کہ اس کا متبادل کیا ہوگا۔

اس کے برعکس خاندان سے متعلق رجائیت پسند لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ خاندان جو ہمیشہ برقرار رہا ہے، آنے والے وقتوں میں بھی برقرار رہے گا۔ اور کچھ لوگ تو یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ آج کے عہد میں خاندان اپنے سنہری دور میں داخل ہو گیا ہے۔ جوں جوں آسائشوں اور تفریحات میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا خاندان کے افراد زیادہ وقت اکٹھے گزارا کریں گے اور مشترکہ سرگرمیوں سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوں گے۔'' وہ خاندان جو اکٹھا کھیلتا ہے، وہ اکٹھا ہی رہتا ہے۔'' وغیرہ۔

ایک اور لطیف نظریہ یہ ہے کہ آنے والے وقت میں برپا ہونے والی بے چینی اور افراتفری لوگوں کو اپنے خاندان پر زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز کرنے پر مائل کرے گی۔ البرٹ آئن سٹائن کالج آف میڈیسن

(Albert Einstein College of Medicine) کے ماہر نفسیات ڈاکٹر اروِن ایم گرین برگ کہتے ہیں ''لوگ مستحکم ڈھانچے کے لیے ہی شادیاں کریں گے۔ اس نظریے کی رو سے خاندان ''مستقل پذیر جڑوں'' کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور تبدیلی کے طوفان میں لنگر کا کام کرتا ہے۔ مختصراً یہ کہ ماحول جتنا ناپائیدار اور انوکھا ہوتا چلا جائے گا، خاندان اتنی ہی اہمیت اختیار کرتا چلا جائے گا۔

ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس بحث میں دونوں اطراف کا نقطۂ نظر غلط ہو۔ کیونکہ ہوسکتا ہے مستقبل اس سے زیادہ روشن ہو جتنا ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ خاندان نہ تو معدومیت کی طرف جائے گا اور نہ ہی کسی سنہری دور میں داخل ہوگا۔ ہوسکتا ہے...... اور ایسا ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے...... یہ معدوم یا زوال کا شکار ہو جائے، بکھر جائے، لیکن کسی اور حیران کن اور انوکھے انداز میں مجتمع ہونے کے لیے۔

پُراسرار مامتا

ایک انتہائی پریشان کن قوت جو آنے والی دہائیوں میں خاندان سے ٹکرانے والی ہے وہ نئی پیدائشی ٹیکنالوجی کے اثرات ہیں۔ پیدا ہونے بچے کی جنس کو پہلے سے سیٹ کر لینا، حتیٰ کہ اس کی ذہنی صلاحیت IQ کو بھی ایک پروگرام کے تحت ترتیب دے دینا، اس کی بیرونی اور شخصی خصوصیات سنوارنا اب حقیقی طور پر، ممکن ہوگیا ہے۔ بیضہ کا (رحم میں) رکھا جانا، بچوں کا لیبارٹریوں میں افزائش پانا، اس صلاحیت کا حصول کہ ایک گولی نگلنے کے بعد کوئی ماں جڑواں یا تین، یا اس سے بھی زیادہ بچوں کو جنم دے، کسی ایسی لیبارٹری میں چلنے جانا جہاں سے بیضے خریدے جاسکتے ہوں، اور وہاں سے عملاً بیضہ کا خریدنا...... یہ سب کچھ، کسی بھی سابقہ انسانی تجربے سے اتنا آگے نکل جائے گا کہ کوئی بھی شخص مستقبل کو، بجائے ماہرین عمرانیات یا روایتی فلسفی کی نظر سے دیکھنے کے، شاعر یا مصور کی آنکھ سے دیکھنے کی ضرورت محسوس کرے گا۔

ان معاملات پر بحث کرنا نہ صرف غیر دانشورانہ محسوس ہوتا ہے بلکہ بے وقعت بھی لگتا ہے۔ تاہم سائنس اور ٹیکنالوجی یا صرف باز تخلیق حیاتیات میں ہونے والی ترقی ہی بہت ہی کم عرصے میں خاندان اور اس کی ذمہ داریوں سے متعلق دقیانوسی خیالات کو درہم برہم کر سکتی ہے۔ جب بچوں کی افزائش لیبارٹریوں میں رکھے ہوئے کسی ظرف میں ممکن ہو تو پھر مامتا سے متعلق تصورات کا کیا بنے گا؟ اور معاشرے میں خواتین کی خود تصوری کا کیا ہوگا کیونکہ ابتدائے زمانہ سے ہی یہ بات باور کروائی گئی ہے کہ خواتین کی زندگی کا اولین مقصد نسل کی پیدائش اور افزائش ہے؟

بہت سے سماجی سائنسدانوں نے اپنی توجہ ایسے سوالات کی طرف مرتکز کی ہے۔ ان میں سے ایک پولی کلینک ہسپتال نیو یارک میں Neuropsychiatri Service (عصبی نفسیاتی) کے ڈائریکٹر ہیمین جی ویٹزن (Hyman G. Weitzen) ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ''پیدائش کا دور یہ زیادہ تر خواتین کے لیے ایک بڑی اور تخلیقی ضرورت پورا کرتا ہے...... بہت سی خواتین بچے پیدا کرنے کی صلاحیت پر فخر کرتی ہیں...... وہ پراسرار تاثر جو ایک حاملہ خاتون کو باوقار بناتا ہے اس کی عکاسی مشرق اور مغرب دونوں کے ادب اور مصوری میں بھرپور طریقے سے کی گئی ہے۔''

مسٹر ویٹزن (Weitzen) استفسار کرتے ہیں کہ مامتا کے اس خاص وصف کا کیا بنے گا ''اگر اس کا بچہ، حقیقی طور پر، اس کا نہیں ہوگا بلکہ اس (بچے) کی جینیاتی افزائش کسی بہتر ''رحم'' میں ہوئی ہو، اور اس رحم کو کسی اور عورت سے حاصل کر کے اس کی پیوند کاری اس عورت میں کی گئی ہو، یا اسے کسی ''ظرف'' میں (افزائش کی غرض سے) رکھا گیا ہو''؟ وہ مزید کہتے ہیں اگر خواتین اپنی اہمیت کھو بیٹھیں گی تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ ہی بچے پیدا نہیں کر سکیں گی۔ اگر اور کچھ نہیں ہوگا تو کم از کم ہم مامتا کے تصور کو مار دینے کے قریب ہیں۔

نہ صرف مامتا بلکہ والدین کا تصور خود بھی یکسر تبدیل ہو جائے گا۔ یقینی طور پر ایسا دن آنے کا بھی امکان ہے جب کسی بچے کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ اس کے دو جینیاتی والدین ہوں۔ فلاڈیلفیا میں واقع Institute for Cancer Research کے ماہر حیاتیات ڈاکٹر بیٹرائس منٹز (Dr. Beatrice Minztz) نے ایسے چوہوں کی افزائش کی ہے جنہیں "multi-mice" کہا جا سکے گا یعنی چوہے کا ایسا بچہ جس کے ماں باپ کی تعداد عمومی (تعداد) سے زیادہ ہے۔ دو حاملہ چوہیوں سے بیضے حاصل کیے گئے۔ ان بیضوں کو ایک لیبارٹری کی ڈش میں رکھا گیا اور ان کی اس وقت تک دیکھ بھال کی گئی جب تک وہ ایک ہی کیست کی حیثیت اختیار کر گئے اس کے بعد اسے ایک تیسری چوہیا کے رحم میں داخل کر دیا گیا۔ ایک ایسے (بچے) چوہے کی پیدائش ہوئی جس میں دونوں جوڑوں کی خصوصیات تھیں۔ لہٰذا ایک خاص اور کئی خصوصیات کا حامل چوہا پیدا ہوا، دو جوڑے اس کے ماں باپ تھے، اس چوہے کے چہرے کی ایک طرف سفید بال اور گل مچھے تھے جبکہ چہرے کی دوسری طرف سیاہ بال اور گل مچھے تھے جبکہ جسم کے باقی حصے پر سفید اور سیاہ بالوں کا ملاپ تھا۔ اس طریقے سے پیدا کردہ ۷۰۰ چوہوں نے از خود ۳۵۰۰۰ چوہوں کو جنم دیا۔ اگر اس طریقے سے ملٹی ماؤس (متفرق رنگ کا چوہا) پیدا کر لیا گیا، کیا ملٹی مین (متفرق والدین کی خصوصیات کا حامل انسان) کی افزائش میں خاصی دیر ہے؟

ایسے حالات میں والدین کون ہیں؟ کب ایک خاتون اپنے رحم میں ایسے بچے کی افزائش کرے گی جسے دوسری کسی خاتون کے رحم سے (بیضے کی صورت میں) حاصل کیا گیا ہو، ماں کون ہے؟ اور پھر حقیقی باپ کون ہے؟

اگر کوئی جوڑا، حقیقتاً کسی بیضے کو خرید سکتا ہے تو پھر والدین ہونا ایک قانونی مسئلہ بن جاتا ہے نہ کہ جینیاتی۔ جب تک اس قسم کے معاملات پر سختی سے کنٹرول نہ کیا جائے کوئی شخص اس طرح کی مزاحیہ صورت حال کا تصور کرسکتا ہے کہ ایک جوڑے نے کوئی بیضہ خریدا، اس کی افزائش کسی لیبارٹری میں کی اور پھر پہلے بیضے کی طرح کا ہی دوسرا بیضہ خریدا، جیسے کسی ٹرسٹ فنڈ کے لیے کوئی چیز۔ ایسی صورت حال میں وہ لوگ قانونی ''دادادادی'' شمار کیے جائیں گے تاوقتیکہ ان کا پہلا بیٹا شیر خواری کے مرحلے سے نکل آئے۔ ہمیں ان رشتوں کی وضاحت کے لیے یکسر نئے ذخیرۂ الفاظ کی ضرورت ہوگی۔

مزید یہ کہ اگر بیضے برائے فروخت ہیں، تو کیا کوئی کارپوریشن کسی بیضے کو خرید سکتی ہے؟ کیا وہ دس ہزار بیضے بھی خرید سکتی ہے؟ کیا وہ کارپوریشن انھیں دوبارہ فروخت کرسکتی ہے؟ اگر کوئی کارپوریشن نہیں، تو ایک کاروباری تحقیقی لیبارٹری کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر زندہ بیضوں کو خریدیں اور فروخت کریں تو کیا ہے غلامی کے ایک دور میں داخل ہو رہے ہیں؟ اس طرح کے بھیانک سوالات پر ہم عنقریب، بحث شروع کردیں گے۔ لہٰذا خاندان کے بارے میں خالص روایتی انداز میں سوچنا تمام تر دلائل کو رد کرنے کے مترادف ہے۔

تیز رفتاری سے ہونے والی سماجی تبدیلیوں اور سائنسی انقلاب کے زیر اثر، جدید ترین صنعتی دور کے شخص کو مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ عجیب وغریب قسم کے خاندان کی تشکیل کے مرحلے سے گزرے۔ مختر ع قسم کی اقلیتوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ رنگارنگ قسم کے خاندانی نظام کو آزمائیں گے۔ اور وہ لوگ یہ کام موجودہ نظام اور حالات میں ردوبدل کر کے کریں گے۔

بہتر کارکردگی والا خاندان

وہ لوگ جو ایک سادہ سا کام کریں گے وہ خاندان کی کارکردگی کو بہتر کرنے کا سامان کرنا ہے۔ صنعتی ترقی سے قبل دور کے روایتی خاندان میں نہ صرف بچوں کی ایک مخصوص تعداد ہے بلکہ دیگر متعلقہ لوگ بھی ہوتے تھے۔ دادا، دادی، چچا، پھوپھی اور عم زاد وغیرہ۔ اس طرح کے وسیع تر خاندان سست رفتار زرعی معاشروں کے لیے تو موزوں ہوتے تھے لیکن اس طرح کے خاندانوں کی نقل وحمل اور کسی اور جگہ منتقلی مشکل تھی۔ یہ غیر متحرک تھے۔

صنعت کاری کا یہ تقاضا ہے کہ محنت کشوں کی ایک بہت بڑی تعداد، روزگار کی تلاش میں، کسی دیگر

مقام کا سفر کرے اور اگر ضرورت ہو تو کسی اور مقام پر دوبارہ سفر کرے۔ لہٰذا ایک وسیع تر خاندان بتدریج اپنا اضافی وزن کم کرتا ہے اور نام نہاد ''نیوکلیائی'' خاندان معرض وجود میں آتا ہے۔ خاندان کا ایک ایسا سلسلہ جو چھوٹا اور نقل پذیر ہو جس میں والدین اور نسبتاً کم بچے ہوں۔ نئی طرز کا یہ خاندان، جو روایتی وسیع تر خاندان سے زیادہ نقل پذیر ہے۔ صنعتی ممالک میں ایک معیاری حیثیت اختیار کرگیا ہے۔

تاہم جدید ترین صنعت کاری، جو معاشی۔ تکنیکی ترقی کا اگلا مرحلہ ہے، اعلیٰ پیمانے کی نقل پذیری کا تقاضا کرتی ہے۔ لہٰذا ہم مستقبل کے بہت سے افراد سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ درستگی کے اس مرحلے میں ایک قدم آگے چلے جائیں گے یعنی وہ اولاد پیدا ہی نہیں کریں گے اور خاندان کو اپنے انتہائی بنیادی اجزا تک محدود کردیں گے، ایک مرد اور ایک عورت۔ دو افراد، شاید ایک ہی پیشے سے وابستہ، تعلیمی اور سماجی معاملات کے ہجوم میں، روزگار کی تبدیلی اور جغرافیائی ردوبدل میں، بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرسکیں، بجائے ایک ایسے خاندان کے جس میں بچوں کی تعداد زیادہ ہو۔ ایک ماہر بشریات مارگریٹ میڈ (Margaret Mead) نے اس سمت میں اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم پہلے ہی ایک ایسے نظام کی طرف سفر کر رہے ہیں جس میں ''والدین ہونا چند خاندانوں تک محدود ہو جائے گا اور ان خاندانوں کا بنیادی مطمح نظر بچوں کی پرورش ہی ہوگا'' اور وہ خاندان باقی تمام تر آبادی کو ''تاریخ میں پہلی مرتبہ...... انفرادی حیثیت میں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیں گے''۔

بچوں کی پیدائش میں تاخر، بجائے بچے کے بغیر رہنے کے ایک معاہدے کی صورت اختیار کرسکتا ہے۔ آج کے دور کے مرد اور خواتین اپنے پیشے سے وابستگی اور بچوں سے وابستگی کے تضاد کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں۔ مستقبل میں بہت سے جوڑے اس مسئلے پر اس صورت میں قابو پالیں گے اور اس کی ممکنہ صورت بچوں کی پرورش کے مرحلے کو ریٹائرمنٹ تک مؤخر کرنا ہوسکتا ہے۔

یہ بات موجودہ دور کے لوگوں کو عجیب وغریب نظر آسکتی ہے۔ اگر ہم بچوں کی پرورش کے مرحلے کو حیاتیاتی بنیادوں سے ذرا ہٹ کر دیکھیں تو بچوں کی پیدائش کا مرحلہ ابتدائی عمر میں پورا کرلینے کا تعلق صرف اور صرف روایت سے ہے۔ کیوں نہ انتظار کیا جائے اور (اپنی ضرورت کے) بیضے ذرا تاخیر سے خریدے جائیں، جب آپ کی پیشہ ورانہ زندگی ختم ہو جائے؟ لہٰذا نوجوان اور ادھیڑ عمر کے جوڑوں میں بچوں کے بغیر زندگی گزارنے کا رواج اور رجحان بڑھنے کا امکان ہے، بچوں کی پرورش کرنے والے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد خاندان کا فروغ ایک مستند ادارے کی حیثیت حاصل کرلے گا۔

حیاتیاتی والدین اور ''والدین نما''

اگر محدود تعداد میں خاندانوں نے ہی بچوں کی پرورش کرنی ہے تو اپنے ہی بچوں کا ہونا ضروری کیوں ہے؟ کیوں نہ ایک ایسا نظام تشکیل دیا جائے جس میں ''پیشہ ور والدین'' دیگر افراد کے بچوں کی پرورش کریں؟

بچوں کی پرورش کے لیے ایسے ہنر کی ضرورت ہے جو کسی بھی طرح آفاقی نہیں ہے۔ ہم ہرگز کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ خاص اس مقصد کے لیے دماغ کی سرجری کرے یا سٹاک اور بانڈ فروخت کرے۔ چھوٹے سے چھوٹے سکیل کے سرکاری ملازم کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی استعداد کے عملی مظاہرے کے لیے ٹیسٹ دے۔ لیکن اس صورت حال کے باوجود کسی شخص کی ذہنی و اخلاقی استعداد کو بالائے طاق رکھ کر ہم لوگ عملاً اسے چھوٹے بچوں کی پرورش کی اجازت دے دیتے ہیں یہ سوچ کر کہ یہ لوگ بھی جینیاتی طور پر انسان ہی ہیں۔ اس کام کی پیچیدگی اور اس میں ہونے والے مسلسل اضافے کے باوجود بچوں کی پرورش اور نگہداشت کا کام اکثر غیر پیشہ ور افراد ہی سرانجام دیتے رہے ہیں۔

چونکہ موجودہ نظام بوسیدگی کے مرحلے میں ہے اور جدید صنعتی انقلاب اس کی جگہ لینا چاہتا ہے، طفل خطاکار کی فوجوں کی بھرمار ہے، ہزاروں کی تعداد میں نوجوان اپنے اپنے گھروں سے دور دراز کے علاقوں میں جا رہے ہیں۔ جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں کی یونیورسٹیوں میں طلبہ کا رویہ انتہائی جذباتی ہے ہم لوگ ولدیت اور مامتا کے سطحی شوق کا اختتام کرنے کے زوردار مطالبے کی توقع کر سکتے ہیں۔

نوجوانوں کے مسائل سلجھانے کے بہت سے بہتر طریقے ہیں لیکن پیشہ ور ولدیت کی افادیت یقینی ہے کیونکہ یہ معاشرے کے تخصص کی طرف لے جانے کی طرف سفر کا دباؤ بڑھاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سماجی جدت و اختراع کے لیے بھی ایک مضبوط مطالبہ موجود ہے۔ ان والدین میں سے لاکھوں ایسے ہیں، جنھیں اگر موقع فراہم کیا جائے تو وہ برضا و رغبت اپنی مادرانہ اور پدرانہ ذمہ داریوں سے دستبردار ہو جائیں گے۔ ضروری نہیں کہ اس میں غیر ذمہ داری یا محبت کے فقدان کا عنصر شامل ہو۔ پریشانی کا شکار، ذہنی انتشار میں مبتلا، اور حیرت میں گرفتار یہ لوگ خود کو اس قسم کے کاموں کے لیے موزوں نہیں سمجھتے۔ چیزوں کی فراوانی، جدید ترین سہولیات سے آراستہ لائسنس یافتہ پیشہ ور والدین کی موجودگی میں بہت سے حیاتیاتی (حقیقی) والدین نہ صرف بخوشی اپنے بچوں کو ایسے لوگوں کے حوالے کر دیں گے بلکہ اپنے اس عمل کو محبت بھرا کام قرار دیں گے نہ کہ دھتکارے جانے کا۔

بچوں کی پرورش اور نشوونما کرنے والے پیشوں سے منسوب لوگ کوئی تھرڈ ریٹ نہیں ہوں گے بلکہ

وہ ایک خاندانی یونٹ میں رہنے والے ہوں گے اور انھیں اس کام کے عوض اچھا خاصا معاوضہ ملے گا۔ ایسے کام کرنے والے خاندان ڈیزائن کے حساب سے کثیر پیدائشی خصوصیات رکھنے والے ہوں گے، جو پرورش پانے والے بچوں کو یہ موقع فراہم کریں گے کہ وہ بالغ افراد کے مختلف ماڈلوں سے چیزیں سیکھیں جس طرح پرانی طرز کے دیہی گھروں میں ہوتا ہے۔ ایسے بالغ افراد جنھیں بچوں کی پرورش کے لیے ''پیشہ ورانہ والدین'' ہونے کے ناطے معاوضہ دیا جاتا ہے، وہ لوگ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد فارغ ہو جایا کریں گے تاکہ انھیں اسی قسم کی ذمہ داری پر دوبارہ معمور کیا جائے۔ اس طرح کے خاندان نئے بچے حاصل کر لیں کہ کیونکہ ان کے پہلے بچے اب ''پرورش کا کورس'' مکمل کر چکے ہیں اور ان کے والدین کی کوشش ہے کہ ان کے درمیان عمر کا وقفہ بھی کم ہو جائے۔

یہ ممکن ہے کہ آنے والے وقت کے اخبارات اس طرح کے اشتہارات کے حامل ہوں جس میں نوجوان جوڑوں کو مخاطب کر کے کہا جائے: ''والدین ہونے کے وصف کو کیوں ترک کیا جائے؟ آیئے! ہمیں موقع فراہم کریں کہ ہم آپ کے بچے کو ایک ذمہ دار اور کامیاب فرد بنائیں۔ کلاس اے قسم کے خاندان کے لیے: باپ کی عمر ۳۹ سال، ماں کی عمر ۳۶ سال، دادی ۶۷ سال۔ ان کے چچا اور چچی کی عمریں ۳۰ سال اور وہ بچے کے لیے رہائش کا بھی بندوبست کریں گے اور جز وقتی طور پر مقامی ملازمین کی خدمات بھی حاصل کی جائیں گی۔ بچوں کی پرورش کا چوتھا یونٹ صرف ایک بچے کی پرورش کے لیے دستیاب ہے جس کی عمر ۶-۸ سال ہو۔ (ان بچوں کو دی جانے والی) خوراک سرکاری معیار سے تجاوز کرتی ہیں (بچوں کی پرورش کرنے والے) یہ بالغ افراد بچوں کی پرورش و نگہداشت اور اسی قسم کے انتظامی امور میں سند یافتہ ہیں۔ حیاتیاتی والدین کو کبھی کبھار ملاقات کی اجازت ہوگی۔ ٹیلی فون پر رابطے کی اجازت ہوگی۔ بچہ گرمیوں کی چھٹیاں اپنے حیاتیاتی والدین کے ساتھ گزار سکتا ہے۔ خصوصی انتظامات کے ذریعے مذہب، مصوری اور موسیقی کی تعلیم دی جائے گی۔ معاہدہ کم از کم پانچ سال کا ہوگا۔ مزید تفصیلات کے لیے لکھیے۔''

اس اشتہار کی رو سے حقیقی یا حیاتیاتی والدین بھی وہی کردار ادا کریں گے جو اس تمام عمل میں شریک نگہداشت کرنے والے والدین کا ہے یعنی دوستانہ رویہ رکھنے والے، امدادی قسم کے، بیرونی افراد۔ ایسی صورت حال میں معاشرہ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے ایک متنوع قسم کی کھیپ تیار کر سکے گا اس وقت تک جب (حقیقی) ماں اور باپ کا گروپ، جو بچوں کی پرورش کے لیے، جذباتی اور علمی سطح پر، جدید ترین سہولیات کے ساتھ تیار نہ ہو جائیں۔

اجتماعی وحدت اور ہم جنس پرستوں کی شادیاں

ایک اجتماعی خاندان میں مختلف قسم کے متبادل موجود ہوتے ہیں۔ چونکہ ناپائیداری معاشرے میں تنہائی اور اجنبیت میں اضافہ کر دیتی ہے لہٰذا ہم اجتماعی شادی کی مختلف قسموں کے بڑھتے ہوئے تجربات کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ مختلف بالغ افراد اور بچوں کا اکٹھے ہو کر ایک ''خاندان'' کی صورت میں رہنا تنہائی کے خلاف رہنے کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ اگر اس گھر میں سے ایک یا دو ارکان چلے بھی جاتے ہیں باقی افراد ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ماہر نفسیات بی ایف سکنر (B.F. Skinner) کی کتاب "Walden Two" اور ناول نگار رابرٹ ریمر (Robert Rimmer) کے ناول "The Harrad Experiment and Proposition 31" میں بیان کردہ نمونے کے مطابق اجتماعی وحدتوں کے قیام کا عمل جاری ہے۔ مؤخر الذکر ناول میں ناول نگار Rimmer بڑی سنجیدگی سے ایسے ''کارپوریٹ خاندان'' کو قانونی حیثیت دلوانے پر زور دیتے ہیں جس میں تین سے چھ افراد ایک ''نام'' اختیار کر لیتے ہیں، مشترکہ طور پر رہتے ہیں اور مشترکہ طور پر ہی بچوں کی پرورش کرتے ہیں اور قانونی طور ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں تاکہ معاشی اور ٹیکس کے مفادات حاصل کیے جا سکیں۔

مشاہدہ کرنے والے کچھ افراد کے نزدیک ایسے بہت سے آزاد خیال اور خفیہ طبقات امریکا کے مختلف علاقوں میں، پہلے سے ہی موجود ہیں۔ ان میں سے تمام کے تمام افراد نوجوان اور ہیپیوں (Hippies) پر مشتمل نہیں۔ کچھ لوگ مشترک مقاصد کے حصول کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ جس طرح تین "East Coast Colleges" کے اشتراک سے چلنے والا ایک گروپ۔ جس کا مقصد کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کو ہاسٹل کی زندگی سے روشناس کرانا ہے۔ ایسے لوگوں کے مقاصد سماجی، مذہبی، سیاسی اور تفریحی نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں کچھ عرصے بعد کیلی فورنیا اور جنوبی فرانس کے ساحلوں پر تفریحی سرگرمیوں میں مصروف، اجتماعی خاندان نظر آئیں گے۔ اگر وہ وہاں پہلے سے نہیں رہ رہے۔ ہمیں مذہبی عقائد اور سیاسی نظریات پر معرض وجود میں آنے والے اجتماعی خاندان کے طبقات بھی دکھائی دیں گے۔ ڈنمارک میں پہلے ہی اجتماعی شادی کو قانونی شکل دینے کا بل پارلیمان میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ اس منزل کا راستہ صاف نظر نہیں آ رہا لیکن (پارلیمان میں بل کا) پیش کیا جانا تبدیلی کی اہم علامت ہے۔

شکاگو میں ۲۵۰ افراد اجتماعی طور پر ''خاندان نما راہبانہ'' زندگی گزار رہے ہیں اور وہ لوگ یہ سب

کچھ، تیزی سے بڑھتے ہوا ایک مذہبی گروہ "The Ecumenical Institute" کے زیر اثر کر رہے ہیں۔ اس گروہ کے ارکان ایک ہی عمارت میں رہتے ہیں۔ کھانا اکٹھے پکاتے ہیں اور اکٹھے کھاتے ہیں، اکٹھے ہی عبادت کرتے ہیں اور مشترکہ طور پر بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کرتے ہیں اور اپنے اخراجات کو تقسیم کر لیتے ہیں۔ تقریباً ۶۰۰۰۰ نے اس تنظیم کے کورسز مکمل کر لیے ہیں اور اسی قسم کے اجتماعی خاندان اب اٹلانٹا، بوسٹن، لاس اینجلس اور دیگر شہروں میں ابھرنا شروع ہو گئے ہیں۔ Ecumenical institute کے سربراہ پروفیسر جوزف ڈبلیو میتھیوز (Joseph W. Mathews) کہتے ہیں۔ ''ایک بالکل نئی دنیا معرض وجود میں آ رہی ہے لیکن لوگ اب تک بھی پرانی طرز کی طرح ہی رہ رہے ہیں، ہم ان لوگوں کو از سر نو تعلیم دینا چاہتے ہیں اور انھیں نئے ''اوزار'' اور سہولیات سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک نیا سماجی پس منظر تشکیل دیا جائے۔''

مستقبل میں ابھر کر سامنے آنے والا ایک اور خاندانی نظام معرض وجود میں آنے والا ہے جسے ''بوڑھوں کا اجتماعی نظام'' کہا جا سکے گا یعنی بوڑھے افراد کو اکٹھا کرنے کی غرض سے کی جانے والی اجتماعی شادی تاکہ انھیں زندگی کے ساتھی اور مددگار میسر آ سکیں۔ چونکہ یہ لوگ بار آور معیشت سے فارغ ہو چکے ہیں جو نقل پذیری اور مسلسل عمل کو ضروری بناتی ہے لہٰذا وہ اکٹھے ہو کر ایک جگہ پر قیام کریں گے، اپنی ضروریات زندگی کو اکٹھا ہو کر پورا کریں گے، اپنے لیے مشترکہ فنڈ اکٹھا کریں گے، اپنی ضروریات اور طبی مدد کے لیے افراد کی پیشہ ورانہ خدمات حاصل کریں گے اور چند مخصوص حدود میں رہ کر۔ اپنی زندگی کے ایام کو بہتر طریقے سے گزارنے کی طرف بڑھ سکیں گے۔

اجتماعیت اس دباؤ کا مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ ہے جو جدید ترین صنعت کاری کے دھکے کی وجہ سے جغرافیائی اور سماجی نقل پذیری کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کو ترتیب دیتی ہے جو کام کاج کی زندگی سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اجتماعیت کے تجربات معاشرے کے ان لوگوں پر کیے جائیں گے جو صنعتی نظام زندگی سے مبرا ہیں..... ریٹائرڈ افراد پر مشتمل آبادی نوجوان افراد، وہ افراد جو اس عمل میں شامل نہیں، طلبہ خود روزگاری کے پیشے سے وابستہ افراد اور ٹیکنالوجی سے وابستہ افراد۔ اس کے بعد جب جدید ترین ٹیکنالوجی اور اطلاعیاتی نظام اتنی ترقی کر لیں گے کہ معاشرے کا زیادہ تر کام، کمپیوٹر۔ ٹیلی مواصلات کے ذریعے، گھر پر ہی کیا جا سکے تو باقی ماندہ افراد کے لیے بھی اجتماعیت کو ممکن بنایا جائے گا۔

ہم ایسے خاندان بھی دیکھیں گے جن کا سربراہ ایک غیر شادی شدہ بالغ فرد ہو گا اور اس کے، ایک یا

ایک سے زائد بچے ہوں گے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ سربراہ عورت ہی ہو۔ چند مقامات پر یہ بات ممکن ہو چکی ہے کہ غیر شادی شدہ مرد حضرات بھی بچے گود لے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اوریگون (Oregon) میں سال ۱۹۶۵ء میں ٹونی پیازا (Tony Piazza) نامی، اڑتیس سالہ موسیقار وہ پہلا شخص قرار دیا گیا جس نے اس ریاست میں، یا شاید پورے امریکا میں، کسی بچے کو، غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود گود لیا۔ عدالتیں افراد کو بھی بچوں کی نگہداشت کی اجازت دے رہی ہیں جن کی بیگمات طلاق حاصل کر چکی ہیں۔ لندن کے ایک فوٹوگرافر جس کا نام میکائیل کوپر ہے، نے ۲۰ سال کی عمر میں شادی کی اور کچھ ہی دنوں بعد شوہر اور بیوی میں طلاق کی نوبت آ گئی، اسے عدالت کی طرف سے اپنے بچے کی پرورش کی اجازت مل گئی اور اس کے بعد اس نے دیگر بچوں کو بھی گود لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس بات کا احساس ہونے کے بعد کہ اسے دوبارہ شادی کی خواہش پیدا نہیں ہوئی بلکہ اسے بچے ہی پسند آئے کوپر نے زوردار انداز میں بیان دیا: ''میری خواہش ہے کہ آپ خوبصورت خواتین سے صرف اور صرف یہ کہیں کہ وہ آپ کے لیے بچوں کو جنم دیں۔ یا کوئی بھی ایسی خاتون جسے آپ پسند کرتے ہوں یا جس کسی میں کوئی ایسی چیز ہو جس کی آپ تعریف کرتے ہوں۔ میں ایسے بڑے سے گھر کی خواہش کرتا ہوں جو بچوں سے بھرا ہوا ہو۔ مختلف رنگوں کے مختلف شکلوں اور قد و قامت کے۔'' شاید رومانیت؟ غیر فطری رویہ؟ تاہم یہ بات طے ہے کہ اس قسم کے رویے مستقبل کے افراد میں عام ہوں گے۔

دو طرح کے دباؤ اب ثقافت کو لچک دار بنا رہے ہیں اور اسے مرد کے ہاتھوں بچوں کی پرورش کے نظریے کو قبول کرنے کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ پہلا دباؤ تو یہ ہے کہ چند مقامات پر گود دیے جانے والے بچوں کی بہتات ہے۔ لہٰذا کیلی فورنیا میں ڈسک جوکی (Jockey) اس قسم کے اشتہارات چلاتے ہوئے نظر آتے ہیں: ''ہمارے پاس مختلف نسلوں اور قومیتوں کے خوبصورت بچے ہیں جو اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ اچھے خاندانوں کے گھروں کو خوشیوں اور محبت سے بھر دیں...... لاس اینجلس میں واقع "Country Bureau of Adoption" سے رابطہ کریں۔'' اسی دوران انتہائی حیران کن اور عدم سازشی انداز میں، ذرائع ابلاغ نے اجتماعی انداز میں یہ فیصلہ کیا کہ جو مرد حضرات بچوں کی پرورش کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں وہ عوام کے لیے خصوصی توجہ اور دلچسپی کا محور بنتے ہیں۔ حالیہ عرصے میں ٹیلی وژن کے مقبول ترین پروگراموں نے ایسے مرد حضرات کو خصوصی توجہ کے ساتھ پیش کیا جو خواتین کے بغیر ہی اپنا گھربار سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ افراد گھر کی صفائی کرتے ہیں، کھانا پکاتے ہیں اور سب سے اہم بات بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ ان مشہور ٹیلی وژن پروگراموں میں

"My three Sons"، "The Rifleman"، "Bonanza" اور "Bachelor Father" شامل ہیں۔

چونکہ (مغربی ممالک میں) ہم جنس پرستی سماج میں قابل قبول ہوتی جا رہی ہے لہٰذا ایسے خاندان دیکھنے میں آ رہے ہیں جن کی بنیاد ہم جنس پرست شادیوں پر ہے اور وہ ساتھی بچے بھی گود لے رہے ہیں۔ یہ مشاہدہ کرنا باقی ہے کہ ان بچوں کی جنس ایک ہی ہوتی ہے یا یہ مختلف جنسوں کے بچے ہوتے ہیں۔ لیکن جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں ہم جنس پرستی جس تیزی سے بڑھ رہی ہے، یہ صورت حال ایسے ہی خاندانوں کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب ہالینڈ میں ایک کیتھولک پادری نے دو ہم جنس پرستوں کی شادی کرا ڈالی اور اس نے ناقدین کو وضاحت کی کہ ''یہ وہ وفادار لوگ ہیں جن کی مدد کی جانی چاہیے۔'' برطانیہ نے اس موضوع کے بارے میں اپنے متعلقہ قانون میں ترمیم کی ہے، برضا و رغبت دو بالغ افراد میں ہم جنس پرست تعلقات جرم کے زمرے میں نہیں آتے۔ اور امریکا میں Episcopal کلیسا کے ایک مشترکہ اجلاس کے بعد پادریوں نے یہ اعلامیہ جاری کیا کہ چند مخصوص حالات میں، ہم جنس پرستی ''جائز'' ہے۔ ایسا بھی دن دیکھنے میں آ سکتا ہے جب کوئی عدالت یہ فیصلہ دے کہ ہم جنس پرستوں کا ایک تعلیم یافتہ اور مستحکم جوڑا ''مہذب'' والدین ثابت ہو سکتے ہیں۔

آنے والے وقت میں ہم لوگ کثیر ازدواجی سے متعلق رکاوٹوں میں بھی کچھ نرمی دیکھ سکتے ہیں۔ کثیر ازدواجی خاندان اب بھی اپنا وجود رکھتے ہیں اور ان کی تعداد عمومی معلومات سے بڑھ کر ہیں اور وہ معمول کے مطابق معاشرے ہی میں رہ رہے ہیں۔ مصنف "Ben Merson" نے "Utah" کے مقام پر ایسے بہت سے خاندانوں کا مشاہدہ کیا، جہاں آج بھی مورمن (Mormon) فرقے کے بنیاد پرست لوگ اسے ضروری خیال کرتے ہیں اور کہا کہ امریکا میں بھی تقریباً ۳۰۰۰۰ لوگ، مخفی خاندانی نظام میں، اسی قسم کی زندگی گزار رہے ہیں۔ چونکہ جنسی تعلقات اور رویے نرمی کا شکار ہو گئے ہیں، اور خوشحالی کی وجہ سے جائیداد کے مالکانہ حقوق کی اہمیت کم ہو گئی ہے لہٰذا کثیر ازدواجی کے خلاف دباؤ اور پابندی غیر منطقی نظر آتی ہے۔ یہ تبدیلی شاید اس نقل پذیری کا نتیجہ ہے جو انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اچھا خاصا وقت اپنے گھروں سے باہر گزارے کچھ افراد کے لیے "Captain's Paradise" کا افسانہ درست ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اگرچہ یہ افسانہ اسی نوعیت کا ہے، اگر ایسے ہی حالات ہوں تو پیچھے رہ جانے والی ازواج، ازدواجی حیثیت سے ہٹ کر، جنسی حقوق کا مطالبہ کر سکتی ہیں جو ماضی کے "Captain" کے لیے ممکن نہیں۔ آنے والے وقت کے لوگ اس سے مختلف انداز میں سوچ سکتے ہیں۔

ہمارے درمیان ایک اور خاندان کا نظام جنم لے رہا ہے، بچوں کی پرورش کا ایک نظام جسے میں ''خاندان کا مجموعہ'' کہوں گا۔ ایک ایسا خاندان جس کی بنیاد طلاق یافتہ اور دوبارہ رشتہ ازدواج میں بندھے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہے، جس میں بچے ایک بڑے خاندان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اگرچہ ماہرین عمرانیات نے اس مظہر کی طرف کم توجہ کی ہے تاہم یہ اتنی مقبولیت اختیار کر گیا ہے اس کی منظر کشی حالیہ امریکی فلم "Divorce Americans Style" میں کی گئی ہے۔ ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ آنے والی دہائیوں میں اس طرح کے خاندان (خاندان کا مجموعہ) انتہائی اہمیت اختیار کر جائیں گے۔

بچوں (کی پیدائش) سے مبرا شادیاں، پیشہ ور والدین، ریٹائر ہونے کے بعد بچوں کی پیدائش اور پرورش، کارپوریٹ خاندان (شادی شدہ) اجتماعی طبقے، بوڑھے افراد کی اجتماعی شادیاں، ہم جنس پرست خاندان، کثیر ازدواجی ...... یہی جب اور جہاں کچھ خاندانی نوعیتیں اور سرگرمیاں ہیں اور آنے والے وقتوں میں مخترع قسم گردہ اس قسم کے تجربات سے گزریں گے۔ تاہم ہم میں سے تمام لوگ اس قسم کے تجربات سے گزرنے کے خواہاں نہیں۔ اکثریت کے بارے میں کیا خیال ہے؟

محبت کی مخالفت

انتہائی قلیل تعداد میں لوگ تجربے کرنے کے مرحلے سے گزرتے ہیں، اکثریت ماضی کی مثالوں سے جڑی رہتی ہے۔ یہ بات کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ لوگوں کی اکثریت شادی کے روایتی اور قدیمی نظریے یا خاندان کی شناسا اور رائج قسموں سے دستبردار ہونے سے گریز کرے گی۔ وہ لوگ یقینی طور پر، اس روایتی طرز کے خاندان میں یہی خوشیاں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاہم آخر میں، اختراع اور تنوع کی تلاش میں، ان پر دباؤ بڑھ جائے گا کیونکہ کامیابی کی مخالفت میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

اس طرح کی قدیم ہیئت میں پہلے سے ہی یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ دو نوجوان افراد ایک دوسرے کو ''پا لینے'' کے بعد رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ دو افراد ایک دوسرے کی نفسیاتی ضروریات بھی پوری کریں گے اور یہ دو شخصیات وقت کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کو پروان چڑھائیں گی، ایک کے بعد ایک، تاکہ وہ ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا رکھنا جاری رکھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا تاوقتیکہ موت ان دونوں کو علیحدہ کر دے۔

ہماری ثقافت میں اس قسم کی توقعات بڑی مضبوط حیثیت کی حامل ہیں۔ اب یہ بات عزت و توقیر

کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی، جیسا پہلے کبھی تصور کیا جاتا تھا، کہ کسی سے صرف محبت کی خاطر شادی کی جائے۔ محبت خاندان میں ثانوی حیثیت کی بجائے اب اس کے لیے بنیادی جواز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے تاہم خاندانی زندگی کے ذریعے محبت کا حصول بہت سے افراد کے لیے، زندگی کا مقصد بن چکا ہے۔

تاہم محبت کی تعریف مشترکہ عمل اور بڑھوتری کے نظریے اور اس پس منظر میں کی جاتی ہے۔ اس کو تکمیلی ضروریات کا ایک خوبصورت جال تصور کیا جاتا ہے جس کا پھیلاؤ کسی بھی شخص کے اندر اور باہر تک موجود ہے جو پیار کرنے والوں کی تکمیل کرتا ہے اور گرمیٔ جذبات، نزاکت اور لگن کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ناراض اور ناخوش قسم کے شوہر اکثر شکایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی سماجی، تعلیمی اور دانشورانہ تعمیر و ترقی کے لیے اپنی بیویوں کو چھوڑ دیا ہے۔ کامیاب شادیوں کے شریک مشترکہ ترقی کرتے ہیں۔

''متوازی ترقی'' کے اس نظریۂ محبت کو ازدواجی زندگی کے مشیران، ماہرین نفسیات اور ماہرین عمرانیات کی سند حاصل ہے۔ لہٰذا ایک ماہر عمرانیات نیلسن فوٹ (Nelson Foote) جو خاندانی امور عمرانیات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ شوہر اور بیگم کے درمیان تعلقات کا انحصار ان کی ممتاز، لیکن قابل موازنہ ترقی کے ہم آہنگ ہونے کی شرح اور ان کے مراحل پر ہے۔''

اگر محبت مشترکہ ترقی و بڑھوتری کی پیداوار ہے اور ہم نے شادی کی کامیابی کا اندازہ اس شرح سے ہی کرنا ہے جس سے ہم آہنگی پیدا ہوئی ہے تو پھر یہ ممکن ہے کہ ہم مستقبل سے متعلق ایک مضبوط اور خوفناک قسم کی پیش گوئی کر سکیں۔

اس بات کا عملی مظاہرہ بھی ممکن ہے کہ ایک نسبتاً ساکن معاشرے میں کسی متوازی ترقی کرنے والے مثالی جوڑے کی راہ میں ریاضی سے وابستہ رکاوٹیں آڑے آتی ہیں۔ ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹیں حقیقی طور پر پر اس وقت کم ہونا شروع ہو جاتی ہیں جب کسی معاشرے میں تبدیلی کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے، جیسا کہ اب ہو رہا ہے۔ ایک تیز رفتار معاشرے میں، جس میں بہت سی چیزیں تبدیل ہوتی ہیں، نہ صرف ایک بار، بلکہ بار بار، جس میں شوہر معاشی اور سماجی وجوہات کی بنا پر ادھر سے ادھر سفر کرتے ہیں، جہاں ایک خاندان اپنے گھر اور طبقے سے بار بار علیحدہ ہو، جہاں کوئی فرد اپنے والدین، اپنے آبائی دین اور روایتی اقدار سے دور ہو جائے وہاں یہ بات معجزے سے کم نظر نہیں آتی کہ دو افراد کسی قابل موازنہ قسم کی چیز کو ترقی دیں۔

اسی دوران اگر اوسط عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے مثلاً یہ پچاس سال کی بجائے ستر سال ہو جاتی ہے،

گویا اس مدت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے جس میں مشترک اور ہم آہنگ ''ترقی کا کرتب'' انجام دیا جاتا ہے تو کامیابی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی تعداد میں حد درجہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا نیلسن فوٹ (Nelson Foote) غیر معمولی قسم کے دھیمے انداز میں کہتے ہیں: ''جدید ترین ماحول میں اس بات کی توقع رکھنا کہ شادی غیر معینہ مدت تک چلتی رہے گی، کچھ زیادہ ہی ہے۔'' اور محبت کے بارے میں یہ توقع رکھنا کہ یہ بھی غیر معینہ مدت تک چلتی رہے گی، اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ناپائیدار اور ندرت ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔

عارضی شادی

یہ محبت کے خلاف شماریاتی رکاوٹوں میں تبدیلی ہی ہے جو جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں طلاق اور علیحدگی کی بڑھتی ہوئی شرح کی ذمہ داری ہے۔ تبدیلی کی شرح جتنی تیز ہوگی اور مدت حیات جتنی طویل ہوگی یہ رکاوٹیں بھی شدید تر ہوتی چلی جائیں گی۔ کسی نہ کسی کو تو ٹوٹنا ہے۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ کچھ نہ کچھ تو ٹوٹ چکا ہے۔ اور وہ ہے دوام پر روایتی زور (دینے کی عادت)۔ لاکھوں مرد اور خواتین اب وہ چیز اختیار کرتے ہیں جو انھیں ایک شعوری اور روایتی حکمت عملی کی صورت میں نظر آتا ہے بجائے اس کے کہ وہ خاندان کی کسی متوقع صورت کو اپنائیں، وہ روایتی طریقے سے شادی کر لیتے ہیں اور اپنی زندگی کے معمولات گزارنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر جب زندگی کے ان ساتھیوں کے راستے کسی قابل قبول صورت سے تجاوز کر جاتے ہیں وہ طلاق یا علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کسی نئے ساتھی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں جس کی ترقیاتی سطح، اس خاص وقت میں ان سے مطابقت رکھتی ہو۔

چونکہ انسانی تعلقات مزید ناپائیدار اور معیاری ہو گئے ہیں لہٰذا محبت کی تلاش ایسی کسی صورت میں ابھر کر سامنے آتی ہے جو جنون پر مبنی ہوتی ہے۔ لیکن وقتی توقعات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ روایتی شادی اس معیار پر اترتی ہوئی کم ہی نظر آتی ہے کہ وہ مدت الحیات محبت کے پیمانے پر پوری اترے، لہٰذا ہم آنے والے وقت میں عارضی شادیوں کی عوامی قبولیت کی پیش گوئی بھی کر سکتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ''تادم مرگ اکٹھے رہنے'' والی شادی کریں (آنے والے وقت میں) جوڑے ایسے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوں گے جس کے بارے میں وہ پہلے سے ہی جانتے ہوں گے کہ یہ رشتہ قلیل المدت ہے۔

وہ لوگ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ جب شوہر اور بیوی کے راستے جدا ہوں اور جب ترقی کے مرحلوں میں تضاد ایک حد سے تجاوز کر جائے تو وہ لوگ اس رشتے سے دستبردار ہو جائیں...... بغیر کسی صدمے یا

شرمندگی کے، حتیٰ کہ بغیر اس تکلیف کے جو آج کے دور میں طلاق کی صورت میں ہوتا ہے اور جب کوئی مناسب موقع آئے تو وہ دوبارہ...... سہ بارہ...... رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔ شادیوں کا سلسلہ...... کامیاب عارضی شادیوں کا ایک نمونہ...... ناپائیداری کے عہد کی ایک (ممکنہ) صورت جس میں ماحول کے ساتھ انسان کے تمام رشتے اور تعلق اپنی مدت کم کر دیتے ہیں۔ یہ سماجی سلسلے کی فطری اور ناگزیر قسم کی پیداوار ہے جس میں کاریں کرائے پر دی جاتی ہیں، گڑیوں کی تجارت (تبادلہ) ہوتی ہے اور ایک مرتبہ استعمال کے بعد، لباس تلف کر دیے جاتے ہیں۔ یہ آنے والے کل کی شادیوں کا ایک نمونہ ہے۔

ایک حوالے سے شادیوں کا تواتر جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں کا ایک خاندانی راز ہے۔ مشہور زمانہ ماہر عمرانیات پروفیسر جیسی برنارڈ کے بقول ''ایک سے زائد شادیوں کی صورت حال ہمارے معاشرے میں اتنی شدید ہے جتنی ان معاشروں میں بھی نہیں تھی جو کثیر ازدواجی کی اجازت دیتے تھے۔ ان میں واضح فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں کثیر ازدواجی منظم طریقے سے کی جاتی ہے، سلسلہ دار ہوتی ہے (یا یکے بعد دیگرے) ہوتی ہے بجائے اکٹھی شادیوں کے۔'' دوبارہ شادی کرنا اب اتنا عام ہو گیا ہے کہ امریکا میں ہر چار جوڑوں میں سے ایک تبدیل ہوا ہے۔ یہ رواج اتنا عام ہوا کہ ایک IBM کے اعلیٰ عہدیدار ایک چونکا دینے والا بیان دیتے ہیں جو ایک طلاق یافتہ خاتون کے بارے میں تھا جس نے ملازمت کے لیے دی جانے والی درخواست پُر کرتے وقت اس وقت ذرا توقف سے کام لیا جب اس نے وہ خانہ پُر کرنا تھا جس میں اس سے اس کی ازدواجی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا۔ اس نے پنسل کو دانتوں میں دبایا، ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر تحریر کیا: ''دوبارہ شادی سے (پہلے) کنواری۔''

ناپائیداری، متوقع دورانیوں پر یقینی طور پر اثر انداز ہوتی ہے جس کے ذریعے افراد نئے مواقع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جب وہ کسی دائمی تعلق کے لیے کوشش کرتے ہیں، ان کے اندر سے کوئی سرگوشی ہوتی ہے کہ یہ انتہائی غیر متوقع قسم کی ایک سہولت ہے۔

حتیٰ کہ وہ نوجوان جو لگن کے ساتھ اپنے مقاصد کے حصول میں لگے ہوتے ہیں، لوگوں کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھتے ہیں، اس دھکے کی قوت سے آشنا ہیں جو ناپائیداری کی طرف گامزن ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک نوجوان، سیاہ فام خاتون کے الفاظ پر توجہ دیں، یہ خاتون امریکی شہری حقوق کی تحریک کی کارکن ہے اور شادی و وقت سے متعلق یہ خیالات رکھتی ہے:

"سفید فام افراد کی دنیا میں شادی کا مطلب ہے اختتام۔ جیسا کہ ہالی وڈ کی فلموں میں ہوتا ہے۔ میرا مطمح نظر یہ نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی کا تمام وقت کسی ایک تصور میں رہ کر گزارنے کا سوچ نہیں سکتی۔ ہوسکتا ہے میں ابھی شادی کرنا چاہ رہی ہوں، لیکن اگلے سال کا کیا ہوگا؟ یہ شادی کے بندھن کے لیے کوئی توہین آمیز بات نہیں بلکہ عین عزت و توقیر پر مبنی ہے۔ شہری حقوق کی تحریک میں ناپائیداری کے احساس کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔ یعنی جب تک وہ چیز برقرار ہے اس سے زیادہ سے زیادہ اور بہترین انداز میں استفادہ کیا جائے۔ روایتی بندھنوں میں وقت ایک قید کی صورت بن جاتا ہے"۔

اس طرح کے رویے اور سوچ نوجوان، محدود تعداد میں موجود افراد یا سیاسی متحرک لوگوں تک محدود نہیں رہیں گے۔ ندرت کے پھیلنے اور عام ہونے سے یہ (رویے) بھی اقوام میں عام ہوجائیں گے اور اگر ناپائیداری کی سطح مزید بلند ہوتی ہے تو اس قسم کے رویے میں بھی شدت پیدا ہوگی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عارضی اور پھر متواتر (یکے بعد دیگر)۔ شادیوں کی شرح میں بھی اضافہ ہوگا۔

اس نظریے کو بڑے بہتر انداز میں سویڈن کے ایک جریدے "Svensk Damtidning" نے پیش کیا، اس جریدے کے نمائندے نے مرد اور عورت کے تعلقات کے موضوع پر سرکردہ ماہرین عمرانیات، قانونی ماہرین اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے انٹرویو کیے اور اپنا تجزیہ پانچ عدد تصاویر کی صورت میں پیش کیا۔ انھوں نے اس ایک خوبصورت دلہن کو پانچ (تصویری) ٹکڑوں میں دکھایا۔ پانچ مختلف دولہوں کے ساتھ۔

شادیوں کا خط مستویر

سلسلہ وار شادیاں عام ہوگئی ہیں، ہم لوگوں کو ان کی موجودہ ازدواجی حیثیت سے نہیں دیکھیں گے بلکہ ان کے ازدواجی "پس منظر" یا خط مستویر کے حوالے سے دیکھیں گے۔ یہ خط مستویر ان فیصلوں کی وجہ سے وجود میں آئے گا جو وہ اپنی زندگی کے چند اہم موڑ پر لیتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کے لیے ایسا پہلا موڑ نوجوانی میں آتا ہے۔ جب وہ "آزمائشی شادی" کے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں۔ امریکا اور یورپ میں نوجوان لوگ اب بھی آزمائشی شادی کے بڑے تجربے سے گزرتے ہیں، یہ کام کسی تقریب کو منعقد کرکے یا منعقد کیے بغیر کیا جاتا ہے۔ امریکا کی مستحکم ترین یونیورسٹیاں اپنے طلبہ کے درمیان مخلوط گھرداری، کے تجربے کو آزما رہے ہیں۔ آزمائشی شادی کی قبولیت کا رجحان اب چند

مذہبی فلسفیوں میں بھی فروغ پا رہا ہے۔ لہٰذا جرمنی کی ماربرگ یونیورسٹی کے نظریہ ساز Sieg fried Keil اس بات پر زور دیتے ہیں جسے ہم "قبل از شادی کا باضابطہ سلسلہ" کہہ سکتے ہیں۔ کینیڈا میں عیسائی پادری Jacques Lazure نے تین سے اٹھارہ ماہ تک کی مدت کی آزمائشی شادیوں کا اعلامیہ جاری کیا۔

ماضی میں مختلف نوعیت کے سماجی دباؤ اور سرمایے کی قلت آزمائشی شادی کے تجربے کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ مستقبل میں ایسے تجربات کی راہ میں حائل ہونے والی یہ دونوں قوتیں فنا ہوجائیں گی۔ سلسلے وار شادیوں کے مرحلے میں آزمائشی شادیاں یہی وہ پہلا قدم ہوگا جسے لاکھوں افراد اٹھائیں گے۔

مستقبل کے لوگوں کی زندگی میں دوسرا مرحلہ وہ ہوگا جب آزمائشی شادی ختم ہوجائے گی۔ اس نہج پر جوڑے اس بات کا چناؤ کریں گے کہ اپنے تعلقات کو باضابطہ شکل دے دیں اور اگلے مرحلے تک اکٹھے زندگی گزاریں یا وہ اس رشتے کو یہیں پر ختم کردیں اور نئے ساتھیوں کی تلاش میں نکل پڑیں۔ دونوں صورتوں میں ان کو مختلف چیزوں کے چناؤ کا سامنا ہوسکتا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو بچوں کے بغیر ہی زندگی گزار سکتے ہیں۔ وہ بچوں کی پیدائش پر اکتفا کرسکتے ہیں، بچے گود لے سکتے ہیں یا ایک یا دو بچے "خرید" سکتے ہیں۔ وہ یہ بھی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ان بچوں کی پرورش خود کی جائے یا کسی پیشہ ور ادارے میں "پیشہ ور والدین" کے ہاتھوں ان کی پرورش کرائی جائے۔ اس قسم کے فیصلے تقریباً ۲۰ سے ۲۵ سال کی عمر تک کرلیے جائیں گے۔ یعنی وہ وقت جب تک بہت سے بالغ افراد اپنی دوسری شادی یا شادی کے دوسرے مرحلے تک پہنچ جائیں گے۔

ان لوگوں کی زندگیوں میں تیسرا اور اہم موڑ اس وقت آئے گا جب ان کے بچے گھر چھوڑیں گے، جیسا کہ آج بھی ہوتا ہے۔ والدین ہونے کے احساس کا ختم ہونا بہت سے افراد کے لیے انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوسکتا ہے خاص طور پر خواتین کے لیے جو، بچوں کے گھر سے جانے کے بعد خود کو علت وجود کے بغیر ہی سمجھتی ہیں۔ آج کے دور میں بھی طلاقوں کے ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ جوڑا پرورش کے اس عمل میں تعطل ہونے کی وجہ سے اس صدمے کو برداشت کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

آنے والے وقت میں بھی وہ روایتی جوڑے جو اپنے بچوں کی پرورش وقت کے تقاضوں کے مطابق کرنا چاہیں گے، ان کے لیے بھی یہ لمحہ انتہائی تکلیف دہ ہوگا۔ تاہم یہ وقت ان کی توقعات سے پہلے ہی آجایا کرے گا۔ آج کے دور کے نوجوان بھی، اپنے سے پہلی نسل کے نوجوانوں کی نسبت، اپنے گھروں کو جلدی چھوڑ دیتے ہیں۔ آنے والے وقت میں وہ لوگ اس سے بھی پہلے اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑیں گے۔

نوجوان لوگ ایک بڑی تعداد میں گھروں سے نکل پڑیں گے چاہے وہ آزمائشی شادی ہو یا کوئی اور صورت اور وہ بھی ۱۳ سے ۱۹ سال کی عمر میں۔ لہٰذا ہم یہ پیش بندی کر سکتے ہیں کہ ۳۰ سال کے بعد کے انتہائی یا چالیس کی عمر سے پہلے والے سال لاکھوں افراد کی ازدواجی زندگیوں اور ازدواجی سلسلوں کے اہم ترین سال ہوں گے۔ اس مقام پر پہنچ کر بہت سے افراد اپنی ''تیسری'' شادی یا شادی کے تیسرے مرحلے میں پہنچ جائیں گے۔

شادی کا یہ تیسرا مرحلہ (جسے تیسری شادی کہا گیا ہے) زندگی کے دو شریکوں کو انتہائی قریب لے آئے گا اور یہ قربت ان کی زندگیوں میں ازدواجی دور کا طویل ترین اور غیر منقطع دور ہوگا۔ شاید ان کی عمروں کی تیس کی دہائی کے آخری سالوں سے لے کر اس وقت تک جب ان میں کوئی شریک زندگی وفات پا جائے اور یہ دور ہی دراصل ''حقیقی'' شادیوں کا دور ہوگا، حقیقتاً ازدواجی رشتے کی دیرپا بنیاد۔ اس عہد کے دوران دو بالغ افراد، مشترکہ مفادات اور اضافی نفسیاتی ضرورتوں کے حامل اور شخصی نشوونما کے قابل موازنہ احساس کے ساتھ، وہ لوگ اس قابل ہوں گے کہ ایسے رشتے میں جکڑ جائیں جو دیرپا ہونے کی ایک بہتر اور ممکنہ صورت ہو۔

شادیوں کی یہ تمام صورتیں ہی تادم مرگ برقرار نہیں رہیں گی کیونکہ خاندان کو بحران کے ایک چوتھے مرحلے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ اس وقت آتا ہے، جیسا آج کے عہد میں ہوتا ہے، جب ایک یا دونوں شریک حیات اپنے کام سے ریٹائر ہوتا/ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کے بعد روزمرہ کے معمولات میں اچانک تبدیلی اس جوڑے پر خاصا دباؤ ڈال دیتی ہے۔ ان میں سے کچھ جوڑے ''بعد از ریٹائرمنٹ'' والی خاندانی ڈگر پر چل نکلیں گے۔ جو اس لمحے کو بچوں کی پرورش کے لیے مختص کریں گے۔ ایسا کرنے سے ان لوگوں کے لیے وہ خلا ختم ہو جائے گا جس کا سامنا بہت سے جوڑے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے اختتام پر کرتے ہیں (آج بہت سی خواتین اس وقت پیشہ ورانہ کام کا آغاز کرتی ہیں جب وہ اپنے بچوں کی پرورش مکمل کر لیتی ہیں؛ آنے ولے وقت میں بہت سے افراد اس نمونے کو الٹا کر دیں گے، پہلے کام کریں گے اور بچوں کی پرورش بعد میں)۔ دیگر جوڑے ریٹائرمنٹ کے ''بحرانی'' لمحے پر اور طریقوں سے قابو پائیں گے، دونوں افراد نئی عادات، نئی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا آغاز کر کے۔ ان کے علاوہ دیگر افراد ناپائیداری کو انتہائی مشکل مرحلے سمجھیں گے اور ''دچولویوں'' سے اپنا تعلق جوڑ کر۔ عارضی غیر شادی شدہ افراد کا الٹ بن کر۔ ان کے طبقے ہی میں شامل ہو جائیں گے۔

بلاشبہ بہت سے ایسے افراد ہوں گے جو خوش بختی سے، باہمی ہنرمندی اور اعلیٰ ذہانت کے بل بوتے پر اس بات کو ممکن بنائیں گے کہ اپنی ایک ہی شادی کو دائمی حیثیت دیں۔ ان میں سے کچھ افراد، آج کل کے

افراد کی طرح، اس بات میں کامیاب ہو جائیں گے کہ وہ مدت الحیات کے لیے شادی کریں اور دیرپا محبت اور میلان حاصل کریں۔ لیکن دیگر افراد اس بات میں بھی ناکام رہیں گے کہ شادیوں کے متواتر سلسلے کو دوام دے سکیں۔ لہٰذا کچھ لوگ شادی کی اس آخری منزل پر دو یا تین جیون ساتھیوں کو آزمائیں گے۔ بیرونی دنیا میں بھی فی کس شادیوں کی اوسط تعداد میں...... آہستگی سے لیکن مسلسل...... اضافہ ہوگا۔

شاید بہت سے لوگ اس ارتقا کے ساتھ آگے بڑھیں کہ وہ ''روایتی'' عارضی شادی بار بار رچائیں لیکن معاشرے میں پھیلے ہوئے اس ''کنبے اور خاندان سے متعلق تجرباتی'' سلسلے کی وجہ سے کچھ باہمت یا ستائے ہوئے لوگ نسبتاً کم روایتی انتظامات پر بھی، ذیلی طور پر، دھاوا بول دیں گے۔ شاید کسی نہج پر طبقاتی زندگی کا تجربہ کرتے ہوئے، یا اپنے کسی بچے کے ساتھ تنہا زندگی گزار کر۔ اس کا نتیجہ ازدواجی خط مستوی کی ان اقسام میں تغیر اور تبدیلی ہے جنھیں لوگ تلاش کر لیں گے، زندگی گزارنے کے مختلف نمونوں میں وسیع تر چناؤ، اور تجربے کی ندرت کا لامتناہی موقع۔ کچھ نمونے دیگر کی نسبت عام ہوں گے۔ لیکن عارضی شادی مستقبل کی خاندانی زندگی کا ایک معیاری وصف، یا شاید مؤثر قسم کا وصف ہوگا۔

آزادی کے مطالبے

ایک ایسی دنیا جہاں شادی مستقل کی بجائے عارضی ہے، جہاں خاندان کا نظام متنوع اور رنگارنگی پر مبنی ہے، جہاں ہم جنس پرست قابل قبول والدین ہیں اور ریٹائر ہونے والے افراد بچوں کی افزائش شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح کی دنیا ہماری دنیا سے یکسر مختلف ہے۔ آج تمام لڑکے لڑکیاں موت الحیات شریک زندگی تلاش کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔ آنے والے وقت میں تنہا زندگی گزارنا جرم نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی جوڑوں کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ آج کل کے ماحول میں موجود بے شمار افراد کی طرح، ایسے ازدواجی بندھن میں جکڑے رہیں جو شکستگی اور بوسیدگی کا شکار ہو چکے ہیں۔ طلاق کا اہتمام کرنا آسان ہوگا، تاوقتیکہ بچوں کے لیے مناسب بندوبست کی صورتیں نہ نکل آئیں۔ دراصل (بچوں کی پرورش کے لیے) پیشہ ورانہ والدین کا متعارف ہونا طلاق کے حصول میں آزادی کی ایک بڑی لہر کی حیثیت اختیار کر لے گا جس سے بالغ افراد کے لیے آسانی پیدا ہو جائے گی کہ وہ نفرت انگیز رشتہ ازدواج میں بندھے رہنے کی بجائے اپنی پدرانہ اور مادرانہ ذمہ داریوں سے مبرا ہو جائیں۔ اس مضبوط بیرونی دباؤ کے ختم ہونے کے بعد وہ لوگ جو اکٹھے رہیں گے وہ وہی ہوں گے جو اکٹھا رہنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ جن کے لیے رشتہ ازدواج، بڑے اہتمام کے ساتھ، تمام تر

تقاضے پورے کر رہا ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں گے۔

ایسی صورت حال میں ہمیں ایسے متنوع خاندانوں کا نظام بھی دیکھنے کو ملے گا جس میں شادی کے جیون ساتھی مختلف یا نامساوی عمر کے ہوں گے۔ بڑی عمر کے افراد چھوٹی عمر کی لڑکیوں سے شادیاں کریں گے اور اسی طرح بڑی عمر کی خواتین چھوٹی عمر کے لڑکوں سے شادیاں کریں گی جو چیز اہمیت حاصل کر لے گی وہ عددی حساب سے عمر نہیں ہوگی بلکہ تکمیلی اقدار اور دلچسپیاں اور سب سے بڑھ کر، ذاتی ترقی کی سطح ہوگی۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شادی کے دو ساتھی عمر میں دلچسپی نہیں رکھتے ہوں گے بلکہ مقام و مرتبے میں دلچسپی رکھتے ہوں گے۔

اس جدید ترین صنعتی معاشرے میں بچے مسلسل بڑھتے ہوئے دائرہ کار میں نشو ونما پائیں گے جسے ''نیم...... برادر'' کہا جا سکے گا۔ لڑکے اور لڑکیوں کا ایک بڑا قبیلہ جنھیں دنیا میں، ان سے پہلے وقتوں میں موجود والدین کے مختلف سیٹ'' دنیا میں لائیں گے۔'' اس طرح کے ''اوسط'' خاندان کا کیا ہوگا، اس کا مشاہدہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ نیم برادر آج کے عم زاد کی طرح سے ہوں گے۔ وہ پیشہ ورانہ طور پر، یا ضرورت پڑنے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ لیکن وہ معاشرے کو انوکھے مسائل سے بھی دوچار کریں گے۔ مثال کے طور پر کیا نیم......بہن بھائی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو سکتے ہوں گے؟

یقینی طور پر بچے کا خاندان کے ساتھ رشتہ ڈرامائی طور پر تبدیل ہو جائے گا۔ شاید ماسوائے طبقاتی گروہوں میں، خاندان نوجوان نسل کو اقدار منتقل کرنے کی رہی سہی قوت سے بھی محروم ہو جائے گا۔ اس بات سے تبدیلی کے چلن اور رفتار میں مزید اضافہ ہو جائے گا اور اس سے وابستہ مسائل بھی گھمبیر ہو جائیں گے۔

ان تمام تبدیلیوں میں خوفناک اضافہ کرنا یا ان کی اہمیت کو کم کرنا بھی انتہائی دقیق ہوگا۔ اس بات کو شاذ ہی زیر بحث لایا جاتا ہے کہ انسانی معاملات میں ایک خفیہ آہنگ ہے جس نے اب تک معاشرے میں کلیدی استحکام پیدا کرنے والی قوت کی حیثیت سے کام کیا ہے: خاندان کا نظام۔

ہم اپنی زندگی کا آغاز بچے کی حیثیت سے کرتے ہیں؛ پھر ہم بڑے ہو جاتے ہیں؛ ہم اپنے والدین کا بنایا ہوا گھر چھوڑ دیتے ہیں؛ ہم بچے پیدا کرتے ہیں؛ جو بڑے ہو جاتے ہیں، گھر بار چھوڑ دیتے ہیں اور عمل کو دہراتے ہیں۔ یہ سلسلہ اتنے طویل عرصے سے، خود کار انداز میں، اس تسلسل اور پابندی کے ساتھ جاری و ساری ہے کہ انسان نے اس کو سطحی اور معمولی سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ انسانی ارضی منظر کا حصہ ہے۔

بلوغت کی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی بچے یہ جان لیتے ہیں اس عظیم سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے انھوں نے جو کردار ادا کرنا ہے وہ اب تبدیل ہو رہا ہے۔ خاندانی واقعات کا یہ قابل پیش گوئی سلسلہ تمام انسانوں کو، چاہے ان کا تعلق کسی بھی قبیلے یا معاشرے سے ہو، احساس تسلسل دیتا ہے، اشیا کے عارضی منصوبے میں ایک خاص مقام۔ خاندان کا یہ سلسلہ انسانی وجود میں شعور محفوظ رکھنے والے غیر متغیر یے ہیں۔

آج یہ سلسلہ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ہم لوگ جلد بڑے ہو جاتے ہیں۔ اپنے گھر بار کو جلد چھوڑ دیتے ہیں، شادی جلد کرتے ہیں اور جلد ہی بچے پیدا کرتے ہیں۔ انھیں بہت قریب رکھتے ہیں اور والدین بننے کے عمل کو بڑی تیزی سے پورا کرتے ہیں۔ یونیورسٹی آف شکاگو میں خاندانی کی نشوونما کے ماہر ڈاکٹر برنائس نیوگارٹن (Dr. Bernice Neugarten) ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں، ''اب رجحان واقعات کی تیز رفتار آہنگ کی طرف ہے جو خاندان کے سلسلے سے ہی معرض وجود میں آتا ہے۔''

لیکن اگر صنعت کاری نے اپنی تیز رفتاری سے، خاندان کے سلسلے کو بھی تیز کر دیا تھا تو جدید ترین صنعت کاری نے اس کے تباہ ہونے کا خطرہ لاگو کر دیا ہے۔ پیدائشی امور سے متعلق سائنسدان اب افسانوی چیزوں کو حقیقت کا روپ دے رہے ہیں، خاندانی امور سے متعلق رنگارنگ وہ تجربہ کاری جسے مخترع قسم کی اقلیتیں سرانجام دیں گی، ایسے اداروں کا پیشہ ورانہ والدین کی حیثیت اختیار کر جانا، عارضی اور سلسلہ شادیوں کی طرف بڑھتی ہوئی حرکت سے ہم نہ صرف اس سلسلے کو تیزی سے چلائیں گے بلکہ ہم غیر معمولی صورت حال، تجسس، غیر متوقع صورت بھی پیدا کر سکتے ہیں...... اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے ندرت......ایک ایسی صورت جو معمول کے مطابق ہے اور ایسی یقینی ہے جیسے مختلف موسم۔

جب ایک ماں کسی بچے کی پیدائش کے مرحلے کو کسی بیٹھے گھر کے ایک دورے سے محدود کر سکتی ہے، جب کسی ایک بیضے کو ایک رحم مادر سے دوسرے رحم میں منتقل کرنے سے قدیم یقین کو متزلزل کیا جا سکتا ہے کہ بچے کی نشوونما میں نو ماہ لگتے ہیں، بچے ایک ایسی دنیا میں افزائش پائیں گے جس میں خاندان اور کنبے کا سلسلہ، جو کسی رواں دواں اور یقینی ہوتا تھا، ذرا سا بے ہنگم پن کا شکار ہو جائے گا۔ اس پرانے سلسلے سے ایک اور اہم آہنگ ساز ہٹا لیا جائے گا، دانائی کا ایک اور ستون ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

[illegible] ہم یہ بات طے ہے کہ گزشتہ صفحات میں مذکورہ پیش رفت سے متعلق کوئی چیز بھی ناگزیر نہیں۔ اسی ([illegible]ت) میں ہماری وہ قوت پنہاں ہے جو تبدیلی کو تشکیل دیتی ہے۔ ہم ایک کے مقابلے میں دوسرا

مستقبل چن سکتے ہیں، تاہم ہم لوگ ماضی کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ خاندان کی (تشکیلی) صورتوں میں ہم پر دباؤ ڈالا جائے گا کہ ہم معاشیات، سائنس، ٹیکنالوجی اور سماجی تعلقات کی طرح، نئی چیزوں سے تعلق استوار کریں۔

جدید ترین صنعتی انقلاب انسان کو بربریت کی ان مختلف اقسام سے آزاد کر دے گا جو ماضی اور حال کی رکاوٹوں سے بھرپور، محدود چناؤ پر مبنی خاندان کی اقسام سے جنم لیتی ہیں۔ یہ ہر فرد کو آزادی کا وہ پیمانہ پیش کریں گی جو ابھی تک نامعلوم ہیں لیکن یہ آزادی کی ایک بھرپور قیمت کا بھی متقاضی ہوگا۔

جوں ہی ہم مستقبل میں داخل ہوں گے لاکھوں کی تعداد میں عمومی مرد و خواتین کو جذبات سے بھرپور ایسی ترجیحات کا سامنا ہوگا جو انتہائی ناآشنا، غیر آزمودہ ہوں گی کہ ماضی کے تجربات ان سے متعلق کم ہی راہنمائی کر سکیں گے۔ اپنے خاندانی تعلقات کے معاملے میں، زندگی کے دیگر پہلوؤں کی طرح، وہ مجبور ہوں گے کہ نہ صرف ناپائیداری سے ہم آہنگ ہوں بلکہ جدت و ندرت سے بھرپور اضافی مسائل سے بھی۔

لہٰذا بڑے اور چھوٹے دونوں قسم کے معاملات میں تضادات کے ہجوم میں اور اکثر نجی صورت حال میں معمول اور خلافِ معمول، قابل پیش گوئی اور ناقابل پیش گوئی، جانے اور انجانے کے درمیان توازن تبدیل ہو جائے گا۔ ندرت کی شرح بڑھ جائے گی۔

ایسے ماحول میں، تیزی سے تبدیلی کا شکار اور ناآشنائی میں مبتلا ہم مجبور کر دیئے جائیں گے، خاص طور پر جب ہم زندگی میں اپنا راستہ تلاش کرنے کے لیے نکلیں گے کہ ہم حق انتخاب کے ایک سلسلے میں سے اپنی ذاتی پسند کا انتخاب کریں اور اب ہمیں مستقبل کی تیسری مرکزیت کی خصوصیت کی طرف مڑنا چاہیے اور وہ ہے تنوع، کیونکہ یہ تینوں عوامل...... ناپائیداری، ندرت اور تنوع کا سمٹاؤ ہے، جو مطابقت پذیری کے تاریخی بحران کے لیے تیاری کا سامان ہے اور یہ ہی اس کتاب کا موضوع ہے: مستقبل کا صدمہ/ دھچکا۔

☆☆☆

چوتھا حصّہ

تنوع

بارھواں باب

بیش انتخاب کا نقطۂ آغاز

جدید ترین صنعتی انقلاب جہالت کے ریکارڈ میں ایسا ہی اضافہ کرے گا جیسا کہ ہم جمہوریت اور انسانی انتخاب کے مستقبل کے بارے میں یقین رکھتے ہیں۔

آج کے ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں آزادی کے مستقبل سے متعلق ایک مضبوط اتفاق موجود ہے۔ زیادہ سے زیادہ انفرادی انتخاب جمہوری تصوراتی چیز شمار کی جاتی ہے۔ تاہم اکثر مصنفین یہ پیش گوئی کرتے ہیں کہ ہم اس تصوراتی چیز سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ لوگ مستقبل کی ایک تاریک تصویر کھینچتے ہیں جس میں لوگ، بغیر دماغ کی، صارف نما مخلوق دکھائی دیتی ہے جو معیاری اشیا کے انبار میں گھرے ہوئے ہیں، معیاری سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، عمومی ثقافتی، معیاری غذا کھاتے ہیں اور مجبور کر دیے جاتے ہیں کہ معیاری طرز زندگی اپنائیں۔

اس طرح کی پیش گوئیوں نے مستقبل سے نفرت کرنے والی اور ٹیکنالوجی کے خوف میں گرفتار ایک نسل کو پروان چڑھا دیا، جیسا کہ کوئی شخص امید کر سکتا ہے۔

ایسے ہی انتہا پسند افراد میں سے ایک فرانسیسی مذہبی صوفی Jacques Ellul بھی ہیں، جن کی کتابیں درسگاہوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہیں، ان کے نظریات کی رو سے انسان ماضی میں زیادہ آزاد ہوتا تھا جب ''اس کے لیے انتخاب کرنا حقیقی طور پر ممکن ہوتا تھا''، اس کے برعکس آج ''کسی بھی صورت، انتخاب کا نمائندہ نہیں رہا۔'' اور آنے والے وقت کے لیے: ''انسان بظاہر ایک ریکارڈنگ کے آلے کی سی حیثیت تک محدود ہو جائے گا۔'' انتخاب کے ہاتھوں مجبور انسان مختلف چیزوں پر عمل پیرا ہو رہا ہوگا نہ کہ کوئی فعال کردار ادا کر رہا ہوگا۔ مسٹر Ellul وارننگ دیتے ہیں کہ وہ ایک ایسی مطلق العنان ریاست میں رہ رہا ہوگا جسے ویلویٹ کے دستانے پہنے ہوئے، گسٹاپو[1] (Gestapo) چلا رہی ہے۔

---

(۱) نازی دور کی خفیہ جرمن پولیس۔

آرنلڈ ٹوائنبی (Arnold Toynbee) کی بیشتر تحریروں کا موضوع بھی یہی......انتخاب کا ختم ہوجانا ہے۔ ہپی لوگوں کے گروہوں سے لے کر سپریم کورٹ کے جسٹسوں تک، چھوٹے سائز کے اخبارات کے اداریوں اور نظریہ وجودیت کے حامل فلسفیوں تک یہی بات دہرائی جا سکتی ہے۔ اپنی سادہ ترین شکل میں موجود ''انتخاب کے فنا ہونے'' کا نظریہ ایک خام قیاس پر ترقی کریں گے اور ان کے ترقی کرنے سے زمانۂ مستقبل، حال کے مقابلے میں، زیادہ معیاری ہو جائے گا۔ لہٰذا انسان بڑی تیزی سے آزادی انتخاب سے محروم ہوجائے گا۔

اس قیاس پر اندھا اعتقاد کرنے کی بجائے ہم نے اس کے تجزیے کے لیے ذرا توقف کیا اور اس نے ایک غیر معمولی دریافت کی۔ نہ صرف یہ منطق نقص پر مبنی ہے یہ تمام تصور ہی فطرت اور جدید ترین صنعتی انقلاب کے معنی ومفہوم سے ہی روگردانی کرتا ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ مستقبل سے تعلق رکھنے والے لوگ انتخاب کی عدم دستیابی کا نہیں بلکہ اس کی فراوانی دیکھیں گے۔ وہ لوگ جدید ترین صنعتی مخمصے کا شکار ہو سکتے ہیں: بیش انتخاب۔

مستنگ (Mustang) کو خود ڈیزائن کریں

یورپ یا امریکا میں سفر کرنے والا کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو وہاں پر واقع کسی گیس سٹیشن کی دوسرے گیس سٹیشن یا کسی ہوائی اڈے کی دوسرے ہوائی اڈے سے تعمیری مماثلت سے متاثر نہ ہوا ہو۔ کوئی شخص اگر مشروب پینا چاہ رہا ہے تو اسے کوکا کولا کی بوتل دستیاب ہوجائے گی اور وہ آئندہ پی جانے والی کوکا کولا کی بوتل جیسی ہی ہوگی۔ یہ بات طے ہے کہ پیداوار کی بہتات کے نتیجے میں ہمارے ظاہری ماحول کے مختلف پہلوؤں نے ہمارے دانشوروں کو سیخ پا کر دیا ہے۔ کچھ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ تمام ہوٹل ہلٹن کا نام ہی استعمال کررہے ہیں دیگر افراد شکایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ تمام بنی نوع انسان کو ایک ہی رنگ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

یقینی طور پر ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ صنعت کاری کا اثر یکسانیت پر مبنی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں یکساں اور مماثل چیزیں تیار کرنے کی صلاحیت ہی صنعتی دور کا نمایاں کارنامہ ہے۔ لہٰذا جب دانشور حضرات ہماری مادی اشیا کی یکسانیت کی شکایت کرتے ہیں تو وہ بجا طور پر صنعت کاری سے متعلق امور کی عکاسی کرتے ہیں۔

تاہم اسی رو میں بہتے ہوئے یہ لوگ جدید ترین صنعت کاری سے متعلق ناواقفیت کا مظاہرہ کرتے

ہیں۔ اس بات پر نظر رکھتے ہوئے کہ معاشرے کی حالت کیا ہوتی تھی، وہ اس بات سے نابلد ہیں کہ یہ بڑی تیزی سے کیا صورت اختیار کررہی ہے۔ مستقبل کا معاشرہ چیزوں کا ایک محدود اور معیاری بہاؤ ہی پیش نہیں کرے گا بلکہ معیار سے مبرا چیزوں اور خدمات کی وہ اقسام بھی پیش کرے گا جو کسی معاشرے نے کبھی نہ دیکھیں ہوں۔ ہم لوگ مادی معیاریت کی مزید توسیع کی طرف نہیں بڑھ رہے بلکہ اس کی منطقی نفی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

معیاریت کا اختتام پہلے سے ہی نظر میں ہے۔ اس کا ڈگر اور چلن ایک صنعت سے دوسری صنعت میں اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں مختلف ہوتا ہے۔ یورپ میں ابھی معیاریت کا عروج نہیں آیا (ابھی اسے اپنا سفر مکمل کرنے میں مزید ۲۰ یا ۳۰ سال لگیں گے) لیکن امریکا میں اس بات کے مضبوط شواہد موجود ہیں کہ تاریخی موڑ آ چکا ہے۔

مثال کے طور پر کچھ سال پہلے ایک تجارتی ماہر Kenneth Schwartz نے ایک حیران کن دریافت کی، وہ لکھتے ہیں، ''ایک انقلابی تبدیلی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جو کچھ گزشتہ پانچ سالوں میں بڑی صارف مارکیٹ میں سامنے آیا ہے، ایک جیسے مشترکہ یونٹ سے لے کر یہ ایک بڑی مارکیٹ ٹکڑوں اور حصوں پر مشتمل مارکیٹوں کے ایک سلسلے میں تقسیم ہوگئی ہے ان میں سے ہر ایک کی اپنی ضروریات، خاصیتیں اور انداز ہے۔'' اس حقیقت نے امریکی صنعت کو، ناقابل بیان حد تک تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کا نتیجہ صارف کو پیش کی جانے والی اشیا کے اصل بہاؤ میں حیران کن تبدیلی ہے۔

مثال کے طور پر فلپ مورس (کمپنی) نے ۲۱ سال تک سگریٹ کا ایک بڑا اور مشہور برانڈ فروخت کیا۔ اس کے برعکس ۱۹۵۴ء کے بعد سے اس کمپنی نے چھ نئے برانڈ متعارف کروائے اور ان برانڈوں میں سائز، فلٹر اور منتھول کے حوالے سے صارف کو اتنا حق انتخاب حاصل ہوگیا کہ اب اس کے سامنے ۱۶ مختلف چیزیں موجود ہیں۔ اس حقیقت کی اہمیت اتنی نہ ہوتی اگر ایسی ہی مثالیں پیداوار کے دیگر شعبوں میں نہ ہوتیں۔ گیسولین؟ حتیٰ کہ موٹر گاڑیاں چلانے والے امریکیوں کو ''ریگولر'' اور ''پریمیئم'' میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ آج وہ Sunoco (کمپنی) کے پمپ تک جاتا ہے اور وہاں اسے آٹھ مختلف بلینڈ اور مکسز (Mixes) میں سے انتخاب کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ روزمرہ استعمال (کریانہ) کی اشیاء؟ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۳ء تک کے درمیانی عرصے میں امریکی کریانہ فروشوں کی دکانوں کے شیلفوں میں مختلف صابن اور واشنگ پاؤڈروں کی تعداد ۶۵ سے بڑھ کر ۲۰۰ ہوگئی ہے؛ منجمد اشیا ۱۲۱ سے بڑھ کر ۳۵۰ ہوگئی ہیں؛ بیکنگ (Baking)

پاؤڈر کی اقسام ٨٤ سے بڑھ کر ٢٠٠ ہوگئیں، حتیٰ کہ پالتو جانوروں کے لیے کھانے کی اقسام کی تعداد ٥٨ سے ٨١ تک جا پہنچی ہیں۔

ایک اور بڑی کمپنی کارن پراڈکٹس (Corn Products) ایک پین کیک (Pancake) سیرپ تیار کرتی ہے جس کا نام Karo ہے۔ اس مال کو ملکی پیمانے پر متعارف کروانے کی بجائے یہ کمپنی دو قسم کے سیرپ فروخت کرتی ہے، اس کمپنی نے ایسا اس لیے کیا کہ انھیں یہ معلوم ہوا کہ کسی ایک خاص موسم میں، Pennsylvania کے لوگ دیگر امریکیوں کے مقابلے میں، اس سیرپ کو ذرا گاڑھا، استعمال کرنا پسند کرتے ہیں۔ دفتروں کی سجاوٹ اور فرنیچر کے شعبے میں بھی یہی عمل کارفرما ہے۔ جنرل فائر پروفنگ کمپنی (General Fire Proofing Company) جو اپنے شعبے کی ایک سرکردہ کمپنی ہے، کے پریذیڈنٹ جان اے سونڈرز (Hohn A. Sourders) کہتے ہیں، ''آج اس شعبے کی تیار شدہ اشیا کے نئے سٹائل اور رنگوں کی تعداد، دس سال پہلے دستیاب سٹائل اور رنگوں کے مقابلے میں دس گنا ہے، ہر ماہر تعمیرات سبز رنگ میں اپنی پسند کا شیڈ پسند کرتا ہے''۔ بالفاظ دیگر صارفین کی ضروریات کے حوالے سے، وسیع پیمانے پر تنوع پیدا کر رہی ہیں اور اپنی پیداوار کو (ضروریات کے مطابق) ہم آہنگ کر رہی ہیں۔ اس رجحان کو فروغ دینے میں دو معاشی عوامل کا کردار ہے: پہلا یہ کہ صارفین کے پاس اپنی خاص ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے وافر سرمایہ ہے؛ دوسرا، اور نسبتاً اہم چونکہ ٹیکنالوجی پیچیدہ تر ہو چکی ہے، تغیر کو متعارف کروانے کی قیمت میں کمی ہوئی ہے۔

یہ وہ نقطہ ہے جسے ہمارے سماجی ناقدین...... جن میں سے اکثر ٹیکنالوجی سے کم ہی واقف ہیں...... سمجھنے سے قاصر ہیں: یہ ابتدائی نوعیت کی ٹیکنالوجی ہے جو معیاریت کا اطلاق کرتی ہے۔ اس کے برعکس خودکاری لامتناہی، تاریک اور ذہن کو بے حس کر دینے والے تنوع کے لیے راستہ کھول دیتی ہے۔

ایک صنعتی انجینئر بورس یویٹز (Boris Yavitz) کہتے ہیں ''ایک غیر لچک دار یکسانیت اور پیداوار میں یکساں اشیا کا طویل سلسلہ جو ہماری کثیر پیداوار کا خاصہ ہے، اب اپنی اہمیت کھو رہے ہیں جبکہ عددی حساب سے کنٹرول کی جانے والی مشینیں، محض پروگرام کی تبدیلی سے، ایک پیداوار کے ماڈل یا سائز سے بآسانی دوسرے ماڈل یا سائز پر شفٹ کی جا سکتی ہیں...... پیداوار کی تھوڑی مقدار بھی اب معاشی طور پر ممکن ہے''۔ کولمبیا یونیورسٹی گریجویٹ سکول آف بزنس کے پروفیسر وین کورٹ ہیئر جونیئر (Prof. Van Court Hare Jr.) کہتے ہیں، ''خودکار آلات...... چھوٹی مقدار میں پیداوار کی زیادہ اقسام کو، بڑی مقدار کے پیداواری اخراجات کے

اندر ہی، ممکن بناتے ہیں۔'' بہت سے انجینئر اور ماہرین تجارتی امور ایسے وقت کی بھی پیش گوئی کرتے ہیں جب تنوع (سے بھرپور پیداوار) پر یکسانیت (سے بھرپور پیداوار) جتنے ہی اخراجات ہوں گے۔

اس بات کا معلوم ہو جانا کہ خودکاری سے پہلے کی ٹیکنالوجی معیاریت کو ہی جنم دیتی ہے جبکہ جدید ترین ٹیکنالوجی کے مرہون منت تنوع کو ملاحظہ کرنے کے لیے امریکا کی متنازع قسم کی جدت، سپر مارکیٹ پر ایک نظر ہی کافی ہے۔ گیس سٹیشنوں اور ہوائی اڈوں کی طرح سپر مارکیٹیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے وہ میلان (Milan) یا ملواکی (Milwaukee) میں واقع ہوں۔ ان سپر مارکیٹوں نے ہزاروں چھوٹے چھوٹے ''موم اینڈ پوپ'' (Mom and Pop) ختم کر دیے اور انھوں نے، بلاشبہ، تعمیراتی ماحول کی یکسانیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تاہم ان مارکیٹوں میں صارف کو فراہم کیے جانے والے مال کا ذخیرہ اور اس میں موجود تنوع، کسی چھوٹے سٹور میں سٹاک کیے گئے مال کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور چھوٹے سٹور کے لیے اتنا مال رکھنا ممکن نہیں۔ لہٰذا اس سپر مارکیٹوں سے تعمیراتی یکسانیت کی حوصلہ افزائی تو ہوتی ہے تاہم یہ طباخی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تنوع بھی فراہم کرتے ہیں۔

اس تضاد کی وجہ انتہائی سادہ ہے: کھانوں اور کھانوں کی چیزوں کی پیکنگ کی ٹیکنالوجی تعمیراتی تکنیک سے کہیں زیادہ جدید ہے۔ بے شک تعمیرات کا سلسلہ کثیر پیداوار کی سطح تک شاذ ہی پہنچتا ہے؛ یہ بڑی سطح تک، ماقبل صنعتی ہنر کی حیثیت سے ہی موجود ہے۔ مقامی تعمیراتی کوڈ اور روایتی تجارتی یونینوں تلے دبی ہوئی اس صنعت کی ٹیکنالوجی ترقی کی شرح دیگر صنعتوں کے مقابلے میں انتہائی کم ہے۔ ٹیکنالوجی جتنی جدید ہوگی اسے پیداواری اقسام متعارف کروانا اتنا ہی ارزاں پڑے گا۔ لہٰذا ہم بآسانی اس بات کی پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ جب تعمیراتی صنعت اپنی پیداوار کے لیے ٹیکنالوجی کی جدت سے ہم آہنگ ہو جائے گی تو گیس سٹیشنز، ہوائی اڈے، ہوٹل اور سپر مارکیٹیں ہمیں ایسی دکھائی نہیں دیں گی کہ جیسے وہ ایک ہی سانچے میں بن کر نکلی ہوں۔ یکسانیت تنوع کے لیے راہیں کھول دے گی۔[1]

اب جبکہ یورپ اور جاپان کے مختلف حصے تمام تر ضروریات پوری کرنے والی سپر مارکیٹیں بنا رہی

---

(١) جہاں جہاں اس عمل کا آغاز ہو گیا ہے وہاں پر نتائج حیران کن ہیں۔ مثال کے طور پر واشنگٹن ڈی سی میں کمپیوٹر سے ڈیزائن کردہ ایک اپارٹمنٹ ہاؤس ہے، جس کا نام واٹر گیٹ ایسٹ (Watergate East) ہے۔ اس عمارت کی کوئی سی دو منزلیں ایک جیسی نہیں۔ ٢٤٠ اپارٹمنٹ میں سے ١٦٧ کے فرشوں کا پلان مختلف ہے۔ اور اس عمارت میں کسی بھی جگہ، [illegible] کے ساتھ کوئی سیدھی لکیریں نہیں ہیں۔

ہیں، امریکا اگلی سیڑھی پر چڑھ گیا ہے۔ خصوصی سپر سٹوروں کا آغاز، ان سٹوروں پر صارف کے لیے دستیاب چیزوں کا دائرہ کار مزید وسیع تر ہو گیا ہے (یقینی طور پر کسی کی سوچ سے بالاتر)۔ واشنگٹن ڈی سی میں واقع اسی قسم کا سٹور بیرونی ممالک کے کھانوں میں خصوصی شہرت رکھتا ہے جس پر کھانے کی انوکھی چیزیں بھی دستیاب ہیں جیسے Hippopotamas Steak (گینڈے کے گوشت کے قتلے)، (چھوٹے مگرمچھ) گھڑیال کا گوشت، جنگلی برفانی خرگوش اور ۱۳۵ اقسام کا شہد۔

یہ تصور کہ ابتدائی صنعتی تکنیک یکسانیت کو جنم دیتی ہے جبکہ جدید ترین خودکار تکنیک تنوع پیدا کرتی ہیں، کاروں کی صنعت میں ہونے والی حالیہ تبدیلیوں کی وجہ سے ڈرامائی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ امریکی منڈیوں میں ۱۹۵۰ء کی دہائی میں یورپ اور جاپان کی بنی ہوئی کاروں کے متعارف ہونے سے خریداروں کے لیے انتخاب کی نئی راہیں کھل گئیں اور اسے انتخاب کے لیے نصف درجن کی بجائے (مختلف کمپنیوں کی بنی ہوئی) پچاس کاریں مل گئیں۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں انتخاب کی یہ وسعت بھی محدود معلوم ہوتی ہے۔

بیرونی کمپنیوں سے مقابلے کے پیش نظر ڈیٹرائٹ (Detroit) کمپنی نے ان بڑے صارفین کے لیے نئی راہ نکالی۔ اس نے یکساں قسم کی ایک بڑی مارکیٹ نہیں بنائی بلکہ عارضی قسم کی چھوٹی مارکیٹیں بنائیں۔ اسی فعل سے متعلق ایک مصنف نے کہا کہ اس کمپنی نے ''صارفین ایسی روایتی کاریں چاہتے تھے جو انھیں ایسا تاثر دیں کہ سب کاریں ایک ہی جیسی ہیں۔'' ایسا تاثر پیدا کرنا پرانی ٹیکنالوجی کے ساتھ ناممکن تھا؛ نئے کمپیوٹرائزڈ اسمبلی سسٹم نے نہ صرف اس تاثر (فریب) کو عملی جامہ پہنا ڈالا بلکہ مختصر سے عرصے میں۔ حقیقت کا رنگ دے دیا۔

لہٰذا فورڈ کمپنی نے قابل دید اور انتہائی کامیاب قسم کی کار مستنگ (Mustang) متعارف کروائی اور وہ بھی اس انداز سے کہ ''آپ خود اسے ڈیزائن کریں'' کی بنیاد پر ایک نقاد رینیر بینہم (Reyner Banham) اسے یوں بیان کرتے ہیں، ''اب معمول کے مطابق بنائی جانے والی مستنگ نہیں رہی، اب چند چیزوں کے انتخاب کا اختیار دیا گیا ہے جو مختلف ملاپ سے بنائی جائیں گی اور ان کا امتزاج کچھ یوں گا:

۳ (باڈیاں) ×۴ (انجن) ×۳ (ٹرانسمیشن) ×۴ اعلیٰ کارکردگی کے انجن ماڈیفیکیشن کے بنیادی سیٹ-۱ (راک باٹم کے چھ سلنڈر) کار جس پر ان تبدیلیوں کا اطلاق نہیں ہوتا..........'' (شلبی گرینڈ ٹورنگ

اور ریسنگ کے سیٹ اپ جس کا تعلق صرف ایک باڈی شیل سے ہے نہ کہ تمام انجن/ٹرانسمیشن کمبینیشن سے) اس میں (کار کے) رنگ، سیٹوں اور کار کی اندرونی چیزوں اور اپنی مرضی سے لگوائے جانے والے آلات کا ذکر نہیں ہے۔

کاروں کے خریدار اور انھیں فروخت کرنے والے دونوں حضرات ان کاروں میں موجود اور ممکنہ سہولیات کے انتخاب سے مبرا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ خریدار کے لیے انتخاب کا مسئلہ گھمبیر ہوتا چلا جا رہا ہے، ہر نئے انتخاب کے شامل ہونے سے مزید معلومات، مزید فیصلوں اور ذیلی فیصلوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو آئندہ کار خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے، جیسے میں خود ہوں، اس نتیجہ پر جلد ہی پہنچ جاتا ہے کہ مختلف ماڈلوں، برانڈ لائنوں اور حق انتخاب سے متعلق جاننے کے لیے (حتیٰ کہ طے شدہ قیمت کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی) کئی دنوں کی ''شاپنگ'' اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ عنقریب کار کی صنعت اس مقام پر پہنچ جائے گی جہاں (اس کمپنی کی) ٹیکنالوجی بڑی کفایت سے، صارف کی ضروریات اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی، تنوع پیدا کر سکتی ہے۔

ہم لوگ اپنی مادی ثقافت کی عدم معیاریت کی طرف سفر شروع کر رہے ہیں۔ مارشل میکلوہن نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ ''ارمیکا کی بنی ہوئی بہت سی کاریں آج بھی، ایک خاص حوالے سے، روایتی طور پر تیار کردہ ہیں۔ مثال کے طور پر نئی فیملی سپورٹس کار کے دستیاب سٹائل، انتخاب اور رنگوں کی اقسام کے ساتھ ایک ماہر کمپیوٹر، خریدار کے لیے ۲۵،۰۰۰،۰۰۰ نمونے بنا سکتا ہے...... جب خودکار الیکٹرانک پیداوار اپنے عروج پر پہنچ جائے گی تو یہ ممکن ہوگا کہ لاکھوں نے مختلف قسم کی چیزیں اور پھر ان کی نقل بنائی جا سکے۔ پیداوار اور اس کی کھپت پر صرف اور صرف انسانی تخیل کی حدود ہوں گی۔'' مسٹر میکلوہن کے دیگر بہت سے قضیے متنازع اور بحث طلب ہیں۔ مگر یہ نہیں۔ ٹیکنالوجی جس راستے پر رواں دواں ہے اس حوالے سے ان کا موقف بالکل درست ہے۔ مستقبل کی مادی چیزیں بہت سی ہوں گی، لیکن وہ (کامل) معیاری نہیں ہوں گی۔ دراصل ہم لوگ بیش انتخاب کی طرف رواں دواں ہیں۔ ایک ایسا مقام جہاں تنوع اور انفرادیت کے مفادات خریدار کے فیصلہ کرنے کے عمل کی پیچیدگی کے سبب منقطع کر دیے جاتے ہیں۔

کمپیوٹر اور کمرۂ جماعت

کیا ان میں سے کسی چیز سے فرق پڑتا ہے؟ کچھ لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ مادی چیزوں کے

ماحول میں تنوع اس وقت تک غیر اہم ہے جب تک ہم ثقافتی یا روحانی یکسانیت کی طرف دوڑ لگا رہے ہیں۔ وہ لوگ ایک مشہور برانڈ کے سگریٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ''جو چیز اندر ہے، اس کی اہمیت ہے۔''

یہ خیال بڑی شدت سے مادی اشیا کی انسان کی شخصی تفریق کی علامت کی حیثیت سے اہمیت کا ناکافی اندازہ کرتا ہے اور یہ بڑے احمقانہ طریقے سے، اندرونی اور بیرونی ماحول کے درمیان ایک تعلق کا بھی انکار کرتی ہے۔ وہ لوگ جنھیں انسانوں کی معیاریت کا خدشہ ہے انھیں چیزوں کی عدم معیاریت کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ کیونکہ انسان کو دستیاب اشیا میں تنوع میں اضافہ کرنے سے ہم ان تفریق کے امکانات میں شماریاتی اضافہ کر دیتے ہیں جس میں انسان رہتا ہے۔

تاہم سب سے اہم قضیہ یہ ہے کہ ہم لوگ بڑی تیز رفتاری سے ثقافتی یکسانیت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ اس کا ''الٹ'' ہی درست ہے۔ یہ کہنا عمومی صورت سے روگردانی ہے لیکن ہم تیزی سے تنوع اور انتشار کی طرف بڑھ رہے ہیں نہ صرف مادی پیداوار میں بلکہ فنون، تعلیم اور مجموعی ثقافت میں بھی۔

کسی خواندہ معاشرے میں ثقافتی تنوع کا ایک ظاہری ٹیسٹ اس معاشرے میں موجود آبادی کی فی ملین شرح کے حساب سے، مختلف موضوعات پر، شائع ہونے والی کتابوں سے کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کا ذوق جتنا محدود ہوگا، فی ملین کے حساب سے چھپنے والے (کتابوں کے) عنوانات ہوں گے، اور ان کے ذوق میں جتنا تنوع ہوگا کتابوں کی تعداد اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس تعداد میں کمی یا بیشی معاشرے میں ثقافتی تبدیلی کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔ یونیسکو (Unesco) کے زیر اہتمام کتابوں کے رجحان پر ہونے والے مطالعے کا یہی موضوع تھا۔ یہ مطالعہ یونیورسٹی آف بورڈیوکس (Bordeaux) میں سنٹر فار سوشیالوجی آف لٹریچر کے ڈائریکٹر رابرٹ ایسکارپٹ (Robert Escarpit) نے ترتیب دیا۔ اس مطالعے نے ثقافتی عدم معیاریت کی طرف، عالمی سطح پر، منضبط قسم کی تبدیلی اور اس کے ڈرامائی شواہد بیان کیے ہیں۔

لہٰذا ۱۹۵۲ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیانی عرصے میں کثیر تعداد میں کتابیں شائع کرنے والے ۲۹ ممالک میں تنوع کا اشاریہ ۲۱ تک جا پہنچا۔ وہ ممالک جو خواندگی میں تنوع کے اعلیٰ پیمانوں کو چھو رہے ہیں ان میں کینیڈا، امریکا اور سویڈن شامل ہیں جن اشاریوں میں اضافہ ۵۰ فی صد یا اس سے زائد۔ برطانیہ، فرانس،

جاپان اور ہالینڈ نے اسی حوالے سے اپنے اشاریوں میں ۱۰ سے ۲۵ فی صد کا اضافہ کیا۔ وہ آٹھ ممالک جو معکوس سمت میں چلے گئے۔ یعنی ادبی چیزوں کی عظیم معیاریت...... ان میں ہندوستان، میکسیکو، ارجنٹائنا، اٹلی، پولینڈ، یوگوسلاویہ، بیلجیئم اور آسٹریا شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی ملک میں ٹیکنالوجی جتنی جدید اور ترقی یافتہ ہوتی چلی جائے گی اس بات کا امکان بھی بڑھتا چلا جائے گا کہ وہ ملک ادبی تنوع کی سمت میں بڑھ رہا ہے اور یکسانیت سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔

تکثیریت کی طرف یہ سفر ہمیں مصوری میں بھی نظر آتا ہے جہاں ہمیں مختلف فن پاروں کی تیاری میں وسعت نظر آتی ہے۔ حقیقت نگاری، علامت نگاری، سرئیل ازم، تجریدی حقیقت نگاری، ہارڈ ایج (Hardedge)، پوپ، حرکی اور سینکڑوں دیگر سٹائل، بیک وقت معاشرے میں متعارف ہو چکے ہیں۔ ایک یا دو اسلوب مصوری کی گیلریوں میں، عارضی طور پر غالب آ سکتے ہیں مگر ان میں سے کوئی آفاقی یا (مستقل) سٹائل نہیں ہے۔ یہ ایک تکثیری مارکیٹ ہے۔

جب مصوری قبائل کی مذہبی سرگرمی تھی تو مصور تمام طبقے کے لیے مصوری کرتا تھا۔ اس کے بعد مصور نے سرمایہ دارانہ اشرافیہ کے چھوٹے سے طبقے کے لیے کام کیا۔ اس کے بعد مصوری سے لطف اندوز ہونے والے ایک مخلوط طبقے کی حیثیت اختیار کر گئے۔ آج اس کی مصوری دیکھنے والے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم شدہ افراد کی ایک بڑی تعداد ہے۔ جان میک ہیل (John Mchale) کے نزدیک: ثقافتی پس منظر میں یکساں ترین ابتدائی دور کی روایتی غاریں تھیں۔ ہماری معاصرانہ ثقافت کا سب سے شاندار وصف متبادل ثقافتی انتخاب کی وسعت اور تنوع ہے...... کسی گہرے مشاہدے سے یہ انبار اور انبوہ بہت سے چھوٹے حاضرین میں تقسیم ہو جاتا ہے''۔

بلاشبہ مصور اب آفاقی نوعیت کے سامعین کے لیے مصوری کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر وہ ایسا کرنے کا سوچتے بھی ہیں تو وہ اس ذوق اور سٹائل کو ترجیح دیتے ہیں جس کو معاشرے کا ایک یا دوسرا ذیلی گروہ پسند کرے۔ Pancake سیرپ اور کاریں تیار کرنے والوں کی طرح مصور بھی ''چھوٹی مارکیٹیں'' تشکیل دیتے ہیں اور جونہی ان مارکیٹوں میں اضافہ ہوتا ہے مصور کے کام کی نوعیت تنوع سے بھرپور ہو جاتی ہے۔

اس دوران تنوع کی طرف رجحان تعلیم کے شعبے میں بھی بہتر مجادلہ پیدا کر رہا ہے۔ صنعت کاری کے عروج سے مغربی ممالک اور خصوصاً امریکا میں تعلیمی شعبے بنیادی اور معیاری قسم کے تعلیمی پیکیج بنانے میں

مصروف ہیں۔ یہ بات کوئی حادثاتی نہیں کہ اس خاص لمحے جب صارف نے تنوع کے لیے تقاضا کیا اور پھر اسے حاصل کرلیا، اس لمحے جب جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے عدم معیاریت کو ممکن کرتی ہے، کالج کیمپس پر غلبہ پانے کے لیے بغاوت کی ایک لہر اٹھی۔ اگرچہ اس تعلق کا شاذ ہی نوٹس لیا گیا، کیمپس میں منعقدہ واقعات اور صارف کی مارکیٹ میں ہونے والے واقعات ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔

طالب علم کی ایک بنیادی شکایت یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک فرد کی حیثیت سے برتاؤ نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ کیا جانے والا برتاؤ ایک غیر منفرد ''دلیے'' کی طرح ہے بجائے کسی انفرادی حیثیت کی حامل غذا کے۔ مستنگ (Mustang) کار کے خریدار کی طرح طلبہ بھی ذاتی حیثیت کا ڈیزائن چاہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ صنعت صارف کی طلب پر فوری ردِعمل کا مظاہرہ کرتی ہے جبکہ روایتی حوالے سے، تعلیم طلبہ کے تقاضوں سے، بے بہرہ دکھائی دیتی ہے۔ (ایک معاملے میں ہم کہتے ہیں ''صارف بہتر جانتا ہے''؛ جبکہ دیگر معاملے میں ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ''والد...... یا اس کا قائم مقام تعلیمی نگران...... بہتر جانتا ہے'') لہٰذا ایک طالب علم کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ تعلیمی صنعت کو، تنوع کے (اپنے) مطالبے پر ردِعمل (ظاہر) کرنے کے لیے جدو جہد کرے۔

اگرچہ بہت سے کالجوں اور یونیورسٹیوں نے آفر کیے جانے والے کورسز کا دائرہ کار بہت وسیع کر دیا ہے۔ لیکن یہ ڈگریوں، درجے اور اسی طرح کے دیگر پیچیدہ قسم کے نظاموں پر مبنی معیارات کے نظاموں سے جڑا ہوا ہے۔ یہ نظام وہ بنیادی ٹریک فراہم کرتے ہیں جس پر تمام طلبہ کو چلنا ہوتا ہے۔ اگرچہ تعلیم کے شعبے سے وابستہ لوگ متبادل قسم کے راستوں کی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں تاہم متنوع بنانے کا چلن طلبہ کے لیے کسی طرح بھی کافی نہیں۔ اس بات سے ہی وضاحت ہو جاتی ہے کہ طلبہ نے امدادی یونیورسٹیاں کیوں بنا رکھی ہیں۔ تجرباتی کالج اور نام نہاد مفت یونیورسٹیاں...... جس میں ہر طالب علم آزاد ہے کہ حیران کر دینے والے مخلوط قسم کے کورسز بھی متعارف کروائے گئے ہیں جن میں گوریلا لڑائی کے گُر اور سٹاک مارکیٹ کی تکنیک سے لے کر بدھ مت اور ''خفیہ تھیٹر'' تک موجود ہے۔

سال ۲۰۰۰ء سے بہت پہلے ڈگریوں، اعزازات اور انعامات کا سلسلہ ابتر ہو جائے گا۔ کوئی سے دو طلبہ بھی یکساں تعلیمی کورسز (یا ڈگر) پر نہیں چلیں گے کیونکہ طلبہ اعلیٰ تعلیم کی عدم معیاریت اور جدید ترین صنعتی

تنوع پر زور دے رہے ہیں تاکہ وہ (اس معاشرے میں) ان کی ضروریات پوری کر سکے۔

مثال کے طور پر یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ فرانس میں طلبہ کی ہڑتال کا بڑا فائدہ یونیورسٹی کے نظام کی بڑے پیمانے پر لامرکزیت تھی۔ لامرکزیت کی وجہ سے بڑے پیمانے پر علاقائی تنوع پیدا ہوا اور اس بات کا بھی امکان پیدا ہوا کہ مقامی انتظامیہ اپنا نصاب تبدیل کرے اور طلبہ سے متعلق ضابطوں اور انتظامی امور میں تبدیلیاں رونما ہوں۔

عوامی سکولوں میں بھی ایک متوازی انقلاب رونما ہوا ہے اور یہ صورت حال بھی کھلی جارحیت کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ جیسے برکرلے (Berkerley) کے مقام پر ہونے والی شورش جس نے عالمی سطح پر طلبہ احتجاج کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کا آغاز ایک ایسی چیز سے ہوا تھا جو پہلے پہل ہمیں صرف مقامی مسئلہ ہی نظر آتا تھا۔

نیویارک شہر، جس کا عوامی تعلیمی نظام ۹۰۰ سکولوں پر مشتمل ہے اور یہ امریکا میں عوامی سطح پر، سکول کے چالیس طلبہ میں سے ایک کا ذمہ دار ہے، کو اساتذہ کی تاریخی ہڑتال دیکھنا پڑی۔ اور یہ ہڑتال لامرکزیت کے مسئلے پر تھی۔ اساتذہ کی ہڑتالی قطاریں، والدین کا بائیکاٹ اور فساد نما ہنگامے اس شہر کے سکولوں کا معمول بن گیا ہے۔ سکول کے غیر مؤثر ہونے کی وجہ سے ناراض والدین اور شوریدہ سر قسم کا نسلی تعصب، سیاہ فام والدین، جنھیں کئی طبقاتی قوتوں کی تائید بھی حاصل ہے۔ تقاضا کرتے ہیں کہ سکول کا تمام نظام چھوٹے چھوٹے ''طبقاتی طور پر کنٹرول کیے جانے والے'' سکول کے نظاموں میں تبدیل کر دیا جائے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیویارک کی سیاہ فام آبادی، جسے نسلی انضمام اور معیاری تعلیم کے مطالبوں پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اپنے سکولوں کا نظام چاہتی ہے۔ وہ ایسا نصاب چاہتی ہے جس میں سیاہ فام لوگوں کی تاریخ موجود ہو۔ وہ ایسے سکول کا قیام چاہتی ہے جس میں والدین کی زیادہ سے زیادہ عمل داری ہو جو کم از کم اس موجودہ بڑے افسر شاہانہ اور سخت گیر نظام سے بہتر ہو۔ مختصر یہ کہ یہ آبادی اپنا جداگانہ حق مانگتی ہے۔

تاہم بنیادی اور اہم قسم کے معاملات نسلی تعصب پر سبقت لے جاتے ہیں۔ اب تک امریکا کے بڑے شہری سکولوں کا نظام یکسانیت کے مضبوط اثرات رکھتا ہے۔ شہری وسعت اور مخصوص نصاب کو حتمی صورت دینے کے بعد، نصاب کے اسباق اور عملے کو شہری بنیادیں چننے سے، انھوں نے سکولوں پر مناسب قسم کی یکسانیت کا اطلاق کر دیا ہے۔

آج لامرکزیت کا وہ دباؤ جو ڈیٹرائٹ(Detroit)واشنگٹن، ملواکی اور امریکا کے دیگر بڑے شہروں تک پھیل چکا ہے(اور جو، مختلف صورتوں میں، یورپ تک پھیل جائے گا) وہ صرف سیاہ فام لوگوں کی تعلیم کو بہتر بنانے کی ایک کاوش نہیں مرکزیت پر مبنی، شہری وسعت تک پھیلی ہوئی سکول پالیسیوں کو ختم کرنے کی آواز ہے۔ یہ سکولوں کو مقامی حکام کے سپرد کر کے عوامی تعلیم میں مقامی رنگ ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔ مختصراً یہ کہ یہ کوشش بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آخر میں تعلیم میں تنوع لانے کی بڑی کوشش کا حصہ ہے اور نیویارک میں اس کوشش کو عارضی طور پر روکنے اور وہ بھی ایک ٹریڈ یونین کی ہٹ دھرم قسم کی مزاحمت کے ذریعے، کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تاریخی قوتیں جو لامعیاریت کی طرف گامزن ہیں انھیں ہمیشہ کے لیے روک لیا جائے گا۔

اپنے نظام میں رہتے ہوئے تعلیم کو متنوع بنا دینا اس نظام کے باہر متبادل تعلیمی مواقع میں اضافے کا باعث ہے۔ لہٰذا آج ہمارے پاس سرکردہ ماہرین تعلیم اور ماہرین عمرانیات کی تجاویز موجود ہیں، جن میں Kenneth B. Clark اور Christopher Jencks بھی شامل ہیں، جو سرکاری پبلک سکول سسٹمز کے دائرہ کار سے باہر نئے سکولوں سے متعلق ہیں جبکہ ان سکولوں سے مسابقت بھی جاری رہے۔ مسٹر کلارک نے علاقائی اور ریاستی سکولوں، فیڈرل سکولوں، کالجوں کے زیر اہتمام چلنے والے سکولوں، ٹریڈ یونینوں، کارپوریشنوں حتیٰ کہ فوجی یونٹوں کی تشکیل پر بھی زور دیا ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اس قسم کے مسابقتی سکول اس تنوع کو پیدا کرنے میں مددگار ہوں گے جو تعلیم کے لیے ناگزیر ہے۔ بیک وقت، نسبتاً نیم باضابطہ انداز میں، امدادی سکولوں کی مختلف صورتیں ہپیوں اور دیگر گروپوں کے زیر اہتمام قائم ہو چکی ہیں کیونکہ یہ لوگ اس مرکزی تعلیمی نظام کو ضرورت سے زیادہ یکسانیت کا شکار سمجھتے ہیں۔

لہٰذا ہمیں یہاں پر معاشرے میں ایک بڑی ثقافتی قوت نظر آتی ہے۔ تعلیم جو اپنی پیداوار کو متنوع بنانے کی کوشش کر رہی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے معیشت کرنا چاہ رہی ہے اور یہاں بھی مادی پیداوار کے شعبے کی طرح، جدید ٹیکنالوجی، معیاریت کو پروان چڑھانے کی بجائے، ہمیں اعلیٰ ترین تنوع کی طرف لے جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک بڑے سکول کے لیے کمپیوٹر یہ ممکن بناتے ہیں کہ ایک خاص لچک کے ساتھ، اپنی کارکردگی کو جاری و ساری رکھے۔ یہ کسی سکول کے لیے اس بات کو بھی ممکن بناتا ہے کہ آزاد تعلیم سے ہم آہنگ ہو جو نصاب کی ایک وسیع اقسام اور مختلف غیر نصابی سرگرمیوں کو بھی متعارف کروائے۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ کمپیوٹر کی مدد سے دی جانے والی تعلیم، تیار شدہ ہدایات اور دیگر تکنیک، تمام تر عوامی غلط فہمیوں کے باوجود،

بڑے منطقی انداز میں کلاس روم میں تنوع کے امکان میں اضافے کا باعث ہیں۔ وہ اس بات کا سامان مہیا کرتے ہیں کہ ہر طالب علم اپنے ذاتی چلن سے آگے بڑھے۔ وہ اس بات کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں کہ طالب علم عام ڈگر سے ہٹ کر معلومات کا حصول کرے بجائے ایک غیر لچک دار نصاب کے جیسا کہ روایتی صنعتی دور کی کلاس میں ہوا کرتا تھا۔

مزید یہ کہ آنے والے وقت کی تعلیمی دنیا میں بڑے بڑے پیمانے پر پیداوار، کام کی مرکزی جگہ بھی اپنی اہمیت کم کر دیں گے۔ جیسے بڑے بڑے پیمانے پر معاشی پیداوار فیکٹریوں میں بڑی تعداد میں محنت کشوں کو جمع ہونے کا تقاضا کرتی ہے، بڑے پیمانے پر تعلیمی پیداوار بھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ طلبہ بڑی تعداد میں سکولوں میں جمع ہو جائیں۔ یہ اپنے اندر، یکساں نظم وضبط کے مطالبے، متواتر گھنٹوں، حاضری کے ضابطوں اور دیگر تقاضوں کے ساتھ ایک معیاری قوت تھی۔ مستقبل میں جدید ٹیکنالوجی ان میں سے زیادہ تر کو غیر ضروری کر دے گی۔ تعلیم کا زیادہ تر حصہ طالب علم کے گھر کے کمرے یا اقامتی کمرے میں، اس کی مرضی کے مطابق مقرر کردہ وقت کے مطابق مکمل کیا جائے گا۔ لائبریریوں میں دستیاب وسیع تر مواد کمپیوٹرائزڈ انفارمیشن ریٹریول سسٹمز (Computerized Information retrieval Systems) کے ذریعے اس تک پہنچے گا، اس کی اپنی ٹیپ اور ویڈیو یونٹوں، اس کی اپنی لینگویج لیبارٹری(Language Laboratory) اور اس کے اپنے الیکٹرانک سٹڈی کیرل(Study Carrel) کی موجودگی اور دستیابی کی وجہ سے، وہ زیادہ تر وقت، ان پابندیوں اور ناخوشگواریوں سے دور گزارتے ہیں جس کا سامنا انھیں ایک بند کلاس روم میں کرنا پڑتا تھا۔

وہ ٹیکنالوجی جس پر ان نئی آزادیوں کی بنیاد ہوگی وہ یقینی طور پر، آنے والے وقت میں سکول میں پھیل جائے گی اور اس بات میں شک نہیں کہ اس کے پھیلاؤ میں IBM، RCA اور Xerox جیسی کمپنیاں اہم ترین کردار ادا کریں گی۔ تیس سال کے اندر امریکا اور مغربی یورپ کے کئی ممالک کے نظام تعلیم ماضی کی تدریسی پیداوار کی کثیر پیداوار کو توڑ دیں گے اور وہ تعلیمی تنوع کے ایک عہد میں داخل ہو جائیں گے جس کی بنیاد نئی مشینوں کی چھٹکارا دلانے والی قوت پر ہوگی۔

لہٰذا تعلیمی شعبے میں مادی اشیا کی پیداوار کی طرح معاشرہ بلا روک ٹوک معیاریت کی طرف بڑھنے کی بجائے اس سے دور ہو رہا ہے۔ یہ مسئلہ محض زیادہ اقسام کی گاڑیوں، واشنگ پاؤڈر اور سگریٹوں والا نہیں۔ تنوع اور تیزی سے بڑھتے ہوئے حق انتخاب کے لیے سماجی دھکا ہمارے ذہنی اور مادی ماحول کو متاثر کرتا ہے۔

''ڈریگ کوئین'' فلمیں

وہ تمام قوتیں جنھیں جدید ذہن کو یکسانیت بخشنے کا موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے، ان میں سے چند کو متواتر اور شدید ترین تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے جیسے ذرائع ابلاغ۔ امریکا اور یورپ میں موجود دانشوروں نے تقریروں، عادات اور لوگوں کے ذوق کو یکسانیت کا شکار کرنے کا دوش دیتے ہوئے، خاص طور پر ٹیلی وژن پر تنقید کی۔ انھوں نے اسے لان کو ہموار کرنے والا رولر قرار دیا جس نے ہمارے علاقائی فرق مٹاتے ہوئے، ثقافتی تنوع اور اقسام کی آخری نشانیاں بھی مٹا ڈالیں۔ اس پھلنے پھولنے والی اکادمی کی صنعت نے جریدوں اور فلموں پر ایک ہی جیسے الزامات لگائے۔

اگرچہ ان الزامات میں سے کچھ درست بھی ہیں، تاہم وہ لوگ انتہائی اہمیت کے حامل ان مخالف رواجوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو تنوع پیدا کرتے ہیں نہ کہ معیاریت۔ ٹیلی وژن، اپنی تیار کردہ چیزوں کی بھاری لاگت اور محدود تعداد کے چینلوں کے ساتھ، اب بھی بڑی تعداد میں ناظرین کا مرہون منت ہے۔ لیکن ابلاغ کے دیگر ذرائع میں بھی ہم کثیر تعداد میں سامعین و حاضرین کے رجحان میں کمی دیکھ رہے ہیں۔ ہر جگہ پر ''مارکیٹ کی دلچسپی والے حصے'' پر زور ہے۔

ایک نسل پہلے، امریکا میں فلمیں دیکھنے والے صرف ہالی وڈ کی بنی ہوئی فلمیں دیکھا کرتے تھے جن کا مقصد کثیر تعداد میں حاضرین کی توجہ حاصل کرنا ہوتا تھا۔ آج ملک کے تمام شہروں میں مرکزی حیثیت کی حامل ان فلموں میں بیرونی ممالک کی فلموں، آرٹ فلموں، جنسی فلموں اور خاص طور پر تیار کردہ متحرک فلموں کا اضافہ ہو گیا ہے جنھیں خاص طور پر ذیلی مارکیٹوں......سمندری لہروں پر موج تختے کے ساتھ کھیلنے والوں، موٹر سائیکل سواروں، تیز رفتار کاریں چلانے والوں کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ ایسا بہترین ہوتا ہے کہ ایسا بھی ممکن ہے کہ ہم کم از کم نیویارک میں ایسے تھیٹر تلاش کر لیں جن کا تمام سلسلہ ہم جنس پرستوں کے لیے ہو جو خصوصی طور پر ان کے لیے بنائے گئے، ایسے ڈرامے اور شو دیکھتے ہیں جس میں خواجہ سرا اور ''ڈریگ کوئین'' کام کرتے ہیں۔

یہ تمام عوامل امریکا اور یورپ میں چھوٹے چھوٹے فلمی تھیٹر کے رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔ جریدے "The Economist" کے مطابق، ''۴۰۰۰ سیٹوں پر مشتمل روایتی "Trocadero"......کا زمانہ جا چکا ہے......پرانی طرز کا بڑا سینما جو ایسے ناظرین کے لیے بنایا جاتا تھا جو ہفتے میں ایک مرتبہ سینما کا رخ

کرتے تھے، اب ختم ہو گیا ہے۔'' اس کی بجائے متفرق ذوق رکھنے والے ناظرین کا دور ہے جو خاص نوعیت کی فلمیں دیکھنا پسند کرتے ہیں اور اس صنعت کی معیشت اس پر ہی کھڑی ہے۔ لہٰذا سینی سنٹا (Cinecenta) نے ۱۵۰ سیٹوں پر مشتمل چار تھیٹر لندن کے ایک ہی مقام پر تعمیر کیے، ایک اور تھیٹر کمپنی پلان بنا رہی ہے کہ وہ بونے افراد کی فلموں کے لیے ایک تھیٹر بنائے۔ ایک مرتبہ پھر جدید ترین ٹیکنالوجی لا یکسانیت کو پروان چڑھا رہی ہے: دوران پرواز فلموں کے رجحان نے ۱۶ ایم ایم پروجیکشن سسٹم کی اہمیت بڑھا دی جو چھوٹی فلموں کے لیے آرڈر دینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ انھیں استعمال کرنے کے لیے کسی فرد کی نہیں بلکہ ایک مشین کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بھی ایک بجائے دو روایتی مشینوں کے۔ یونائیٹڈ آرٹسٹس (United Artists) ان "Cineautomats" (چھوٹی خودکار فلمی مشینیں) کو خصوصی اجازت نامے کے ساتھ فروخت کر رہی ہے۔

ویڈیو، جس کی توجہ کا مرکز و محور ابھی تک عمومی اور بڑی سطح کے سامعین ہیں، تنوع کی طرف گامزن نظر آتا ہے۔ کچھ امریکی ریڈیو سٹیشنز اعلیٰ آمدنی کے حامل افراد اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی خاطر صرف کلاسیکی موسیقی ہی چلاتے ہیں، جبکہ دیگر سٹیشنز خبروں میں خصوصیت رکھتے ہیں اور کچھ سٹیشن ہر دلعزیز قسم کی راک اینڈ رول (Rock & Roll) موسیقی ہی نشر کرتے ہیں۔ (راک موسیقی چلانے والے سٹیشن بڑی تیزی سے، اس موسیقی کو ذیلی حصوں میں تقسیم کر رہے ہیں: کچھ سٹیشن صرف ۱۸ سال سے کم عمر افراد کے لیے موسیقی نشر کرتے ہیں؛ دیگر سٹیشن اس سے نسبتاً زیادہ عمر والوں کے لیے؛ اور چند سٹیشن سیاہ فام افراد کے لیے)۔ ایسی کاوشیں بھی کی جا رہی ہیں کہ ایسے ریڈیو سٹیشن بنائے جائیں جو خاص طور پر کسی ایک خاص پیشے سے متعلق نشریات چلائیں۔ مثال کے طور پر طبیب حضرات۔ مستقبل میں ہم لوگ ایسے نیٹ ورک بنائے جانے کی پیش گوئی کر سکتے ہیں جو اپنی نشریات مخصوص پیشوں کے لیے نشر کریں جیسے انجینئر، اکاؤنٹینٹ اور اٹارنی حضرات۔ اس کے بعد مارکیٹ سے منسوب کچھ حصے ہوں گے نہ صرف پیشہ ورانہ خطوط پر بلکہ معاشرتی......معاشی اور نفسی......سماجی خطوط پر بھی۔

تاہم یہ اشاعت کا شعبہ ہے، جس میں لا معیاریت کے آثار بے چوک ہیں۔ ٹیلی وژن کے رائج ہونے سے پہلے بہت سے ممالک میں جریدے ہی نمایاں لا معیاریت پیدا کرنے کا باعث تھے۔ ان جریدوں نے اپنی کہانیاں، مضامین اور اشتہارات کی تعداد کو سینکڑوں سے ہزاروں اور پھر لاکھوں گھروں میں پہنچا کر تیزی سے فیشن، سیاسی رائے اور سٹائل تشکیل دیتے ہیں۔ ریڈیو براڈکاسٹروں اور فلمسازوں کی طرح پبلشرز نے بھی کوشش کی کہ وہ انتہائی بڑے اور آفاقی نوعیت کے سامعین کی دلچسپی کا کام کریں۔

ٹیلی وژن (چینلز) جن میں Collier's اور Woman Home Companion نامی جریدے شامل ہیں۔ بڑی مارکیٹ کے لیے شائع کی جانے والی اشاعتوں جو ٹیلی وژن کے عروج پر آنے کے بعد بھی شائع ہوتی رہیں، نے کام کر دکھایا اور ان میں سے کچھ نے جزوی طور پر اپنی توجہ علاقائی اور ٹکڑوں پر مشتمل ایڈیشنوں تک محدود کر لی ہے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۹ء تک کے درمیانی عرصے میں امریکا سے شائع ہونے والے ان جریدوں کی تعداد ۱۲۶ سے ۲۳۵ ہوگئی جو خصوصی شمارے نکالا کرتے تھے۔ لہٰذا امریکا میں ہر کثیر الاشاعتی جریدہ ملک کے مختلف علاقوں کے لیے مختلف ایڈیشن نکالتا ہے۔ کچھ پبلشرز تو تقریباً ایک سو کے قریب مختلف ایڈیشنز نکالتے ہیں۔ خصوصی ایڈیشنز پیشہ ورانہ اور مختلف گروپوں کے لیے شائع کیے جاتے ہیں۔ امریکا میں ۸۰۰۰۰ کے قریب طبیب اور دندان ساز ایسے ہیں جنھیں ہر ہفتے Time کا ملنے والا شمارہ اس شمارے سے مختلف ہوتا ہے جو اساتذہ کو موصول ہوتا ہے اور اساتذہ کو ملنے والا شمارہ کالج کے طلبہ کو ملنے والے شمارے سے مختلف ہوتا ہے۔ ''مردم شماری سے متعلق یہ ایڈیشنز اب انتہائی بہتر اور خصوصی حیثیت کے حامل ہوگئے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ذرائع ابلاغ سے متعلق شائع ہونے والے جریدے بھی، کاروں اور گھریلو استعمال کی چیزیں تیار کرنے والی کمپنیوں کی طرح، بڑی تیزی سے اپنے جریدوں کو لا معیاریت اور تنوع کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔

مزید یہ کہ نئے جریدوں کے شائع ہونے کے امکانات معدوم ہوگئے ہیں۔ میگزین پبلشرز ایسوسی ایشن کے مطابق ہر شائع ہونے والے جریدے کی بندش کے بعد چار نئے جریدے شائع ہوا کرتے تھے، مگر یہ گزشتہ دہائی کی بات تھی اب صورت حال یہ ہے کہ ہر ہفتے ایک قلیل الاشاعت جریدہ ہمیں بک سٹال کے سٹینڈ پر نظر آتا ہے جس کا مقصد اور موضوع سرفرز (سمندری لہروں پر موج تختے سے لطف اندوز ہونے والے)، غوطہ خوروں اور بزرگ شہریوں سے متعلق ہوتا ہے جو تیز رفتار کار چلانے والوں، کریڈٹ کارڈ کے حاملوں، ہوا بازوں اور جیٹ مسافروں سے متعلق ہوتے ہیں۔ نوعمر لڑکوں سے متعلق خاص قسم کے میگزین نکالے جاتے ہیں اور حالیہ زمانے میں ہم نے کوئی ''ایسا بڑا معاشرہ'' نہیں دیکھا جس سے متعلق کسی مغربی سربراہ نے پیش گوئی کرنے کی جسارت کی ہو: یعنی مقامی ماہوار جریدوں کا باز اجرا۔ آج امریکا کے مختلف شہروں جیسے فونکس (Phoenix) فلاڈیلفیا، سان ڈیگو اور اٹلانٹا میں خاصے ضخیم اور بہترین مالی تعاون کے ساتھ ایسے نئے جریدے نکلتے ہیں جن کا محور مقامی یا علاقائی معاملات ہے۔ یہ معاملات اور موضوعات کے متفرق ہونے کا اشارہ نہیں بلکہ ہم ایک بہتر ملاپ حاصل کر رہے ہیں۔ پہلے سے کہیں زیادہ جریدوں کا انتخاب اور جیسا کہ یونیسکو کا مطالعہ

ظاہر کرتا ہے یہی بات کتابوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ہر سال مختلف کتابوں کے شائع ہونے والے ٹائٹلز کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور اب یہ تعداد اتنی بڑھ چکی ہے (صرف امریکا میں یہ تعداد ۳۰۰۰۰ تک جا پہنچی ہے) کہ ایک نیم دیہی علاقے کی منتظمہ نے شکایت کی، ''اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ کون سا شخص ہے جو وہی کتاب پڑھ رہا ہو جو آپ پڑھتے ہیں۔ لہٰذا آپ کسی مخصوص کتاب کے بارے میں گفتگو کیسے کر سکتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ وہ محترمہ مبالغے سے کام لے رہی ہوں لیکن کتابوں کے کلب کے لیے اس بات میں مشکل پیش آتی ہے کہ وہ مختلف ذوق رکھنے والے قاریوں کے لیے ہر ماہ کتابوں کا انتخاب کیسے کریں۔

ذرائع ابلاغ میں تفریق کا عمل صرف کاروباری اشاعتوں تک محدود نہیں۔ ایسے بہت سے جریدے بھی منظر عام پر ہیں جو کاروباری نہیں۔ نیویارک ٹائمز بک ریویو (New York Times book Review) کی ایک رپورٹ کے مطابق ''امریکی تاریخ میں اتنے جریدے نہیں نکلے جتنے آج شائع ہو رہے ہیں۔ اسی طرح امریکا اور یورپ کے درجنوں شہروں میں درجنوں ''خفیہ اخبارات'' بھی شائع ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ اسی طرح کے ۲۰۰ اخبار تو صرف امریکا میں ہیں اور ان میں سے اکثر اخبارات ریکارڈ تیار کرنے والے اداروں کی طرف سے دی گئی مالی اعانت کے مرہون منت ہیں۔ یہ اخبار زیادہ تر ہپی افراد، اقامتی رہائش گاہوں میں رہنے والے افراد اور راک موسیقی کے شائقین کی دلچسپیوں کے لیے شائع کیے جاتے ہیں اور نوجوان حضرات کے ذہنوں میں کسی نظریے کی تشکیل کے لیے ایک حقیقی قوت بن گئے ہیں۔ لندن میں شائع ہونے والے جریدے آئی ٹی (IT) اور نیویارک کے "East Village Other" سے لے کر جیکسن، مسی سی پی کے Kudzu تک تمام جریدے رنگین اشاعت سے بھرپور ہوتے ہیں اور ان میں ''نشہ سے شعور حاصل کرنے'' والے اور ''ملاقاتوں'' کے اشتہارات سمیت دیگر اشتہارات بھی ہوتے ہیں۔ کچھ سکولوں میں بھی خفیہ اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ان تمام تر اہم اشاعتوں میں اضافے کا مشاہدہ کرنا اور ''بڑی ثقافت'' یا ''معیاریت'' کی بات کرنا خود کو نئی حقیقتوں سے بے بہرہ رکھنے والی بات ہے۔

یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ذرائع ابلاغ میں اس قسم کا دھوکا صرف اور صرف فراوانی کی وجہ سے نہیں بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا، جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہے۔ وہ مشینیں جن کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ وہ ہمیں یکسانیت کا شکار کر دیں گی اور تنوع کے تمام پہلو ختم کر دیں گی۔ آفسیٹ پرنٹنگ اور Xerography کی جدت آنے سے چھوٹے پیمانے پر پبلشنگ کی لاگت میں خاصی کمی آ گئی ہے، اور وہ بھی

اتنی کہ سکولوں کے طلبہ خفیہ پبلشنگ کے اخراجات اپنی جیب خرچ سے ہی کر سکتے ہیں (اور کر رہے ہیں)۔ بے شک، آفس کا پنگ مشین...... جس کی ایک قسم صرف تیس ڈالر میں دستیاب ہے۔ انتہائی کم پیمانے پر بھی چھپائی کا کام کرسکتی ہے، جیسے کہ مسٹر مکلوہن (Mcluhan) نے بیان کیا ہے کہ اب ہر شخص اپنی شخصی ہی چیزوں کا پبلشر بن سکتا ہے۔ امریکا میں جہاں آفس کا پنگ مشین اتنی ہی مقبول ہے جیسے کوئی عام سی مشین اور ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہر شخص ہی ''اپنی چیزیں چھاپ دے گا۔'' کسی بھی شخص کی میز پر پڑے ہوئے جریدوں کی کثیر تعداد، اشاعت کے شعبے میں آسانی کی دلیل ہے۔

اسی اثنا میں چھوٹے کیمرے اور نئے ویڈیو ٹیپ آلات سینما کے شعبے میں انقلاب پیدا کر رہے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کی سہولیات کی وجہ سے کیمرہ اور فلم کا سلسلہ ہزاروں طلبہ اور غیر پیشہ ور افراد کے ہاتھ لگ گیا ہے اور خفیہ قسم کی فلمیں۔ عام سی سطح کی رنگا رنگ، گمراہ کن، انتہائی منفرد قسم کی اور مقامی حیثیت کی حامل بھی خفیہ قسم کے پبلشرز کے ہاتھوں فروغ پا رہی ہیں۔

ٹیکنالوجی کے میدان میں یہ ترقی آڈیو ذرائع ابلاغ میں بھی دکھائی دیتی ہے جہاں ٹیپ ریکارڈرز کی بھرمار نے ہر شخص کو اس قابل بنا دیا کہ وہ خود براڈ کاسٹر (نشر کار) بن سکے۔ مشرقی یورپ سے تعلق رکھنے والے ریڈیو۔ ٹیلی وژن نشریاتی امور کے ماہر اینڈرے موسمین (Andre' Moosmann) روس اور پولینڈ سے تعلق رکھنے والے ایسے مشہور پوپ گلوکاروں کا ذکر کرتے ہیں جو کبھی بھی ریڈیو اور ٹیلی وژن پر سنائی یا دکھائی دیے لیکن جن کے نغمے اور آوازیں ٹیپ ریکارڈروں کے ذریعے مقبول ہوئیں۔ مثال کے طور پر ایک گلوکار "Bulat Okudzara" کے نغمے ایک شائق سے ہوتے ہوئے دوسرے تک پہنچے جو اپنی (ریکارڈ) کاپی خود رکھ کر وہی ریکارڈ دوسرے کو تھما دیتا۔ ایک ایسا عمل؛ جس کا تدارک آمرانہ حکومتوں اور پولیس کے بس کی بھی بات نہیں۔ مسٹر موسمین (Moosmann) مزید کہتے ہیں، ''یہ کام بہت تیزی سے ہوا، اگر ایک شخص ایک ٹیپ تیار کر لے اور اس کا دوست دو تیار کر لے تو اس ٹیپ کی تعداد کے بڑھنے کی شرح انتہائی تیز ہو گی۔''

انقلابی اور انتہا پسند افراد عموماً یہ شکایت کرتے ہیں کہ ذرائع ابلاغ پر مخصوص لوگوں کا قبضہ ہے۔ ماہر عمرانیات سی رائٹ ملز نے، میری یادداشت نے مطابق، ثقافتی کارکناکنوں پر زور ڈالا کہ وہ تمام ذرائع ابلاغ پر قبضہ کر لیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کام کرنا ضروری ہے۔ ذرائع ابلاغ سے متعلق ٹیکنالوجی، بغیر کسی گولی چلے، خاموشی اور تیزی کے ساتھ ذرائع ابلاغ پر حاوی ہونے والی اجارہ داری کو ختم کر رہی ہے۔ اس کا

نتیجہ ثقافتی پیداوار کی لامعیاریت ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اب تک بھی ٹیلی وژن لوگ کے ذوق میں یکسانیت پیدا کر رہا ہو؛ لیکن دیگر ذرائع ابلاغ اس تکنیکی معیار و مقام سے گزر کر آگے چلے گئے ہوں جہاں معیاریت ضروری ہے۔ جب تکنیکی کارنامے، مزید چینلوں کی دستیابی اور پیداواری اخراجات میں کمی کے باعث، ٹیلی وژن کی معاشیات تبدیل کر دیں تو ہم اس بات کی امید بھی کر سکتے ہیں کہ ابلاغ کا کوئی ذریعہ بھی اپنی پیداوار کو حصوں بخروں میں تبدیل کر سکتا ہے اور اس سے استفادہ کرنے والی عوام میں بڑھتے ہوئے تنوع کو روکنے کی بجائے، اس سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ اس طرح کے کارنامے اپنی تعبیر کے قریب ہیں۔ الیکٹرانک ویڈیو ریکارڈنگ کی ایجاد کیبل ٹیلی وژن کا پھیلاؤ، سیٹلائٹ سے بلاواسطہ، نشریات کا کیبل سسٹم پر جاری ہونا وغیرہ اور اسی قسم کے جدید سلسلے پروگراموں کے تنوع میں اضافے کو ظاہر کرتے ہیں لہٰذا یہ بات عیاں ہو جانی چاہیے کہ یکسانیت کی طرف رخ، کسی بھی ٹیکنالوجی کی ترقی میں ایک مقام کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک منطقی عمل کارفرما ہے اور ہم غیر متوازی قسم کے ثقافتی تنوع کی طرف چھلانگ مارنے کے دہانے پر کھڑے ہیں۔

ہم اس دن پر بھی نظر رکھے ہوئے ہیں جب کتابیں، جریدے، اخبارات، فلمیں اور دیگر ذرائع ابلاغ بھی، مستنگ (Mustang) کی طرز پر صارف کو ''آپ خود ڈیزائن کریں'' کی بنیاد پر صارف کو ڈیزائن کرنے کا موقع فراہم کریں گی۔ لہٰذا ۶۰ کی دہائی میں ایک ریاضی دان اور کمپیوٹر ماہر جوزف نیوٹن (Joseph Naughton) جن کا تعلق یونیورسٹی آف پٹس برگ سے ہے، نے ایک ایسا نظام وضع کیا جو صارف کے تمام کوائف۔ جس میں اس کے پیشے اور دلچسپیوں سے متعلق تفصیلات ہوں۔ ایک مرکزی کمپیوٹر میں جمع کر سکتا ہے۔ اس کے بعد مشینیں اخبارات، جریدوں، ویڈیو ٹیپ، فلموں اور دیگر چیزوں کو کسی صارف کی دلچسپیوں کے مطابق ہم آہنگ کرتی ہیں اور اس صارف کی دلچسپی سے متعلق شائع ہونے والی کسی بھی چیز کی فوری نشاندہی کرتی ہیں۔ یہی نظام اسی طرح کی ہی مشینوں اور ٹی وی ٹرانسمیٹر سے منسلک ہو کر، اس صارف کے کمرے میں ایسے پروگرام نشر کر سکتے ہیں یا چھپی ہوئی چیزوں کے پرنٹ دے سکتے ہیں جو اس کی خاص دلچسپی سے متعلق ہوں۔ ۱۹۶۹ء سے جاپان کا ایک روزنامہ "Asahi Shimbun" عوامی سطح پر ایک ایسے ارزاں ''ٹیلی نیوز نظام'' کا مظاہرہ کر رہا ہے جس کے ذریعے گھروں میں بھی اخبارات کی اشاعت ممکن ہے اور اوساکا (جاپان) کی ایک کمپنی Matsushita Industries ایک ایسے مسابقتی نظام کا مظاہرہ کر رہا ہے جو ٹی وی فیکس (TV Fax (H) کے

نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ مستقبل کے اخبار سے متعلق اٹھائے جانے والے پہلے اقدامات ہیں۔ ایک ایسا اخبار جو کوئی سے بھی دو قاری۔ ناظروں کو ایک جیسا مواد فراہم نہیں کرے گا۔ ایسے نظام کی موجودگی میں ذرائع ابلاغ کا سلسلہ ''حصوں میں تقسیم'' ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہے اور ہم یکسانیت سے مختلف النوعیت کی طرف سفر کر رہے ہیں۔

ان تمام چیزوں کا سامنا کرنے کے بعد اس بات پر زور دینا انتہا درجے کی حماقت ہوگی کہ مستقبل کی مشینیں ہمیں روبوٹ بنا دیں گی، ہماری انفرادیت ختم کر دیں گی اور ثقافتی رنگارنگی کو معدوم کر دیں گی وغیرہ۔ ابتدائی ذرائع ابلاغ اگرچہ کچھ یکسانیت پیدا کر دیتے تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ جدید ترین صنعت کاری کے عہد کی مشینیں بھی ایسا کریں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مستقبل کا دھکا معیاریت۔ یکساں طور پر تیار شدہ چیزوں، یکسانیت کے شکار فنون اور کثیر پیداواری تعلیم اور کثیر الثقافتی چیزوں سے دور کر دیتا ہے۔ ہم لوگ منطقی طور پر معاشرے کی تکنیکی ترقی کے اہم موڑ پر پہنچ گئے ہیں اور ٹیکنالوجی جو ہماری انفرادیت کی راہ میں حائل ہونے سے کوسوں دور ہے، ہمارے لیے انتخاب کی راہوں میں بے پناہ اضافہ کر دے گی۔ اور یقینی طور پر ہماری آزادی میں بھی اضافہ ہوگا۔

یہ ایک علیحدہ سوال ہے کہ انسان خود کو دستیاب ہونے والی مادی و ثقافتی چیزوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے ہم آہنگ ہونے کے لیے تیار ہے یا نہیں۔

کیونکہ ایک ایسا بھی وقت آتا ہے جب، فرد کو آزاد کر دینے کی بجائے، حق انتخاب اتنا پیچیدہ، دشوار اور مہنگا ہو جاتا ہے کہ اس کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک وقت وہ آتا ہے جب انتخاب بیش انتخاب میں اور آزادی پابندی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یہ بات سمجھنے کے لیے ہمیں ثقافتی اور مادی حق انتخاب کے اس بڑھتے ہوئے سلسلے کے اس تجزیے سے بھی بالا ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ سماجی حق انتخاب کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔

☆☆☆

تیرھواں باب

ذیلی مسالک کی بھرمار

نیویارک سے تیس میل شمال میں، جہاں سے اس شہر کی بلند و بالا عمارتیں دکھائی دیتی ہیں، اس کی ٹریفک اور شہری سہولیات کی چکا چوند کی دمک بھی نظر آتی ہے ایک جوان ٹیکسی ڈرائیور رہتا ہے، جو پہلے سپاہی ہوتا تھا، اس کے جسم میں ۷۰۰ ٹانکے لگ چکے ہیں۔ یہ ٹانکے کسی مقابلے میں آنے والے زخم یا اس کی ٹیکسی کے کسی حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ ٹانکے اس کی ایک خاص تفریح کا نتیجہ ہے: روڈیو (Rodeo) رائڈنگ۔(۱)

ایک ٹیکسی ڈرائیور کی مناسب سی تنخواہ حاصل کرنے والا یہ شخص ایک گھوڑے کو خریدنے، اسے مضبوط و طاقتور بنانے اور اسے کرتب کے لیے تیار کرنے پر سالانہ ۱۲۰۰ ڈالر خرچ کرتا ہے۔ گاہے بگاہے وہ اپنی گھوڑا گاڑی میں گھوڑا جوت کر اپنے گھر سے تقریباً ۱۰۰ میل دور، فلاڈیلفیا کے مضافاتی مقام پر جاتا ہے جسے Cow Town کہا جاتا ہے جہاں وہ اپنے ہی طرح کے دیگر افراد کی طرح رسہ کشی (مخصوص قسم کی) کشتی (وحشیانہ) کے بازی اور اسی طرح کے جفاکش مقابلوں میں حصہ لیتا ہے، جس کا سب سے بڑا انعام ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے بار بار چکر ہے۔

باوجود قربت کے نیویارک شہر کو اس شخص سے کوئی سروکار نہیں۔ جب میری اس شخص سے ملاقات ہوئی تو اس کی عمر ۲۳ سال تھی اور وہ صرف دو یا تین مرتبہ ہی نیویارک جا سکا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ بچھیروں کے احاطے پر ہی مرکوز ہے اور وہ ان کٹر قسم کے روڈیو کھلاڑیوں میں سے ہے جو امریکا میں، ایک محدود، لیکن مخفی، تعداد میں موجود ہیں۔ یہ لوگ ایسے پیشہ ور افراد نہیں جو اپنے اس جدی اور روایتی کھیل سے سرمایہ کما سکیں اور نہ ہی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مغربی طرز کے بوٹوں، ہیٹ، ڈینم جیکٹوں یا چمڑے کی بیلٹوں سے لوگوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا لیکن مضبوط ذیلی گروہ ہے جو جدید ترین ٹیکنالوجی کی حامل اس تہذیب کی وسعت اور پیچیدگی میں گم نظر آتا ہے۔

---

(۱) امریکی چرواہوں کے کرتبوں کی عوامی نمائش جس میں ضدی گھوڑوں کی سواری، بھاگتے ہوئے جانوروں سے کشتی لڑنا اور بچھیروں کو قابو کرنا وغیرہ شامل ہے۔

یہ عجیب و غریب گروہ نہ صرف ٹیکسی ڈرائیوروں کا جنون لیے ہوئے ہے اور اپنا وقت اور سرمایہ خرچ کرتا ہے۔ اس کا اثر اس کے خاندان، دوستوں اور خیالات پر بھی ہوتا ہے۔ یہ گروہ معیارات کا وہ پیمانہ بھی فراہم کرتا ہے جس پر وہ خود کو پرکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ گروہ اپنے کسی بھی فرد کو وہ چیز عطا کرتا ہے جس سے ہم میں سے اکثر افراد محروم ہیں: شناخت۔

جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل معاشرے، پھیکے اور یکسانیت کا شکار ہونے سے دور اس طرح متفرق اور دلچسپ گروہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن میں ہپی اور تیز رفتار کار چلانے والے، وجدانی اور اڑن طشتریوں کے شوقین، غوطہ خور اور فضائی کرتب کرنے والے، ہم جنس پرست، کمپیوٹر پر کام کرنے والے، سبزی خور، باڈی بلڈرز اور سیاہ فام مسلمان۔

آج کے دور میں جدید ترین صنعتی انقلاب کی دھمک ہمارے معاشرے کو عملاً پارہ پارہ کر رہی ہے۔ ہم لوگ اپنے اندر موجود ان سماجی محصوروں، قبیلوں اور ذیلی گروہوں کو اتنی تیزی سے ہی بڑھا رہے ہیں جتنی تیزی سے ہم گاڑیوں کے حق انتخاب کو بڑھا رہے ہیں۔ لا معیاریت کی یہی قوتیں جو پیداوار اور ثقافتی حوالے سے انفرادی انتخاب میں اضافہ کر رہی ہیں وہ ہمارے معاشرتی ڈھانچے کو بھی لا معیاریت سے دوچار کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہپیوں جیسے ذیلی گروہ معرض وجود میں آئے۔ دراصل ہم لوگ ''ذیلی گروہوں کی تیزی سے تشکیل'' کے عہد میں رہ رہے ہیں۔

اس کی اہمیت کے بیان میں مبالغہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہم تمام لوگ شدید متاثر ہیں، ہماری شناخت وضع ہوگئی ہے اور وہ بھی ان ذیلی گروہوں کی نسبت سے۔ جن کو ہم شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی شناخت کے لیے چن لیتے ہیں۔ کسی ہپی (Hippie) یا کسی ایسے ان پڑھ نوجوان کا مذاق اڑانا انتہائی آسان ہے جو خود کو ''تلاش'' کرنے اور ٹیسٹ کرنے کی کوشش میں ۷۰۰ ٹانکے لگوا بیٹھے۔ ہم تمام لوگ ایک خاص حوالے سے روڈیو رائڈر یا ہپی ہیں: ہم لوگ بے قاعدہ قسم کے ذیلی گروہوں، قبیلوں یا مختلف قسم کے گروہوں سے منسلک ہو کر اپنی شناخت تلاش کرتے ہیں اور انتخاب کرنے کے لیے جتنی چیزیں اور اقسام ہوں گی یہ مقابلہ بھی اتنا ہی سخت ہوگا۔

سائنسدان اور سٹاک بروکر

ذیلی گروہوں کے بننے کی کثرت کام کی دنیا میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ بہت سے ذیلی گروہ پیشہ ورانہ

مہارتوں کے اردگرد بن جاتے ہیں۔ لہٰذا جوں جوں کوئی معاشرہ مہارتوں کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، اس کے اندر زیادہ سے زیادہ ذیلی ثقافتی تنوع پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر سائنسی طبقہ بہتر سے بہتر ذیلی گرہوں میں تقسیم ہو رہا ہے۔ اس کا تانا بانا باضابطہ تنظیموں اور کمپنیوں سے جڑا ہوتا ہے جن کے خصوصی جریدوں، کانفرنسوں اور اجلاسوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن موضوع کے حوالے سے یہ ''واضح'' امتیازات ''مخفی'' امتیازات اور تفریق سے جڑے ہوتے ہیں۔ بات صرف یہ نہیں کہ کینسر پر تحقیق کرنے والے اور ماہرین فلکیات مختلف امور سرانجام دیتے ہیں؛ وہ مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف شخصی اوصاف اپنانے کی کوشش کرتے ہیں؛ وہ مختلف انداز سے سوچتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں اور مختلف طریقے سے زندگی گزارتے ہیں۔ (یہ امتیازات اتنے نمایاں ہیں کہ بعض اوقات یہ لوگ باہمی تعلقات میں مداخلت کرتے ہیں۔ ایک خاتون سائنسدان کہتی ہیں، ''میرے شوہر ایک خردحیاتیات دان ہیں اور میں نظری طبیعیات دان اور کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کیا ہم باہمی طور پر اپنا وجود رکھتے ہیں۔'')

ایک خصوصیت کے ساتھ سائنسدان اپنی ہی وضع کے ساتھ اکٹھا ہونا پسند کرتے ہیں اور وہ خود کو چھوٹے ذیلی ثقافتی گروہوں میں مسدود کر لیتے ہیں جس کے پاس وہ تصدیق اور عزت و توقیر کے لیے آتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ لباس، سیاسی نظریات اور طرز زندگی کے بارے میں راہنمائی بھی حاصل کرتے ہیں۔

جوں جوں سائنس کا دائرہ کار پھیلتا جا رہا ہے اور سائنس دانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، نئی مہارتوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور اس ''مخفی'' یا بے ضابطہ سطح پر زیادہ سے زیادہ تنوع پیدا ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ تخصص ذیلی گروہ کو جنم دیتا ہے۔

کسی ایک پیشے کے اندر جوف دار تقسیم کا یہ عمل سرمایے سے ڈرامائی طور پر جڑا ہوا ہے۔ وال سٹریٹ کسی دور میں نسبتاً ایک یکسانیت پر مشتمل طبقہ تھا۔ سرمایہ کاروں کا مشاہدہ کرنے والے ایک سرکردہ ماہر عمرانیات کہتے ہیں: ''ایسی روایت کبھی ہوا کرتی تھی کہ آپ یہاں سینٹ پال سے تشریف لائیں اور یہاں آ کر خاصا سرمایہ کمائیں اور پھر Racquet Club سے منسلک ہو جائیں اور اس کے بعد شمالی ساحلی علاقے میں کوئی جاگیر خرید لیں اور آپ کی بیٹیاں معاشرے میں پہلی مرتبہ متعارف ہوں۔ آپ یہ سلسلہ

اپنے سابقہ ہم جماعتوں کو بانڈ بیچ کر چلا تے تھے۔'' یہ بات ذرا مبالغہ آرائی پر مبنی لگتی ہے لیکن وال سٹریٹ دراصل، سفید فام اینگلوسیکسن پروٹسٹنٹ لوگوں کا ایک ذیلی گروہ تھا اور اس کے ارکان بھی انہی سکولوں میں جانا پسند کرتے تھے، انہی کلبوں کی رکنیت حاصل کرتے تھے، وہی کھیل کھیلتے تھے (ٹینس، گالف اور سکوائش، انہی گرجا گھروں میں عبادت کرتے تھے (Episcopalian اور Presbyterian) اور اسی پارٹی کو ووٹ دیتے تھے (ری پبلکن)۔

کوئی بھی شخص جو وال سٹریٹ کے بارے میں یہ خیالات رکھتا ہے وہ یہ مواد اوچن کلوس (Auchincloss) یا مارکوانڈ (Marquand) کے ناولوں سے لیتا ہے، بجائے نئی اور تیزی سے تبدیل ہوتی حقیقت سے۔ آج وال سٹریٹ کا دائرہ کار پھیل چکا ہے اور کوئی بھی نوجوان شخص جو اس کاروباری سلسلے میں داخل ہوتا اس کے پاس یہ حق انتخاب ہوتا ہے کہ وہ ذیلی ثقافتی وابستگیوں کے وسیع تر تناظر سے جڑ جائے۔ سرمایہ کارانہ بینکنگ میں روایتی WASP گروپنگ اب بھی عروج پر ہے۔ یہاں اب بھی کچھ روایتی اجارہ دار گروپ موجود ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ''بیشتر اس کے کہ وہ کسی یہودی کی خدمات حاصل کریں ان کے پاس کوئی سیاہ فام شراکت دار موجود ہوتا ہے'' تاہم مشترکہ فنڈ کے شعبے میں جو صنعتی سرمایہ کاری کا نسبتاً خصوصی شعبہ ہے، یونانی، یہودی اور چینی سے تعلق رکھنے افراد کی بھرمار ہے جبکہ کچھ نمایاں سیلز مین سیاہ فام ہیں۔ یہاں پر زندگی کی مجموعی طرز، گروپ کی مضمر اقدار، یکسر مختلف ہے۔ مشترکہ فنڈ کے حامل افراد ایک دیگر ''قبیلہ'' ہے۔

سرمایہ کاری سے متعلق ایک سرکردہ مصنف کہتے ہیں: ''ہر شخص نہیں چاہتا کہ WASP کا سلسلہ مزید چلتا رہے۔'' بے شک بہت سے وہ نوجوان جو وال سٹریٹ میں کام کرتے ہیں اور جو کبھی WASP کا حصہ ہوتے تھے، وال سٹریٹ کے اس ذیلی گروہ کی نفی کرتے ہیں اور اپنی شناخت ایک یا ایک سے زائد ان تکثیری گروپوں کے حوالے سے کرتے ہیں جو اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں اور کبھی کبھار لوئر مین ہیٹن کے مختلف حصوں میں ٹکرا بھی جاتے ہیں۔

جیسے جیسے تخصص کا سلسلہ جاری رہتا ہے، تحقیق نئے شعبوں تک پھیلتی ہے اور پہلے سے موجود چیزوں کا بڑی گہرائی اور شدت سے مشاہدہ کیا جاتا ہے، معیشت نئی ٹیکنالوجی اور خدمات کو جنم دیتی ہے، ذیلی گروہوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ وہ سماجی نقاد جو بڑے معاشرے پر ایک ہی سانس میں، تنقید کی بوچھاڑ

کر دیتے ہیں اور آنے والے وقت میں ''بیش تخصص'' کی بھی نفی کرتے ہیں، وہ لوگ محض اپنی زبانوں کو حرکت دے کر تھکا رہے ہیں۔ تخصص کا مطلب ہے یکسانیت سے ذرا دوری۔

یکسانیت کی ضرورت کے خلاف، خاصی گفتگو ہونے کے باوجود اس بات کا امکان کم ہی ہے کہ آنے والے وقت میں ٹیکنالوجی استعمال کرنے کے لیے اعلیٰ تربیت یافتہ افراد کی کھیپ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہم ان مہارتوں کو تیزی سے تبدیل کر رہے ہیں جن کی تسلسل کے ساتھ ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں کثیر الجہت ماہرین کی ضرورت ہے (وہ افراد جو ایک شعبے میں انتہائی مہارت رکھتے ہوں لیکن بوقت ضرورت دوسرے شعبے میں بھی قسمت آزمائی کر سکیں) بجائے ایک ہی شعبے میں مہارت رکھنے والے۔ معاشرے کی تکنیکی بنیادوں کے حوالے سے پیچیدگی میں اضافے کی وجہ سے ہمیں ہمیشہ جدید ترین مہارتوں کے حامل افراد کی ضرورت پیش آتی رہے گی اور ہم انھیں پروان چڑھاتے رہیں گے۔ صرف اسی وجہ سے ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ ہم ذیلی گروہوں کی تعداد اور اقسام میں اضافہ ہوتا ہوا دیکھیں گے۔

ماہرین تفریحی امور

اگرچہ مستقبل میں ٹیکنالوجی کی سہولیات کے پیش نظر لاکھوں افراد کام کرنے کی ضرورت سے مبرا ہو جائیں گے اور ہمیں ان لوگوں کی صفوں میں بھی یہی تنوع دیکھنے کو ملے گا جو تمام کاموں سے آزاد ہو کر صرف اور صرف کھیلوں پر ہی توجہ مرکوز کیے ہوں گے۔ اس صورت حال سے پیشتر ہی ہم ''ماہرین تفریح'' کی ایک بڑی کھیپ تیار کر رہے ہیں۔ ہم لوگ بڑی سرعت کے ساتھ نہ صرف کاموں کی نوعیت میں اضافہ کر رہے ہیں بلکہ کھیلوں کی اقسام میں بھی اضافہ کر رہے ہیں۔

وقت گزارنے کے لیے قابل قبول فرصت کے مشاغل، مشاغل، تفریح، کھیل اور دلچسپیاں فروغ پا رہی ہیں اور سرفنگ (سمندر کی لہروں پر موج تختے سے تفریح کرنا) کے گرد اکٹھے ہونے والے منفرد ذیلی گروہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ کم از کم کچھ وقت کے لیے تفریحی وقت کسی نئی طرز زندگی کی بنیاد بھی بن سکتا ہے۔ سرفنگ کا یہ ذیلی گروہ مستقبل کی طرف ایک اشارہ ہے۔

ریمی ناڈیو (Remi Nadeau) لکھتے ہیں: ''سرفنگ پہلے ہی ایک ایسی علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آ گیا ہے جو اسے ایک خفیہ اخوت یا مذہبی سلسلے کے طور پر پہچانی جاتی ہے اور ان کی شناختی علامت شارک کا [illegible] ٹ کرسٹوفر تمغہ یا مالٹا (جزائر) سے تعلق رکھنے والا کراس ہے جو کسی بھی سرفر (Surfer)

کے گلے میں لٹکا ہوا دکھائی دیتا ہے...... ایک طویل عرصے سے، ان لوگوں کی روایتی اور قابل قبول سواری پرانے ماڈل کی فورڈ (Ford) سٹیشن ویگن ہے جس میں ایک لکڑی کا ابھرا ہوا ٹکڑا بھی لگا ہوتا ہے۔ ''سرفنگ سے محفوظ ہونے والے یہ کھلاڑی اپنے گھٹنوں اور پیروں پر موجود زخموں اور نشانوں کو بڑے فخریہ انداز میں دکھاتے ہیں اور یہ چیز ان لوگوں کو اس کھیل اور مشغلے میں مشغولیت اور انتہائی دلچسپی کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ دھوپ کی وجہ سے ان کا رنگ سیاہی مائل سا ہو جاتا ہے۔ بالوں کا سٹائل ذرا منفرد ہوتا ہے۔ اس ''قبیلے'' سے تعلق رکھنے والے افراد گھٹنوں تک اپنے ہی گروپ کے ہیروز، جن میں جے جے مون کا نام سرفہرست ہے، کے کارناموں سے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور ایسی ٹی شرٹس، سرف بورڈ (موج تختے) خریدتے ہیں جن پر جے جے مون کی تصاویر بنی ہوں اور اس کلب کی رکنیت بھی حاصل کرتے ہیں۔

کھیل کی بنیاد پر بننے والے ذیلی گروہوں میں سے سرفرز ایک ہیں۔ دیگر گروپوں میں، مثال کے طور پر خلائی کرتب دکھانے والے، جے جے مون (J.J. Moon) کا نام شناسا نہیں اور نہ ہی سمندری موجوں سے کھیلنے والے ان لوگوں کے رواج اور فیشن سے لوگ آشنا ہیں۔ جبکہ فضائی کرتب دکھانے والے لوگ (اپنے ہیرو) راڈ پیک (Rod Pack) کے کرتبوں کا ذکر کرتے ہیں جس نے کچھ ہی عرصہ قبل ہوائی جہاز سے بغیر پیراشوٹ کے چھلانگ لگائی اس کے ایک ساتھی نے خلا میں پیراشوٹ اسے پکڑائی اور اس پیراشوٹ کے ذریعے راڈ پیک بحفاظت زمین پر اتر گئے۔ فضائی کرتب دکھانے والوں کی اپنی علیحدہ دنیا ہے جیسے گلائیڈرز، غوطہ خوروں، تیز رفتار گاڑیاں چلانے والوں اور موٹر سائیکل چلانے والوں۔ ان میں سے ہر کوئی، تفریحی سرگرمیوں پر مبنی، ایسے ذیلی گروہ کی نمائندگی کرتا ہے جو کسی نہ کسی تکنیکی آلے کے گرد جمع ہوتی ہے۔ چونکہ نئی ٹیکنالوجی کھیل کے انعقاد کو ممکن بناتی ہے لہٰذا ہم انتہائی انفرادیت کے حامل، کھیلوں کی بنیاد پر بننے والے ذیلی گروہوں کی امید رکھ سکتے ہیں۔

مشغولیت کے اوقات میں مختلف کھیلوں اور سرگرمیوں کا سلسلہ بھی لوگوں کے درمیان تنوع پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ معاشرہ کام کاج کے سلسلوں سے ہوتا ہوا اب مشغولیت کی طرف جا چکا ہے۔ صرف امریکا ہی میں اس صدی (گزشتہ صدی) کے آغاز سے ہی معاشرے میں کام سے لگن اور دلچسپی کی شرح ایک تہائی رہ گئی ہے۔ یہ کسی بھی معاشرے میں وقت اور توانائی کی بازصف آرائی ہے۔ اس شرح میں اور بھی کمی ہو رہی ہے ہمیں ایک ایسے عہد میں داخل ہونا ہے جو، حیران کن حد تک، تفریحی تخصص

سے بھرپور ہوگا...... اور ان میں سے اکثر کا انحصار جدید ترین اور لطیف ٹیکنالوجی پر ہوگا۔

ہم اس بات کی بھی پیش بینی کرتے ہیں کہ خلائی کرتب کرنے والوں، خودنوشت تحریروں، اعصابی کنٹرول، انتہائی گہرائی میں غوطہ خوری، چھوٹی آبدوزوں سے محظوظ ہونے والوں، کمپیوٹر گیم کھیلنے والوں کے بھی ذیلی گروہ بنیں گے۔ اسی افق میں ہم کچھ سماجی سرگرمیوں اور مشاغل میں ملوث افراد کے بھی ذیلی گروہ بھی بنتے دیکھ رہے ہیں۔ ایسے افراد کے منظم گروہ جو اس معاشرے کی عمومی سرگرمیوں کو کسی مادی حصول کی خاطر سبوتاژ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ ''نظام کو تباہ کرنے کے لیے'' ایسا کریں گے۔ اس قسم کا تاثر "Duffy" اور "The Thomas Crown Affair" نامی فلموں میں دیا گیا ہے۔ ایسے گروہ سرکاری یا کارپوریٹ کمپیوٹر پروگراموں کو خراب کرنے، ای میل کو کسی اور طرف بھیجنے ریڈیو اور ٹیلی وژن کی نشریات کو روکنے یا تبدیل کرنے، دھوکا دہی پر مبنی ڈراموں کا تھیٹر چلانے سٹاک مارکیٹ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے (نمونے یا) نمائشی پروگراموں کے نشر ہونے کو متاثر کرتے کہ جن کی بنیاد پر سیاسی یا دیگر الیکشن منعقد ہوتے ہوں اور شاید ایسی ڈکیتیوں یا اہم افراد کے قتل وغیرہ کی پیچیدہ ترین منصوبہ سازی وغیرہ جیسے جرائم کے مرتکب بھی ہو سکتے ہیں۔ ناول نگار تھامس پنک ن (Thomas Pynchon) اپنے ناول "The Crying of Lot 49" میں ایک ایسے افسانوی خفیہ گروپ کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے اپنا ڈاک کا نجی نظام بنایا ہوا تھا اور انھوں نے اسے نسلوں تک برقرار...... سائنسی افسانہ نگاری کے ایک مصنف Robert Sheckley نے اپنی تحریر کردہ ایک بھیانک کہانی The Seventh Victim میں تحریر کیا کہ اس بات کا بھی امکان ہے کچھ مخصوص ''کھلاڑیوں'' کے زیر اثر آ کر کہیں معاشرے میں قتل کو قانونی حیثیت نہ مل جائے ایسے لوگ ایک دوسرے کو قتل کریں گے اور اس کے نتیجے میں خود بھی کسی کا شکار بن جائیں گے۔ اس طرح کا کھیل خطرناک اور دہشت گرد قسم کے لوگوں کو اس بات کی اجازت دے گا کہ وہ ایک مخصوص دائرہ کار میں رہ کر اپنی جارحانہ سرگرمیوں کو جاری رکھ سکیں۔

یہ بات کچھ لوگوں کو عجیب و غریب لگے گی، لیکن اسے امکان کی فہرست سے نکالنا نہیں چاہیے کیونکہ تفریحی مشغولیت، کام کے برعکس، عملی لحاظ سے محدود و مقید ہے۔ یہاں پر تخیل آزاد ہے اور انسان کا ذہن تفریح کی ناقابل یقین اقسام وضع کر سکتا ہے۔ مستقبل کے لوگ وافر وقت، وافر سرمایہ اور چند افراد کے حوالے سے، تکنیکی مہارت ہونے کی وجہ سے، کھیل و تفریح سے ایسے محظوظ ہوں گے کہ ان سے پہلے موجود

لوگوں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ ہو۔ وہ لوگ عجیب وغریب جنسی کھیل کھیلیں گے۔ وہ اپنے ذہن کو استعمال کر کے بھی کھیل سے لطف اندوز ہوں گے وہ معاشرے کے ساتھ بھی کھیل کھیلیں گے اور ایسا کرنے سے، یعنی نا قابل یقین حد تک وسیع تر پسندیدگی اور انتخاب کا حق حاصل ہوتے ہوئے وہ لوگ ذیلی گروہ بنا لیں گے اور باقی خود کو ایک دوسرے سے دور کر لیں گے۔

نوجوانوں کی (مخصوص) آبادیاں

ذیلی گروہوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور یہ گروہ عمر کے اعتبار سے بھی بنیں گے۔ ہم لوگ ''ماہرین عمر'' بھی بن رہے ہیں اور کام اور کھیلوں کے ماہرین بھی۔ ایک وہ وقت تھا جب لوگ عموماً ''بچے''، ''نوجوان لوگ'' اور ''بڑے'' لوگوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ تقریباً ١٩٤٠ء کی دہائی میں ایک مبہم سی اصطلاح ''نوجوان لوگ'' نے ایک محدود قسم کی اصطلاح ''ٹین ایجز'' (١٣ سے ١٩ سال تک کے نوجوان لڑکے) کی جگہ لے لی۔ (دراصل جنگ عظیم دوم کے بعد تک یہ لفظ برطانیہ میں شناسا نہیں تھا)۔

آج یہ بنیادی سطح کی، تین حوالوں سے تقسیم واضح طور پر نامناسب ہے اور ہم لوگ خاص قسم کی تقسیم کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمارے پاس ایک ایسی صف بندی ہے جو "Pre-teens" (١٣ سال سے کم عمر لوگ) یا "Sub-teens" (١٣ سال کے ذیلی بچے) اور یہ صف بندی بچپن اور آغاز عنفوان شباب کے درمیان کی ہے۔ ہمیں اب "Post-teen" (١٩ سال کی عمر سے زیادہ لوگ) اور ''شادی شدہ نوجوان'' کی اصطلاحیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ ان میں سے ہر اصطلاح اس حقیقت کی لسانیاتی تصدیق ہے کہ ہم لوگ تمام کے تمام نوجوان لوگوں کو ایک ہی صف بندی کے زمرے میں نہیں رکھنا چاہتے۔ تیزی سے فروغ پانے والے اس رجحان کے تحت بڑے واضح شگاف عمر کے حوالے سے ایک گروہ کو دوسرے سے علیحدہ کرتے ہیں۔ یہ فرق اتنے باریک ہیں کہ یونیورسٹی آف مشی گن (Michigan) کے ماہر عمرانیات جان لوف لینڈ پیش گوئی کرتے ہیں کہ ''جنوبی اور شمالی، سرمایہ دار اور محنت کش، آبادکار اور مقامی رہائشی، سیاسی سرگرم خاتون اور مرد، سفید فام اور سیاہ فام تقریباً مساوی ہی ہو جائیں گے''۔

مسٹر لیفلینڈ (Lafland) اس حیران کن بیان کی حمایت اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہ نوجوان حضرات کے لیے علیحدہ آبادیوں کی تعمیر کا ذکر کرتے ہیں...... اور ان میں سے اکثر نوجوان، کالجوں کے طلبہ

ہوں گے۔ سیاہ فام افراد کی علیحدہ آبادیوں (اقلیتی باڑوں) کی طرح، یہ آبادیاں بھی گھریلو سہولیات سے محروم، کرایہ اور قیمت میں فریب کے سے معاملات، بہت زیادہ آمد و رفت اور پولیس کے ساتھ جھڑپوں اور بے چینی جیسے مسائل سے دوچار ہوں گی۔ سیاہ فام اقلیتی باڑوں کی طرح یہ آبادیاں بھی لا یکسانیت پر مشتمل ہوں گی، جن میں سے بہت سے ذیلی گروہ اس آبادی میں رہنے والے دیگر افراد کی توجہ اور وفاداری حاصل کرنے کے لیے سرگرداں ہوں گے۔

بڑی عمر کے ہیروز سے مایوس ہو کر یا اپنے والدین کے علاوہ، دیگر مثالی افراد سے ہٹ کر، یہ بچے جن کا تعلق کامیاب، قسم کے اہم خاندان سے ہوتا ہے، دیگر دستیاب افراد سے جا ملتے ہیں۔ دوسرے بچے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے ہیں اور وہ لوگ اپنے اساتذہ کے زیر اثر، پہلے سے کہیں زیادہ اثر پذیر ہو جاتے ہیں۔ بجائے اپنے کسی انکل کو مثالی سمجھنے کے وہ لوگ Bob Dylan یا Donoran یا دیگر کسی شخص کو اپنی زندگی کے لیے ماڈل بنا لیتے ہیں۔ لہٰذا ہم نہ صرف کالج کے طلبہ کے لیے علیحدہ آبادی بنا رہے ہیں بلکہ "Pre-teen" اور "teenager" (١٣ سے ١٩ سال تک کے نوجوان) کے لیے بھی ذیلی آبادیاں بنا رہے ہیں ان میں سے ہر آبادی کی علیحدہ خصوصیات، وقتی فیشن، فیشن ہیرو اور ولن ہوں گے۔

ہم کم نسبتاً زیادہ عمر کے افراد میں بھی مزید تقسیم کر رہے ہیں۔ کچھ ایسی مضافاتی آبادی بھی ہیں جہاں ایسے شادی شدہ نوجوان حضرات رہ رہے ہیں جن کے بچے ابھی چھوٹی عمر کے ہیں یا درمیانی عمر کے ایسے لوگ جن کے بچے ''ٹین ایجز'' ہیں یا وہ بڑی عمر کے افراد جن کے بچے، پہلے ہی گھر چھوڑ چکے ہیں۔ ہمارے پاس ریٹائر شدہ افراد کے لیے ''ریٹائرمنٹ طبقات'' ہیں۔ پروفیسر لوف لینڈ وارننگ دیتے ہیں، ''ایک دن ایسا بھی آئے گا جب کچھ شہر یہ دیکھیں گے کہ ان کی سیاست بطور خاص، ان افراد کے ووٹوں کے گرد گھومتی ہے جو مختلف عمر سے تعلق رکھنے والے افراد کی مخصوص آبادیوں میں رہتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے شکاگو کی سیاست، ایک طویل عرصے تک علاقائی اور نسلی محصوروں کے گرد گھومتی رہی۔''

عمر کی بنیاد پر ابھرنے والی یہ ذیلی ثقافتیں سماجی امتیاز کی بنیاد پر، ہونے والی حیران کن تاریخی منتقلی کے تناظر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انسان کے درمیان امتیازات کے ذریعے کے حوالے سے وقت زیادہ اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے؛ جبکہ جگہ کی اہمیت کم ہو رہی ہے۔ لہٰذا یونیورسٹی آف الی نائس (Illinois) میں ماہر ابلاغیات جیمز ڈبلیو کارے (James W. Carey) اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں، ''مغربی تاریخ کے ابتدائی دور میں

ابتدائی معاشروں میں مکان (جگہ) میں چھوٹا سا عدم تسلسل ثقافت میں وسیع تر تفریق کا باعث ہوتا تھا...... وہ قبائلی معاشرے جن میں ۱۰۰ میل کا فاصلہ تھا ان میں بیانیہ علامت نگاری کے متفرق نظاموں، دیو مالائی کہانیوں اور رسم و رواج کے متفرق نظاموں کے سلسلے کے امکان موجود تھا۔" تاہم ان یکساں معاشروں میں "نسلوں سے...... معاشروں میں عظیم تسلسل بھی موجود تھا لیکن کسی خاص معاشرے میں نسلوں کے درمیان ذرا سی تفریق موجود تھی۔"

مسٹر جیمز مزید کہتے ہیں کہ '' جگہ ایک متفرق عامل کے طور پر عملاً بڑی تیزی سے غائب ہو چکی ہے۔'' لیکن اگر علاقائی تفریق میں کچھ تخفیف پائی جاتی ہے تو '' کسی شخص کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان گروہوں میں موجود تفریق ختم ہو گئی ہے...... جیسا کہ کچھ معاشرتی نظریہ ساز سمجھتے ہیں۔'' مسٹر کارے اس بات کا اشارہ بھی دیتے ہیں '' تنوع کا زاویہ مکان (جگہ) سے تبدیل ہو کر عارضی یا نسلی نوعیت کا رہ جاتا ہے۔'' لہٰذا ہمیں نسلوں کے درمیان اسی نوعیت کے، کچھ وقفے نظر آتے ہیں۔ اور ماریو سیوو دیو (Mario Savio) اس انقلابی نعرے کے ساتھ بات ختم کرتے ہیں '' کسی ایسے شخص پر بھروسہ نہ کریں جس کی عمر تیس سال سے زائد ہو!'' کسی بھی سابقہ معاشرے میں ایسا نعرہ، اتنی جلدی، اخذ نہیں کیا گیا۔

مسٹر کارے نے مکان سے عارضی تفریق کی اس تبدیلی کو ابلاغ اور ابلاغی ٹیکنالوجی کی طرف توجہ مبذول کروا کر وضع کیا ہے، جو (ٹیکنالوجی) طویل فاصلے طے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کے نتیجے میں مکان کو فتح کر لیتی ہے۔ تاہم ایک اور عامل بھی موجود ہے جو بآسانی نظر انداز کر دیا جاتا ہے: تبدیلی کی رفتار۔ کیونکہ تبدیلی کا چلن بیرونی ماحول میں تیز ہو چکا ہے، لہٰذا نوجوان اور بوڑھے کے درمیان اندرونی اختلافات مزید واضح ہو گئے ہیں۔ دراصل تبدیلی کا چلن پہلے ہی اتنا دھندلا ہے کہ کسی بھی فرد کی زندگی کے تجربات میں چند سال سے خاصا فرق پڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہن بھائی جن کی عمروں میں صرف تین سے چار سال کا فرق ہوتا ہے وہ خود کو عملاً مختلف ''نسلوں'' کا فرد سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ انقلابی جنھوں نے کولمبیا یونیورسٹی کی ہڑتال میں حصہ لیا، ان میں سے سینئرز نے اس ''نسلی تفاوت'' کا ذکر کیا جو انھیں (کالج کے) دوسرے سال کے طلبہ سے ممتاز کر رہی تھی۔

شادیوں والے قبیلے

پیشہ ورانہ، تفریحی اور عمر کے حوالے سے تقسیم ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرہ جنسی...... خاندانی خطوط پر بھی تقسیم ہو رہا ہے۔ اب بھی ہم منفرد قسم کے نئے ذیلی گروہ بنا رہے ہیں جن کی بنیاد ازدواجی حیثیت پر مبنی

ہے۔ کسی دور میں لوگ غیر شادی شدہ، شادی شدہ، بیوہ/رنڈوا کی تقسیم سے پہچانے جاتے تھے۔ آج یہ تین قسم کی تقسیم کارگر نہیں رہی۔ بہت سے جدید ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں طلاق کی شرح اس قدر بڑھ چکی ہے کہ ایک نئی سماجی تقسیم سامنے آ گئی ہے۔ وہ لوگ جو ابھی تک، غیر شادی شدہ ہیں یا جو لوگ شادیوں کے بیچ کے مرحلے میں ہیں۔ لہٰذا مارٹن ہنٹ (Morton Hunt)، جو اس خاص موضوع پر ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں، ان لوگوں کے لیے '' ایسے لوگوں کی دنیا جو کبھی شادی شدہ تھے'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

مسٹر ہنٹ (Hunt) کہتے ہیں کہ یہ گروہ '' ایک ذیلی ثقافت کی حیثیت رکھتا ہے...... اس گروہ کے پاس لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے اپنا ہی طریقہ کار ہے، طلاق یافتہ یا علیحدہ زندگی گزارنے والوں کو اطمینان بخش حالت میں لانے کا اپنا نظام ہے اور دوستی، سماجی زندگی اور محبت کے اپنے ہی تقاضے ہیں۔'' چونکہ اس گروہ کے ارکان اپنے شادی شدہ دوستوں اور ماضی کے شادی شدہ لوگوں سے علیحدہ ہو چکے ہوتے ہیں لہٰذا '' ٹین ایجز'' یا '' سرفرز'' (Surfers) کی طرح یہ لوگ بھی اپنے اپنے سماجی محصورے بنانے کے خواہاں ہوتے ہیں جہاں پر ان کی پسند کے مطابق بیٹھنے کی جگہ، '' وقت'' سے نبرد آزما ہونے کے لیے مخصوص رویے، اپنی مرضی کے مطابق جنسی ضابطے اور رواج ہوں۔

مضبوط رویے اور کارگزاری اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ مستقبل میں ایک مخصوص سماجی طبقہ ابھر کر سامنے آئے گا اور جب ایسا ہوگا تو پہلے سے شادی شدہ لوگوں کی دنیا متفرق '' دنیاؤں'' اور ذیلی ثقافتی گروہوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور کوئی ذیلی گروہ جتنا بڑا ہوگا اس کی تقسیم کے اتنے ہی امکانات ہوں گے اور وہ مزید ذیلی گروہوں کو جنم دے گا۔

اگر سماجی تنظیموں کے مستقبل کا پہلا نظریہ ذیلی گروہوں کی تشکیل سے مشتق ہے تو دوسرا اسی (گروہ) کے حجم سے۔ اس بنیادی اصول سے وہ لوگ روگردانی کرتے ہیں جو '' بڑے معاشرے'' پر زور دیتے ہیں اور اس بات سے، معیاریت کے لامتناہی اور شدید دباؤ کے باوجود تنوع کے امکانات دکھائی دیتے ہیں۔ سماجی ابلاغ میں اس کی تشکیلی حدود کی وجہ سے اس کا حجم بھی ایک ایسی قوت کے طور پر کام کرتا ہے جو تنظیمی تنوع کی طرف دھکیل رہا ہے۔ مثال کے طور پر کسی جدید شہر کی آبادی جتنی زیادہ ہوگی اس شہر کے اندر اتنے زیادہ اور متنوع...... ذیلی گروہ ہوں گے۔ اسی طرح ذیلی گروہ جتنا بڑا ہوگا اس سے منسوب عجیب و غریب چیزیں اور تنوع کی شرح بھی بلند ہوگی۔ ہپی لوگ اس کی شاندار مثال ہیں۔

ہپی، انکار پوریٹ

۱۹۵۰ء کی دہائی کے وسط میں سان فرانسسکو میں، بحیرہ کیلی فورنیا کے ساحلی علاقوں Carmel اور Big Sur کے قریب ایک قلیل تعداد میں مصنفین، مصوراور ان سے منسوب دیگر افراد اکٹھے ہوئے، انھوں نے خود کو "beats" یا "Beatniks" کہلانا پسند کیا، ایک منفرد انداز میں کچھ وقت گزارا اور نیا آہنگ پیش کیا۔ اس اجتماع کی نمایاں خصوصیات میں غربت کی عکاسی۔ جین کی پینٹیں، سینڈل، گدے اور جھونپڑیاں؛ سیاہ فام لوگوں کی جاز موسیقی میں دلچسپی؛ مشرقی تصوف اور فرانسیسی نظریۂ وجودیت میں دلچسپی اور جدید ٹیکنالوجی کے حامل معاشرے سے عناد۔

ذرائع ابلاغ میں خاصی نشر و تشہیر ہونے کے باوجود "Beats" نامی اس چھوٹے سے (نظریاتی) گروہ نے کوئی بہتر پذیرائی حاصل نہیں کی تاوقتیکہ ایک تکنیکی ایجاد ہوئی۔ لائی سرجک ایسڈ (Lysergic Acid) جسے عمومی طور پر ایل ایس ڈی (LSD) کہا جاتا ہے۔ منظر عام پر آیا۔ اس نشے کی اشتہاری مہم Timothy Leary، Allen Finsberg اور Ken Kesey نامی کمپنیوں نے بڑی شائستگی کے سے انداز میں چلائی اور اسے غیر ذمہ دار قسم کے جذباتی افراد سے مفت تقسیم کیا۔ ایل ایس ڈی کچھ ہی عرصے میں امریکی نوجوانوں میں مقبول ہوئی اور پھر اس کا دائرہ کار یورپ تک پھیل گیا۔ ایل ایس ڈی کے ساتھ رغبت ایک اور خاص نشے ماریجوانہ (Marijuana) سے جڑی ہوئی تھی، یہ ایک ایسا نشہ ہے جس کے لیے، ایک طویل عرصے تک جانوروں پر تجربے کیے گئے تھے۔ ان دو ذرائع میں سے، یعنی ۱۹۵۰ء کی دہائی کا ذیلی گروہ "Beat" اور ۱۹۶۰ء کی دہائی کا ایسڈ نامی گروہ ایک بڑے گروہ کی بنیاد بن گیا۔ ایک اور ذیلی گروہ جو دو چھوٹے ذیلی گروہوں کا کارپوریٹ ادغام کہلایا: ہپی تحریک (Hippie Movement) ان لوگوں نے "Beats" گروپ کی نیلی جینز لی اور "Acid" گروپ کے کڑے اور مالائیں اور پھر یہ ہپی امریکی معاشرے کا جدید ترین اور عوامی طور پر شناسا گروہ بن گیا۔

تاہم اس کی نشوونما کا دباؤ خاصا بڑھ گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں ''ٹین ایجز'' اس صف میں داخل ہو گئے، لاکھوں کی تعداد میں "Pre-teens" (۱۳ سال سے کم عمر افراد) نے اس تحریک کے بارے میں اپنے ٹیلی وژن شوز اور جریدوں کے ذریعے معلومات حاصل کیں اور اسی سے ہمدردی کا اظہار کیا؛ مضافاتی علاقوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے عمر رسیدہ افراد ''پلاسٹک'' یا ہفتہ وار ہپی بن گئے۔ اس کا نتیجہ بین تھا۔

ہپیوں کا ذیلی گروہ...... جنرل موٹرز یا جنرل الیکٹرک (GE) کی طرح۔ اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ اس کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لہٰذا ہپیوں کے ذیلی گروہ سے ہی ان کے اخلاف کا سلسلہ چل نکلا۔

ایک سطحی نظر رکھنے والے کے لیے تمام کے تمام ایسے لوگ جن کے لمبے بال ہوں ایک جیسے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اسی تحریک سے چھوٹے چھوٹے اور گروپ بھی نکلے۔ ایک نوجوان مشاہد ڈیوڈ سیلے (David Seelay) کے مطابق یہ لوگ اپنے عروج پر تھے اور ''وہ قابل ذکر اور منفرد گروہوں کا ایک ادغام ہے''۔ یہ لوگ نہ صرف اپنے رنگارنگ لباس کی وجہ سے مختلف ہیں بلکہ دلچسپیوں میں بھی مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا مسٹر سیلے نے رپورٹ کی کہ ان لوگوں کی سرگرمیاں ''بیئر پینے سے لے کر شاعری پڑھنے، چرس پینے سے ماڈرن ڈانس تک...... اور عموماً وہ لوگ جو ایک دوسرے میں دلچسپی رکھتے ہوں، وہ کسی اور کو چھو نہیں سکتے''۔ اس کے بعد مسٹر سیلے ان لوگوں کے درمیان موجود تفریق کو مزید بیان کرتے ہیں کہ ان گروہوں میں Taeny-boppears (ایک خاص قسم کا گروہ جو اب منظر عام سے غائب ہو گیا ہے)، سیاسی طور پر متحرک "Beatniks" اور پھر، صرف اور صرف اصل ہپی لوگ، جنھیں ایسا کہا جا سکے۔

ان ذیلی گروہوں کی مزید تقسیم سے بننے والے گروہوں کے ارکان شناختی بلے (Badge) لگاتے ہیں جو ارکان کے لیے معنی و مفہوم لیے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر Tenmy-boppers ڈاڑھی کے بغیر ہوتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں سے اکثر ابھی اتنے نوجوان ہیں کہ ان کے چہرے (ڈاڑھی) پر بال نہیں آئے۔ دیہی قسم کے ماحول میں سینڈل پہنے جاتے ہیں، لیکن تمام لوگ اس کی پابندی نہیں کرتے۔ کسی شخص کی پینٹ کے ''چست'' ہونے کا دارومدار اس کے ذیلی گروہ کے رواج کے مطابق ہے۔

جہاں تک خیالات کا تعلق ہے تو حاوی ثقافت سے متعلق کئی عام شکایات تھیں۔ لیکن سیاسی اور سماجی عمل میں بہت سے اختلافات سامنے آئے۔ رویے مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں جن میں ایسڈ پائپ (Acid Pipe) (کے نشے) سے شعوری طور پر دور ہو جانا، tenny-bopper سے عدم معلومات کی بنا پر، لاغرضی، بائیں بازو کے کارکناں کی شدید طریقے سے شمولیت اور چند گروہوں کی احمقانہ سرگرمیاں جن میں Dutch Provos the Crazies اور گوریلا تھیٹر کے لاتعداد لوگ شامل ہیں۔

الغرض ہپی کارپوریشن اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ اسے اور اس کے تمام تر معاملات کو بہتر انداز میں سنبھالنا انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔ اس کو متنوع ہونا پڑے گا اور ایسا ہوا بھی ہے۔ اور یہ نوخیز قسم کے ذیلی گروہوں

کے ایک انبوہ کی صورت سے سامنے آیا ہے۔

قبائلی ردوبدل

ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ یہ تحریک قریب اختتام تک پہنچ گئی۔ ماضی میں LSD (کے نشے) کی پُرزور حمایت کرنے والے اس بات کا احساس کرنا شروع ہو گئے کہ ''ایسڈ سے منسوب یہ نشے بری لت ہیں اور ان لوگوں کے خفیہ اخبارات اپنے پیروکاروں اور ارکان کو وارننگ دینے لگے کہ وہ ''ٹرپسٹرز'' (Tripsters) سے بہت زیادہ قربت سے گریز کریں۔ سان فرانسسکو کے مقام پر ایک علامتی اور مزاحیہ ''جنازے'' کا اہتمام کیا گیا تاکہ ہپیوں کے اس ذیلی گروہ کی ''تدفین'' کی جائے اور اس سے منسوب مقامات "Haight Ashbury" اور ایسٹ ویلیج "East Village" سیاح لوگوں کے تفریحی مقامات میں تبدیل ہو چکے ہیں اور یہ حقیقی تحریک انتشار کا شکار ہو چکی ہے اور نئے اور عجیب غریب، چھوٹے اور کمزور ذیلی گروہ اور ذیلی قبیلے وجود میں آئے۔ اس کے بعد، گویا اس سارے عمل کو یکسر نئے سرے سے شروع کرنے کے لیے، ایک اور نئے ذیلی قبیلے "Skinheads" کا وجود عمل میں آیا۔ Skinhead نامی ذیلی قبیلے کے لوگ اپنی ہی خاص وضع کے حامل ہوتے ہیں۔ سسپینڈر (Suspenders) (ایک خاص وضع کی پتلون) بوٹ، چھوٹے بال...... اور تشدد کے لیے ایک غیر یقینی قسم کی لگن۔

ہپی تحریک کا اختتام اور "Skinheads" نامی گروہ کا ابھر کر سامنے آنا، آنے والے کل کے معاشرے میں ذیلی ثقافتوں کے ڈھانچے کے بارے میں یکسر نئی بصیرت ہے کیونکہ لوگ صرف اور صرف ذیلی گروہوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کر رہے بلکہ ہم بڑی تیزی سے ان میں ردوبدل بھی کر رہے ہیں۔ یہاں پر بھی ناپائیداری کا اصول کارفرما ہے۔ چونکہ معاشرے کے ہر شعبے میں ردوبدل کی شرح میں اضافہ ہوا ہے لہٰذا ذیلی (ثقافتی) گروہ بھی قلیل العمر ہو گئے ہیں۔

ذیلی گروہوں کے برقرار رہنے کی مدت میں کمی کے شواہد کے ساتھ، ۱۹۵۰ء کی دہائی کا پُرتشدد ذیلی گروہ بھی فنا ہو گیا جو سڑکوں پر گروپوں کی صورت لڑائی کرتا تھا۔ اس دہائی کے دوران نیویارک شہر کی بہت سی سڑکیں تواتر کے ساتھ ایسے لوگوں کے ہاتھ لگی ہوتی تھیں جو ایک خاص قسم کی اجتماعی لڑائی میں ملوث ہوتے تھے جسے ''رمبل''[1] (Rumble) کہا جاتا ہے۔ اس جھگڑے میں بیسیوں، اگر سینکڑوں نہیں، نوجوان لڑکے ایک

(۱) گلی محلے کے مخالف گروہوں کے نوجوانوں میں روایتی جھگڑا۔

دوسرے پر خاص قسم کی زنجیروں، بٹن والے چاقوؤں، ٹوٹی ہوئی بوتلوں اور زپ بندوقوں (دیسی ساخت کی بندوق) سے لیس ہو کر مخالف گروپ پر حملہ کر دیتے تھے۔ اس طرح کے ''رمبل'' شکاگو، فلاڈیلفیا، لاس اینجلس حتیٰ کہ لندن اور ٹوکیو جیسے علاقوں میں بھی ہوتے تھے۔

اگرچہ ایک دوسرے سے دور دراز واقع ان علاقوں میں ہونے والے ان رمبلز (جھگڑوں) میں کوئی براہِ راست تعلق اتفاقیہ ہیں تاہم یہ جھگڑے ایک خاص منصوبے سے ہوتے تھے اور عسکری مہارت کے ساتھ ان منظم قسم کے "Bopping gangs" کی زیرنگرانی ہوتے تھے۔ نیویارک میں تو ان گروہوں نے رنگارنگ نام بھی اختیار کیے ہوئے تھے۔ ''کوبراز'' (Cobras)، Corsair Lords، Apaches، Egyptian Kings اور اسی طرح دیگر نام۔ وہ لوگ ایک دوسرے سے علاقوں کی ''منڈلی حکمرانی'' کے لیے برسرپیکار ہوتے تھے۔ ''منڈلی حکمرانی'' کسی خاص علاقے پر مخصوص گروہ کی اجارہ داری سے مشتق ہے۔

اپنے عروج کے دنوں میں صرف نیویارک شہر ہی میں اس طرح کے ۲۰۰ گروہ تھے اور صرف ایک سال ۱۹۵۸ء میں اس طرح کے تصادم کے دوران ۱۱۱ افراد کی ہلاکت ہوئی۔ تاہم پولیس کے بقول ۱۹۶۶ء تک اس طرح کے "Bopping gangs" عملاً ختم ہو گئے تھے۔ نیویارک میں صرف ایک گروہ بچ گیا تھا اور نیویارک ٹائمز نے رپورٹ دی: ''کسی شخص کو یاد نہیں کہ کسی کوڑے کرکٹ سے بھری ہوئی سڑک پر آخری ''رمبل'' ہوا۔ لیکن یہ چار یا پانچ سال قبل ہوا تھا (جس سے ''رمبل'' کے زوال کا پتہ لگتا ہے، وہ بھی اپنے عروج یعنی ۱۹۵۸ء کے دو یا تین سال بعد) پھر اچانک، انتہائی تشدد کی ایک دہائی کے بعد نیویارک میں گروہوں میں لڑائی کا عہد اپنے اختتام کو پہنچا''۔ یہی صورت حال واشنگٹن، نیوآرک (New Ark)، فلاڈیلفیا اور دیگر مقامات پر بھی صادق آئی۔

سڑکوں پر پُرتشدد گروہوں کے ختم ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم لوگ شہری آسودہ ماحول میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہ جارحانہ عزائم جو پیورٹو ریکو (Puerto Rico) سے تعلق رکھنے والے شخص اور نیویارک میں رہنے والے سیاہ فام جوان کو اس بات پر اکساتا تھا کہ وہ مخالف گروہوں سے پُرتشدد لڑائی لڑے، اب ان عزائم کا رخ سماجی نظام کی طرف مڑ گیا ہے اور ان لوگوں کے مخصوص علاقوں اور محصوروں میں نئی طرز کی سماجی تنظیمیں، ذیلی گروہ [illegible] کو نئے ڈگر سے گزارنے والے گروہ ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔

لہٰذا ہمیں جو چیز نظر آ رہی ہے وہ ایک ایسے عمل کا سامنے آنا ہے جس کے ذریعے ذیلی گروہ انتہائی تیز

رفتاری سے فروغ پاتے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی کے نتیجے میں جلد ہی ختم ہو جاتے ہیں تاکہ نئے ذیلی گروہوں کے لیے راستہ ہموار کیا جائے۔ معاشرے کے خون کے بہاؤ میں ایک نئے تحویلی عمل کا آغاز ہوا اور سماجی میل ملاپ کے دیگر پہلوؤں میں ہونے والی تیزی کی طرح، اس کی رفتار میں بھی تیزی آ گئی ہے۔

کسی فرد کے لیے یہ تحویلی عمل انتخاب کے مسائل کو شدت کے یکسر نئے معیار تک بلند کرتا ہے۔ بات صرف یہ نہیں ہے کہ قبائل کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور نہ ہی سلسلہ ہے کہ قبائل یا ذیلی گروہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں اور انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اپنے رشتے ناطوں کو منتقل کر رہے ہیں اور ان میں تبدیلی لا رہے ہیں۔ بلکہ ایسا بھی ہے کہ ان میں سے اکثر طویل عرصے تک اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکیں گے کہ کوئی فرد (اس گروہ سے) اپنی وابستگی کے بارے میں منطقی پرکھ کر سکے۔

وہ فرد جو کسی احساسِ ملکیت کی تلاش میں ہے، کسی ایسے سماجی تعلق کی جستجو کر رہا ہے جو اسے شناخت کا شعور عطا کرے، ایسے دھندلے ماحول میں سفر کر رہا ہے جس میں وابستگی کے تمام تر ممکنہ اہداف تیز رفتار حرکت میں ہیں اور اسے انہی حرکت کرتے ہوئے اہداف کی بڑھتی ہوئی تعداد میں سے انتخاب کرنا ہے اور وہ بھی انتخاب کے ان مسائل میں سے جو اوپر کی طرف ریاضی کے نقطۂ نظر سے سفر نہیں کر رہے بلکہ جیومیٹری (علم ہندسہ) کے انداز سے۔

اس خاص موقع پر جب مادی اشیا، تعلیم، ثقافتی سرگرمیوں، تفریح اور مشاغل سے متعلق اس کے حقِ انتخاب میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اس کے سامنے سماجی حقِ انتخاب کا بھی ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ جیسے اس فرد کے پاس کار خریدنے کے لیے یہاں تک گنجائش موجود تھی کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق خود اسے ڈیزائن کر سکتا ہے اور کسی نہج پر پہنچ کر یہ حقِ انتخاب اس حد تک فیصلہ کرنے کی ایسی صلاحیت کا متقاضی ہوتا ہے جتنی اس کی اہمیت اور وقت نہ ہو...... اسی طرح سے ہم لوگ سماجی بیش انتخاب کی منزل تک جلد ہی پہنچ جائیں گے۔

ہمارے معاشرے میں شخصیت کے انتشار، خللِ اعصاب یا عام نفسیاتی دباؤ کی سطح اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بہت سے افراد پہلے سے ہی، اس بات میں دشواری محسوس کرتے ہیں کہ ایک معقول، مکمل اور منطقی طور پر مضبوط ذاتی سٹائل بنا سکیں۔ تاہم اس بات کے شواہد بھی ظاہر ہیں کہ سماجی تنوع کی طرف

لے جانے کے لیے (ایسا) دھکا، جو اشیا اور ثقافت کے متوازی ہو، شروع ہوا چاہتا ہے۔ ہمیں آزادی کی ایک پُرکشش اور خوفناک وسعت کا سامنا ہے۔

رذیل سفاک

کسی معاشرے میں جتنے زیادہ ذیلی ثقافتی گروہ ہوں گے اس معاشرے کے فرد کی امکانی آزادی کے مواقع اتنے ہی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صنعت کاری کے عہد سے قبل کا فرد، اس صورت حال کے برعکس، رومانوی دیومالائی اساسوں کا حامل ہونے کے باوجود، حقِ انتخاب کے حوالے سے انتہائی کمی کا شکار تھے۔

جذباتی لوگ ابتدائی عہد سے تعلق رکھنے والے انسان کی دباؤ سے پاک، قیاسی آزادی سے متعلق بسیار گوئی کرتے ہیں تاہم ماہرین علم بشریات اور تاریخ دانوں کو حاصل ہونے والے شواہد اس کے متضاد ہیں۔ جان گارڈنر (John Gardner) اس مسئلے کو بڑے جامع انداز میں پیش کرتے ہیں: ''ابتدائی عہد کے قبائلی لوگ یا پیش صنعتی عہد کا طبقہ کسی فرد سے، اس کے گروہ یا قبیلے کے دیگر افراد کے ساتھ، انتہائی اطاعت گزارانہ رویے کی توقع رکھتے تھے جس کا تصور ترقی یافتہ معاشرے میں نہیں''۔

سیارہ لیون (Sierra Leone) سے تعلق رکھنے والے "Temne" قبیلے کے ایک فرد نے آسٹریلوی ماہر معاشرتی علوم کو بتایا: ''جب ہمارے قبیلے سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد کسی چیز کو چن لیتا ہے تو ہم سب کو اس سے متفق ہونا چاہیے۔ تعاون اس چیز کا نام ہے۔''

یقیناً مطابقت اور ہم آہنگی اسے ہی کہتے ہیں۔ پیش صنعتی عہد سے تعلق رکھنے والے فرد کے لیے موجود اس دباؤ سے بھرپور اور کچل دینے والی، مطابقت اور ہم آہنگی کی وجہ یہ تھی کہ اس قبائلی فرد کو ہر صورت، اپنے ہی قبیلے کے دیگر افراد کے ساتھ چلنا پڑتا تھا اور اس کی واضح وجہ یہ تھی کہ اس قبیلے کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ہے جہاں وہ جا سکے۔ اس کا معاشرہ یکسانیت کا معاشرہ ہے جو ابھی تک اپنے اجزا کی انفرادی حیثیت سے نشوونما کی تقسیم کے مرحلے میں داخل نہیں ہوا۔ اسی چیز کو ماہرین عمرانیات ''عدم تفریق شدہ'' کہتے ہیں۔

جس طرح ایک گولی شیشے کے بڑے ٹکڑے کو پاش پاش کر دیتی ہے اسی طرح صنعت کاری معاشروں کو اجزا میں تقسیم کر دیتی ہے، وہ معاشرہ مخصوص قسم کی ایجنسیوں میں بکھر جاتا ہے۔ ان سکول، کارپوریشنیں، سرکاری بیورو، گرجا گھر اور افواج شامل ہیں اور یہ ایجنسیاں، مخصوص قسم کی دیگر چھوٹی اکائیوں

میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ انشقاق کا یہ عمل غیر رسمی سطح پر بھی ہوتا ہے اور بے شمار قسم کے ذیلی گروہ معرض وجود میں آتے ہیں: روڈیو رائڈرز (Rodeo Riders)، سیاہ فام مسلم، موٹر سائیکل سوار طبقہ، سکن ہیڈ (Skinheads) اور باقی تمام۔

سماجی نظام کا یہ پھیلاؤ حیاتیات میں نشو ونما کے عمل سے مماثلت رکھتا ہے۔ جیسے اس وقت تفریق کا شکار ہو جاتے ہیں جب وہ افزائش کی منزل میں داخل ہوں اور زیادہ سے زیادہ اعضا کو تشکیل دیں۔ ارتقا کا تمام سفر، وائرس سے انسان کی طرف تفریق کی بلند ہوتی ہوئی سطح کی طرف، درشت قسم کی، پیش قدمی کی عکاسی کرتا ہے۔ جاندار اشیا اور سماجی گروہوں کی نسبتاً کم تفریق شدہ اقسام سے زیادہ متفرق اقسام تک، بظاہر نا قابل مزاحمت سفر صاف دکھائی دیتا ہے۔

لہٰذا یہ بات محض اتفاق نہیں کہ ہمیں تنوع کی طرف متوازی قسم کا میلان نظر آتا ہے۔ خاص طور پر معیشت، فنون، تعلیم، بڑی ثقافتوں اور خود سماجی نظام میں۔ ایسے تمام کے تمام رجحانات یکجا ہو کر، ایک بڑے پیمانے پر ہونے والے تاریخی عمل کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جدید ترین صنعتی انقلاب کو اب اس کے اصل معنی و مفہوم کے ساتھ دیکھا جا سکتا۔ انسانی معاشرے کی تفریق کی اعلیٰ سطح کی طرف پیش قدمی۔

یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے کے جوڑ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ ایسا ہے بھی صحیح۔ اور اسی وجہ سے ہر چیز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہو رہی ہے۔ جہاں کہیں ۱۰۰ تنظیموں کا وجود ہوتا تھا، وہاں آج ۱۰۰۰ تنظیمیں موجود ہیں۔ جو تیزی سے بڑھتے ہوئے عارضی قسم کے تعلقات سے باہمی مربوط ہوتی ہیں۔ کسی دور میں نسبتاً دیرپا قسم کے چند ذیلی گروہ ہوتے تھے جن کی بنا پر کسی شخص کی شناخت کی جا سکتی تھی مگر اب ہزاروں قسم کے عارضی نوعیت کے ذیلی گروہ ہیں جو ایک دوسرے کو پیس رہے ہیں، ٹکرا رہے ہیں اور ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ مضبوط بندھن جو صنعتی معاشرے کو جوڑے رکھتے تھے۔ قانونی ضابطے، عام اقدار، مرکزیت اور معیاریت پر مبنی تعلیمی اور ثقافتی پیداوار...... اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔

یہ صورت حال اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ شہر کیوں ''نا قابل انتظام'' ہو رہے ہیں اور یونیورسٹیاں کیوں ''بے قابو'' ہوتی جا رہی ہیں۔ چونکہ معاشرے کی ہم آہنگ سازی کے پرانے سلسلے، وہ طریقہ کار جن کی بنیاد یکسانیت، سادگی اور دوام پر ہوتی تھی، اب مؤثر نہیں رہے لہٰذا ایک نیا، بہتر طریقے سے

تفریق شدہ سماجی ضابطہ...... جدید ترین صنعتی ضابطہ۔ ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ اس کی بنیاد بہت سے متنوع اور قلیل المیعاد اجزا پر ہے اور ان کی تعداد کسی سابقہ سماجی نظام (کے جزائر) سے زیادہ ہے۔ اور ہم نے اب تک یہ نہیں سیکھا کہ ان کو آپس میں کیسے جوڑا جائے، اس ''کُل'' کی ہم آہنگ سازی کیسے کی جائے۔

کسی فرد کے لیے، تفریق کی اس نئی سطح کی طرف چھلانگ عجیب وغریب مضمرات لیے ہوئے ہے لیکن ان کے حوالے سے نہیں جن کے بارے میں لوگ خوفزدہ ہیں۔ ہمیں اکثر بتایا گیا ہے کہ ہم لوگ ایک انجانی یکسانیت کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ہم لوگ انفرادیت کے ان شاندار مواقع کی قدر شناسی میں ناکام ہو جاتے ہیں جو جدید ترین صنعتی انقلاب اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ اور ابھی تک ہم نے بیش۔ صنعت کاری کے ان خطرات پر سوچنا شروع نہیں کیا جو اس سے وابستہ ہوں گے۔

''وسیع تر معاشرے'' کے نظریہ ساز اس حقیقت کے غلبے میں گرفتار نظر آتے ہیں کہ جس حقیقت نے ہمارے قریب سے گزرنا شروع کر دیا ہے۔ کسانڈرا افراد[1] (The Cassandras) جو بڑے شدید طریقے سے، ٹیکنالوجی سے نفرت کرتے ہیں اور ایک تباہ کن مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صنعت کاری کی شرائط کو اسی قسم کے فوری تشکیل پا جانے والے حالات کا سامنا ہوگا۔ تاہم یہ نظام پہلے ہی غلبہ پا چکا ہے۔

صنعتی محنت کش کو مسدود و محدود کرنے والی شرائط کو کالعدم قرار دینا قابل تعریف ہے۔ مستقبل میں ان شرائط کو لاگو کرنا، انفرادیت، تنوع اور حق انتخاب کے ختم ہو جانے کی پیش گوئی کرنا خطرناک قسم کے فرسودہ خیالات کے اظہار کرنے کے مترادف ہے۔

ماضی اور حال کے لوگ ایسے طرز زندگی میں جکڑے ہوئے ہیں جو نسبتاً انتخاب سے مبرا ہے۔ مستقبل کے لوگ، جن کی تعداد میں روزانہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے، وہ انتخاب نہیں بلکہ پیش انتخاب کا شکار ہوں گے۔ ان لوگوں کے لیے آزادی کی انتہائی وسعت ہوگی۔

اور یہ آزادی نئی ٹیکنالوجی کی موجودگی کے باوجود نہیں ہوگی بلکہ بڑی حد تک اس کی وجہ سے ہی ہوگی۔ کیونکہ اگر صنعت کاری سے متعلق ابتدائی ٹیکنالوجی کو لا متناعی قسم کے تکراری امور کی انجام دہی کے لیے، دماغی صلاحیتوں سے مبرا، روبوٹ کی طرز کے لوگ درکار ہیں تو آنے والے وقت کی ٹیکنالوجی ان

---

(۱) پیش گوئی کرنے والے یا آنے والی آفات سے خبردار کرنے والا شخص۔ قدیم شہر ٹرائے کی کسانڈرا سے منسوب۔

تمام امور پر اپنی گرفت مضبوط کر لے گی اور انسانوں کے لیے صرف اور صرف وہی امور چھوڑ دے گی جن کے لیے فیصلہ کرنے کی صلاحیت، باہمی مہارتوں اور تخیل کی ضرورت ہو۔ جدید ترین صنعت کاری متقاضی ہے، اور تخلیق کرے گی، یکساں قسم کے لاتعداد افراد نہیں بلکہ ایسے افراد جو ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہوں، افراد نہ کہ روبوٹ۔

نسل انسانی، مشابہت اور مطابقت میں یکسانیت سے دور، سماجی طور پر اتنی متنوع ہو جائے گی جتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔ نیا معاشرہ، جدید ترین صنعت کا حامل معاشرہ اب اپنے تعمیری مرحلے میں داخل ہو گیا ہے اور وہ فنا پذیر قسم کے طرز زندگی کا ایک رنگارنگ نمونہ پیش کرے گا۔

☆☆☆

چودھواں باب

لائف سٹائل (طرزِ زندگی) میں تنوع

سان فرانسسکو میں منتظمین اور اعلیٰ افسران ایسے ریستورانوں میں (دوپہر کا) کھانا کھاتے ہیں جہاں کھانے پیش کرنے کے لیے عریاں چھاتیوں والی ویٹرسز موجود ہوتی ہیں۔ نیویارک میں جاز میوزک میں وائلن بجانے والی خبطی قسم کی لڑکی کو گرفتار کیا گیا جو اپنے ابتدائی پروگراموں میں میوزک بجانے کے لیے، عریاں چھاتیوں والا لباس زیب تن کرتی تھی۔ سینٹ لوئس (St. Louis) میں سائنسدان، اجرت پر کسی عورتوں اور دیگر افراد کی خدمات حاصل کرتے ہیں انھیں کیمرے کے سامنے جنسی سرگرمیاں کرنے کا کہتے، اس کا مقصد اعضا کا فعلیاتی مطالعہ ہوتا ہے۔ لیکن کولمبس، اوہائیو (Ohio) میں اس وقت متنازع صورت حال کھڑی ہو جاتی ہے جب مارکیٹ میں "Little Brother" نامی گڑیاں فروخت ہوئیں، ان (گڑیوں) کے جسم میں مردانہ عضو لگا ہوتا ہے۔ کنساس سٹی میں ہم جنس پرست تنظیموں کی ایک کانفرنس میں یہ اعلامیہ جاری ہوا کہ تنظیم ایک مہم چلائے گی جس میں پینٹا گون کو کہا جائے گا کہ وہ امریکی افواج میں ہم جنس پرستوں پر لگائی جانے والی پابندی کو واپس لینے کا اعلان کرے اور پینٹا گون نے بڑی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے قبول کر لیا۔ لیکن امریکی جیلوں میں لاتعداد ایسے افراد موجود ہیں جنھیں ہم جنس پرستی کے الزام میں قید کیا گیا ہے۔

جنس سے متعلق اقدار کے حوالے سے شاید ہی کسی قوم نے اتنے تذبذب اور پریشانی کا مظاہرہ کیا ہو۔ تاہم ایسی ہی بات دیگر اقدار کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ امریکہ کو سرمایے، جائیداد، قانون اور ضابطے، نسل، مذہب، تصورِ خدا، خاندان اور خود سے متعلق معاملات میں غیر یقینی کیفیت کا سامنا ہے۔ صرف امریکہ ہی اقدار کے حوالے سے گھمبیر صورت حال میں گرفتار نہیں، تکنیکی صلاحیت کے مالک تمام معاشرے اس بڑے انتشار کا شکار ہیں۔ ماضی کی اقدار کا زوال عدم توجہی کا شکار نہیں۔ ہر پادری، سیاست دان اور والدین اس کی وجہ سے الجھن میں گرفتار ہیں۔ تاہم اقدار کی تبدیلی سے متعلق اکثر بحث و مباحث بے سود ثابت ہوئیں کیونکہ وہ دو بنیادی اور اہم نکات سے مبرا تھے۔ ان میں سے پہلا نکتہ رفتار ہے۔

اقدار میں ردوبدل کی شرح اتنی تیز ہے جتنی تاریخ میں کبھی نہیں تھی۔ ماضی میں معاشرے میں نشوونما پانے والا کوئی شخص یہ توقع رکھ سکتا تھا کہ اس کی مدت حیات میں اس کے معاشرے میں رائج عوامی اقدار کا نظام ویسے کا ویسا ہی رہے گا، آج کے عہد میں اس قسم کی کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی، ماسوائے ان معاشروں کے جو بیش ٹیکنالوجی کے طبقات تھے اور وہ الگ تھلگ بھی تھے۔

اس بات سے عوامی اور ذاتی اقدار کے نظاموں کے ڈھانچوں میں ناپائیداری کے مضمرات عیاں ہوتے ہیں اور ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان اقدار کے موضوعات جو کوئی بھی ہوں کہ جو صنعتی عہد میں متبادل کے طور پر سامنے آتی ہیں، وہ ماضی کی اقدار کے مقابلے میں، مختصر المدت اور وقتی نوعیت کی ہوں گی۔ اس بات کا بھی امکان نہیں کہ ٹیکنالوجی سے بھرپور معاشروں میں اقدار کا سلسلہ ایک ''مضبوط اور پائیدار'' صورت اختیار کر لے گا۔ ایک قابل قیاس مستقبل کے لیے ہمیں اقدار کی تیز تر تبدیلی کی امید رکھنی چاہیے۔

تاہم اس تناظر میں ایک اور مضبوط رجحان سامنے آ رہا ہے۔ کیونکہ معاشروں میں ہونے والی تفریق اپنے ساتھ اقدار کا تنوع بھی لے کر آتی ہے۔ ہم لوگ اجتماعیت کو منتشر ہوتا دیکھ رہے ہیں۔

انتہائی ابتدائی عہد کے معاشرے عمومی مشتر کہ اقدار کے ایک وسیع تر اور مرکزی سانچے میں جڑے ہوتے تھے۔ اب یہ سانچا سکڑ رہا ہے اور اس بات کی پیش بینی کے لیے ذرا سے ادراک کی ضرورت ہے کہ آنے والی دہائیوں میں ایک وسیع تر اجتماعیت کی تشکیل کا امکان موجود ہے۔ اور اس قسم کے دباؤ کا دھارا بیرونی جانب یعنی تنوع کی طرف ہے، نہ کہ اندرونی جانب یعنی اتحاد اجتماعیت کی طرف ہے۔

اس بات کا تعلق اس انتہائی بے ہنگم قسم کے پراپیگنڈے سے ہے جو تکنیکی طور پر ترقی یافتہ معاشروں کے افراد کے ذہنوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ گھر، سکول، کارپوریشنز، گرجا گھر، طبقہ امرا، ذرائع ابلاغ...... اور لاتعداد ذیلی گروہ...... تمام کے تمام مختلف قسم کی اقدار کی تشہیر و تعلیم کرتے ہیں۔ بعض افراد کے لیے اس کا نتیجہ ''کسی بھی عمل کا جاری ہونے'' کے سے رویے کا ہوتا ہے۔ جو بذات خود ایک اور اقدار نما چیز ہے۔ نیوز ویک میگزین کے مطابق ''ہم لوگ ایسے معاشرے کے افراد ہیں جس نے اجتماعیت کو کہیں کھو دیا ہے...... ایک ایسا معاشرہ جو کارکردگی، زبان اور آداب کے معیارات پر راضی برضا نہیں ہو سکتا، اور ان پر بھی کہ جو کچھ سنا اور دیکھا۔''

اجتماعیت کے منتشر ہونے کی اس تصویر کی تصدیق Rhode Island Hospital کے سوشل سائنس ریسرچ کوارڈینیٹر مسٹر والٹر گروئن (Wallter Gruen) نے کر دی، جنھوں نے شماریاتی مطالعے کی

ایک سیریز وضع کی، جسے انھوں نے ''حقیقی امریکی ثقافت'' کا نام دیا۔ ابتدائی تفتیش کنندگان کے، یکسانیت پر مبنی، اعتقادات اور ان کے سلسلوں پر چلنے کی بجائے مسٹر گروئن...... خود بھی حیرت میں مبتلا ہو کر...... اس نتیجے پر پہنچے کہ ''عقائد میں تنوع، اعداد کے اعتبار سے زیادہ تعداد میں پائی جانی والی یکسانیت کی نسبت زیادہ بہتر تھا۔ شاید ''امریکی'' ثقافتی احساس سے متعلق گفتگو کرنا گمراہ کن تھا۔ مسٹر گروئن تجویز پیش کرتے ہیں کہ خاص طور پر دولت مند اور تعلیم یافتہ طبقے میں اجتماعیت اقدار کے ایک ''خزانے'' کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ ہم اس بات کی توقع بھی رکھ سکتے ہیں کہ جوں جوں ذیلی گروہوں کی تعداد اور ان کی اقسام میں اضافہ ہوتا رہے گا یہ ''خزانے'' بھی فراوانی کا شکار ہی رہیں گے۔

اقدار کے ٹکراتے ہوئے نظاموں کا سامنا کرتے ہوئے روزمرہ استعمال کی نئی چیزوں کے دھندلکے میں، خدمات، تعلیمی، پیشہ ورانہ اور تفریحی حق انتخاب کے پیش نظر، مستقبل کے لوگ مجبور کر دیے جائیں گے کہ وہ ایک نئے طریقے سے چیزوں کا انتخاب کریں۔ وہ لوگ ایسے ہی طرزِ زندگی ''اختیار'' کریں گے جیسے ابتدائی دور کے لوگ، نسبتاً کم حق انتخاب پر مبنی آزمودہ چیزوں کا استعمال کرتے تھے۔

موٹر سائیکل سوار اور دانشور لوگ

ملکۂ الزبتھ کے عہد میں ''شریف'' کی اصطلاح سے مراد اس شخص کا پیدائشی حادثہ نہیں تھا بلکہ اس اصطلاح کا اطلاق اس کے پورے طرزِ زندگی پر ہوتا تھا۔ شاید اس کے لیے متعلقہ شخص کا شجرہ نسب بھی لازمی ہو لیکن ''شریف'' اور نجیب کہلانے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی شخص ایک خاص طرزِ زندگی اختیار کرے: وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، بہتر اخلاقیات کا حامل ہو، عوام کی نسبت بہتر لباس زیب تن کرے، مخصوص قسم کی تفریحی سرگرمیوں سے محظوظ ہو (اور دیگر سے گریز کرے)؛ ایک بڑے اور بہتر طور پر آراستہ گھر میں زندگی گزارے؛ اپنے ماتحتوں سے ذرا بے نیازی برتے؛ مختصر یہ کہ کبھی بھی اپنی ''برتری'' سے غافل نہ ہو۔''

تاجر طبقے کا بھی ایک مخصوص طرزِ زندگی ہوتا تھا اور زراعت سے وابستہ لوگوں کا ایک اور............ یہ طرزِ زندگی، جیسا کہ ''شریف'' کا ہوا کرتا تھا، مختلف اجزا کو یکجا کر کے بنایا گیا تھا اور ان اجزا میں اس کا گھر پیشہ اور لباس، اس کی زبان، اس کی حرکات اور اس کا مذہب شامل ہیں۔

آج کے عہد میں ہم لوگ اجزا کی پچی کاری کے ذریعے ہی اپنی طرزِ زندگی بنا لیتے ہیں۔ لیکن بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ اب طرزِ زندگی کسی خاص طبقے کا خاصا نہیں۔ طبقات اب خود اکائیوں میں تقسیم ہو رہے

ہیں۔معاشی حوالے اب اپنی اہمیت کھو رہے ہیں لہٰذا آج مسئلہ طبقے کا نہیں رہا بلکہ کسی فرد کے کسی ذیلی گروہ کے ساتھ تعلقات یا وابستگی ہی اس کی طرزِ زندگی کو وضع کرتے ہیں۔محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والا ہپی اور وہ ہپی جو "Exeter" یا "Eton" سے خارج کر دیا گیا ایک جیسی طرزِ زندگی تو رکھتے ہیں مگر ایک جیسا طبقہ نہیں۔

جب سے طرزِ زندگی ایک ایسا ذریعہ بن گیا ہے جس کے ذریعے کوئی بھی فرد، کسی ذیلی گروہ کے ذریعے اپنی شناخت کرواتا ہے، معاشرے میں موجود ذیلی گروہوں کی تعداد میں دھماکہ خیز اضافہ ہوا ہے اور اسی وجہ سے اتنی ہی تعداد میں نئے طرزِ زندگی سامنے آئے ہیں۔لہٰذا اگر آج کے دور میں کسی اجنبی کو امریکہ، برطانیہ، جاپان یا سوئٹزرلینڈ کے معاشروں میں سے کسی ایک میں داخل کر دیا جائے تو اسے، اپنے لیے، طبقات کی بنیاد پر نئے چار یا پانچ طرزِ زندگی میں سے انتخاب نہیں کرنا چاہیے بلکہ حقیقی طور پر موجود سینکڑوں متنوع امکانات میں سے انتخاب کرنا ہے۔آنے والے وقت میں ذیلی گروہ بھی بڑھ جائیں گے لہٰذا طرزِ زندگی کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

ہم کسی طرزِ زندگی کا انتخاب کیسے کریں اور ہمارے لیے کیا معنی و مفہوم لیے ہوئے ہے، یہ بات آنے والے وقت میں نفسیات کا ایک اہم اور مرکزی مسئلہ ہوگا کیونکہ کسی طرزِ زندگی کا انتخاب شعور یا لاشعوری طور پر ہی سہی، کسی فرد کے مستقبل کو بڑی مضبوطی سے ترتیب دیتا ہے اور اس کا اطلاق فرد کی روزمرہ زندگی میں کیے جانے والے انتخاب کے سلسلے میں دیے جانے والے آرڈر، اصولوں کے مجموعے یا معیار کے اطلاق سے ہوتا ہے۔

یہ بات اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ہم اس بات کا تجزیہ کریں کہ انتخاب کس طرح عمل میں آیا۔ ایک نوجوان شادی شدہ جوڑا جو اپنے اپارٹمنٹ کی آرائش کرنا چاہتا ہے سینکڑوں قسم کے لیمپ دیکھ سکتا ہے۔ جن میں سکینڈے نیویائی ممالک کے بنے ہوئے، جاپانی، فرانسیسی پروِنشل، لفافی لیمپ، لالٹین نما لیمپ، امریکی کولونیئل لیمپ وغیرہ شامل ہیں، کسی ایک لیمپ کے انتخاب، مثال کے طور پر لفافی لیمپ سے پہلے فرد کے سامنے بے شمار اقسام، سائز، ماڈلوں اور سٹائل کے لیمپ تھے۔امکانات کی ''کائنات'' میں گھومنے پھرنے کے بعد انھوں نے (امکانات کو) ایک چیز میں ایسے ''صفر'' کیا اور اسے چن لیا۔فرنیچر کے شعبے میں بھی ان لوگوں کے سامنے ''متبادلات'' کی طویل صف بندی ہو سکتی ہے اس تمام کو سکین کرنے کے بعد وہ لوگ ایک "Victorian end" میز پر اکتفا کر لیتے ہیں۔"Scan-and-Select" (پہلے سکین کریں اور پھر انتخاب کریں) کا یہ طریقۂ کار نمدوں، صوفہ سیٹ، پردوں، کھانے کی میزوں اور کرسیوں پر بھی لاگو ہو سکتا ہے۔ دراصل اسی طرح کی کسی چیز کا اطلاق محض ان کے گھر کی سجاوٹ ہی کے سلسلے میں نہیں ہوتا بلکہ اس طریقۂ کار کو

خیالات اپنانے، دوست بنانے، حتیٰ کہ ان کے زیرِ استعمال ذخیرۂ الفاظ اور اقدار پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

چونکہ معاشرہ کسی فرد کے اوپر چکراتے ہوئے، بظاہر نمونے کے بغیر متبادلات کے مجموعے سے بڑے بے قاعدہ انداز میں، چیزوں کا انتخاب کر لیا جاتا ہے۔صارف (چاہے وہ "End Tables" کا ہو یا خیالات کا) اپنے ذہن میں پہلے سے قائم شدہ، مجموعۂ ذوق اور ترجیحات سے لیس ہو کر آتا ہے۔مزید یہ کہ کوئی بھی انتخاب مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتا۔ہر انتخاب سابقہ انتخابات سے مشروط ہوتے ہیں۔اس جوڑے کا End table کو منتخب کرنا، ماضی میں لیمپ کے انتخاب کرنے سے مشروط تھا۔مختصر یہ کہ یہ تمام کا تمام ایک ربط اور آہنگ کا سلسلہ ہے، ذاتی طرز کے لیے ایک کاوش، وہ بھی ہمارے تمام افعال میں..... چاہے شعوری طور پر اس کی قبولیت ہو یا نہیں۔

ایک امریکی مرد جو "button down" کالر پہنتا ہے، لمبے سائز کے موزے پہنتا ہے، (مخصوص) غلاف والا جوتا پہن کر اٹیچی کیس اٹھاتا ہے۔اگر ہم قریب سے جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کا چست انداز بالکل ایسا ہے جیسے روایتی منتظم کاروبار۔ہمیں اس کی کچھ باتیں عجیب و غریب لگیں گی مثلاً وہ کبھی بھی اپنے بال، راک (Rock) موسیقار جمی ہینڈرکس (Jimi Hendrix) کی طرح نہیں بکھرنے دے گا۔وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کچھ لباس، آداب، گفتگو کا انداز، تبصرے اور اشارے کنائے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں جبکہ دوسرے نہیں۔وہ شخص یہ سب کچھ ''محسوس'' کرنے یا اپنے ''وجدان'' سے جانتا ہے اور یہ چیزیں اس نے معاشرے کے دیگر افراد کا مشاہدہ کر کے سیکھیں لیکن تعلیم اس کی حرکات و سکنات کو سنوارتی ہیں۔

سیاہ جیکٹس زیب تن کیے ہوئے موٹر سائیکل سوار جنھوں نے سٹیل جڑے ہوئے آہنی دستانے پہنے ہوتے ہیں، ان کے گلے میں سواستیکا[1] (Swastika) لٹکا ہوتا ہے اور وہ اپنے لباس کو نوکیلے جوتے پہن کر مکمل کرتے ہیں لیکن جوتوں کے اوپر (مخصوص) غلاف نہیں ہوتا، جب وہ چلتا ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ بڑی نخوت سے چلے گا اور جب وہ اپنے عدم استبدانہ اور فرسودہ خیالات کا اظہار کرے گا تو وہ غرائے گا، چونکہ وہ بھی اقدار کی وضع داری سے واقف ہے۔وہ یہ جانتا ہے کہ نرمی اور شائستگی کا کوئی ایک وصف بھی اس کے سٹائل کی تکمیلی صورت کو شدید نقصان پہنچا سکتا ہے۔

نیا سٹائل متعارف کروانے والے اور چھوٹے ہیرو

موٹر سائیکل سوار کالی جیکٹس ہی کیوں زیب تن کرتے ہیں؟ بھوری یا نیلی کیوں نہیں۔امریکہ میں

(۱) ایک شکل جسے علامت، خوش بختی یا سجاوٹ کے لیے پہنا جاتا تھا، نازی پارٹی کا سرکاری نشان۔

(سفر کرنے والے منتظمین (کاروبار) اٹیچی کیس کو ترجیح دیتے ہیں وہ روایتی بریف کیس کیوں نہیں لیتے؟ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ لوگ کسی ماڈل کی پیروی کر رہے تھے اور ان کی نظروں کے سامنے کوئی آئیڈیل ہے۔ ہم لوگ لائف سٹائل ماڈلوں[۱] کے آغاز سے متعلق کم ہی جانتے ہیں۔

تاہم ہمیں یہ معلوم ہے کہ مشہور ہیروز اور شخصیات، جس میں فرضی کردار بھی شامل ہیں (مثلاً جیمز بانڈ)، انھیں اس سے کچھ نہ کچھ سروکار ہے۔

مارلن برنیڈو (Marlon Brando) کالی جیکٹ پہننے والا موٹر سائیکل سوار تھا، شاید بنایا گیا تھا، اس کے بعد اسے ایک لائف سٹائل ماڈل کے طور پر متعارف کروادیا گیا۔ ٹموتھی لیئری (Timothy Leary) نے محبت اور LSD سے متعلق کچھ نام نہاد تصوف کی فضیلتوں کو زبردستی اٹھا کر آراستہ کر کے، غیر واضح انداز میں پیش کر دیا اور وہ ہزاروں نوجوانوں کے لیے ایک ماڈل ثابت ہوئے۔ مشہور ماہر عمرانیات اورن کلیپ (Orrin Klapp) کے نزدیک ایسے ہیروز ''کسی سماجی نمونے کو شفاف بنا دیتی ہیں۔'' انھوں نے آنجہانی جیمز ڈین (James Dean) کا ذکر بھی کیا جنھوں نے "Rebel Without a Cause" نامی فلم میں برگشتہ قسم کی نوخیز جوانی کو بھرپور طریقے سے پیش کیا یا انھوں نے ایلوس پریسلے Elvis Presley کا ذکر کیا جنھوں نے، ابتدائی طور پر، گٹار بجانے والے راک گلوکار (Rock-n-roller) کے تاثر کو پیش کیا اور پھر نقش کر دیا۔ اس کے بعد Beatles اپنے بالوں کے ناشائستہ انداز اور عجیب وغریب لباس میں منظر عام پر آئے۔ مسٹر کلیپ کہتے ہیں، ''مقبول فنکاروں کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں پیش کی جائیں جن کی وجہ سے نئے سٹائل اور نئے ذوق متعارف ہوسکیں۔''

تاہم یہ بھی ضروری نہیں کہ سٹائل متعارف کروانے والا ذرائع ابلاغ میں نظر آنے والی کوئی مشہور شخصیت ہی ہو۔ وہ کوئی غیر معروف اور عام سا شخص بھی ہوسکتا ہے جس کا تعلق کسی ذیلی گروہ سے ہو۔ کولمبیا میں انگریزی کے پروفیسر لیونل ٹرلنگ (Lionel Trilling) کئی سالوں تک "West Side Intellectuals" نامی تنظیم کے مرکزی کردار رہے ہیں، یہ نیویارک کا ایک ذیلی گروہ ہے اور امریکہ کے ادبی اور علمی حلقوں میں جانا جاتا ہے اور اسی گروہ کی سرکردہ خاتون Mary McCarthy تھیں، بیشتر اس کے کہ وہ ایک معروف شخصیت بن گئیں۔ نوجوانوں کے ایک جریدے میں John Speicher نے "Cheetah" کے نام سے ایک

(۱) کوئی نیا طرز زندگی متعارف کروانے والے ماڈل۔

دقیق قسم کا مضمون تحریر کیا اور اس میں انھوں نے ان شخصیات کا ذکر کیا جن سے ۱۹۶۰ء کی دہائی کے نوجوان متاثر تھے۔ ان شخصیات میں چے گوئیوارا (Che' Guevara) سے ولیئم بکلے (William Bucklay)، باب ڈائلان (Bab Dylan) اور جان بائز (John Baez) سے رابرٹ کینیڈی (Robert Kennedy) شامل ہیں۔ مسٹر سپیشیئر (Speicher) ایک ہی اصطلاح کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''امریکی نوجوان کا بگ ہیروز سے، اچھی طرح بھرا ہوا ہے، جہاں جہاں ہیروز جاتے ہیں وہیں پر ہی ان کی پیروی اور نقالی کرنے والے ان گروہوں کے لوگ جاتے ہیں۔''

ایک ذیلی گروہ کے ممبر کو اس کا ہیرو جو کچھ فراہم کرتا ہے اسے مسٹر سپیشر (Speicher) نے ''نفسیاتی شناخت کی لازمی وجودی ضرورت'' کہا ہے۔ یہ تصور کوئی نیا تصور نہیں۔ پہلے کی نسلیں "Charles Lindbergh" اور "Theda Bara" کے حوالے سے اپنی شناخت کروائی تھیں۔ جو چیز نئی اور انتہائی اہمیت کی حامل ہے وہ ان ہیروز اور چھوٹے ہیروز کی حیرت انگیز طور پر فراوانی ہے۔ جوں ہی ذیلی گروہوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور اقدار میں تنوع پیدا ہوتا ہے، ہمیں مسٹر سپیشر کے الفاظ میں، ''ہمیں شناخت کا ایک ایسا قومی احساس ہوتا ہے جو بڑے ابتر طریقے سے تفریق کا شکار ہے''۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ کسی فرد کے لیے یہ ایک بڑا انتخاب ہے: ''گروہوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے، ہیروز کی بھی ایک بہت بڑی تعداد میسر ہے۔ آپ تقابلی شاپنگ کر سکتے ہیں۔''

لائف سٹائل فیکٹریاں

اب جبکہ کرشماتی شخصیات سٹائل وضع کرنے والی ہیں، سٹائل باہر نکلتے ہیں اور پھر ذیلی معاشروں یا چھوٹے قبیلوں کے ذریعے عوام تک پہنچ جاتے ہیں جنھیں ہم لوگ ذیلی گروہ کہتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ سے نیم پختہ قسم کا علامتی مواد لینے کے بعد، لباس، رائے عامہ اور اظہار و ہیئت کا سہارا لے کر وہ تمام ٹکڑے جوڑ کر اسے ایک ہم آہنگ قسم کے پیکیج میں پیش کرتے ہیں اور وہ ہوتا ہے لائف سٹائل ماڈل (طرز زندگی کا ایک نیا ماڈل)۔ جب وہ کسی خاص ماڈل کو تشکیل دے دیتے ہیں، تو وہ کسی اچھی کارپوریشن کی طرح، اسے فروخت کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ اس کے لیے خریدار تلاش کرتے ہیں۔

اگر کسی شخص کو اس بات پر شک ہو تو اسے چاہیے کہ وہ Timothy Leary کے نام مسٹر ایلین گنز برگ (Allen Ginsberg) کے خطوط کا مطالعہ کرے۔ یہ دونوں افراد ہی لائف سٹائل کو تخلیق کرنے کے ذمہ دار تھے اور اس میں خاص کر منشیات کے کثرت استعمال پر بھاری توجہ مبذول کرانے کے۔

ایک شاعر گنز برگ (Ginsberg) کہتے ہیں: ''کل میں این میلر (N.Mailer) اور ایشلے مونٹاگو (Ashley Montages) کے ہمراہ ٹیلی وژن پر گیا اور وہاں طویل تقریر کی...... ہر شخص کو سفارش کی کہ وہ اعلیٰ درجے کی...... ان تمام آزاد خیال لوگوں سے بھی ملاقات کی جو منشیات کے حامی ہیں۔ میرے بارے میں وہ جانتے تھے کہ میرے پاس (ایک خاص رپورٹ تھی جس میں منشیات استعمال کرنے کی حمایت کی گئی تھی) جو رپورٹ ہے اسے میں نے عوام میں عام کیا اور لوگوں کو اس کی کاپیاں فراہم کی ہیں۔ میں نے اس صورت حال کے حوالے سے پانچ صفحات پر مشتمل ایک خلاصہ ''نیویارک ٹائمز'' میں اس کے دوست "Kenny Love" کو ارسال کی، جس پر انھوں نے خبروں کی حد تک اس کہانی کو اٹھایا ہے جسے یو پی (U.P) (یونائیٹڈ پریس) سے تعلق رکھنے والے ایک دوست نیشنل وائر (National Wire) پر دے سکتا تھا۔ میں نے اس کی کاپیاں نیویارک پوسٹ سے تعلق رکھنے والے "Al Aronowitz" کو، اور ٹائم (Time) کے Rosalind constable اور ہارپرز (Harper's) کے باب سلورز (Bab Silvers) کو دیں......''

اس بات میں کوئی حیرت نہیں کہ ہپیوں کے تمام سلسلے کو ذرائع ابلاغ کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ لیکن مسٹر گنز برگ کی پرزور قسم کی پریس ریلیز کا قضیہ جس کو میڈیسن ایونیو (Madison Avenue) کے لاحقے "Wise" (جیسا کہ (news wise) کا اضافہ، بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ''ہل'' (Hill) اور ''نولٹن'' (Knowlton) کے اندرونی میمو (Memo) کی طرح ہی پڑھا گیا، یا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے عوامی سطح کی ایسی کارپوریشن جنھیں عوامی رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے ہی لوگ استعمال کرتے ہوں۔ ہپیوں کے لائف سٹائل (طرزِ زندگی) ماڈل کی تکنیکی طور پر ترقی یافتہ معاشروں کے نوجوانوں کو کامیاب فروخت، ہمارے عہد میں موجود سامان تجارت سے متعلق کہانیوں میں سے ایک ہے۔

تمام کے تمام ذیلی گروہ اشتہاری مہم میں اتنے جارحانہ اور باصلاحیت نہیں، اگرچہ ان لوگوں کے پاس معاشرے میں بھرپور اجتماعی قوت موجود ہے۔ یہ قوت ہماری اس آفاقی خواہش ''تعلق'' سے جنم لیتی ہے۔ ایک غیر ترقی یافتہ قبائلی فرد اپنے قبیلے سے دیرینہ وابستگی رکھتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ اس کا ''تعلق'' اس قبیلے سے ہے۔ اور اس قبیلے سے جدا ہو جانے کا تصور اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے۔ تاہم جدید ٹیکنالوجی کے حامل معاشرے انتہائی وسعت کے حامل ہیں اور ان کی پیچیدگیاں فرد کی توضیحات سے بھی باہر ہیں، لہٰذا کسی ایک یا ایک سے زائد ذیلی گروہوں سے وابستگی کے ذریعے ہی ہم، کسی حد تک اپنی شناخت قائم کر سکتے ہیں اور ''کُل''

کے ساتھ اپنا رشتہ برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح کے کسی گروہ یا گروہوں کے ساتھ عدم وابستگی ہمیں تنہائی، اجنبیت اور لاحاصلی کے احساسات میں گرفتار کرتی ہے اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ''ہم کون ہیں؟''

اس کے برعکس کسی ایسی بڑی اکائی کے ساتھ وابستگی، جو ہماری ذات سے وسیع تر ہو (تاہم ادراک پذیری کے حوالے سے خاصی چھوٹی) اور کبھی کبھار تو وہ اتنی پسندیدہ ہو جاتی ہے کہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں حتیٰ کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم وابستگی کی رو میں آ کر، اپنے قیاس، اقدار، رویوں اور اپنے پسندیدہ طرزِ زندگی کے مخالف چل رہے ہوتے ہیں۔

تاہم ہم ان تمام مراعات کے حصول کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اگر ہم ایک مرتبہ کسی ذیلی گروہ سے وابستہ ہو جائیں تو وہ ہم پر مختلف قسم کے دباؤ ڈالنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی گروہ کے ساتھ ''چلتے رہنے'' کے لیے ہمیں ادائیگیاں کرنی پڑتی ہیں۔ اگر ہم اس گروہ کا سٹائل اپنا لیں تو یہ ہمیں دوستی، محبت اور توصیف کے جذبات عطا کرتا ہے۔ لیکن اگر ہم اس گروہ سے انحراف کا اظہار کریں تو یہ گروہ ہمیں، مذاق اڑا کر، ناپسندیدہ قرار دے کر یا دیگر حربوں سے، سخت ترین سزا دیتا ہے۔

اپنے پسندیدہ لائف سٹائل ماڈلوں کی نمائش کر کے یہ ذیلی گروہ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرواتے ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ ہمارے سب سے زد پذیر تعیناتی اثاثے پر اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں: خود خیالی، ''ہم سے وابستہ ہو جائیں''، وہ لوگ ''سرگوشی'' کرتے ہیں، ''اور اس کے بعد آپ ایک بڑے، بہتر، زیادہ مؤثر، نسبتاً زیادہ معزز شخص بن جائیں گے اور کم تنہائی کا شکار ہوں گے۔'' ان تیزی سے بڑھتے ہوئے ذیلی گروہوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے وقت ہم صرف یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ ہماری شناخت کی صورت گری ہمارے فیصلے کے ذریعے ہی ممکن ہے لیکن ہم ان لوگوں کے احتجاج اور باز احتجاج کی عُجلت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ہم ان کے نفسیاتی قول و قرار کی وجہ سے تذبذب کا شکار بھی ہوتے ہیں۔

ان تمام گروپوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے وقت ہماری مثال نیو اورلینز (New Orleans) کی بوربون سٹریٹ (Bourbonstreet) میں پیدل چلنے والے ایک سیاح کی سی ہوتی ہے۔ جب وہ وہاں پر قائم کردہ گھٹیا قسم کے نائٹ کلبوں کے قریب سے گزرتا ہے اس کلب کے دربان اس کے بازوؤں سے اسے پکڑ لیتے ہیں، اسے (اٹھا کر) چکر دیتے ہیں اور اس کے بعد دوسرا دروازہ کھول دیتے ہیں تاکہ وہ شخص اس بار کے پیچھے بنے ہوئے پلیٹ فارم پر رقص کرنے والے افراد کے برہنہ جسموں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال سکے۔

اسی طرح ذیلی گروہ بھی ہمیں قابو کرنے کے لیے ہم تک آتے ہیں اور ہمارے اندر موجود ذاتی اور نجی نوعیت کے ''سراب خیال'' کو اتنے بھرپور اور دقیق انداز سے متاثر کرتے ہیں کہ جو میڈیسن ایونیو (Madison Avenue) کی تشہیر کردہ کسی چیز سے بھی نہیں ہوتا۔

جو چیز وہ پیش کرتے ہیں وہ محض کوئی پُرفریب کھیل، کوئی صابن یا واشنگ پاؤڈر نہیں ہوتا۔ وہ لوگ کوئی تیار کردہ چیز پیش نہیں کرتے بلکہ ایک بہترین طریقے سے تیار کردہ چیز پیش کرتے ہیں اور یہ بات بھی درست ہے کہ وہ گرمی جذبات، ہم نشینی، عزت نفس اور کسی طبقے سے وابستگی کے احساس کو ہی اپنا مشن قرار دیتے ہیں۔ عطریات اور بیئر تیار کرنے والوں کی اشتہاری مہم والے بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان تمام تر چیزوں میں جو ''جادوئی جز''، امتیازی قسم کی آمیزش کی حیثیت رکھتی ہے اور جسے ذیلی مسالک والے ہی پیش کرتے ہیں اور کوئی پیش کار پیش نہیں کرتا اور یہ سب کچھ بیش انتخاب کے مسئلے سے چھٹکارے کا نام ہے۔ کیونکہ یہ لوگ کسی ایک تیار کردہ چیز یا خیال کا نام نہیں بلکہ تمام تیار شدہ چیزوں اور خیالات کو منظم کرنے کا نام ہے، روزمرہ استعمال کی کوئی عام چیز نہیں بلکہ ایک مکمل سٹائل، راہنما اصولوں کا ایک مجموعہ جو کسی فرد کی اس حوالے سے اعانت کرتا ہے کہ وہ انتخاب کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی کو بہتر شرح تک لے آئے۔

ہم میں سے اکثر لوگ بڑی بے تابی سے، اس قسم کی باضابطہ راہنمائی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ تضادات سے بھرپور اخلاقی اقدار کے گنجلک میں، بیش انتخاب سے پیدا شدہ الجھن میں، مضبوط ترین، کارآمد ترین، ''بہترین تیار شدہ چیز'' کسی شخص کی زندگی کو منظم کرنے والا اصول ہے۔

سٹائل کی قوت

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کوئی ایک طرزِ زندگی ناکافی ہوتا ہے۔ ہم لوگ مسابقتی ماڈلوں کے ایک ''بازارِ مصر'' میں رہتے ہیں۔ اس نفسیاتی سراب خیال میں ہم لوگ کوئی سٹائل تلاش کرتے ہیں، اپنے وجود کو ترتیب میں لانے کے لیے ایک طریقۂ کار جو ہمارے مخصوص مزاج اور حالات کے عین مطابق ہو۔ ہم لوگ ہیروز یا چھوٹے ہیروز تلاش کرتے ہیں تاکہ ان کے اعمال و افعال کی نقالی کر سکیں۔ کسی سٹائل کو تلاش کرنے والا شخص اس خاتون کی طرح ہے جو کسی فیشن سے متعلق جریدے کی ورق گردانی کرنے کے بعد اپنے لیے لباس کا (نیا) نمونہ تلاش کرتی ہے۔ وہ خاتون ایک جریدہ دیکھنے کے بعد دوسرا دیکھتی ہے، کسی ایسے نمونے پر اکتفا کرتی ہے جو اسے بھاجاتا ہے، اور اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے لباس تیار کرتی ہے۔ اس کے بعد وہ ضروری چیزیں

اکٹھی کرتی ہے۔ کپڑا، دھاگہ، بٹن، ڈوریاں، بالکل اسی طرح لائف سٹائل بنانے والا ضروری چیزیں اکٹھی کرتا ہے۔ وہ اپنے بال بڑھاتا ہے وہ مصوری کے نئے پوسٹر اور جیسے گویا کی تصانیف کے (کاغذی جلد کے) سستے ایڈیشن خریدتا ہے۔ وہ مارکیوس (Marcuse) اور فینن (Frantz Fanon) پر بحث و مباحث کرنا سیکھتا ہے۔ مخصوص الفاظ کا استعمال سیکھتا ہے جن میں ''رابطہ'' اور ''حاکمہ'' بھی شامل ہیں۔ ان میں سے کسی بات کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی سیاسی سرگرمیاں غیر اہم ہیں، یا یہ کہ اس کے نظریات نامعقول یا احمقانہ ہیں۔ وہ معاشرے سے متعلق اپنے خیالات میں درست ہو سکتا ہے (اور نہیں بھی)۔ تاہم وہ مخصوص طریقۂ کار جسے وہ ان خیالات کے اظہار کے لیے چن لیتا ہے وہ یقینی طور پر اس کے ذاتی سٹائل کی تلاش کا لازمی حصہ ہے۔

وہ خاتون جو اپنا لباس تیار کرنا چاہتی ہے، اس لباس کو تھوڑا بہت تبدیل کرتی ہے، اور یہ تبدیلی ان نمونوں سے ذرا سا انحراف ہے، تاکہ وہ اس لباس کو اپنے مطابق بہتر سے بہتر بنا سکے۔ اس کے نتیجے میں تیار ہونے والی چیز حقیقی طور پر رواج کے مطابق ہوتی ہے؛ تاہم یہ ان لباسوں سے ذرا مشابہ ہے جو اسی ڈیزائن کو مدنظر رکھ کر تیار کیے گئے۔ بعینہ ہم اپنے سٹائل کو انفرادی بناتے ہیں تاہم یہ سٹائل اکثر کسی اور کے تیار کردہ لائف سٹائل کے اس ماڈل سے مشابہ ہو جاتا ہے جسے کسی ذیلی مسلک نے تیار کیا ہو اور پھر اسے معاشرہ میں پھیلایا ہو۔

عمومی طور پر ہم لوگ اس لمحے سے ناآشنا ہوتے ہیں جب کسی ایک طرزِ زندگی کے ماڈل کو دیگر پر ترجیح دے رہے ہوتے ہیں۔ یہ فیصلہ کہ ہم نے کسی کاروبار کا ناظم بننا ہے یا سیاہ فام مسلح شخص یا ویسٹ سائیڈ (تنظیم کا) دانشور، یہ شاذ ہی خالص منطقی تجزیے کا نتیجہ ہوتا ہے اور نہ ہی یہ فیصلہ، ہمیشہ، اچانک کیا جاتا ہے۔ وہ تحقیقی سائنسدان جنھوں نے سگریٹ چھوڑ کر پائپ پینا شروع کر دیا ہے، شاید ان کے سامنے صحت سے متعلق چند معروضات ہوں، بغیر اس بات کا احساس کیے کہ پائپ ایک مکمل لائف سٹائل کا حصہ ہے جس کی طرف وہ خود کو مائل ہوتا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ وہ شادی شدہ جوڑا جس نے Tiffamy لیمپ پسند کیا تھا، تصور کر رہا ہوگا کہ وہ لوگ اپنے اپارٹمنٹ کی سجاوٹ مکمل کر رہے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو ایک مکمل طرز زندگی کو اپنانے کی کاوش سمجھ رہے ہوں۔

دراصل ہم میں سے بہت سے افراد اپنی اپنی زندگیوں کو زندگی گزارنے کے ایک ''سٹائل'' کی حیثیت سے نہیں دیکھتے اور ہمیں اس کو خارجی طور پر زیر بحث لاتے ہوئے بھی دقت پیش آتی ہے ہم اس وقت زیادہ مشکل کا شکار ہوتے ہیں جب ہم اپنے معاشرے میں پھیلی ہوئی اقدار اور ان کے ڈھانچوں کو وضع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کام سراسر مشکل ہے کیونکہ ہم میں سے اکثر افراد کوئی سا ایک یا اتمامی سٹائل نہیں

اپناتے بلکہ مختلف ماڈلوں سے اخذ کیا ہوا مجموعی سٹائل اپناتے ہیں۔ ہم ہپی اور سرفر (Surfer) دونوں کے انداز اپنا سکتے ہیں۔ ہم West Side Intellectual اور کسی کاروبار کی درمیانی راہ پر بھی چل سکتے ہیں۔ ایک ایسا ملاپ جسے نیویارک سے تعلق رکھنے والے پبلشنگ اداروں کے مالکان کے اپنایا ہے۔ جب کسی شخص کا ذاتی سٹائل دورنگا ہوگا تو اس بات میں یقینی طور پر دقت پیش آئے گی کہ ان مختلف ماڈلوں کی گتھی سلجھائی جائے جس پر ان دونوں کا انحصار ہے۔

جب ہم ایک مرتبہ کسی ایک خاص ماڈل سے منسوب کر لیں تو ہم بھرپور قوت کے ساتھ اسے تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور شاید ہم اس سے زیادہ قوت اسے کسی بھی چیلنج سے بچانے کے لیے صرف کرتے ہیں۔ سٹائل ہمارے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ یہ بات مستقبل کے لوگوں کے لیے مزید درست ہے جن کے لیے سٹائل کا مسئلہ سیدھا سادہ جنون کا سا ہوتا ہے۔ تاہم سٹائل کے لیے یہ غرض وغایت وہ نہیں جسے ادبی نقاد ''رسم پرستی'' کہتے ہیں۔ یہ محض ظاہری چیزوں میں دلچسپی نہیں ہے۔ اور نہ ہی سٹائل رویوں کی سطحی اور بیرونی ہیئت تک محدود ہے بلکہ ان رویوں میں پنہاں اقدار تک وسیع ہے اور کوئی بھی شخص اس وقت تک کسی کا لائف سٹائل تبدیل نہیں کر سکتا جب تک وہ اس کے خودتصوری میں کوئی تبدیلی لے کر نہ آئے۔ مستقبل کے لوگ ''سٹائل'' کے بارے میں اتنے حساس نہیں ہوں گے بلکہ وہ ''لائف سٹائل'' کے بارے میں زیادہ حساس ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات چھوٹی چھوٹی چیزیں ان کے لیے انتہائی اہمیت حاصل کر لیتی ہیں۔ کسی بھی شخص کی زندگی کی چھوٹی سی تفصیل جذباتی قوت سے بھرپور ہو سکتی ہے اگر وہ کسی ایسے طرز زندگی کو چیلنج کر دیتی ہو جو اکتسابی نوعیت کا ہے اور اگر وہ کسی سٹائل کی سالمیت کو توڑنے کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ آنٹی ایتھل (Ethel) ہمیں شادی کے موقع پر کوئی تحفہ پیش کرتی ہیں، ہم اس تحفے کو دیکھ کر خفا ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ ایسے سٹائل میں ہے جو ہمارے لیے شناسا نہیں۔ ہم اس سے بدگمان اور پریشان ہو جاتے ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ''آنٹی ایتھل (Ethel) چیزوں کے بارے میں بہتر نہیں جانتیں۔'' ہم اس تحفے کو اپنے کمرے کے شیلف میں واضح جگہ پر نہیں رکھتے۔

آنٹی ایتھل کا دیا ہوا ٹوسٹر یا میز پوش اپنی جگہ کسی اہمیت کا حامل نہیں لیکن یہ ایک مختلف ذیلی ثقافتی دنیا سے پیغام کی طرح ہے، جب تک ہم اپنے سٹائل کے ساتھ شدید وابستگی رکھتے ہیں، جب تک ہم دو مختلف سٹائلز کے بیچ تذبذب کی کیفیت میں رہیں گے، یہ ہمارے لیے مسلسل خطرہ ہی بنا رہے گا۔ ماہر نفسیات

لیون فیسٹنگر (Leon Festinger) نے اس عمل کو ''ادراکی ناہمواری'' کا نام دیا ہے اس سے مراد کسی شخص کی وہ صلاحیت ہے جس سے وہ اس اطلاع یا معلومات کو رد کرتا ہے جو اس کی پیش بینی کے لیے چیلنج کا باعث ہو۔ ہم لوگ ان چیزوں کو سننا پسند نہیں کرتے جو ہمارے، بڑی احتیاط سے ترتیب دیے گئے عقائد اور ڈھانچوں کو متزلزل کر دیں۔ اسی طرح آنٹی ایتھل کا دیا ہوا تحفہ ''سٹائل کی ناہمواری'' کے عنصر کی نمائندگی کرتا ہے اور اس سے ہمارے اس طرز زندگی کی بربادی کا خدشہ محسوس ہوتا ہے جسے ہم نے بڑی احتیاط سے ترتیب دیا۔

طرز زندگی کے پاس خود کو محفوظ رکھنے کی یہ قوت کیونکہ موجود ہوتی ہے؟ اس سے ہماری وابستگی کا ذریعہ کیا ہے؟ طرز زندگی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنے خیالات (وغیرہ) کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ دنیا کو بتانے کا ایک ذریعہ ہے کہ ہم کس مسلک یا ذیلی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ اس چیز کی بڑے پیمانے پر اہمیت ہمارے لیے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ وہ خاص وجہ کہ طرز زندگی ہمارے لیے کیوں اہم ہیں۔ اور معاشرے میں تنوع کے ساتھ ساتھ ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ تمام چیزوں سے ہٹ کر اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی طرز زندگی کے تشکیل پا جانے کا انتخاب، پیش انتخاب کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے خلاف ہماری نجی جنگ کا ایک فیصلہ کن لائحہ عمل ہے۔

شعوری یا لاشعوری طور پر اس بات کا فیصلہ کرتے ہوئے کہ ولیم بکلے جان بائز (Joan Baez)، لیونل ٹرلنگ (Lionel Trilling) یا انہی کے برابر مرتبے کے حامل سرفر جے جے مون (J.J.Moon) کی طرح بن جایا جائے ہم لاکھوں کی تعداد میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے فیصلے کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ کسی سٹائل سے وابستگی ہو جائے تو ہم بہت سے لباسوں اور رویوں، بہت سے خیالات اور انداز سے اس لیے جان چھڑانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ وہ ہمارے اختیار کردہ سٹائل سے مطابقت نہیں رکھتے۔ کالج کا وہ طالب علم جو "Student Protestor Model" میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے اس بات پر نسبتاً کم توانائی خرچ کرتا ہے کہ "Wallace" (نامی پارٹی) کو ووٹ دیا جائے، اٹیچی کیس لے کر سفر کیا جائے یا مشترکہ فنڈز میں سرمایہ کاری کی جائے۔

کسی ایک طرز زندگی پر متفق ہونے کے بعد ہم لاتعداد متبادلات پر مزید غور کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ شخص جس نے موٹر سائیکلسٹ ماڈل (نامی ذیلی مسلک) کا انتخاب کیا ہے اسے بازار سے دستیاب ہونے والے سینکڑوں قسم کے ان دستانوں سے کوئی غرض وغایت نہیں جو اس کے مخصوص انداز کی خاصیت سے تکرار ہے ہوں۔ اسے تو صرف انہی دستانوں کو انتخاب کرنے کی ضرورت ہے جو حجم میں چھوٹے ہیں اور ان حدود کے اندر ہیں جو

اس کے ماڈل نے مختص کیا ہے۔ اور وہ دستانے جو اس کے خیالات اور اس کے سماجی تعلقات کے عین مطابق ہے۔

لہٰذا کسی خاص سٹائل کو دوسرے سٹائل سے بہتر جان کر اس سے وابستگی ایک اعلیٰ سطح کا فیصلہ ہے۔

یہ زندگی کے ان روزمرہ فیصلوں کے سلسلے سے ہٹ کر بڑی سطح کا ایک فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جو ان متبادل چیزوں کی وسعت کو کم کرتا ہے جن کا سامنا ہم نے مستقبل میں کرنا ہے۔ جب تک ہم اپنے انتخاب کردہ سٹائل کی حدود میں کام کرتے ہیں ہمارے انتخاب سادہ نوعیت کے ہی ہوتے ہیں۔ راہنما اصول بھی واضح ہوتے ہیں۔ وہ ذیلی مسلک یا گروہ جس سے ہمارا تعلق ہوتا ہے کسی سوال کا جواب دینے میں ہماری مدد کرتا ہے؛ یہ راہنما اصولوں کو اپنی جگہ پر قائم رکھتا ہے۔ لیکن جب ہمارے سٹائل کو اچانک چیلنج کیا جاتا ہے، جب کوئی قوت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں، تو ہم ایک اور اہم ترین فیصلہ کرنے کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ہمیں اس تکلیف دہ ضرورت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ہم نہ صرف خود کو تبدیل کریں بلکہ اپنی خود تصوری میں بھی تبدیلی لے کر آئیں۔

یہ صورت حال اس لیے تکلیف دہ ہوتی ہے کہ اپنے مخصوص سٹائل سے وابستگی سے آزاد ہو کر، اس ذیلی مسلک سے بھی علیحدگی اختیار کر کے جس نے اسے جنم دیا، ہم ''وابستہ'' نہیں رہ سکتے۔ اس سے بھی بدتر یہ بات ہے کہ ہمارے بنیادی اصولوں سے متعلق ہماری باز پرس شروع ہو جاتی ہے اور ہمیں اپنی زندگی سے متعلق ہر فیصلہ نئے انداز سے کرنا پڑتا ہے اور فیصلہ بھی تنہا ہی کرنا ہوتا ہے جس میں کسی یقینی اور طے شدہ پالیسی کی ضمانت بھی نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ ہم ایک مرتبہ پھر بیش انتخاب کے ایک مکمل اور کچل دیے جانے والے بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔

''خود'' کی بہتات

''سٹائل کے بیچ'' یا ''ذیلی مسالک کے بیچ'' ہونا زندگی میں ایک بحرانی کیفیت کا نام ہے اور مستقبل کے لوگ اس حالت میں زیادہ وقت گزاریں گے، سٹائل کی تلاش میں، بہ نسبت ماضی یا حال کے لوگوں۔ اپنی شناخت تبدیل کرنے سے، جدید ترین صنعتی عہد کا شخص، برسرپیکار ذیلی مسالک کی دنیا کے ذریعے ایک نجی خط مستدیر تلاش کر لیتا ہے۔ یہ مستقبل کا ایک سماجی تحرک ہے: نہ صرف ایک سماجی طبقے سے دوسرے طبقے میں بلکہ ایک قبائلی تقسیم سے دوسری قبائلی تقسیم تک۔ ایک ذیلی مسلک سے ایک عارضی قسم کے ذیلی مسلک تک انتھک قسم کی نقل و حرکت اس کی زندگی کی اتصالی صورت کو بیان کرتی ہے۔

اس بے چینی کی بے شمار وجوہات ہیں۔ بات صرف یہاں تک ہی محدود نہیں کہ کسی فرد کی نفسیاتی

ضروریات ماضی کے مقابلے میں زیادہ تبدیل ہوتی ہیں؛ ذیلی مسالک بھی تبدیل ہوتے ہیں۔ ان تمام اور دیگر وجوہات کی بنا پر، ذیلی مسالک کے ممبران کے مزید ناپائیدار ہونے کی وجہ سے، ذاتی سٹائل کی تلاش میں شدت آ جائے گی، بلکہ آنے والی دہائیوں میں انتہائی شدید ہو جائے گی۔ ہم لوگ خود کو عجیب سا اور بوریت کا شکار محسوس کرتے ہیں، اور موجودہ صورت حال کے پیش نظر عدم اطمینان کا شکار۔ بالفاظ دیگر، موجودہ سٹائل سے ناخوش۔ اس خاص لمحے ہم لوگ کسی ایسے اصول کی تلاش میں دوبارہ سرگرداں ہو جاتے ہیں جس کے گرد اپنے انتخاب کو منظم کر سکیں۔ ہم پھر ''اعلیٰ ترین فیصلے'' کی نہج پر پہنچ جاتے ہیں۔

اس خاص لمحے اگر کوئی شخص ہمارے رویوں پر غور کرے تو اسے ایک چیز میں خاصا اضافہ نظر آئے گا جسے ناپائیداری کا اشاریہ کہا جا سکتا ہے۔ اشیا، مقامات، لوگ اور معلومات پر مبنی تعلقات میں ردوبدل کی شرح میں حیران کن اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ اس ریشمی لباس یا ٹائی، پرانے Tiffany لیمپ، بڑے پنجے نما وکٹورین اینڈ (Victorian End) میز سے جان چھڑا لیتے ہیں۔ یہ تمام علامتیں ہمارے ماضی کے ذیلی مسلک سے وابستگی کی علامتیں ہیں۔ ہم یکے بعد دیگرے، ان چیزوں کے ذریعے متبادل تلاش کر لیتے ہیں جو ہماری نئی شناخت کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہی عمل ہماری سماجی زندگیوں میں بھی وقوع پذیر ہوتا ہے۔ لوگوں کی سرگرمیوں کی شرح بڑھ جاتی ہے۔ ہم جن خیالات پر کاربند ہوتے ہیں انھیں رد کرنا شروع کر دیتے ہیں (یا ان کی نئے سرے سے تشریح کرتے ہیں اور وضاحت کرتے ہیں)۔ پھر ہم ان تمام پابندیوں سے آزاد ہو جاتے ہیں جو ہمارے ذیلی مسلک یا سٹائل نے ہم پر لاگو کی تھیں۔ ناپائیداری کا اشاریہ ہماری زندگی کے ان لمحات کو، حساس قسم کے اشارے کے ذریعے ہی ثابت کرے گا جب ہم بالکل آزاد ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی، بالکل گم۔

یہی وہ وقفہ ہے جب ہم شدید قسم کے ارتعاش کا شکار ہوتے ہیں جسے ''متلاشی رویہ'' کہتے ہیں۔

اب ہم لوگ نئے ذیلی مسالک کے پیغامات اور اپنے اردگرد کے ماحول میں موجود دعوے اور ان کے رد سے زد پذیر بن گئے ہیں۔ ہم کبھی اس طرف جھکتے ہیں کبھی دوسری طرف۔ کوئی مضبوط قسم کا نیا دوست کوئی فیشن یا خیال، ایک نئی سیاسی تحریک، ذرائع ابلاغ کی گہرائیوں سے کسی نئے ہیرو کا ابھرنا۔ ایسے لمحے یہ تمام چیزیں بھرپور قوت کے ساتھ ہم سے ٹکراتی ہیں۔ ہم لوگ کسی فرد یا کسی گروہ کے انتظار میں مزید ''اثر پذیر''، غیر یقینی کا شکار اور تیار ہو جاتے ہیں کہ کوئی ہمیں بتائے کہ کیا کیا جائے اور کیا رویہ اختیار کیا جائے۔

فیصلے ..... چاہے چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں ..... کرنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی حادثاتی سلسلہ

نہیں۔روزمرہ کے دباؤ سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ہمیں ان چھوٹے چھوٹے معاملات سے متعلق بھی مزید معلومات کی ضرورت ہے جو ہمارے مضبوط قسم کے سٹائل میں آئے ہوئے اور تنہائی کا شکار نظر آتے ہیں اور ہم آگے چلتے چلے جاتے ہیں۔ہم ایک نئے ذیلی مسلک کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر اس میں گھل مل جانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ہم نیا سٹائل اختیار کر لیتے ہیں۔

جوں ہی ہم جدید صنعت کاری کی طرف، تیزی سے، بڑھتے ہیں تو ہمیں ایسے افراد دکھائی دیتے ہیں جو لائف سٹائل کو اس تیز رفتاری سے اختیار کر رہے ہوتے ہیں اور رد کر رہے ہوتے ہیں کہ کسی بھی گزشتہ نسل کے لوگ یہ منظر دیکھ کر چونک جائیں۔کیونکہ خود لائف سٹائل بھی تلف پذیر چیز بن چکی ہے۔

یہ کوئی چھوٹا یا آسان مسئلہ نہیں ہے۔اس کا تعلق ایک معروف اصطلاح ''عدم وابستگی'' سے ہے اور یہ ہمارے عہد کی ایک اہم چیز ہے۔جیسے جیسے لوگ ایک ذیلی مسلک سے دوسرے ذیلی مسلک یا ایک سٹائل سے دوسرے سٹائل کی طرف جاتے ہیں ان پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ خود کو عدم وابستگی کے ناگزیر دکھ سے محفوظ رکھیں۔وہ لوگ خود کو جدا ہو جانے کے ''میٹھے'' دکھ سے بچانا بھی سیکھ لیتے ہیں۔انتہائی پارسا قسم کا کیتھولک عیسائی جو اپنا مذہب تبدیل کر لیتا ہے اور بائیں بازو کے ایک کارکن کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے، اس کے بعد وہ خود کو کسی اور مقصد اور تحریک یا ذیلی مسلک سے بھی منسلک ہو جاتا ہے جس کے ساتھ اس نے ہمیشہ نہیں چلنا ہوتا۔وہ گراہم گرین کی اصطلاح پر پورا اترتا ہے ''خاکستر ہوا معاملہ'' وہ اپنی گزشتہ مایوسی سے سبق سیکھتا ہے کہ اس پرانی ''خودی'' پر ضرورت سے زیادہ اعتماد نہیں کرتا۔

اور پھر جب وہ بظاہر کسی ذیلی مسلک یا سٹائل کو اپناتا بھی ہے تو وہ اپنی ذات کے کچھ حصے پر قابو پالیتا ہے۔ وہ گروہ کے تقاضوں سے متفق ہو جاتا ہے اور اسی گروپ کی دی ہوئی چیزوں پر ہی خوش ہو جاتا ہے۔لیکن یہ لوازمات ویسے نہیں ہوتے جیسے پہلے کبھی ہوا کرتے تھے اور خفیہ طریقے سے، وہ ایک لمحے کے نوٹس پر اس سے جدا ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔اس کا یہ مطلب ہے کہ جب وہ بظاہر کسی ایک گروہ یا قبیلے کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے تو اسے رات کے اندھیرے میں، ہم عصر قبیلوں کے شارٹ ویو (Short-Wave) سگنل موصول ہو رہے ہوتے ہیں۔

اس حوالے سے اس گروپ میں اس کی رکنیت سطحی ہوتی ہے۔وہ مسلسل عدم وابستگی کی حالت میں رہتا ہے اور اس گروپ کی اقدار اور سٹائل سے مضبوط وابستگی نہ ہونے کی وجہ سے اسے معیار کا وہ پیمانہ نہیں مل سکتا جو اس کو بیش انتخاب کے ایک پھیلے ہوئے جنگل میں راستہ بنانے کے لیے درکار ہے۔

نتیجتاً جدید صنعتی انقلاب بیش انتخاب کے کل مسئلے کو، ماہیئتی طور پر، نئی سطح بن جانے پر مجبور کرتا ہے،۔یہ ہمیں اس بات پر بھی مجبور کرتا ہے کہ ہم انتخاب کریں صرف لیمپ یا لیمپ کے رنگوں میں سے ہی نہیں بلکہ زندگیوں میں سے، لائف سٹائل کے اجزا میں سے نہیں بلکہ مکمل لائف سٹائلز میں سے۔

بیش انتخاب کے مسئلے کی شدت ہمیں خود احتسابی، احتساب بالنفس اور دروں بینی کی محفلیں منعقد کرنے پر مجبور کرتی ہے۔یہ ایک مشہور اور معاصرانہ عارضے کے ذریعے ہمارا راستہ روکتی ہے جسے ''شناخت کا بحران'' کہا جاتا ہے۔اس سے پہلے کثیر تعداد میں افراد نے انتخاب کے اتنے پیچیدہ مجموعے دیکھے۔شناخت کی تلاش اس بڑے معاشرے کے نام نہاد عدم انتخاب کی وجہ سے نہیں ابھری بلکہ محض ہمارے حق انتخاب کی فراوانی اور پیچیدگی کی وجہ سے۔

ہر مرتبہ ہم کسی سٹائل کا انتخاب کرتے ہیں، کوئی بہترین قسم کا فیصلہ کرتے ہیں، ہم کسی خاص ذیلی ثقافتی گروہ یا گروہوں سے منسلک ہوتے ہیں، ہم اپنی خود تصوری میں کچھ تبدیلی لے کر آتے ہیں۔کسی حوالے سے ہم مختلف قسم کا کوئی شخص بن جاتے ہیں جبکہ ہم خود کو مختلف ظاہر کرتے ہیں۔ہمارے پرانے دوست جو ہمیں ہمارے سابقہ حوالے کی وجہ سے جانتے ہیں اپنی بھنویں اٹھا کر ہمیں دیکھتے ہیں۔انھیں ہمیں پہچاننے میں دقت پیش آتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمیں خود بھی پہچاننے میں اور، اپنے ہی ماضی کے انسان سے ہمدردی کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔

ہپی بہترین قسم کا حاکم اعلیٰ بن جاتا ہے اور حاکم اعلیٰ خلا باز بن جاتا اور یہ کام تبدیلی کے باضابطہ قدم سمجھے بغیر ہی ہو جاتا ہے اس سارے عمل میں وہ نہ صرف اپنے سٹائل کی بیرونی چیزیں بھی رد کر دیتا ہے بلکہ اپنے بہت سے اساسی قسم کے رویے بھی فراموش کر دیتا ہے اور ایک دن یہی سوال اس کے غنودگی بھرے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے کی طرح لگتا ہے: ''کیا بچ گیا ہے؟'' مسلسل، دیرپا اندرونی ڈھانچے کی صورت میں ''خود'' یا ''شخصیت'' سے متعلق کیا کہا جائے گا؟ کچھ لوگوں کے لیے جواب انتہائی مختصر ہے کیونکہ ان کا تعلق اب ''خودی'' سے نہیں ہے بلکہ ''سلسلہ وار خود'' سے ہے۔

لہٰذا جدید صنعتی انقلاب انسان کے اپنے بارے میں تصور میں بنیادی تبدیلی چاہتا ہے، شخصیت سے متعلق ایک نیا نظریہ جو مردوں کی زندگیوں میں موجود عدم تسلسل، اور تسلسل دونوں پر اپنی توجہ مبذول کرتا ہے۔

جدید صنعتی انقلاب آزادی کے ایک نئے تصور کا متمنی ہے۔اس بات کی آگہی کہ آزادی کو اس میں موجود انتہائی لچک تک دبائے جانے کے بعد، اپنی ہی نفی کرتی ہے۔تفریق کی نئی سطح کی طرف معاشرے کی

''چھلانگ''، لازمی طور پر، اپنے ساتھ انفرادیت کے نئے مواقع لے کر آئے گی، اور جدید ٹیکنالوجی، عارضی قسم کی تنظیمی صورتیں، انسان کی ایک نئی نوع کا تقاضا کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاہ فام لوگوں پر ''پابندی'' کے عہد اور عارضی مخالفت کے باوجود سماجی پیش قدمی کا عمل ہمیں وسیع تر برداشت اور زیادہ سے زیادہ متنوع انسانوں کی نسبتاً آسان قبولیت کی طرف لے کر جاتا ہے۔

اور مشہور نعرے ''اپنا اپنا کام کرو'' کی فوری شہرت اس تاریخی پیش قدمی کی عکاسی کرتی ہے۔ کیونکہ معاشرہ جتنا زیادہ تقسیم ہوگا یا تفریق شدہ ہوگا اس میں اتنے ہی زیادہ لائف سٹائل جنم لیں گے اور معاشرہ جتنے زیادہ سماجی طور پر قابل قبول لائف سٹائل ماڈل پیش کرے گا وہ معاشرہ اس صورت حال کے اتنا ہی قریب پہنچے گا جس میں، حقیقی طور پر انسان اپنا بے مثال قسم کا کام کرتا ہے۔

لہٰذا تمام Ellups، Fromms، Mumfords اور Marcuses کے تمام تر ٹیکنالوجی مخالف دلائل کے باوجود یہ جدید ترین صنعتی معاشرہ ہی ہے، انسانی تاریخ میں ترقی یافتہ ترین معاشرہ، جو آزادی کی حدود وسیع کر دیتا ہے۔ مستقبل کے لوگوں کو تکمیل ذات کے اتنے مواقع حاصل ہیں جتنے کبھی بھی، کسی کو بھی حاصل نہیں تھے۔

نیا معاشرہ، صحیح معنوں میں دیرپا تعلقات کے زمرے میں کچھ نئی بنیادی چیزیں پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ زیادہ متنوع قسم کی زندگی سے متعلق مناسب اشیا، سرگرمیوں کے لیے زیادہ آزادی تاکہ اپنے لیے موزوں ترین چیزیں تخلیق کی جاسکیں جو ابتدائی عہد کے معاشروں میں دستیاب نہیں تھیں۔ یہ معاشرہ اپنے فرد کو "Riding Change" نام کی فرحت بخش تفریح میسر کرتا ہے، اسے فروغ دیتا ہے، تبدیل کرنے اور اس کی نشوونما کے مواقع میسر کرتا ہے۔ ایک ایسا عمل جو سرفنگ (Surfing)، جانوروں سے زور آزمائی کرنے اور آٹھ۔ لین والی سڑک پر گاڑیوں کو ٹکرانا، نشہ آور ادویات کے استعمال کے بعد سیر و تفریح۔ یہ تمام چیزیں کسی فرد کو ایسے مقابلے فراہم کرتی ہیں جس میں اسے انتہائی مہارت اور بلا کی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو فرد ان چیزوں سے لیس ہوگا جو اس بات کی کوشش کرے گا کہ ان تیزی سے فروغ پاتے جدید صنعتی سماجی ڈھانچے کو سمجھے، اس فرد کے لیے جو زندگی کے چلن کو بالکل ''صحیح'' پائے، ذیلی مسالک کی ترتیب کو ''صحیح'' پائے، تاکہ لائف سٹائل ماڈلز کو پھلنے پھولنے کا موقع میسر آئے تو بڑی شاندار جیت ہوگی۔

یہ بات ناقابل تردید ہے کہ ان شاندار الفاظ کا اطلاق ان میں سے اکثر پر نہیں ہوتا۔ ماضی اور حال کے اکثر لوگ اپنی زندگیوں کی موزوں ترین جگہوں میں مقید رہے ان حالات میں نہ تو ان کے پاس امید تھی اور نہ

ہی انھوں نے لگائی، تاکہ ہمیشہ راہ فرار اختیار کی جائے۔ اکثر انسانوں کے لیے حق انتخاب انتہائی محدود ہی رہا۔

ان کی یہ قید ٹوٹنی چاہیے......اور ٹوٹے گی۔ تاہم اس کا ٹوٹنا ٹیکنالوجی کے خلاف دھواں دھار تقریروں کی وجہ سے نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ہی اس کا ٹوٹنا کاہلی، تصوف اور غیر منطقیت کی طرف لوٹ کر ہوگا۔ اس کا ٹوٹنا تجزیات، تجرباتی مطالعے اور منطقی کوششوں کو حقیر قرار دیتے ہوئے مستقبل کی طرف اپنے سفر کو ''احساسات'' یا ''وجدان'' کے ذریعے سفر کو جاری رکھتے ہوئے کیا جا سکتا ہے۔ بجائے اس کے مشینوں کے خلاف فیشن کے موضوع پر بات کرتے ہوئے، وہ لوگ جو ماضی اور حال کے جکڑے ہوئے لوگوں کی قید سے چھٹکارا چاہتے ہیں انھیں آنے والے کل کی ٹیکنالوجی کی منظم آمد میں عجلت کے لیے کام کرنا چاہیے۔ تاہم اس کی تکمیل کے لیے وجدان اور ''صوفیانہ بصیرت'' ناکافی ہیں۔ اس کے لیے حقیقی سائنسی علم کی ضرورت ہوگی، جس کا اطلاق سماجی کنٹرول کے انتہائی اہم اور انتہائی حساس مقامات پر کیا جائے۔ نہ ہی یہ انتخاب میں اضافے کے اصول کو آزادی کے ذریعے کے طور پر پیش کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔ ہمیں یہاں پر پیش کردہ اس امکان پر توجہ دینی چاہیے کہ انتخاب بیش انتخاب میں اور آزادی لاآزادی میں تبدیل ہو جائے۔

آزاد معاشرہ

رومانوی دلائل کے باوجود، آزادی مطلق اور مکمل نہیں ہو سکتی۔ کامل انتخاب یا مکمل انفرادیت (ایک بے معنی قسم کا نظریہ) کے لیے دلائل دینا کسی بھی نوعیت کے طبقے یا معاشرے کے خلاف دلائل دینے کا مترادف ہے۔ اگر کوئی ایسا شخص جو اپنے کام میں انتہائی مصروف ہو، ہر دیگر شخص سے مکمل طور پر مختلف ہو تو پھر کوئی سے بھی دو انسان ذرائع ابلاغ کی کوئی بنیاد یا جواز نہیں رکھتے ہوں گے۔ یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ بڑے بلند و بالا انداز میں شکایت کرتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ''ربط'' نہیں رکھ سکتے یا ایک دوسرے سے ''ابلاغ'' نہیں کر سکتے یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے عظیم تر انفرادیت کے لیے دلائل پیش کیے۔ ماہر عمرانیات کارل مین ہم (Karl Mann heim) نے اس تضاد کا ذکر اپنی اس تحریر میں کیا: ''لوگ جتنے انفرادیت کے حامل ہوتے ہیں ان کے لیے شناخت کا حصول اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔''

جب تک ہم عملی طور پر قبل از ٹیکنالوجی عہد میں جانے کے لیے تیار نہ ہوں اور ان تمام نتائج کو قبول نہ کریں......ایک نسبتاً چھوٹی، وحشیانہ زندگی، زیادہ بیماریاں، دکھ درد، بھوک و افلاس، خوف، توہمات، غیر ملکیوں سے نفرت، تعصب وغیرہ۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ متفرق معاشروں کی طرف آگے بڑھنا ہے۔ اس

بات سے سماجی ہم آہنگ سازی کے کئی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تعلیم، سیاست، ثقافت کے جو بھی بندھن ہوں کیا ہمیں جدید ترین صنعتی سلسلے کو ایک کارآمد کُل میں سمونے کی کوشش کرنی چاہیے؟ کیا اسے مکمل کہا جا سکتا ہے؟ Wayne State University کے برٹریم ایم گراس (Bertram M. Gross) لکھتے ہیں،
''ہم آہنگ سازی کی بنیاد عام تسلیم شدہ اقدار پر ہونی چاہیے یا اگر باہمی تسلیم شدہ مقاصد نہیں تو کسی حد تک قابل ادراک، باہمی انحصار۔''

ایک معاشرہ جو اقدار اور لائف سٹائل کی سطح پر تیزی سے تقسیم کا شکار ہو وہ تمام روایتی ہم آہنگ ساز میکانیوں کو چیلنج کرتی ہے اور تعمیر نو کی نئی بنیادوں کے لیے شور مچاتی ہے۔ ہم نے ابھی تک اس بنیاد کو حاصل نہیں کیا۔ تاہم اگر ہمیں پریشان کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا تو ہمیں انفرادی ہم آہنگ سازی کے اذیت پسند قسم کے مسائل کا سامنا کریں گے کیونکہ لائف سٹائل میں اضافہ خود کو برقرار رکھنے کی ہماری صلاحیت کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہم ان میں سے کتنے وجوبی ''خودٗ'' کا انتخاب کریں گے؟ سلسلہ وار ''خودٗ'' کا کون سا تسلسل ہماری وضاحت کرے گا؟ مختصر یہ کہ ہمیں اس انتہائی ذاتی نوعیت اور جذبات سے بھرپور سطح پر، بیش انتخاب سے کیسے نبرد آزما ہونا چاہیے؟ اقسام حق انتخاب اور آزادی کی اس بے ہنگم دوڑ میں ہم نے ابھی تک تنوع کے تعجب انگیز مضمرات کا تجزیہ کرنا شروع نہیں کیا۔

تاہم جب تنوع، ناپائیداری اور ندرت سے سمٹاؤ کے مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو ہم معاشرے کو مطابقت پذیری کے ایک تاریخی بحران کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ ہم ایک ایسا ماحول تشکیل دیتے ہیں جو اتنا عارضی، غیر آشنا اور پیچیدہ ہوتا ہے کہ جو لاکھوں افراد کے لیے تطابقتی خلل کا خطرہ لیے ہوئے ہے۔ یہ خلل مستقبل کا صدمہ ہے۔

☆☆☆

پانچواں حصّہ

مطابقت پذیری کی حدود

پندرھواں باب

مستقبل کا صدمہ: جسمانی ضخامت

کئی زمانے قبل سمندروں نے اپنا حجم کم کرتے ہوئے لاکھوں آبی جانوروں کو، نہ چاہتے ہوئے، ساحلِ سمندر کی نئی حدود پر چھوڑ دیا۔ اپنے شناسا ماحول سے محروم ہونے کے بعد وہ جانور مر گئے۔ وہ دوام کے اضافی اور فوری لمحات کے لیے ہانپتے اور پنجے مارتے رہے۔ ان میں سے وہ خوش قسمت جانور جو فقری جانوروں کے وجود سے مطابقت رکھتے تھے تبدیلی کے اس اچانک صدمے سے بچ سکے۔ یونیورسٹی آف وِنکونسن (Winconsin) کے ماہر عمرانیات لارنس سوہم (Lawrence Suhm) کہتے ہیں، ''آج ہم ایک ایسے عہد میں زندگی گزار رہے ہیں جو اتنی ہی مجروحیت پر مبنی ہے جتنا انسان کے پیشرو سمندری جانوروں کا زمینی جانور بننے کا ارتقائی مرحلے کا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ جو مطابقت اختیار کر لیں گے وہ؛ اور جو مطابقت پذیری اختیار نہیں کر سکیں گے وہ یا تو نشوونما کی نسبتاً کم سطح پر زندہ رہ سکیں گے یا فنا ہو جائیں گے۔ ساحلوں پر ان کا صفایا ہو جائے گا۔''

اس بات پر زور دینا کہ انسان کو لازمی طور پر مطابقت اختیار کرنی چاہیے سراسر سطحی سا خیال لگتا ہے۔ انسان نے خود کو پہلے ہی زندہ اشیاء میں سے سب سے زیادہ مطابقت اختیار کرنے والا ثابت کر دیا ہے۔ وہ خطِ استوا کی گرمیوں اور انٹارکٹیکا کی سردیوں میں بھی زندہ رہا۔ اس نے Dachau اور Yorkuta میں بھی زندگی کے ایام گزارنے سیکھے۔ اس نے چاند کی سرزمین پر بھی اپنے قدم رکھے۔ اس طرح کے کارنامے اس واضح خیال کو جنم دیتے ہیں کہ مطابقت پذیری کے لیے اس کی صلاحیتیں ''لامحدود'' ہیں۔ تاہم کوئی بات بھی سچائی سے بالا نہیں۔ اپنے تمام تر کارناموں اور کام کرنے کی صلاحیتوں کے باوجود انسان ایک حیاتیاتی جانور ہی رہا جو ایک حیاتیاتی نظام کے سہارے چل رہا ہے اور اس طرح کے تمام نظام بڑی کڑی حدود میں کام کرتا ہے۔

درجۂ حرارت، دباؤ، کیلوریز کا جسم میں داخل کرنا، آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کی سطح تمام چیزیں حدود کا تعین کرتی ہیں، جن سے بالا ہو کر، جیسا کہ اس کے موجودہ وجود سے ظاہر ہے، انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا جب ہم کسی انسان کو خلاء میں بھیجتے ہیں تو ہم، اس کے لیے خاص طور پر تیار کردہ ماحول مہیا کرتے ہیں

جوان تمام عوامل، زندہ رہنے کی حدود تک برقرار رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات باعثِ حیرت نہیں کہ جب ہم کسی شخص کو ''مستقبل'' میں بھیجیں تو ہم اسے تبدیلی کے دھچکے سے بچنے کے لیے ذرا سا تر ڈ کرلیں۔ (ہمارا یہ بندوبست نہ کرنا) ایسا ہی ہے جیسے ناسا (NASA) نے آرم سٹرونگ اور ایلڈرین (Aldrin) کو مدار میں بالکل برہنہ ہی روانہ کر دیا ہو۔

یہ اس کتاب کا مقالہ ہے کہ تبدیلی کی وہ مقدار قابل دریافت حدود میں ہے جو بنی نوع انسان جذب کرسکتا ہے اور یہ کہ اس تبدیلی کی اس رفتار کو، ان حدود کو تعیّن کیے بغیر، بڑھا دینے سے ہم، کثیر تعداد میں، انسانوں سے وہ تقاضے منسوب کر سکتے ہیں جسے وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم انھیں اس مخصوص حالت میں پھینکنے سے ان خطرات کا سامنا کر سکتے ہیں جسے میں نے مستقبل کا صدمہ کہا ہے۔

ہم لوگ مستقبل کے دھچکے کو اس جسمانی اور نفسیاتی آزار سے وضع کر سکتے ہیں جو انسانی جان کے جسمانی مطابقت کے نظاموں اور فیصلہ کرنے کے عوامل پر ضرورت سے زیادہ دباؤ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس بات کو ذرا سادہ انداز میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل کا صدمہ پیش ہیجانی کیفیت پر انسانی ردعمل کا نام ہے۔

مختلف لوگ مستقبل کے صدمے کے سامنے مختلف انداز میں ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کی علامات بھی بیماری کی سطح اور شدت کے حوالے سے مختلف ہوتی ہیں۔ یہ علامتیں ذہنی الجھن، عداوت سے لے کر اعانتی اختیار اور بظاہر احساسات سے عاری تشدد، جسمانی بیماری، دباؤ اور بے حسی کی حدود تک جاتی ہیں، اس کے شکار افراد دلچسپیوں اور لائف سٹائل میں ''آوارگی کی سی لہر'' کا اظہار کرتے ہیں، جس کے بعد سماجی، دانشورانہ اور جذباتی طور پر عدم وابستہ ہو کر ''اپنے اپنے خول میں چلے جانے کی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کو مسلسل ڈر اور خوف محسوس ہوتا ہے اور وہ بڑی شدت کے ساتھ فیصلے کرنے کی صلاحیت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

بیماری کی ان علامتوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں مختلف شعبوں سے چیزوں کو اکٹھا کرنا ہوگا جیسے نفسیات، علم الاعصاب، نظریہء ابلاغ اور علم درافرازیات کہ جن کی رو سے انسانی مطابقت پذیری سے متعلق کوئی سائنس نہیں ہے اور نہ ہی مطابقت پذیری سے متعلق بیماریوں کی باضابطہ فہرست ہے۔ لیکن مختلف شعبوں سے شواہد دستیاب ہونے لگے ہیں جو اس بات کو ممکن بناتے ہیں کہ نظریہ مطابقت پذیری سے متعلق عارضی نوعیت کے خاکے بنائے جا سکیں۔ اس شعبے کے محققین ایک دوسرے کی کاوشوں سے نابلد رہتے ہوئے ہی کام کیے چلے جا

رہے ہیں، ان کی کوششیں اور ان کا کام انتہائی مناسب ہے۔ منفرد اور شاندار نمونوں کی تشکیل سے، یہ کام مستقبل کے صدمے کے خیال کو مضبوط قسم کا سہارا عطا کرتا ہے۔

زندگی میں تبدیلی اور بیماری

جب لوگوں کو بار بار تبدیلی کے لیے کہا جائے تو انھیں کیا ہوتا ہے؟ اس بات کا جواب سمجھنے کے لیے ہمیں اس کا آغاز جسم، جسمانی ناپیے سے کرنا ہوگا۔ خوش قسمتی سے سلسلہء آغاز کے طور پر، لیکن ابھی تک عوامی معلومات سے مبرا، تجربات نے تبدیلی کے جسمانی صحت کے ساتھ تعلق پر روشنی ڈالی ہے یہ تجربات نیویارک میں واقع Correll Medical Centre کے آنجہانی ڈاکٹر ہیرولڈ جی وولف کے کام سے مشتق ہیں۔ ڈاکٹر وولف نے بارہا اس بات پر زور دیا کہ کسی فرد کی صحت کا تعلق، بڑی شدت کے ساتھ، ان مطابقتی تقاضوں سے جڑا ہوا ہے جو ماحول اس پر ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر وولف کے ایک پیروکار ڈاکٹر لارنس ای ہنکل جونیئز (Dr. Lawrence E.Hinkle) نے اسے طب کا ''انسانی ماحولیاتی'' حوالہ قرار دیا اور بڑے جذباتی انداز میں یہ دلیل پیش کی کہ بیماری کسی واحد اور مخصوص عامل، مثلاً جراثیم یا وائرس، کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ کئی عوامل کا نتیجہ ہے، جس میں جسم کے اردگرد موجود ماحول کی عمومی نوعیت بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر ہنکل نے کئی سال تک طب کے شعبے کو طب کے حوالے سے ماحولیاتی عوامل کی اہمیت باور کروانے کے لیے کام کیا۔

آج کے عہد میں فضائی آلودگی، آبی آلودگی، شہری آبادی اور دیگر عوامل پر تیزی سے بڑھتی ہوئی تشویش کی وجہ سے صحت پر کام کرنے والے زیادہ سے زیادہ ادارے اس ماحولیاتی نظریے پر غور وفکر کر رہے ہیں کہ کسی فرد کو ایک مکمل نظام کے ایک جز کے طور پر دیکھے جانے کی ضرورت ہے اور یہ کہ اس کی صحت کا دارومدار دقیق قسم کے کئی بیرونی عوامل پر ہے۔

ڈاکٹر وولف کے ہی ایک ساتھی ڈاکٹر تھامس ایچ ہومز (Dr.Thomas H Holmes) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ بذاتِ خود تبدیلی کوئی مخصوص قسم کی تبدیلی نہیں بلکہ انسان کی زندگی میں تبدیلی کی عمومی شرح مجموعی ماحولیاتی عوامل میں سب سے اہم ہو سکتا ہے۔ کارنیل (Cornell) کے رہنے والے ڈاکٹر ہومز آج کل یونیورسٹی آف واشنگٹن سکول آف میڈیسن میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں، اور اسی مقام پر انھوں نے ایک نوجوان ماہر نفسیات Richard Rahe کی مدد سے ایک اختراعی نوعیت کا تحقیقی آلہ تیار کیا جس کا نام Life Change Units Scale ہے۔ یہ آلہ اس بات کی پیمائش کرنے کے لیے ہے کہ کوئی فرد اپنی

موت وحیات میں تبدیلیوں کے کتنے مرحلوں سے گزرا۔ اس آلے کی تیاری ایک اہم بااُصول کارنامہ ہے اور اس کی تیاری سے، پہلی مرتبہ یہ ممکن ہوا کہ، ابتدائی سطح پر ہی سہی، کسی فرد کی زندگی میں تبدیلی کی شرح کا معیار جانچا جا سکے۔

مختلف اقسام کی زندگی کی موجودگی میں تبدیلی مختلف قوتوں کے ساتھ ہم سے ٹکراتی ہے، اسی چیز کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، ڈاکٹر ہومز اور راہی (Rahe) نے اتنی تبدیلیوں کی فہرست بتانی شروع کر دی جتنی وہ بتا سکتے تھے۔ کوئی طلاق، شادی، کسی نئے گھر میں منتقلی اس طرح کے واقعات ہم لوگوں پر مختلف طریقے سے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ کچھ لوگ، دیگر افراد کی نسبت زیادہ اثر قبول کرتے ہیں۔ کوئی تفریحی دورہ اس معمول میں ایک خوشگوار وقفہ ثابت ہو سکتا ہے تاہم اس کا موازنہ، مثال کے طور پر، والدین کے انتقال سے ہونے والے اثر سے نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد ڈاکٹر ہومز اور راہی (Rahe) زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے متعلق اس فہرست کو لے کر امریکہ اور جاپان میں، زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے پاس گئے۔ ہر شخص سے کہا گیا کہ وہ اس فہرست میں دریافت کردہ سوالات کا اس ترتیب سے جواب دے جس ترتیب سے اس نے اثر قبول کیا۔ کون سی تبدیلیاں ایسی تھیں جن سے ہم آہنگی کے لیے زیادہ تردد کرنا پڑا؟ کون سی تبدیلیاں معمولی نوعیت کی تھیں؟

ڈاکٹر ہومز اور راہی (Rahe) اس وقت حیران ہوئے جب ان کے سامنے ایسے اعداد وشمار آئے جس کی رو سے لوگوں کی رائے میں اتفاق پایا جاتا تھا کہ ان کی زندگی میں کون کون سی تبدیلیاں زیادہ مطابقت کی متقاضی ہیں اور کون کون سی نسبتاً غیر اہم ہیں۔ زندگی کے مختلف واقعات کی اثر پذیری سے متعلق لوگوں کی رائے کا ''اتفاق'' قومی اور لسانی حدود[1] سے بھی پار چلا گیا۔ لوگ اب یہ جاننا چاہ رہے ہیں اور اس بات پر متفق ہیں۔

یہ معلومات فراہم کرنے کے بعد ڈاکٹر ہومز اور راہی اس قابل ہوئے کہ ہر قسم کی تبدیلی کو ایک خاص عددی وزن سے ظاہر کر سکیں۔ ان کی فہرست میں شامل ہر چیز کو اس کی شدت سے ظاہر کیا گیا اور اس کے مطابق اسے عدد سے ظاہر کیا گیا۔ مثال کے طور پر کسی کے/کی شریک حیات کے انتقال کے حوالے سے ۱۰۰

(۱) اس موضوع پر امریکہ اور جاپان میں کام کیے جانے کے بعد اب اس مطالعے میں فرانس، بیلجیئم، اور ہالینڈ سے تعلق رکھنے والے افراد کو بھی شامل کیا جا رہا ہے کہ کون کون سی تبدیلی نے ان پر سب سے گہرا اثر مرتب کیا۔

پوائنٹس مختص کیے گئے ہیں، نئے گھر میں منتقل ہونے کے لیے ۲۰ پوائنٹس، تفریحی دورے کے لیے ۱۳ پوائنٹس (حتمی طور پر یہ بات سامنے آئی ہے کہ کسی کے/کی شریک حیات کا انتقال آفاقی طور پر تسلیم شدہ، وہ واحد اثر پذیر، تبدیلی ہے جو کسی فرد کی زندگی پر اثرات مرتب کرتی ہے)

اب ڈاکٹر ہومز اور راہی اگلی پیش رفت کے لیے تیار تھے۔ اپنے لائف چینج یونٹس سکیل (Life Change Unit Scale) سے ''لیس'' ہو کر انھوں نے لوگوں سے ان کی زندگیوں میں تبدیلی کے اصل نمونے سے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیے۔ اس سکیل نے یہ بات ممکن بنائی کہ ایک شخص میں ہونے والی ''تبدیلی'' کا دوسرے شخص کی زندگی میں ہونے والی تبدیلی سے موازنہ کیا جائے۔ اس فرد کی زندگی میں تبدیلی کی ''مقدار'' کا مطالعہ کرنے سے کیا یہ ممکن ہوگا کہ ہم اس تبدیلی سے اس فرد کی صحت پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لے سکیں؟

اس بات کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر ہومز، راہی اور دیگر محققین نے عملاً ہزاروں افراد کے ''لائف چینج سکورز'' (زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے دیے گئے نمبرز) اکٹھے کیے اور اس کے بعد ان سکورز کا موازنہ انہی افراد کے طبی احوال سے کرنے کا محنت طلب کام کیا۔ اس سے پہلے کبھی بھی تبدیلی اور صحت کے باہمی ملاپ کی کوئی راہ نہیں نکلی اور نہ ہی اس سے پہلے افراد کی زندگیوں میں آنے والی تبدیلیوں سے متعلق اتنے مفصّل اعداد وشمار سامنے آئے ہیں۔ اور نسبتاً کم مبہم تجربے کے نتائج کبھی کبھار سامنے آئے۔ امریکہ اور جاپان میں ملازمین، سول آبادی، حاملہ خواتین، سرطان، خون کا شکار افراد کالجوں کے کھلاڑی اور ریٹائرڈ افراد، ان تمام میں یہی حیران کن نمونہ موجود تھا۔ جن لوگوں کی تبدیلی کے حوالے سے، سکورز زیادہ تھے، وہ اپنے ان ساتھیوں کی طرح ہی تھے جنھوں نے آنے والے سال میں بیمار ہونا تھا۔ پہلی مرتبہ یہ ممکن ہوا کہ انتہائی ڈرامائی انداز میں یہ بات سامنے لائی جائے کہ کسی فرد کی زندگی، اس کی زندگی کے چلن میں ہونے والی تبدیلی کی شرح کا اس کی صحت سے گہرا تعلق ہے۔

ڈاکٹر ہومز کہتے ہیں، ''نتائج اتنے دیدنی اور دلچسپ تھے کہ پہلے پہل ہم ان کی اشاعت سے گریزاں تھے، ہم نے اپنی تحقیقات اور ان کے نتائج 1967ء تک شائع نہیں کیے۔''

اس کے بعد سے لائف چینج یونٹس سکیل اور زندگی میں تبدیلیوں سے متعلق مختلف سوالنامے (Life Changes Questionnaire) مختلف افراد کے گروہوں میں تقسیم کیے گئے جن میں Watts سے تعلق

رکھنے والے سیاہ فام بے روزگاروں سے لے کر سمندری علاقوں میں رہنے والے نیول افسران تک شامل تھے۔ ہر معاملے میں تبدیلی اور بیماری کے درمیان ایک تعلق پایا گیا۔ یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ''لائف سٹائل میں تبدیلیاں'' جن کے لیے تسویے اور جدوجہد کی ضرورت ہے، بیماری سے مربوط ہیں چاہے یہ تبدیلیاں فرد کے براہ راست کنٹرول میں ہوں یا نہیں، چاہے وہ اس کے لیے اہمیت کی حامل ہوں یا نہیں۔ مزید یہ کہ زندگی میں تبدیلی کی شرح جتنی زیادہ ہوگی، اس کے بعد آنے والی بیماریوں کا خدشہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ یہ دلیل اتنی مضبوط ہے کہ اب اس بات کے امکانات نظر آ رہے ہیں کہ، زندگی میں تبدیلیوں کے سکور (نمبر) پڑھ لینے کے بعد مختلف آبادیوں میں بیماریوں کی سطح کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔

لہٰذا اگست 1967ء میں سان ڈیگو (San Diego) میں واقع "United States Navy Medical Neuropsychiatric Research Unit" کے سربراہ کمانڈر رینسم جے آرتھر (Ransom J.Arthur) اور کمانڈر آرتھر گروپ میں موجودہ کیپٹن رچرڈ راہی (Richard Rahe) بیماری کی نوعیت اور نمونوں کی پیش بینی کرنے کی غرض سے نیوی کے 3000 افراد کے پاس گئے۔ ڈاکٹر آرتھر اور ڈاکٹر راہی نے سان ڈیگو کے ساحل پر لنگر انداز تین بڑے گشتی (بحری) جہازوں کے سیلرز کو ''لائف چینج یونٹس'' سے متعلق سوالنامے دیے۔ وہ جہاز روانہ ہونے والے تھے اور انھوں نے تقریباً چھ ماہ تک سمندر میں ہی رہنا تھا۔ اس عرصے میں یہ ممکن تھا کہ عملے کے ہر فرد کا طبی ریکارڈ درست رکھا جا سکے۔ کیا کسی شخص کی زندگی میں تبدیلیوں کے نمونوں کی معلومات اس شخص کے سفر کے دوران بیمار ہونے کی پیشگی اطلاع دے سکتی ہیں؟

عملے کے ہر فرد سے یہ دریافت کیا گیا کہ اس سن سے قبل گزرنے والے سال کے دوران اس کی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس سوالنامے میں وسیع تر موضوعات سے متعلق سوالات شامل کیے گئے۔ اس میں یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ اس فرد کے گزشتہ ۱۲ مہینے کے عرصے میں اپنے اعلیٰ افسروں سے معاملات اور مسائل کی نوعیت کیسی رہی۔ اس میں یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ اس کی غذا اور نیند کے معمولات میں کیسی تبدیلیاں آتی رہیں۔ اس سوالنامے میں یہ بھی دریافت کیا گیا کہ فرد کے حلقہ احباب میں، اس کے لباس میں اور اس کی تفریحی نوعیت میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں، اس میں پوچھا گیا تھا کہ فرد کی سماجی سرگرمیوں، خاندان کی تقاریب اور مالی حیثیت میں کوئی تبدیلی محسوس ہوئی۔ کیا اسے اپنے سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ کم یا زیادہ مسائل کا سامنا ہے؟ کیا کوئی چھوٹا سا مسئلہ بیگم کے ساتھ بھی ہے؟ کیا اس کا بچہ حقیقی ہے یا گود لیا ہوا ہے؟ کیا

اسے (اس عرصے کے دوران) اپنی بیگم، اپنے کسی دوست یا عزیز کی موت کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟

اس سوالنامے میں اس قسم کے سوالات بھی تھے کہ اس فرد کو کتنی مرتبہ نئے گھر میں منتقل ہونا پڑا۔ کیا اسے ٹریفک کے ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے پر یا کسی چھوٹے مسئلے پر قانونی چارہ جوئی کا سامنا کرنا پڑا؟ کیا اسے اپنی ملازمت کے سلسلے میں یا کسی گھریلو مسئلے کی وجہ سے خاصا وقت اپنی بیگم سے علیحدہ تو نہیں گزارنا پڑا؟ کیا اس نے ملازمتیں تبدیل کی ہیں؟ اسے انعامات سے نوازا گیا یا اس کی ترقی ہوئی؟ کیا اسے گھر کی حالت بہتر کرنے کی غرض سے یا ہمسایہ سے تعلقات کشیدہ ہونے کی وجہ سے اپنا معیار زندگی تبدیل کرنا پڑا؟ کیا اس کی بیگم نے کوئی کام (ملازمت وغیرہ) شروع کی ہے یا کوئی کام ترک کیا ہے؟ کیا اس نے کوئی قرضہ لیا ہے یا رہن رکھا ہوا ہے؟ اس فرد نے کتنی مرتبہ تفریحی دورے کیے ہیں؟ کیا اس فرد کی زندگی میں اس کے والدین کے ساتھ تعلقات میں کسی شخص کی موت، طلاق، یا دوبارہ شادی کے نتیجے میں کوئی بڑی تبدیلی تو نہیں آئی؟

مختصراً یہ کہ اس سوالنامے کے ذریعے یہ کوشش کی گئی تھی کہ زندگی میں رونما ہونے والی ان تبدیلیوں کے بارے میں پوچھا جائے جو کسی فرد کے عمومی وجود کا حصہ ہیں۔ اس میں یہ دریافت نہیں کیا گیا تھا کہ یہ تبدیلی ''اچھی'' تھی یا ''بری''، محض اس لیے کہ یہ تبدیلی رونما ہوئی ہے یا نہیں ہوئی۔

وہ تینوں (گشتی) بحری جہاز چھ ماہ تک سمندر ہی میں رہے۔ ان کی واپسی سے کچھ ہی عرصہ قبل آرتھر اور راہی نے کچھ تحقیقی ٹیموں کو (بذریعہ طیارہ) ان بحری جہازوں تک پہنچا دیا۔ ان ٹیموں نے وہاں پہنچ کر بحری جہاز میں سوار افراد کی طبی رپورٹوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کون کون سے افراد بیمار ہوئے؟ ان لوگوں کو کون کون سے عارضے لاحق ہوئے؟ وہ لوگ کتنے دنوں کے لیے جہاز کے ہسپتال میں رہے؟

جب یہ تمام تر معلومات مکمل کر لی گئیں تو تبدیلی اور بیماری کے درمیان تعلق، پہلے سے کہیں زیادہ بھرپور انداز میں سامنے آیا۔ وہ افراد جن کا شمار ''لائف چینج یونٹس'' میں، اوپر کے دس فیصد لوگوں میں کیا گیا تھا۔ جنھیں گزشتہ سال زیادہ سے زیادہ تبدیلیوں کے مرحلے سے گزرنا پڑا انھیں، اسی یونٹ کی روشنی میں، نیچے کے دس فیصد افراد کے مقابلے میں ''ڈیڑھ'' سے ''دو'' گنا تک، زیادہ ہوگا بیماری کی شدت کے امکانات بھی اتنے زیادہ ہی ہوں گے۔ زندگی میں تبدیلی کے نمونوں کا مطالعہ، تبدیلی بحیثیت ایک ماحولیاتی عامل، مختلف آبادیوں میں بیماریوں کی مقدار اور شدت کی کامیاب پیش گوئی میں بہت مددگار ثابت ہُوا۔

ڈاکٹر آرتھ کہتے ہیں، ''یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ ہمارے پاس تبدیلی کا اشاریہ ہے، اگر گزشتہ کچھ عرصے میں، آپ کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں تو اس کا شدید اثر آپ کے جسم پر ہوگا اور یہ چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔۔۔۔ایک مختصر سے عرصے میں تبدیلیوں کی بہت بڑی تعداد شاید اس فرد میں موجود نظام ہم آہنگی پر حاوی ہو جائے۔ ڈاکٹر آرتھر مزید کہتے ہیں، ''یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ جسم کی مدافعت اور تبدیلی کے ان تقاضوں میں جو معاشرہ اس پر لاگو کرتا ہے، ایک مسلسل متحرک توازن کے مرحلے میں ہیں۔ اندرونی اور بیرونی طور پر موجود بہت سے ضرر رساں عناصر ہمیشہ موجود رہتے ہیں اور وہ ہمیشہ بیماری کی صورت میں پھیلنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر انسانی جسم میں بہت سے وائرس رہتے ہیں اور صرف اسی وقت بیماری پھیلاتے ہیں جب جسم کا مدافعتی نظام کمزور پڑ جاتا ہے۔ جسم کے اندر عمومی مدافعتی نظام موجود ہیں جو تبدیلی کے اس سیلاب کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں جو اعصابی اور غدود کے نظاموں کی طرف سے آ رہے ہیں۔''

زندگی میں تبدیلی سے متعلق بہت سے شدید خدشات موجود ہیں نہ صرف بیماری کے حوالے سے بلکہ موت کے حوالے سے بھی، اور ان کا تعلق مطابقت پذیری کے ان شدید تقاضوں سے ہے جو جسم پر ڈالے جاتے ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر آرتھر، راہی اور ان کے ایک ساتھی ڈاکٹر جوزف ڈی میکین جونیئر (Dr.Joseph D.Mckean) کی ایک رپورٹ سومر سیٹ موگام (Somerset Maugham) کی ادبی خودنوشت، ''The Summing up'' کے ایک اقتباس سے شروع ہوتی ہے: ''میرے والد پیرس گئے اور برطانوی سفارت خانے میں مشیر قانونی بن گئے۔ میری والدہ کی وفات کے بعد ان کی ملازمہ میری نرس بن گئی...... میرا خیال ہے میرے والد رومانوی موڈ کے مالک تھے۔ انھوں نے پکا ارادہ کر لیا کہ موسم گرما میں رہائش کے لیے ایک گھر تیار کروانا ہے۔ انھوں نے Suresnes کے مقام پر ایک پہاری کے اوپر ایک قطعۂ ارضی خریدا۔ اس گھر کو Bosphorous کے مقام پر تعمیر شدہ ولاز کی طرز پر بنایا گیا اور اس مکان کی اوپر منزل Loggias سے گھری ہوئی تھی...... یہ گھر سفید رنگ کا تھا اور اس کے شٹر سرخ رنگ کے تھے۔ باغیچہ لگایا گیا۔ کمرے سجائے گئے اور پھر میرے والد وفات پا گئے۔''

وہ لوگ لکھتے ہیں کہ Somerest Maugham کے والد کی وفات پہلے پہل ایک غیر متوقع قسم کا واقعہ لگتا ہے۔ تاہم ان کے والد کی وفات سے قبل گزرنے والے ایک یا دو سال ان کے پیشے، رہائش گاہ، ذاتی عادات، مال و اسباب اور خاندان سے متعلق مشاورت میں تبدیلیاں ظاہر کرتی ہیں۔'' وہ لوگ یہ خیال کرتے

ہیں کہ یہ تبدیلیاں شدت اور تیزی پر مبنی واقعات کی عکاسی کرتی ہیں۔

اس بات کے دلائل رپورٹوں سے ثابت ہیں کہ بیوہ عورتوں اور رنڈوے مردوں میں، اپنے/اپنی شریک حیات سے جدائی کے پہلے سال، شرح اموات، عمومی حالات سے زیادہ ہے۔ برطانوی مطالعوں کے ایک سلسلے نے بڑی مضبوطی کے ساتھ یہ بات باور کرائی ہے کہ بیوہ ہونے کا صدمہ بیماری کے خلاف موافقت کو کمزور کر دیتا ہے اور عمر رسیدگی کے عمل کو تیز کر دیتا ہے۔ یہی بات مردوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ''Institute of community studies London'' کے سائنسدانوں نے 4486 رنڈوے افراد کا مطالعہ کرنے اور شواہد اکٹھے کرنے کے بعد یہ اعلامیہ جاری کیا: ''(اپنی شریک حیات کے چھن جانے سے جو غم ہوتا ہے، جو زندہ بچ جانے والے کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ شریک حیات کی وفات کے بعد محض تھوڑے ہی عرصے میں زندگی کی تبدیلیوں میں کثرت کا سامنا کرے۔

مسٹر ہنکل، ہومز، راہی، آرتھر، میکین (Mckean) اور دیگر افراد کا کام یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ تبدیلی اور بیماری میں تعلق ابھی اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے۔ تاہم ایک سبق بڑا واضح نظر آتا ہے: تبدیلی اپنے ساتھ قیمت پر مبنی فعلیاتی ٹیگ (tag) لیے ہوئے ہے۔ تبدیلی جتنی اہمیت اور بنیادی نوعیت کی ہوگی اس کی قیمت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

ندرت کے خلاف ردِ عمل

ڈاکٹر ہنکل کہتے ہیں، ''زندگی نامیے اور ماحول کے درمیان ایک مسلسل تفاعل پر دلالت کرتی ہے۔'' جب ہم اس تبدیلی سے متعلق گفتگو کرتے ہیں جو کسی طلاق، خاندان میں کسی شخص کی موت، ملازمت میں تبادلے یا کسی تفریح سے متعلق ہو تو ہم زندگی کے کسی بڑے واقعے کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں۔ تاہم جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ زندگی چھوٹے واقعات پر بھی مشتمل ہے، ان واقعات کا ایک دھارا ہمارے تجربات کے اندر اور باہر بہہ رہا ہے۔ زندگی میں رونما ہونے والی کوئی بڑی تبدیلی اس لیے بڑی نظر آتی ہے کیونکہ وہ ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم مزید بہت سی تبدیلیاں کریں، نتیجتاً یہ تبدیلیاں چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ تیز رفتار معاشرے میں زندگی کے معنی و مفہوم سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی ''مائیکرو تبدیلیوں'' کی سطح پر کیا کچھ ہوتا ہے۔

اس وقت کیا ہوتا ہے جب ہمارے ماحول میں کوئی چیز تبدیل ہو جائے؟ ہم میں سے تمام لوگ

ماحول میں موجود سگنلز (اشاروں) کی بارش میں مسلسل بھیگتے ہیں۔ (وہ اشارے) بصری، سامعاتی، لمسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے (اشارے) معمول کے مطابق دہرائے جانے والے نمونوں کی صورت میں آتے ہیں۔ جب کوئی چیز ہماری حسیات کی حدود میں تبدیل ہوتی ہے تو اشاروں کا وہ نمونہ جو ہمارے حسیاتی چینلز سے ہوتا ہوا ہمارے اعصابی نظام تک جاتا ہے وہ ردّوبدل کا شکار ہو جاتا ہے۔ معمول کے مطابق تشکیل پانے والے تکراری نمونے تعطّل کا شکار ہو جاتے ہیں...... اور اس تعطّل کے حوالے سے ہم ایک خاص دقیق سے انداز میں ردّعمل کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ جب محرکات کا کوئی مجموعہ ہم سے آن ٹکراتا ہے تو فوراً جسم اور دماغ دونوں یہ جان پاتے ہیں کہ یہ نئی چیزیں ہیں۔ اس عمل پر جو تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ آنکھ کے کونے پر رنگ کی ہلکی سی لہر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی پیارا اپنی انگلیوں کے پوروں سے چھوئے بغیر بڑی ملائمت کے ساتھ انگلیاں (ہمارے قریب سے) گزار رہا ہے۔ تبدیلی جو کچھ بھی ہو، بڑی تعداد میں جسمانی مشینری حرکت میں آ جاتی ہے۔

جب کوئی کتا انجانا قسم کا شور سنتا ہے۔ اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی گردن مڑ جاتی ہے۔ اور ہم بھی کم و بیش ایسا ہی کرتے ہیں۔ محرکات میں تبدیلی جس چیز کو حرکت دیتے ہیں اسے تجربہ کرنے والے ماہرین نفسیات ''سمت بندی سے متعلق ردّعمل'' کا نام دیتے ہیں۔ سمت بندی سے متعلق یہ ردّعمل (Directional Response) یا ایک پیچیدہ قسم کا حجم میں بڑا جسمانی عمل ہے۔ آنکھوں پر تحقیقات کرنے والے طلبا اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں۔ آنکھ کے ریٹینا (Retina) میں ضیائی کیمیائی (Photochemical) تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ہماری سماعت زیادہ دقیق ہو جاتی ہے۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے اعضا کا استعمال کرتے ہیں تا کہ اپنے حسیاتی اعضا کو آنے والے محرک سے متعلق راہنمائی دے سکیں۔ مثال کے طور پر ہم آواز کی طرف جھک جاتے ہیں یا اپنی آنکھوں کو بہتر انداز میں دیکھنے کی غرض سے حرکت دیتے ہیں۔ ہمارے اعضا کے عمل کی عمومی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے دماغ کی لہروں اور ان کے نمونوں میں تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ رگیں اور شریانیں سکڑنے کی وجہ سے ہماری انگلیاں اور پنجے سرد پڑ جاتے ہیں۔ ہماری ہتھیلیوں میں پسینہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ خون کا بہاؤ سر کی طرف ہو جاتا ہے۔ ہمارے سانس لینے اور دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔

ان تمام تر حالات میں ہم یہ سب کچھ............ اور بہت کچھ زیادہ بھی...... بڑے بیّن انداز میں کر سکتے ہیں۔ اس بات کو ظاہر کرتے ہوئے جسے ''چونکا دینے والا ردّعمل'' کہتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس بات سے بھی بے بہرہ ہوں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے، اس وقت بھی یہ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور ہمیں ہر مرتبہ اپنے ماحول میں ندرت کا احساس ہوتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس بظاہر ہمارے دماغوں میں تعمیر شدہ نظر آنے والا ندرت کا کھوج لگانے کا آلہ موجود ہے جو حال ہی میں ماہرین علم الاعصاب کی توجہ کا مرکز بنا ہے۔ روسی سائنسدان ای این سوکولوف (E.N.Sokolov)، جنھوں نے مفصل ترین انداز میں اس بات کی وضاحت کی تھی سمت بندی سے متعلق ردّعمل کیسے کام کرتا ہے، رائے پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دماغ کے عصبی خلیے آنے والے متحرک کی شدت، دورانیے، معیار اور تسلسل سے متعلق معلومات محفوظ کر لیتے ہیں۔ جب محرک وہاں پہنچتا ہے تو وہ کارٹیکس (cortex) میں موجود ''عصبی ماڈلوں'' سے میل کرتے ہیں۔ اگر تو محرک نادر یا نیا ہے، تو ''Orientation response'' یا ''OR'' کوئی غیر معمولی معاملہ نہیں۔ یہ ہم لوگوں میں سے اکثر افراد کے جسم کے اندر، عملاً، ایک دن میں ہزاروں مرتبہ ہوتا ہے کیونکہ ہمارے ارد گرد کے ماحول میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ''OR'' بار بار شعلہ فشانی کرتا ہے، حتیٰ کہ سوتے ہوئے بھی۔

نیند کے نظام سے متعلق امور کے محقق ماہر نفسیات آرڈی لوبن (Ardie Lubin) کہتے ہیں، ''OR'' یقیناً بہت بڑا ہے، اس میں تمام جسم شامل ہوتا ہے اور جب ماحول میں ندرت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس کا مطلب بہت سی تبدیلیوں کا رونما ہونا ہے تو آپ کو اس کے ساتھ متواتر ''OR'' موصول ہوتے رہتے ہیں۔ یہ جسم کے لیے بڑے کھچاؤ کا باعث ہوتا ہے۔ یہ جسم پر ڈالا جانے والا ایک اضافی بوجھ ہے۔

''اگر کسی ماحول کو (نئے اور انوکھے سلسلوں پر مبنی) ندرت سے لبالب بھر دیں گے تو آپ کو اعصابی امراض کے مساوی پریشانیاں موصول ہوں گی...... وہ لوگ جن کے نظام ایڈرینالن (Adrenalin)، وقفوں وقفوں سے دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہے، ہاتھ ٹھنڈے ہوتے ہیں، اعضا کی تیز حرکت اور رعشہ...... یہ تمام or کا معمول کے مطابق عمل ہے۔''

سمت بندی کے حوالے سے ردّعمل کوئی حادثہ نہیں۔ یہ قدرت کی طرف سے انسان کے لیے ایک تحفہ ہے، اس کے کلیدی مطابقت پذیر نظاموں میں سے ایک ''OR'' کے پاس اسے حساسیت کا احساس

دلانے کا اثر ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ معلومات کا حصول ممکن ہو...... مثال کے طور پر دیکھنے اور سننے کی بہتر صلاحیت اگر ضرورت ہو تو یہ اس کے اعضا کو مشقت کرنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسے پرواز یا لڑنے جھگڑنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ تاہم ہر OR، جیسا کہ مسٹر لوبن (Lubin) نے بتایا ہے، جسم کے ٹوٹنے پھوٹنے کے عمل سے شریک ہوتا ہے، کیونکہ اسے برقرار رہنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

لہٰذا OR کا ایک نتیجہ جسم کے ذریعے پیش بینی کر سکنے کی قوت کے لیے رو بھیجنا ہے۔ اس طرح کے مقامات پر سٹور شدہ قوت موجود ہوتی ہے، جیسے پٹھے اور پسینے کے غدود وغیرہ۔ ندرت کے لیے ردعمل کے طور پر جب بھی کوئی اعصابی حرکت میں آتا ہے، اس کے لونیوی جوڑوں کے (نشانے نما) جوف ایڈرینالن (Adrenalin) اور نار ایڈرینالن (Nor-adrenalin) کی چھوٹی مقدار خارج کرتے ہیں۔ نتیجتاً یہ محفوظ شدہ توانائی کا جزوی اخراج کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر OR نہ صرف جسم کی محدود نوعیت کی فوری توانائی سے مشتق ہوتا ہے بلکہ توانائی خارج کرنے والے ''غدودوں'' کے (مزید) محدود تر اخراج پر بھی۔

مزید برآں اس بات پر بھی زور دینے کی ضرورت ہے کہ ''OR'' صرف اور صرف سادہ سنسری ان پُٹ (In put) کے ردعمل کے طور پر ہی حرکت میں نہیں آتے۔ یہ اس وقت بھی حرکت میں آتا ہے جب ہمارا سامنا نادر قسم کے مناظر یا آوازوں سے ہوتا ہے۔ دفتر میں کوئی نئی گپ شپ، یکساں کر دینے کا نظریہ حتیٰ کہ کوئی نیا لطیفہ یا کسی عبادت کی تشریح نو بھی اسے محرک دے سکتی ہے۔

OR اس وقت دباؤ کا شکار ہوتا ہے جب کوئی نادر قسم کا واقعہ یا حقیقت پہلے سے قائم کردہ اور تسلیم کردہ نظریے کو چیلنج کرتی ہے۔ جب کوئی مخصوص نظریہ، کیتھولک مذہب، مارکس ازم یا دہ جو ہم فوری طور تسلیم کر لیں (یا یہ سوچ لیں کہ ہم نے ایسا کر لیا ہے) کسی نادر قسم کے محرک میں شناسا عناصر، اور اس طرح ہمیں کچھ آسانی فراہم ہو جاتی ہے۔ بے شک نظریات کو ہم اس الماری کی حیثیت سے جانتے ہیں جن کے خانے (ذہن کی صلاحیتوں سے) پر ہیں لیکن درازیں خالی ہیں یا وہ نکتے جو نئے مواد کا انتظار کر رہی ہیں۔ اسی وجہ سے نظریات OR کی شدت اور تعدّد میں کمی کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

یہ اسی وقت ہوگا جب کوئی نئی حقیقت موزوں نہ بیٹھے، جب وہ اسے پُر کرنے میں رکاوٹ کا باعث بنے، عین اسی وقت OR کا عمل وجود میں آتا ہے اس کی ایک روایتی مثال اس مذہبی شخص کی سی ہے جس کی پرورش خدا کی رحمت پر یقین رکھنے پر ہوئی ہو اور اس مذہبی شخص کی سی ہے جس کی پرورش خدا کی رحمت پر یقین

رکھنے پر ہوئی ہو اور اسے اچانک ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ ایک بے حس قسم کی بُرائی اس پر غالب آ جاتی ہے۔ جب تک اس نئی چیز سے مفاہمت نہیں ہوتی یا اس کی سوچ تبدیل نہیں ہو جاتی اس وقت تک وہ شدید قسم کے تذبذب اور پریشانی کا شکار رہے گا۔

OR اتنے دباؤ کا موجب ہے کہ جب یہ ختم ہو جاتا ہے تو ہم بڑے سکون اور اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ جہاں تک خیالات اور آگہی کا تعلق ہے تو اس کے سامنے آنے پر ہم ''آہا!'' قسم کا ردعمل دیکھتے ہیں، لیکن بالآخر ہم یہ بات سمجھ پاتے ہیں کہ کوئی چیز ہمیں پریشان کر رہی ہے، ہم لوگ ''آہا!'' قسم کے ردّعمل سے خاص خاص مواقع پر ہی شناسا ہوتے ہیں لیکن ''OR'' اور ''آہا!'' شعور کی سطح سے نیچے ہی ہو رہے ہوتے ہیں۔

لہٰذا ندرت...... ایک قابل ادراک ندرت...... جسم کے اندر ایک دھماکہ خیز سرگرمی کا آغاز کر دیتی ہے اور خاص طور پر اعصابی نظام۔ ''OR'' کا عمل ہمارے جسم کے اندر چمکدار بلبلوں کی طرح روشن ہوتے ہیں وہ بھی اس شرح پر جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ہمارے جسم کے باہر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ انسان اور کائنات ایک مسلسل، ترکیبوں سے بھرپور کھیل کھیل رہے ہیں۔

مطابقت پذیر ردعمل

ماحول میں موجود ندرت اس شرح میں کمی یا بیشی کرتی ہے جس پر ''OR'' کا عمل شروع ہوتا ہے کچھ نادر قسم کے حالات مزید طاقتور ردعمل سامنے لے کر آتے ہیں۔ ہم لوگ ایک طویل اور اکتا دینے والی شاہراہ پر سفر کر رہے ہیں، ریڈیو سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور غنودگی کی حالت میں چلے جاتے ہیں۔ اچانک ایک تیز رفتار کار قریب سے گزرتی ہے اور ہمیں اپنی لین سے ہٹا دیتی ہے۔ ہمیں خود بخود اور اچانک ردعمل کا اظہار کرتے ہیں اور OR حرکت میں آتا ہے۔ ہمارا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے اور ہمارے ہاتھ کانپنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس دباؤ کی کیفیت کو ختم ہونے میں کچھ دیر لگتی ہے۔

لیکن اگر یہ صورت حال درست نہ ہو تو؟ کیا ہو اگر ہم ایسی صورت حال میں گرفتار ہو جائیں جو پیچیدہ قسم کی جسمانی اور نفسیاتی ردعمل کی متقاضی ہو اور جس میں دباؤ مسلسل برقرار رہے؟ کیا ہو اگر فرض کریں کہ ہمارا مجاز افسر ہر روز ہم پر اپنی برہمی کا اظہار کرے؟ کیا صورت حال بنے اگر ہمارے بچوں میں سے کوئی ایک شدید بیمار ہو جائے؟ یا جب دوسری طرف ہم کسی ''اہم دن'' کا بے تابی سے انتظار کرتے ہیں یا کسی اہم کاروباری معاہدے کی تکمیل کا؟

اس طرح کے معاملات OR کی طرف سے فراہم کردہ فوری توانائی کے ذریعے کنٹرول نہیں کیے جا سکتے اور ان کے لیے ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے اسے ہم "مطابقت پذیر ردعمل" کہتے ہیں۔ یہ OR سے باہم مربوط ہے۔ بے شک یہ دونوں عوامل ایک دوسرے سے اس قدر جڑے ہوئے ہیں کہ OR کو اس کا حصّہ شمار کیا جا سکتا ہے یا کم از کم بڑے اور احاطہ بندی کرنے والے مطابقت پذیر ردعمل کا ابتدائی مرحلہ۔ لیکن اگر OR کا بنیادی انحصار اعصابی نظام پر ہے تو مطابقت پذیر ردعمل کا انحصار مختلف غدودوں اور ان ہارمونز سے ہوتا ہے جو وہ دوران خون میں شامل کرتے ہیں۔ پہلی دفاعی لائن نیورل ہے، دوسری ہارمونز پر مشتمل ہے۔

جب افراد کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ندرت کے لیے مکرر مطابقت پذیری کریں، اور خاص طور پر جب انھیں ان صورت حال سے مطابقت پذیری سے "مطابقت" کے لیے مجبور کیا جاتا ہے جس میں تضاد اور غیر یقینی کا عمل دخل ہوتا ہے، تو مٹر کے دانے کے برابر ایک غدود جسے نخامی (pituitary) غدود کے لیے ہیں، بہت سی رطوبتیں خارج کرتا ہے۔ ان میں سے ایک "ACTH" گردے کے غدود میں چلا جاتا ہے۔ جو اس کے نتیجے میں، انھیں دیگر کیمیاؤں کی تیاری پر مجبور کرتا ہے جنھیں "Corticosteroids" کہا جاتا ہے۔ جب یہ خارج ہوتے ہیں تو یہ جسم کے تحول (metabolism) کی رفتار کو تیز کر دیتے ہیں۔ یہ فشار خون کو بھی بڑھا دیتے ہیں۔ یہ خون کے ذریعے سوزش مادے بھیجتے ہیں تا کہ زخموں کی جگہ پر عفونت کا مقابلہ کیا جا سکے، بشرطیکہ کوئی ایسی عفونت موجود ہو۔ اور یہ چربی اور لحمیات کو قابل انتشار قوت میں تبدیل کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور اس طرح وہ جسم میں موجود قوت محفوظ رکھنے کے ٹینک میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مطابقت پذیری کا رد عمل، OR کے مقابلے میں زیادہ قوی اور قابلِ انحصار توانائی فراہم کرتا ہے۔

سمت بندی کے ردعمل کی طرح، مطابقت پذیری کا ردعمل بھی نایاب نہیں۔ اس کو تشکیل پانے میں خاصا وقت لگتا ہے اور یہ کافی دیر تک برقرار رہتی ہے، لیکن یہ ایک دن کے دورانیے میں ہی بے شمار مرتبہ رونما ہو جاتا ہے اور، اس کی وجہ ہمارے جسمانی اور سماجی ماحول میں ہونے والی تبدیلیاں ہیں۔ مطابقت پذیری کے رد عمل، جسے کبھی کبھار ایک ڈرامائی اصطلاح "دباؤ" کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے، کو ہمارے اردگرد موجود نفسیاتی آب و ہوا میں ہونے والی تبدیلیوں کے ذریعے پہچانا جا سکتا ہے۔ پریشانی، اضطراب، تضاد، غیر یقینی، حتیٰ کہ خوشگوار پیش بینی، خوش دلی اور ترنگ، یہ تمام کے تمام "ACTH" فیکٹری کی کارکردگی کے عوامل ہیں۔ تبدیلی کی پیش بینی مطابقت پذیری کے ردعمل کو شروع کر سکتی ہے۔ کسی کے طرز زندگی کو تبدیل کر دینے کی

ضرورت، کسی نئے روزگار کے لیے پرانے کو خیر آباد کہہ دینا، سماجی دباؤ، رتبے یا حیثیت میں کمی، لائف سٹائل (طرز زندگی) میں ردوبدل، درحقیقت، کوئی بھی ایسی چیز جو ہمیں مجبور کرتی ہے کہ انجانی چیز کے خلاف مزاحمت کی جائے، مطابقت پذیر ردعمل کا آغاز کر سکتی ہے۔

سٹاک ہوم میں واقع "Karolinska Hospital" کی "Clinical Stress Laboratory" کے ڈائریکٹر لینارٹ لیوی نے یہ بات واضح کی ہے کہ جذباتی آب و ہوا یا باہمی تعلقات میں چھوٹی سی تبدیلیوں سے جسم کی کیمیائی ہیئت میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ذہنی دباؤ کی پیمائش عموماً Corticosterods اور Catecholomines (ایڈرینالن اور نار۔ایڈرینالن) کی، پیشاب اور خون میں پائی جانے والی مقدار سے کیا جاتا ہے۔ تجربات کے ایک سلسلے میں ڈاکٹر لیوی نے جذبات پیدا کرنے کے لیے فلموں کا استعمال کیا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیمیائی تبدیلیوں کو ترتیب دیا۔

سویڈن سے تعلق رکھنے والے مردانہ میڈیکل کے طلبہ کو ایسے فلمی جھلکیاں دکھائی گئیں جس میں قتل، لڑائی جھگڑے، تشدد، جانوروں کو ذبح کرنا اور ان پر کیا جانے والا ظلم دکھایا گیا تھا۔ اس پر ان لوگوں کے پیشاب میں ایڈرینالن کی شرح 70 فی صد تک بڑھ گئی، اس کی پیمائش فلم سے پہلے اور بعد میں کی گئی تھی۔ اس کے بعد دفتر میں کام کرنے والی نوجوان لڑکیوں کے ایک گروپ کو متواتر چار راتوں میں چار مختلف فلمیں دکھائی گئیں۔ پہلا تو ایک خوشگوار قسم کا سفر نامہ تھا، ان لوگوں میں سکون اور طمانیت کے جذبات نوٹ کیے گئے اور ان لوگوں میں "Catecholamines" کے اخراج کی شرح کم ہوئی۔ دوسری رات انھوں نے سٹینلے کوبرک کی فلم "Paths of glory" دیکھی اور ان لوگوں میں خوشی اور غصّے کے جذبات دیکھنے میں آئے۔ ایڈرینالن کے اخراج کی شرح بلند ہوئی تیسری رات انھوں نے "Charley's Aunt" دیکھی اور وہ اس میں موجود مزاح کی وجہ سے خوب ہنستی رہیں۔ خوشگوار احساسات کے ہونے اور جارحیت یا شدت کے مناظر نہ ہونے کے باوجود ان لوگوں کے Catecholamines میں اضافہ ہو گیا۔ چوتھی رات اس نے "The Devil's Mask" دیکھی یہ ایک خوفناک فلم تھی جس کی وجہ سے وہ چلا اٹھیں۔ متوقع طور پر "Catecholamine" کا اخراج بلندی کی طرف چلا گیا۔ مختصر یہ کہ جذباتی ردعمل، تقریباً اپنی نوعیت اور خصوصیات وضع کیے بغیر، ایڈرینالن کے حرکت میں آنے کے عمل سے مربوط ہوتا ہے۔

مرد اور خواتین کے معاملات میں بار بار اسی قسم کے نتائج سامنے آتے رہے..... جہاں تک

چوہوں، کتوں، ہرنوں اور دیگر تجرباتی جانوروں کا ابھی ذکر نہیں...... پانی کے نیچے سیلرز کی تربیت، وہ لوگ جو انٹارکٹیکا(Antarctica) کے سنسان مقامات پر فوجی چوکیوں پر تعینات نہیں، خلاباز، فیکٹریوں کے محنت کش، حکام اعلیٰ تمام لوگوں نے بیرونی ماحول میں تبدیلی پر اس قسم کے کیمیائی ردعمل کا اظہار کیا۔

اس کے تمام مضمرات بمشکل رجسٹر ہونا شروع ہوئے، تاہم اس بات کے خاصے شواہد ملے کہ مطابقت پذیر ردعمل کا باز محرک شدید نقصان کا باعث ہوسکتا ہے اور اندرونی غدود (Endocrine) کا بیش محرک ہونا ناقابل تلافی نقصان کا باعث ہے۔ لہٰذا کتاب ''Man adapting'' کے مصنف ڈاکٹر رینے ڈوبوس (Dr. Rene Dubos) ہمیں وارننگ دیتے ہیں کہ اس قسم کے مبدل حالات جیسے ''مسابقتی ماحول، ہجوم والے ماحول میں کوئی آپریشن ہارمونز کے اخراج میں عمیق انداز میں تبدیلی لے آتا ہے۔ کوئی بھی شخص ان تمام تفصیلات کو پڑھ سکتا ہے، جو اس صورت حال سے، خون اور پیشاب پر اثرات سے سامنے آتی ہیں، کسی بھی پیچیدہ انسانی صورت حال کا سامنا کرنے کے بعد ایسی صورت حال پیدا ہوسکتی ہے، یعنی تمام تر Endocrine نظام کا تحرک۔''

اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر ڈوبوس اعلامیہ جاری کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ کوئی بھی شخص Ecdocrine نظام کے تحرک کو انتہا درجے تک بڑھا سکتا ہے اور یہ کہ اس کے فعلیاتی نتائج ہوتے ہیں جو اعضا کی مدت حیات تک برقرار رہتے ہیں۔''

بہت عرصہ قبل جسم کے مطابقت پذیر ردعمل سے متعلق بانی محقق ڈاکٹر ہینز سیلیے (Dr.Hans Selye) نے رپورٹ دی کہ ''وہ جانور جن میں کسی وجہ سے شدید اور طویل دباؤ پیدا ہوتا ہے وہ جنسی خلل کا شکار ہوجاتے ہیں...... کلینیکل مطالعات نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ جو لوگ دباؤ کا شکار ہوتے ہیں، وہ تمام حوالوں سے تجرباتی جانوروں کی طرح ہی ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، خواتین میں ماہواری کا نظام بے ترتیبی کا شکار ہوجاتا ہے یا بالکل ہی بند ہوجاتا ہے اور (بچے کو) دودھ پلانے کے عرصے میں، بچے کے لیے، دودھ کی مقدار ناکافی ہوتی ہے۔ مردوں میں جنسی خواہش اور کرم منوی کی پیداوار دونوں ہی تعطل کا شکار ہوجاتی ہیں۔

اس کے بعد سے ماہرین امور آبادی اور ماہرین ماحولیات نے متاثر کن شواہد اکٹھے کیے جنھوں نے چوہوں، ہرنوں...... اور لوگوں...... کی آبادی کو بری طرح متاثر کیا اور ان لوگوں میں شرح افزائش، ان

لوگوں کی نسبت کم تھی، جو نسبتاً کم دباؤ کا شکار تھے، کراؤڈنگ (Crowding) (جم غفیر) ایک ایسی حالت ہے جس کے لیے اعلیٰ سطح کا متواتر باہمی تفاعل درکار ہوتا ہے اور یہ فرد کو مجبور کرتا ہے کہ وہ، کثیر تعداد میں، ان مطابقت پذیر ردعمل کا اظہار کرے جو ہمیں جانوروں میں نظر آتا ہے تاکہ ایڈرینالن میں وسعت پیدا ہو اور زرخیزی میں نمایاں کمی آئے۔

OR کی یکے بعد دیگرے شعلہ فشانی اور مطابقت پذیری کا ردعمل، اعصابی اور (اندرونی) غدودوں کی ریزش کا نظام، دیگر بیماریوں اور جسمانی مسائل سے بھی مربوط ہے، ماحول میں تیزی سے ہونے والی تبدیلی جسم میں توانائی پہنچانے کے عمل کو بار بار اشارے دیتی ہے۔ اس سے چربی کے تحول میں تیزی آجاتی ہے، نتیجتاً یہ شوگر کے کچھ مریضوں کے لیے شدید مشکلات پیدا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ عام سی سردی کا لگ جانا بھی ماحول میں شرح تبدیلی...... ڈاکٹر ہنکل کے مطالعے میں دی گئی تفصیلات کے مطابق یہ بات سامنے آئی کہ نیویارک کی ایک محنت کش خاتون جس پر تجربہ کیا گیا نے بھی ''اپنے موڈ اور خاتون کی سرگرمیوں کے نمونوں، اپنے اردگرد کے لوگوں کے ساتھ تعلقات میں تبدیلی اور وہ واقعات جن کا اس نے سامنا کیا'' جیسے معاملات کو آپس میں مربوط کیا۔

القصہ اگر ہم ان حیاتیاتی واقعات کے ان سلسلوں کو سمجھ لیں جو تبدیلی اور ندرت سے ہم آہنگ ہونے کی ہماری کوششوں کا نتیجہ ہیں، تو ہم یہ سمجھنا شروع ہو جائیں گے کہ صحت اور تبدیلی ایک دوسرے سے، اتنے پیچیدہ طریقے سے، مربوط کیوں نظر آتے ہیں، ڈاکٹر ہومز راہی، آرتھر اور دیگر محققین کے اخذ کردہ نتائج جو اب زندگی میں تبدیلی لانے والی تحقیق میں شامل ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کا موازنہ علم دروں افرازیات (Endocrinology) اور تجرباتی نفسیات کے شعبوں میں جاری تحقیق سے کیا جاسکے۔ یہ بات صریحاً ناممکن نظر آتی ہے کہ معاشرے میں آبادی کی اہم جسمانی کیمیائی تبدیلیوں کا آغاز کیے بغیر معاشرے میں اضافہ کیا جائے۔ سائنسی، ٹیکنالوجی، اور سماجی تبدیلی کا معیار بلند کرکے ہم بنی نوع انسان کے کیمیائی اور حیاتیاتی استحکام میں مداخلت کررہے ہیں۔

اس بات کو فوری شامل کرلینا چاہیے کہ ضروری نہیں کہ یہ بات بری ہو۔ ڈاکٹر ہومز ہمیں یاد کراتے ہیں، ''کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو بیماری سے بھی شدید تر ہیں''۔ ڈاکٹر سیلیے (Selye) نے لکھا: ''کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو ہر وقت، تھوڑے بہت ذہنی دباؤ کے بغیر زندگی گزار سکتا ہو۔'' OR اور مطابقت پذیر ردعمل کو حذف

کرنے کا مطلب ہے کہ تمام تر تبدیلیوں کو حذف کر دیا جائے جن میں بڑھوتری، خودنموئی، اور پختگی بھی شامل ہے۔ یہ مکمل جمود کی پیش بینی کرتی ہے۔ تبدیلی زندگی کے لیے صرف ضروری نہیں؛ یہ زندگی ہے اور اسی تناظر میں یہ بات کہ زندگی مطابقت پذیری ہے۔

تاہم مطابقت پذیری پر حدود لاگو ہوتی، جب ہم اپنا لائف سٹائل (طرزِ زندگی) تبدیل کرتے ہیں، جب ہم چیزوں، مقامات یا لوگوں کے ساتھ تعلقات استوار کرتے ہیں اور توڑتے ہیں، جب ہم معاشرے کے تنظیمی جغرافیے میں بڑی اضطراری کے ساتھ سفر کرتے ہیں، جب ہم نئی معلومات اور نظریات سیکھتے ہیں، پھر ہم ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں، اور زندگی گزارتے ہیں۔ تاہم کچھ حدود بھی ہیں؛ ہم لوگ لامحدود لچک رکھنے والے نہیں ہیں۔ ہر سمت بندی ردعمل کا اظہار کرتی ہے، ہر مطابقت پذیر ردِعمل ایک خاص قیمت کا روادار ہے، جو جسم کی مشینری کو آہستہ آہستہ، تھوڑا تھوڑا کر کے (کثرتِ استعمال سے) فرسودہ کر رہا ہے تاوقتیکہ احساسیت سے بھرپور باوقت نتائج کو شدید نقصان پہنچاتا ہے۔

لہٰذا انسان آخر میں بھی وہی کچھ رہ جاتا ہے جیسا کہ کسی چیز کے آغاز کے وقت تھا: ایک حیاتی نظام جس میں تبدیلی کے لیے محدود صلاحیت ہے۔ جب اس صلاحیت پر غلبہ پالیا جاتا ہے تو نتیجہ مستقبل کا صدمہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

سولھواں باب

مستقبل کا صدمہ: نفسیاتی پہلو

اگر مستقبل کا صدمہ صرف جسمانی بیماری کی صورت ہی ہوتا، تو اس کا تدارک اور علاج آسان تر تھا۔ لیکن مستقبل کا صدمہ نفسیات پر بھی حملہ آور ہوتا ہے۔ جس طرح جسم ماحولیاتی بیش محرکات کے کھچاؤ سے شکستگی کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح سے انسانی دماغ اور اس کے فیصلہ کرنے والے عوامل، بہت زیادہ وزن ہونے کی وجہ سے فرسودگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تبدیلی کے میکانکی آلات کو اندھادھند چلاتے ہوئے ہم صرف ان لاگوں کی صحت کو گھن لگا رہے ہیں جو مطابقت پذیری کے عمل کو شاذ ہی مکمل کر سکتے ہیں بلکہ ان کی اس صلاحیت کو بھی، جوان کی اپنی خاطر، منطقی حوالے سے کام کرنے میں بروئے کار لائی جاتی ہے۔

ہم اپنے اردگرد اس طرح کے الجھن بھرے تعطل کی واضح علامت دیکھ سکتے ہیں...... منشیات کا پھیلتا ہوا استعمال، باطنیت کا عروج، غارت گری اور بلا سوچے سمجھے تشدد کے کثرت سے ہونے والے واقعات، لاوجودیت اور ماضی پرستی کی سیاست، لاکھوں افراد کی سردمہری...... ان تمام چیزوں کی بہتر شناسائی ''مستقبل کے صدمے'' کے ساتھ ان کے رشتے کا ادراک کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ سماجی لامعقولیت کی یہ اقسام ماحولیاتی طور پر بیش محرکات کے حالات میں، فرد کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت کے حوالے سے تنزلی کا مظہر ہے۔

ماہرین فعلیاتِ نفسی نے مختلف نامیوں پر تبدیلی کے اثرات کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کامیاب مطابقت پذیری صرف اس صورت میں ممکن ہے جب تحرک کی سطح...... ماحول میں موجود تبدیلی اور ندرت کی مقدار...... نہ تو انتہائی کم ہو اور نہ ہی انتہائی زیادہ۔ یونیورسٹی آف ٹورنٹو کے پروفیسر برلائن (D.E.Berlyne) کہتے ہیں، ''کسی اعلیٰ سطح کے جانور کا مرکزی اعصابی نظام ایسا ساختہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے ماحول کا مقابلہ کر سکے جو...... تحرک...... کی ایک خاص شرح سامنے لے کر آئے یہ (اس کا اعصابی نظام) ایک ایسے ماحول میں اپنی بہترین کارکردگی نہیں دکھا سکتا جو اس کی بساط سے زیادہ دباؤ اور بیش وزن سامنے لے کر آئے۔'' وہ یہ بات ایسے ماحول کے بارے میں بھی کہتے ہیں جو اعصابی نظام کے لیے زیرِ تحرک کا موجب

ہیں، ہرن، کتا، چوہا اور انسان تمام میں واضح طور پر ایک ایسے نکتے کا وجود پایا گیا ہے جسے ''مطابقت پذیر حد'' کہا جا سکتا ہے، ایسے نکتے سے نیچے یا اس سے بالا صورت حال میں فرد کی مقابلہ کرنے کی صلاحیت جواب دے جاتی ہے۔

مستقبل کا صدمہ بیش محرک کے ردعمل کا نام ہے۔ یہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب فرد کو اس کی مطابقت پذیر حد سے بڑھ کر کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ انسان کی کارکردگی پر نامناسب تبدیلی اور ندرت کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے خاصی تحقیقات کی گئیں۔ انٹارکٹیکا (Antarctica) جیسے سنسان اور ویران مقام پر فوجی چیک پوسٹوں پر تعینات لوگ، حسیات سے محرومی پر تجربات، کارخانوں میں دوران ملازمت کارکردگی، یہ تمام چیزیں زیر محرک کی وجہ سے ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں تنزلی کی علامات ظاہر کرتی ہیں۔ بیش محرک کے اثرات پر ہمارے پاس براہ راست اعداد و شمار کم ہیں لیکن موجودہ صورت حال کی روشنی میں معاملہ ڈرامائی اور پریشان کن ہے۔

بیش متحرک فرد

جنگی سرگرمیوں میں مصروف فوجی خود کو ایک ایسے ماحول میں موجود پاتے ہیں جو اُن کے لیے تیزی سے تبدیل ہوتا ہُوا، انجانا اور ناقابلِ پیش گوئی ہوتا ہے۔ اس کے سامنے مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ہر طرف گولہ باری ہو رہی ہوتی ہے۔ گولیاں اس کے پاس سے ہو کر گزر رہی ہیں۔ شعلے فضا کو روشن کر رہے ہیں۔ اس کے کانوں میں چیخنے، کراہنے اور دھماکوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ لحہ بہ لحہ حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس طرح کے بیش محرک ماحول میں اپنی بقا کے لیے وہ فوجی اپنی مطابقت پذیری کی وسعت اور حدود کی انتہا کو چھوتے ہوئے اپنا کام جاری رکھنے پر گامزن رہتا ہے۔ کبھی کبھار اسے اپنی حدود سے تجاوز بھی کرنا پڑتا ہے۔

جنگ عظیم دوم کے دوران جنرل ونگیٹ کی فوج کا ایک باریش سپاہی، برما میں جاپانیوں کے ساتھ برسر پیکار تھا، وہ عین اس وقت نیند کے مزے لے رہا تھا جب اس کے اردگرد مشین گن کے گولوں کی برسات ہو رہی تھی۔ بعد میں ہونے والی تحقیقات سے یہ بات عیاں ہوئی کہ وہ سپاہی جسمانی تھکاوٹ یا نیند کی کمی کا شکار نہیں تھا بلکہ وہ بے کیفی اور سستی کی کیفیت اور غلبے کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔

دراصل گوریلا فوجوں میں بے کیفی اور سستی کی ایک خاص حالت کی وجہ سے موت کی طرف مائل ہونے کا رجحان عام ہو گیا تھا اور وہ بھی خاص طور پر ان فوجیوں میں جو دشمن کی حدود میں داخل ہو گئے تھے اور

اس دماغی حالت یا دباؤ کو برطانوی فوج کے ڈاکٹروں نے ایک نام دیا، انھوں نے اسے ''Long Range Penetrationstrain'' (طویل عرصے تک کسی غیر ملکی حدود میں داخل ہو کر جنگ کرنے کی وجہ سے پیدا ہونے والا عارضہ)۔ ان کے خیال میں، ''جو فوجی اس عارضے یا دباؤ میں مبتلا ہوتا ہے وہ خود کے لیے سادہ ترین کام کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ایک چھوٹے بچے کا دماغ ہے۔'' اور یہ خطرناک قسم کی سستی، کاہلی اور کیفیت صرف گوریلا چھاپہ ماروں تک محدود نہیں تھی۔ اس ......سپاہی والے واقعات کے ایک سال بعد اسی قسم کی علامات، بڑے پیمانے پر، ان اتحادی فوجیوں میں پائی گئیں جنھوں نے نارمنڈی (Normandy) فتح کیا، اور برطانوی محققین نے اس جنگ میں مارے جانے والے 5000 برطانوی اور امریکی فوجیوں کی موت کی تحقیقات کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عجیب و غریب قسم کی سردمہری اور اس نفسیاتی انہدام کے پیچیدہ عمل کا آخری مرحلہ تھا۔

عموماً دماغی تنزلی کا آغاز تھکاوٹ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد الجھن اور اعصابی چڑچڑے پن کا آغاز ہوتا ہے۔ انسان اپنے اردگرد موجود چھوٹے چھوٹے محرک کے بارے میں بھی بیش حساسیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ معمولی سے بھی اشتعال پر فوری ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اضطرابی کیفیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اسے دشمن کی گولیوں کی آوازیں اور دیگر، نسبتاً کم خوفناک، آوازوں میں فرق ختم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے، مضطرب ہو جاتا ہے اور تنگ مزاج ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھی اس بات سے ناآشنا ہوتے ہیں کہ کب وہ شخص معمولی سی بات پر غصّے میں آ سکتا ہے حتیٰ کہ تشدد پر بھی آمادہ ہو سکتا ہے۔

پھر جذباتی ناتوانی کا آخری مرحلہ آ جاتا ہے۔ فوجی زندہ رہنے کی خواہش سے مبرّا ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو بچانے کی کوشش ترک کر دیتا ہے، جنگ میں خود کو دانش سے چلاتے رہنے کی حس سے بہرہ ہو جاتے ہیں اور مسٹر آر۔ ایل۔ سوانک (R.L.Swank)، جو اس برطانوی تحقیقاتی ٹیم کی سربراہی کر رہے تھے کے بقول، ''ایسا شخص......کند ذہن اور بے کار......ذہنی اور جسمانی طور پر ناکارہ ہو جاتا ہے اور سوچوں میں غرق رہتا ہے۔'' اس کا چہرہ بھی ماند پڑ جاتا ہے اور بجھا بجھا لگنے لگتا ہے۔ مطابقت پذیری کی جنگ شکست کی صورت میں اختتام پذیر ہوئی اور مکمل پسپائی کا مرحلہ آن پہنچا۔

افراد اس وقت عجیب و غریب انداز میں اپنے ردّعمل کا اظہار کرتے ہیں جب انھیں ایسے حالات کا سامنا ہو جو انتہائی تبدیلی اور ندرت پر مبنی ہوں، انسانی روّیوں پر ہونے والی تحقیقات سے یہ بات بھی ثابت

ہے کہ انسان کو اسی قسم کے روّیوں کا سامنا آگ لگنے کی صورت میں، سیلاب، زلزلہ یا دیگر قدرتی آفات کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ حتیٰ کہ انتہائی مستحکم و مضبوط اور ''ذی شعور'' افراد، جنھیں جسمانی گزند بھی نہ پہنچا ہو، بھی عدم مطابقت پذیری کی حالت میں جاسکتے ہیں۔ انتہائی الجھن اور ناسمجھی کی حالت میں جانے کے بعد یہ لوگ بنیادی نوعیت کی سمجھ بوجھ سے تعلق رکھنے والے فیصلے بھی نہیں کرسکتے۔

لہٰذا ٹیکساس میں آنے والے مخصوص طوفان (Tornado) کے ردعمل کے حوالے سے کیے جانے والے مطالعے میں یہ بات سامنے آئی: ''پہلا اور ممکن ردعمل........... انتہائی سراسیمگی کی حالت ہے، کبھی کبھار عدم یقینی یا کم از کم حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی حالت کی بہترین عکاسی ہے جو واکو (Waco) میں اس وقت موجود تھے جب وہ، 1953ء میں، تاراج ہوا...... ذاتی حیثیت میں اس بات کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے کہ کیوں ایک لڑکی ایک میوزک سٹور کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے اندر داخل ہوئی، خاموشی سے ایک ریکارڈ خریدا اور واپس باہر آگئی جب کہ عمارت کا شیشے سے بنا فرنٹ دھماکے سے اڑ گیا تھا اور عمارت کے اندر موجود چیزیں بری طرح بکھر گئی تھیں۔''

اوڈال (Udall)، کنساس میں طوفان کے حوالے سے کیے جانے والے مطالعے میں ایک خاتون نے کہا: ''جب یہ طوفان ختم ہوگیا تو میں اور میرے شوہر نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی اور دوڑنا شروع کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہم کہاں جارہے ہیں...... لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میں صرف دوڑنا چاہ رہی تھی۔'' اس تباہی میں اتاری جانے والی ایک روایتی تصویر میں ایک ماں اپنے ایک مردہ یا شدید زخمی بچے کو اٹھائے ہوئے ہے، اس خاتون کا چہرہ سپاٹ اور سراسیمگی سے بھرا ہوا ہے جیسے وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی اٹل حقیقت کو بیان نہیں کرسکتی۔ کبھی وہ بیٹھ کر اپنے ہاتھ میں موجود گڑیا کو، بجائے بچے کے، جھلانا شروع کردیتی ہے۔

لہٰذا کسی قدرتی آفت میں بھی، جنگی دنوں کی سی صورت حال کی طرح افراد نفسیاتی طور پر سراسیمگی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر ماحولیاتی تحرک پر مبنی اس حیران کن صورت حال کے منبع کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ آفت سے متاثرہ فرد خود کو ایک ایسی صورت حال میں مبتلا پاتا ہے جس میں شناسا اشیا اور رشتہ دار تبدیلی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ جہاں اس کا گھر ہوتا تھا، ہوسکتا ہے وہاں دھواں اٹھ رہا ہو۔ اس سیلاب کے پانی میں بہتی ہوئی الماری نظر آسکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک کشتی فضا میں اڑ رہی ہو۔ ماحول تبدیلی اور ندرت سے بھرا ہوا ہے اور ایک مرتبہ پھر ردعمل پریشانی، مایوسی، چڑچڑے پن اور سرد مہری میں مبتلا ہوجانے کے

جذبات پائے جاتے ہیں۔

ثقافتی صدمہ، کسی سفر کرنے والے شخص کی عمیق بے سمتی کیونکہ وہ بغیر مناسب تیاری اور بندوبست کے ایک اجنبی ثقافت میں چلا آیا ہے، یہ عدم مطابقت پذیری کی تیسری مثال ہے۔ یہاں پر ہمیں کسی جنگ یا آفت کے روایتی عناصر نظر نہیں آتے۔ منظر مکمل طور پر پرامن اور خطرے سے خالی ہوسکتا ہے۔ تاہم صورت حال کا تقاضا ہے کہ نادر قسم کے حالات سے بار بار مطابقت کی جائے۔ ایک ماہر نفسیات سیون لنڈ سٹیڈٹ (Seven lund stedt) کے بقول ثقافتی صدمہ ''شخصی عدم مطابقت کی ایک قسم ہے جو نئے ماحول اور نئے لوگوں کے ساتھ مطابقت کرنے کی عارضی ناکام کوشش کا ردعمل ہے۔''

ثقافتی صدمے کا شکار افراد، اس فوجی سپاہی اور قدرتی آفت کے شکار اس شخص کی طرح مجبور کر دیے جاتے ہیں کہ وہ ناشناسا اور ناقابلِ پیش گوئی واقعات، تعلقات اور چیزوں سے ہم آہنگ ہوں۔ اپنے کاموں کی تکمیل کے جانے پہچانے طریقے...... حتیٰ کہ ٹیلی فون کال کرنے کا سادہ ترین طریقہ...... کو بھی موزوں نہیں سمجھ رہے ہوتے۔ اگرچہ وہ نیا معاشرہ بھی تبدیلی کا شکار ہورہا ہوتا ہے مگر اس شخص کے لیے یہ تمام صورت حال بالکل نئی ہوتی ہے۔ اشارے، آوازیں اور دیگر نفسیاتی رمز، اس کی سمجھ بوجھ سے پہلے ہی، آگے بھاگنا شروع کردیتے ہیں۔ یہ سارا تجربہ ورائے حقیقت انداز میں ہوتا ہے۔ ہر لفظ، ہر عمل غیر یقینی کی سی صورت میں انجام پاتا ہے۔

اس تناظر میں تھکاوٹ معمول کی نسبت زیادہ ہونے لگتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف ثقافتوں میں سفر کرنے والا یہ فرد، مسٹر لنڈ سٹیڈٹ (Lundstedt) کے بقول، ''ذاتی حیثیت میں کسی چیز کے کھو جانے کے احساس، علیحدہ ہوجانے کے احساس اور تنہائی کے جذبات سے گزر رہا ہوتا ہے۔''

ندرت سے ابھر کر آنے والی ناقابلِ پیش گوئی صورت حال اس کے احساس حقیقت کو نیست و نابود کرتے ہیں۔ پروفیسر لنڈ سٹیڈٹ (Lundstedt) کہتے ہیں: ''لہٰذا ایسا شخص ایک ایسے ماحول کی خواہش کرتا ہے جس میں نفسیاتی اور جسمانی ضروریات کی تسکین قابلِ پیش گوئی اور نسبتاً کم غیر یقینی کی سی ہو۔ وہ شخص تذبذب اور پریشان ہوجاتا ہے اور سرد مہر نظر آتا ہے۔ دراصل ثقافتی دھچکا جذباتی اور دانشورانہ پسپائی کے ذریعے دباؤ کے خلاف ایک ردعمل ہے۔''

دباؤ کی مختلف اقسام سے متعلق، ان کی مماثلت سے متعلق بہتر طور پر جانے بغیر، تعطل ردعمل کے

ان (اور دیگر) بیانات کو پڑھنا مشکل ہوگا۔ یہ بات طے ہے کہ حالت جنگ میں مبتلا ایک فوجی سپاہی، قدرتی آفت کے شکار ایک فرد اور ثقافتی طور پر، مقررہ جگہ سے ہٹے ہوئے ایک شخص کو بیک وقت تیز رفتار تبدیلی، ندرت یا دونوں صورتوں کا سامنا ہے۔ اور ان تینوں افراد کو ناقابلِ پیش گوئی تحرک کے ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ اور بار بار مطابقت پذیری کی ضرورت اور جس طرح یہ تینوں اس پیش تحرک سے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں ان میں حیران کن حد تک متوازی پن پایا جاتا ہے۔

پہلے پہل ہمیں پریشانی، بے سمتی یا حقیقت سے روگردانی جیسے شواہد ملتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر ان لوگوں میں تھکاوٹ، انتشار، تناؤ، تذبذب، اور انتہائی چڑچڑے پن کی کیفیات ملیں گی۔ تیسرے یہ کہ ان تمام معاملات میں ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جہاں سے واپسی ناممکن نظر آتی ہے۔ ایک ایسا مرحلہ جہاں سے سردمہری اور جذباتی انخلا کا معاملہ شروع ہوجاتا ہے۔

مختصر یہ کہ دستیاب شواہد ہمیں بتاتے ہیں کہ بیش تحرک عجیب وغریب اور عدم مطابقت پذیر رویے کی طرف جاسکتا ہے۔

حسیات کی بھرمار

ابھی ہم لوگ اس مظہر کے بارے میں کم ہی جانتے ہیں کہ ہم بڑے اعتماد اور مضبوطی کے ساتھ اس بات کی وضاحت کرسکیں کہ بیش تحرک برے طریقے سے اختیار کردہ روّیے کو جنم دیتا نظر کیوں آرہا ہے۔ تاہم ہم اہم قسم کے اشارے پاسکتے ہیں اگر ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ بیش تحرک صرف تین مختلف سطحوں پر ہوتا ہے: حسیاتی، دانشمندانہ اور فیصلہ کن۔

حسیاتی سطح کو سمجھنا آسان ترین ہے۔ حسیاتی محرومی سے متعلق وہ تجربے جن کے دوران رضاکاران کو ان کی حسیات تحرک سراسیمگی اور ناقص ذہنی کارکردگی کی طرف لے جاسکتا ہے۔ اسی حوالے سے بہت زیادہ ترتیبی کا شکار یا انتشاری حسیاتی تحرک بھی اسی قسم کے نتائج سامنے لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی یا مذہبی دماغ شوئی کرنے والے لوگ نہ صرف حسیاتی محرومی (مثال کے طور پر قیدِ تنہائی) کا بھرپور استعمال کرتے ہیں بلکہ حسیاتی بوچھاڑ کا بھی بھرپور استعمال کرتے ہیں جس میں چمکدار روشنیاں، مختلف رنگوں کے تیزی سے بدلتے نمونے، ذہنی انتشار پیدا کرنے والی آوازیں...... حس ادراک کی شدت کرنے والے متغیرانہ سلسلوں کا تمام ساز وسامان۔

مذہبی جوش وخروش اور کچھ ہپی مسالک کا عجیب وغریب روّیہ منشیات کے بے جا استعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ حسیاتی محرومی اور بھرمار دونوں کے گروہی تجربوں کی وجہ سے ہے۔ یکساں آوازوں میں پڑھے جانے والے منتر، فرد کی توجہ اندرونی، جسمانی حسیات پر مبذول کرانا تاکہ بیرونی تحرک کو خارج کیا جاسکے، یہ تمام کی تمام کاوشیں زیرِ تحرک کے مافوق الفطرت اور کبھی کبھار واہموں پر مبنی اثرات پیدا کرنے کے لیے ہیں۔ اس پیمانے کی دوسری جانب ہمیں راک میوزک(Rock music) کے بڑے بڑے آڈیٹوریمز میں نوجوان ڈانسروں کے چمکدار نظروں والے بے حس سپاٹ چہرے دکھائی دیتے ہیں اور وہاں چمکدار روشنیاں، علیحدہ سکرینوں والی فلمیں، انتہائی بلند چیخیں، پکار اور آہیں، مضحکہ خیز لباس اور عجیب وغریب لکھائی، نقش ونگار والے رنگین جسم ایک حسیاتی قسم کا ماحول بنادیتی ہیں جس کی خصوصیات میں بڑے پیمانے پر ادخال اور انتہائی درجے کی ناقابلِ پیش گوئی صورت حال اور ندرت ہیں۔

کسی بھی نامیے کی حسیاتی ادخال سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت کا دارومدار اس کے عضویاتی ڈھانچے پر ہے۔ اس کے حسیاتی اعضاء اور وہ رفتار جو اس کی اعصابی نظام سے گزر جانے کی قوت محرکہ ہے وہ اس حسیاتی اعداد وشمار کی مقدار پر حدود کا تعین کرتی ہیں کہ جتنا یہ قبول کرسکتا ہو۔ اگر ہم مختلف نامیوں میں ایک ٹرانسمشن (ترسیل) کی رفتار کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ارتقا کی سطح جتنی پست ہوگی نقل وحمل بھی اتنی ہی سست ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک سمندری خارپشت کے انڈے سے، جس میں اعصابی نظام نہیں ہوتا، کوئی بھی سگنل جھلی کے اندر سے تقریباً ایک سنٹی میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرتا ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس رفتار پر یہ نامیہ اپنے ماحول کے ایک محدود سے حصے میں ہی ردعمل کا اظہار کرسکتا ہے۔ پھر ہم معیار ذرا بلند کرتے ہیں اور جیلی فش (Jelly Fish) کی طرف دیکھتے ہیں، جس میں ابتدائی نوعیت کا اعصابی نظام موجود ہوتا ہے، اس میں سے سگنل 36,000 گنا تیز گزرتا ہے: دس سنٹی میٹر فی سیکنڈ جبکہ ایک کرم میں یہ شرح 1,000 cps تک چلی جاتی ہے۔ بڑے بوزنوں میں یہ شرح 10,000 cps تک چلی جاتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں تاہم یہ اس بات کی وضاحت میں آسانی پیدا کرتے ہیں کہ انسان مسلمہ طور پر، انتہائی مطابقت پذیر قسم کی مخلوق ہے۔

تاہم انسان میں بھی، اعصابی ترسیل کی شرح تقریباً 30,000 cps ہونے کے باوجود اس نظام کی حدود بھی مضبوط ہیں۔ (اس کے برعکس ایک کمپیوٹر میں برقیاتی سگنلز کئی بلین گنا تیز چلتے ہیں)۔ حسیاتی اعضا اور اعصابی نظام کی حدود کا مطلب ہے کہ بہت سے ماحولیاتی واقعات ایسی شرح رفتار پر وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ

ہمارے لیے ان کا پیچھا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور ہم صرف ان کی بہتر نمونہ بندی تک ہی محدود رہتے ہیں۔
جب ہم تک پہنچنے والے سگنلز لگاتار اور بار بار پیدا ہوتے ہیں تو نمونہ بندی کا یہ عمل حقیقت کی ایک بہتر ذہنی نمائندگی کر سکتا ہے۔ لیکن جب یہ بڑے پیمانے پر بدنظمی کا شکار ہو جائے، جب یہ نادر ہو اور ناقابلِ پیش گوئی ہو تو ہمارے تخیل کی سچائی، یقینی طور پر کمی کا شکار ہو جاتی ہے۔ حقیقت کے بارے میں ہمارا تخیل مسخ ہو جاتا ہے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ہم حسیاتی بیش تحرک کا شکار ہوتے ہیں ہم الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں، حقیقت اور فریب کے درمیان لکیر دھندلی ہو جاتی ہے۔

معلومات کی بھرمار

اگر حسیاتی سطح پر بیش محرک اس صلاحیت کو مسخ کر دیتی ہے جس سے ہم حقیقت کا ادراک کرتے ہیں، دانشمندانہ بیش محرک ہماری سوچنے کی صلاحیت میں مخل ہوتا ہے۔ ندرت کے لیے کچھ انسانی روّیے رضاکارانہ نہیں ہوتے، دیگر (رویے) شعوری سوچ کی تقدیم کرتے ہیں اور اس کا انحصار ہماری جاذبیت، ہنرمندی، تخمینہ کاری اور معلومات کو قبضے میں رکھنے کی صلاحیتوں پر ہے۔
خاص طور پر معقول روّیے کا دارومدار ماحول سے اعدادوشمار کے متواتر بہاؤ پر ہے۔ اس کا انحصار فرد کی اس قوت پر بھی ہے جس سے وہ، مناسب کامیابی کے ساتھ اپنے افعال کے نتائج کے بارے میں پیش گوئی کر سکے۔ ایسا کرنے کے لیے اسے ضرور اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ یہ بیش بینی کر سکتے کہ اس کے افعال کے حوالے سے ماحول کیسے ردعمل کا اظہار کرے گا۔ لہٰذا دانائی انسان کی اس صلاحیت میں پنہاں ہے، جس کے بل بوتے پر وہ ماحول سے موصول ہونے والی معلومات کی بنیاد پر، اپنے ذاتی مستقبل کے بارے میں پیش بینی کر سکتا ہے۔
جب کوئی فرد تیزی اور غیر معمولی طریقے سے تبدیل ہوتی صورت حال میں مبتلا ہوتا ہے یا ندرت سے بھرپور کسی تناظر کا سامنا ہوتا ہے تو اس کی پیش بینی کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ وہ ان چیزوں کے بارے میں درست پیش بینی نہیں دے سکتا کہ جس پر منطقی روّیے کا انحصار ہے۔
اس بات کا ازالہ کرنے کے لیے، اپنی مہارت کو دوبارہ معمول کی سطح پر لانے کے لیے اسے اپنا معیار بلند کرتے ہوئے، پہلے سے کہیں زیادہ معلومات اکٹھی کرنی چاہئیں اور اسے یہ کام انتہائی تیز رفتاری سے کرنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ ماحول جتنا تیزی سے تبدیل ہوتا رہے گا اور جتنی زیادہ ندرت پر مبنی ہوگا اس فرد کو مؤثر

اور منطقی فیصلے کرنے کے لیے اتنی زیادہ معلومات کی تکمیل کی ضرورت ہوگی۔
جس طرح اس بات پر حدود و قیود ہیں کہ ہم کتنا حسیاتی ادخال کو قبول کر سکتے ہیں اس طرح معلومات کی تکمیل کے لیے ہماری صلاحیتوں پر فطری پابندیاں ہیں۔ راکی فیلر (Rocke feller) یونیورسٹی کے ماہر نفسیات جارج اے ملر (Miller) کہتے ہیں، ''ہم جو معلومات حاصل کرنے، تکمیل کرنے اور یاد رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان پر شدید قسم کی حدود ہیں۔'' معلومات کی درجہ بندی کر کے، ان کا مختلف طریقوں سے خلاصہ بنا کر، انھیں ترتیب دے کر ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ ان حدود کو وسیع کر سکیں تا ہم مناسب شواہد یہی بتاتے ہیں کہ ہماری صلاحیتیں محدود ہی ہیں۔
ان بیرونی حدود کو دریافت کرنے کی خاطر ماہرین نفسیات اور ابلاغی نظریہ ساز افراد نے چیک کرنے کے ایک کام کا آغاز کیا جسے وہ نامیوں کی ''Channel capacity'' کہتے ہیں۔ اس قسم کے تجربات کے لیے وہ انسان کو ایک چینل کا درجہ دیتے ہیں۔ معلومات بیرونی ذرائع سے حاصل کی جاتی ہیں۔ پھر اس پر کام ہوتا ہے۔ پھر یہ ان سرگرمیوں کی صورت میں باہر نکلتی ہیں جن کی بنیاد پر فیصلے کیے جاتے ہیں۔ معلومات کی تکمیل کی انسانی رفتار اور سچائی کی پیائش معلومات کے ادخال کی رفتار کا موازنہ معلومات کے اخراج کی رفتار سے کر کے کیا جا سکتا ہے۔
معلومات کی وضاحت تکنیکی طور پر کی جاتی ہے اور ان کی پیائش یونٹس کی شکل میں کی جاتی ہے جسے ''بٹس'' (Bits) کہا جاتا ہے۔ اب تک تجربات نے مختلف سرگرمیوں کے عمل میں شرح کا تعین کیا ہے جن میں مطالعہ کرنا، ٹائپ کاری، پیانو بجانے سے ڈائل کرنے میں تبدیلی یا ذہنی حساب کرنا وغیرہ۔ اور جب محققین ان واضح اعداد سے اتفاق کرتے ہیں، تو وہ دو بنیادی اصولوں پر متفق ہوتے ہیں: پہلا تو یہ کہ انسان کی صلاحیت محدود ہے؛ اور دوسرے کسی نظام پر بیش باری کارکردگی میں خاصے تعطل کی طرف لے جاتی ہے۔
مثال کے طور پر کارخانے کے کسی ایسے محنت کش کا تصور کریں جو بچوں کے لیے بلاکس بنا رہا ہے۔ اس کا کام ہر مرتبہ ایک بٹن دبانا ہے اور اس طرح ہر مرتبہ ایک مخصوص پٹے پر ایک سرخ رنگ کا بلاک اس کے سامنے آجاتا ہے۔ جب تک وہ پٹا مناسب رفتار سے چلتا رہتا ہے اسے کم مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی کارکردگی 100 فی صد درستی تک پہنچ جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر اس کا چلن انتہائی سست ہے تو اس کا ذہن حیران ہوگا اور اس کی کارکردگی تنزلی کا شکار ہو جائے گی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر وہ پٹا بہت تیز چلتا ہے تو وہ

محنت کش ڈگمگا جائے گا، اس سے کام چھوٹ جائے گا، وہ الجھن کا شکار ہوگا اور بے ربط ہو جائے گا۔ وہ دباؤ کا بھی شکار ہوگا اور چڑچڑے پن کا بھی۔ اس پریشانی کی وجہ سے وہ مشین پر ایک زوردار ضرب بھی لگا سکتا ہے، بالآخر وہ ہم آہنگی رکھنے کی کوشش بھی ترک کر دے گا۔ یہاں پر معلومات کے تقاضے سادہ ہیں لیکن ایک پیچیدہ کام کی عکاسی کرتے ہیں۔ اب اس لائن میں تیار ہو کر آنے والے بلاکس مختلف رنگوں کے ہیں۔ اسے یہ ہدایات ہیں کہ اس نے کسی مخصوص رنگ کے سامنے آنے پر بٹن دبانا ہے...... فرض کریں پیلا بلاک اور اس کے بعد سرخ اور ایک سبز...... اس کام میں پہلے اسے معلومات حاصل کرنی ہیں اور اس کے بعد مزید معلومات آگے پہنچانی ہیں بیشتر اس کے کہ بٹن کو ہاتھ لگایا جائے یا نہیں۔ تمام چیزیں مناسب ہونے کے باوجود، اگر اس (پٹے کی) لائن کا چلن تیز ہوتا ہے تو اسے اس کے ساتھ چلنے میں دشواری کا سامنا کرنا ہوگا۔

اس کام کی بہتر کارکردگی میں ہم نہ صرف اس محنت کش کو اس بات پر مجبور کریں گے کہ بٹن کو ہاتھ لگانے سے پہلے بہت سے اعداد و شمار اکٹھے کر لے بلکہ ہم اسے مجبور کریں گے کہ وہ فیصلہ کرے کہ ان مختلف بٹنوں میں سے کون سے بٹن کو دبایا جائے۔ ہم ہر بٹن کو دبائے جانے کی تعداد میں بھی ردوبدل کر سکتے ہیں۔ اب اس کی ہدایات میں آ سکتا ہے: رنگوں کے نمونوں کے لیے پیلا۔ سرخ۔ سرخ۔ سبز، بٹن نمبر 6 کو تین مرتبہ دبائیں؛ اور اسی طرح آگے۔ اس طرح کے کام تقاضا کرتے ہیں کہ محنت کش بڑی مقدار میں اعداد و شمار کی تحلیل کرے تاکہ وہ اپنا کام جلد مکمل کر سکے۔ اس ترسیل کنندہ کو مزید تیز کرنے سے کام کی پختگی بھی تیزی سے ختم ہو جائے گی۔

اس طرح کے تجربات پیچیدگی کے معیار کی حوصلہ شکنی کریں گے۔ اس طرح کے ٹیسٹوں میں چمکدار روشنیوں کا چلنا، موسیقی کی دھنیں، حروف، اشارے کیے ہوئے الفاظ اور مختلف قسم کے دیگر محرکات۔ وہاں پر موجود افراد سے کہا گیا کہ وہ انگلیاں بجائیں، جملے بولیں، پہیلیاں حل کریں، اور دیگر قسم کے امور سرانجام دیں، اور یہ تمام سلسلہ فضول قسم کے عدم استعداد تک ہی محدود رہا۔

یہ نتائج اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ مواد کون سا ہے، ایک خاص قسم کی رفتار ہے جس سے زیادہ تیز کارکردگی نہیں دکھائی جا سکتی...... اور اس کی وجہ محض اعضاء کی نامناسب سبک دستی ہی نہیں۔ بلند ترین رفتار عمومی طور پر، عضویاتی حدود کی بجائے، ذہنی حدود کی وجہ سے لاگو کی جاتی ہے۔ یہ تجربات ایک اور بات بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اسی موضوع سے منسوب متبادل نصاب کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی

کسی شخص کو کسی فیصلے پر پہنچنے میں اور اس کی عملداری سے اتنا وقت لگے گا۔

یہ نتائج، بڑے واضح انداز میں نفسیاتی الجھنوں کی مختلف قسموں کو سمجھنے میں ہماری مدد کر سکتی ہیں۔ منیجروں پر یہ بوجھ ہوتا ہے کہ وہ تیزی سے، متواتر اور پیچیدہ فیصلے کریں؛ طلبہ پر حقائق کی بوچھاڑ ہوتی ہے اور انھیں ٹیسٹ کے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے؛ گھریلو خواتین کو بچوں کی چیخ و فریاد، ٹیلی فون کے شور، خراب واشنگ مشین، کسی ٹین ایجر کے کمرے سے راک اینڈ رول (Rock and Roll) موسیقی کی آوازوں اور مہمانوں والے کمرے سے ٹیلی وژن کی آواز...... ان تمام چیزوں سے ان لوگوں کے سوچنے اور کام کرنے کی صلاحیت شکستگی کا شکار ہو سکتی ہے، خاص طور پر معلومات کی ان لہروں کی جوان لوگوں کے اعصاب سے ٹکرا رہی ہیں۔ اس بات کی بھی واضح امکانات ہیں کہ جنگی دباؤ کے شکار فوجی، قدرتی آفت کے شکار افراد اور ثقافتی دھچکے کے شکار مسافروں میں پائی جانے والی علامات اسی قسم کی ''معلومات کی بیش باری'' سے منسلک ہوں۔

یونیورسٹی آف مشی گن کے ''Mental Health Research Institute'' کے ڈائریکٹر ڈاکٹر جیمز جی ملر (Miller)، ''جو انفارمیشن سٹڈیز'' کے بانیوں میں سے ہیں، بڑے واضح انداز میں کہتے ہیں، ''کسی شخص کو اتنی معلومات دے دینا کہ جنھیں وہ تکمیل کے مرحلے تک نہ لے جا سکے...... اس کی پریشانی کا موجب ہے۔'' دراصل وہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ معلومات کی بیش باری کا تعلق دماغی عارضوں کی مختلف قسموں سے ہے۔

مثال کے طور پر شقاق دماغی کی ایک واضح علامت ''نامناسب ارتباطی ردعمل'' ہے۔ کسی بھی شخص کے دماغ میں جن الفاظ کو ترتیب سے جڑ جانا چاہیے وہ نہیں ہوتے اور اس کے برعکس، اس عارضے میں مبتلا شخص اپنی مرضی سے سوچتا ہے یا اپنی ذاتی دلچسپیوں پر غور کرتا ہے۔ مختلف قسم کے بلاکس (Blocks) کے مجموعے کا سامنا کرتے ہوئے۔ تکون، چوکور، یا کون کی طرح کے وغیرہ...... ایک عام شخص انھیں جیومیٹری کی اشکال کے حوالے سے تقسیم کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر شقاق دماغی میں مبتلا کسی شخص سے کہا جائے کہ وہ ان میں تفریق کرے تو ہو سکتا ہے کہ وہ کہے، ''وہ تمام فوجی سپاہی ہیں'' یا ''ان تمام نے مجھے رنجیدہ کیا ہے۔''

اپنی کتاب ''Disorder of Communication'' میں ملر (Miller) ان تجربات کا ذکر کرتے ہیں جو ذی شعور اور شقاقی دماغی کے مریضوں کا موازنہ کرنے کے لیے گئے اور ان میں الفاظ کے ربط کو ہی ملحوظ رکھا گیا تھا۔ ذی شعور لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا اور انھیں کہا گیا کہ وہ الفاظ کو دیگر الفاظ یا

نظریات سے جوڑیں۔ ایک گروپ نے اپنے خاص چلن پر اسے کرنا شروع کیا۔ دوسرے گروپ نے وقت کے دباؤ میں رہ کر کام کیا، ان افراد نے تقریباً ویسے ہی ردعمل کا اظہار کیا جیسے شقاق دماغی میں مبتلا لوگوں نے بجائے ان ذی شعور لوگوں کی طرح جنھوں نے معمول کے وقت کے اندر رہ کر کام کیا۔

ماہرین نفسیات جی اسدینسکی (G.Usdansky) اور ایل جے چیپمین (L.J.Chapman) نے بھی اسی قسم کے تجربات کیے اور نسبتاً بہتر انداز میں ان لوگوں کے باتے تجزیہ پیش کیا جو کسی دباؤ کی شرح رفتار اور معلومات کے ادخال کی اعلیٰ شرح کے ساتھ کام کرنے والوں کی غلطیوں اور ان کی نوعیت کے بارے میں بتایا، انھوں نے بھی یہ نتیجہ پیش کیا کہ ردعمل کی رفتار تیز کرنے سے، ذی شعور افراد میں بھی غلطیوں کے وہی نمونے سامنے آئے جو شقاق دماغی کے مریضوں کے لیے مختص تھے۔

مسٹر ملر (Miller) کہتے ہیں، ''کوئی شخص یہ مفروضہ قائم کرسکتا ہے کہ شقاق دماغی (کچھ لوگوں کے لیے یہ ابھی تک ایک انجانے عمل کا نام ہے، شاید تحول کا نقص جو اعصابی ''شعور'' کو بڑھا دیتا ہے) دانشمندانہ معلوماتی تکمیل سے منسلک چینلز کی صلاحیتوں کو کم کر دیتا ہے۔ نتیجتاً شقاق دماغی کے مریض ایک معیاری شرح کے مطابق معلومات کے ادخال میں مشکلات کا سامنا کرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ذی شعور افراد کو تیز شرح رفتار پر کام کرتے وقت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر شقاق دماغی کے مریض معیاری شرح رفتار پر غلطیاں سرزد کرتے ہیں جیسے ذی شعور اور صحیح الدماغ لوگ تیز رفتاری اور دباؤ کے تحت ادخال کے وقت غلطیاں سرزد کرتے ہیں''۔

مسٹر ملر (Miller) بات کو سمیٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ معلومات کے بھاری بوجھ تلے انسانی کارکردگی کا تعطل شاید ذہنی علم الامراض (Psychopethology) سے جڑا ہوا ہے مگر ابھی تک ہم نے وہ راہیں تلاش کرنا شروع نہیں کیں۔ تاہم اس کا زبردست تاثر سمجھے بغیر ہی ہم معاشرے کے اندر موجود عمومی شرح تبدیلی کو تیز تر کر رہے ہیں۔ ہم لوگوں پر زور دے رہے ہیں کہ وہ زندگی کی نئی شرح رفتار کو اپنائیں، نادر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کریں اور چھوٹے چھوٹے وقفوں میں ان پر گرفت کرنے کے ہنر کو کامل بنائیں۔ ہم لوگ انھیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ تیزی سے بڑھتے ہوئے عوامل میں سے اپنا انتخاب کریں۔ بالفاظ دیگر ہم انھیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ معلومات کی تیاری اس شرح رفتار سے کہیں تیز رفتاری سے کریں جو سستی سے ارتقا پذیر معاشروں میں درکار ہوتی ہے۔ اس بات کا بھی ذرا سا شائبہ ہوتا ہے کہ ہم ان میں سے چند کو دانشمندانہ پیش

معاشروں میں درکار ہوتی ہے۔ اس بات کا بھی ذرا سا شائبہ ہوتا ہے کہ ہم ان میں سے چند کو دانشمندانہ پیش
محرک کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔ ابھی ہم نے اس بات کا یقین کرنا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں اس چیز کے دماغی صحت پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

فیصلہ کرنے کے دباؤ

ہم لوگ عوام کو معلومات کی بیش افزائی کی طرف لے جا رہے ہیں یا نہیں لیکن ہم ان پر تیسری قسم کے بیش تحرک...... فیصلہ کرنے کے دباؤ...... کو ٹھونس کر ان کے رویوں پر منفی اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ بہت سے ایسے افراد بھی ہیں جو کند قسم کے، یا سست روی سے تبدیل ہونے معاشروں میں پھنسے ہوئے ہیں اور نئی ملازمتوں یا نئے کرداروں میں آنا چاہتے ہیں جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تیزی کے ساتھ اور پیچیدہ قسم کے فیصلے کریں۔ لیکن مستقبل کے لوگوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ''فیصلے، فیصلے......'' وہ لوگ بڑبڑاتے ہیں جب وہ ایک کام سے دوسرے کام کی طرف بڑی عجلت میں جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے پریشان اور مضطرب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ناپائیداری، ندرت اور تنوع متضاد قسم کے تقاضے کرتے ہیں گویا انھیں بری طرح دہری صورت حال میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

تیز رفتار دھکا اور اس کی نفسیاتی شریک کار ناپائیداری ہمیں مجبور کرتی کہ ہم نجی اور عوامی فیصلے کرنے کی رفتار کو تیز کریں۔ نئی ضروریات، نادر اور انوکھی قسم کی ہنگامی حالتیں اور بحران فوری ردعمل چاہتے ہیں۔

تاہم ان حالات کا نیا اور انوکھا پن ان فیصلوں کی نوعیت میں انقلابی تبدیلیاں لے آیا جن پر ابھی عملدرآمد کیا جانا تھا۔ ماحول میں ندرت کا فوری اقسام داخل ہونا ہماری تنظیموں اور ہماری نجی زندگیوں میں ہونے والے ''منضبط'' اور ''غیر منضبط'' فیصلوں کے درمیان باریک توازن کو متزلزل کر دیتا ہے۔ ''منضبط'' فیصلہ وہ ہوتا ہے جو معمول کے مطابق کیا جاتا ہے، بار بار کیا جاتا ہے اور اسے کرنا آسان ہوتا ہے۔ وہ شخص جو روزانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ باقاعدگی سے سفر کرتا ہے، پلیٹ فارم کے ایک کونے میں کھڑا ہے جونہی 8:05 پر آنے والی ٹرین رکتی ہے وہ فوراً اس میں سوار ہو جاتا ہے، جیسا کہ اس نے گزرنے والے ماہ و سالوں میں روزانہ کیا ہے۔ اس نے بہت عرصہ پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے لیے 8:05 والی ٹرین پر جانا ہی موضوع رہے گا، لہٰذا ٹرین پر سوار ہونے کا اصل فیصلہ ''منضبط'' ہے۔ یہ عمل فیصلے سے زیادہ ایک منضبط چیز ہے۔ وہ فوری معیار جس پر فیصلے کی بنیاد ہے وہ نسبتاً سادہ اور بیّن ہیں، چونکہ تمام کے تمام حالات شناسا ہیں لہٰذا اسے اس سے متعلق

اس حوالے سے مضبوط فیصلے تعیناتی قیمت واہمیت میں کم ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ فیصلے جن کے بارے میں یہی شخص شہر کی طرف آتے ہوئے سوچتا ہے وہ الگ ہیں۔کیا اسے نئی کارپوریشن میں ملازمت اختیار کر لینی چاہیے جس کی پیش کش حال ہی میں ہوئی؟ کیا اسے نیا گھر خریدنا چاہیے؟ کیا اپنی سیکریٹری کے ساتھ اس کا معاشقہ چلنا چاہیے؟ اسے نئی منیجمنٹ کمیٹی سے کیسے رابطہ کرنا چاہیے تاکہ وہ نئی اشتہاری مہم سے متعلق اس کی تجاویز قبول کر لے؟ اس طرح کے سوالات غیر معمولی جوابات کے متقاضی ہیں۔وہ اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ یا پہلی مرتبہ فیصلے کرے جس کی وجہ سے نئی عادات اور ردعمل کے نئے طریقہ کار وجود میں آئیں۔بہت سے عوامل کا مطالعہ کیا جانا چاہیے اور ان کی اہمیت کا اندازہ ہونا چاہیے۔معلومات کی ایک بڑی مقدار اس عمل سے گزرنی چاہیے۔یہ فیصلے ''غیر منضبط'' ہیں اور نفسیاتی طور پر ان کی بڑی قیمت واہمیت ہے۔

ہم سب کے لیے زندگی دو چیزوں کا امتزاج ہے۔اگر منضبط فیصلوں میں یہ امتزاج خاصا بلند ہے تو ہم چیلنج نہیں کیے جاتے؛ ہمیں زندگی بوریت کا شکار اور بے ہنگم دکھائی دیتی ہے۔ہم لوگ لاشعوری طور پر بھی ایسی راہیں تلاش کرتے ہیں کہ ندرت ہماری زندگیوں میں متعارف ہو جائے، لہٰذا ہم اس فیصلے کو ''مخلوط'' سمجھ لیتے ہیں۔لیکن اگر یہ مخلوط ہی غیر منضبط فیصلوں میں خاصے اونچے پیمانے پر ہے، اگر ہم ایسی بہت سی نادر صورت حال کے روبرو کھڑے ہیں کہ ان کا انضباط ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔زندگی بڑے دردناک انداز میں غیر منظم، تھکا دینے والی اور اضطراب سے بھرپور ہو جاتی ہے۔اپنی انتہا کو چھوتے ہوئے، اس کی آخری انتہا دماغی عارضہ ہے۔

تنظیمی نظریہ ساز برٹریم ایم گراس (Bertram M.Gross) لکھتے ہیں، ''منطقی رویہ عمومیت اور تخلیقیت کا ایک امتزاج ہوتا ہے۔عمومی چیز لازمی ہے...... [کیونکہ یہ] تخلیقی توانائیوں کو آزاد کرتی ہے کہ وہ نئے مسائل کے ایک طویل سلسلے سے نبرد آزما ہو جس کے لیے معمولات ایک غیر منطقی صورت ہے۔''

جب ہم اپنی زندگیوں کے بیشتر حصوں کو پروگرام دینے سے قاصر رہتے ہیں تو ہم پریشانی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ولیم جیمز لکھتے ہیں، ''اس شخص سے زیادہ کوئی بھی قابل رحم نہیں جس کے لیے ہر سگار کا جلایا جانا، ہر کپ کا پیا جانا...... ہر طرح کے کام کا آغاز ارادی ہو۔'' کیونکہ جب تک ہم اپنے رویوں کو بہتر طریقے سے پروگرام کے مطابق نہیں بنائیں گے ہم معلومات کی تیاری صلاحیت کے ایک بڑے حصے اور اس کی مقدار کو

معمولی چیزوں پر ہی ضائع کر دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم عادات بنا لیتے ہیں۔دوپہر کے کھانے کے لیے اجتماعی طور پر جانا اور پھر اپنے کمرے میں واپس آ جانا: غیر متغیر طور پر اس کے ممبران اپنی سیٹوں پر آ کر بیٹھ گئے جہاں وہ پہلے بیٹھے تھے۔کچھ ماہرین علم بشریات نے ''علاقہ وارانہ نظام'' کا نظریہ پیش کیا ہے تاکہ اس کے رویے کو بیان کیا جا سکے...... یہ خیال کہ انسان ہمیشہ سے یہ کوشش کر رہا ہے کہ وہ اپنے لیے مقدس ''منڈلی حکمرانی'' کی جگہ تلاش کرتا رہا ہے۔

اس میں سادہ کی وضاحت اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ پروگرامنگ معلومات کی تیاری کی صلاحیت کو تحفظ دیتی ہے۔اسی سیٹ کا دوبارہ انتخاب ہمیں سروے کی ضرورت کی طرف لے جاتی ہے دیگر ممکنات کی جانچ پر مجبور کرتی ہے۔

ایک جانے پہچانے تناظر میں ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنی زندگی کے بہت سے مسائل کو کم قیمت پروگرام پر تیار ہوئے فیصلوں سے حل کریں۔تبدیلی اور ندرت فیصلہ کرنے کی صلاحیت کی تعیناتی قیمت بڑھا دیتی ہیں۔مثال کے طور پر جب ہم کسی نئے پردیس میں جاتے ہیں تو ہم مجبور کر دیے جاتے ہیں کہ پرانے تعلقات کو تبدیل کر دیں اور نئے معمول یا عادتیں اختیار کریں۔یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک پہلے سے پروگرام شدہ لاکھوں پروگراموں کو رد کریں اور پہلی مرتبہ کیے جانے والے قیمتی، بغیر پروگرام کے (غیر تیار شدہ) فیصلوں کا سلسلہ شروع کریں۔دراصل ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم خود کو از سر نو (ری۔پروگرام) تیار کر لیں۔

بالکل یہی بات اس مسافر کے لیے بھی درست ہے جو ایک اجنبی ثقافت میں، بغیر تیاری کے چلا گیا، یہ بات اس شخص پر بھی صادق آتی ہے جو ابھی تک اپنے معاشرے میں رہ رہے ہیں اور اسے پیشگی وارننگ کے بغیر مستقبل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ندرت اور تبدیلی کی صورت میں مستقبل کی آمد، اس کے مشکل سے یکجا کیے ہوئے کرداری معمولات کو متروک ثابت کر دیتا ہے۔اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرانے معمولات، بجائے اس کے مسئلے کو حل کرنے کے صرف اس کی شدت میں اضافہ کرتے ہیں۔نئے اور ابھی تک بغیر کسی پروگرام (یا ناقابلِ منصوبہ سازی) کے کیے جانے والے فیصلوں کی مانگ ہے۔مختصر یہ کہ ندرت فیصلوں کو ''مخلوط'' بنانے کے عمل کو تیز و بالا کرتی ہے اور اس توازن کو انتہائی مشکل اور فیصلہ کرنے کی مہنگی ترین قسم کی طرف لے جاتی ہے۔

یہ بات بھی درست ہے کہ کچھ لوگ دیگر افراد کی نسبت ندرت کا بہتر طریقے سے مقابلہ کر سکتے

ہیں۔ہم میں سے ہر کسی کے ہم آہنگ ہو جانے کی سطح مختلف ہے تاہم وہ فیصلے جن کی ہم سے توقع کی جاتی ہے وہ ہمارے ہی، خودمختار کنٹرول میں نہیں۔ بنیادی طور پر یہ معاشرہ ہی ہے جو ہمارے ان فیصلوں کے غلط ہونے کا تعین کرتا ہے جو ہم نے ضرور کرنے ہیں اور اس شرح رفتار کا بھی جس پر ہم نے یہ فیصلے کرنے ہیں۔آج ہماری زندگیوں میں موجود ایک چھپا ہوا تضاد ہے اور وہ ہے تیز رفتاری اور ندرت کے دباؤ کے درمیان۔ان میں سے ایک دباؤ ہمیں تیز تر فیصلے کرنے پر مجبور کرتا ہے جبکہ دوسرا ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم سخت ترین اور وقت لیوا قسم کے فیصلے کریں۔

اس جاری رہنے والے تضاد سے پیدا ہونے والا اضطراب، وسعت پذیر تنوع کی وجہ سے ذرا شدت اختیار کر گیا ہے۔ مسلمہ شواہد یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ کسی فرد کے لیے حق انتخاب کی تعداد میں اضافہ کر دینے سے اس کو درکار معلومات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے، وہ بھی اس صورت حال کے لیے اگر وہ ان سے معاملہ کرنا چاہتا ہے۔انسانوں اور جانوروں پر ہونے والے ٹیسٹ یہ ثابت کرتے ہیں کہ حق انتخاب جتنا زیادہ ہوگا، ردعمل کا وقت اتنا ہی سست روی کا شکار ہوگا۔

یہ ان تین متضاد تقاضوں کا ظاہری ٹکراؤ ہے جو جدید ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں فیصلہ کن بحران پیدا کر رہا ہے، ان تمام تر دباؤ کو اگر یکجا طور پر دیکھا جائے تو یہ ''فیصلوں پر مبنی بیش تحرک'' نامی اصلاح کا جواز پیدا کر دیتے ہیں، اور وہ اس بات کی وضاحت میں بھی مدد کرتے ہیں کہ اس معاشرے میں لوگوں کی کثیر تعداد خود کو پریشان، بے مصرف اور اپنے اپنے نجی مستقبل کو سنوارنے میں ناکام نظر آتی ہے۔اس بات کی یقین دہانی کہ بھیڑ چال خاصی سخت ہے، چیزیں قابو سے باہر ہیں، یہ ان متحارب قوتوں کا ناگزیر نتیجہ ہے۔کیونکہ سائنسی ٹیکنالوجی پر مبنی اور سماجی تبدیلی کی ناقابلِ گرفت تیز رفتاری کسی فرد کی اس قوت کو شدید نقصان پہنچاتی ہیں جس کے تحت وہ اپنی منزل کے بارے میں معقول اور موزوں فیصلے کرتا ہے۔

مستقبل کے صدمے کے متاثرین

جب ہم فیصلہ کرنے کے دباؤ اور اس کے اثرات کو حیاتی اور دانشمندانہ بیش باری کو ملا دیتے ہیں تو ہم انفرادی ''بدمطابقت پذیری'' کی کئی اقسام کو جنم دیتے ہیں۔مثال کے طور پر تیز رفتار تبدیلی کے وسیع تر ردّعمل کا طریقہ سے انکار ہے۔انکار کرنے والے کا طریقہ کار بن بلائے حقیقت کو ''روکنا'' ہے۔جب فیصلوں کے لیے تقاضے بلندی کی طرف جاتے ہیں تو وہ نئی معلومات کے حصول سے صاف انکار کر دیتا ہے۔قدرتی آفت کے شکار اس فرد کی طرح جس کا چہرہ مکمل بے یقینی کو ظاہر کر رہا تھا۔اس طرح انکار کرنے والا

(Denier) بھی اپنے حواس واحساسات کی شہادت کو تسلیم نہیں کرتا لہٰذا وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ حقیقتاً چیزیں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں اور یہ کہ تبدیلی کی تمام تر شہادتیں محض سطحی ہوتی ہیں وہ اس طرح کے فرسودہ مفروضوں میں سہولت محسوس کرتا ہے جیسے ''نوجوان لوگ ہمیشہ باغی ہوتے ہیں'' یا ''اس کرہ ارض پر کوئی چیز نئی نہیں،'' ''چیزیں جتنی زیادہ تبدیل ہوں گی، وہ اتنی زیادہ ہی یکسانیت کا شکار ہوں گی۔''

مستقبل کے صدمے کا ایک انجانا شکار ہونے کے ناطے انکار کرنے والا خود کو ذاتی ناکامی و تباہی کے لیے تیار کرتا ہے۔اس کے مقابلہ کرنے کا لائحہ عمل اس امکان کو بڑھا دیتا ہے کہ جب اسے آخر میں مطابقت پذیری کے لیے کہا جاتا ہے، تو تبدیلی کے ساتھ اس کی پہلی معرکہ آرائی زندگی کے ایک بڑے بحران کی صورت میں سامنے آئے گی بجائے قابلِ انتظام قسم کے مسائل کے ایک سلسلے کے۔

مستقبل کے صدمے کے شکار شخص کا دوسرا طریقہ کار تخصیص کاری ہے۔ایک ماہر شخص تمام تر نادر خیالات یا معلومات کو روکتا نہیں ہے بلکہ وہ بھرپور قوت کے ساتھ یہ کوشش کرتا ہے کہ تبدیلی کی شرح رفتار سے خود کو ہم آہنگ رکھے...... لیکن صرف زندگی کے ایک مخصوص شعبے کی حد تک۔لہٰذا ہم کسی ماہر طبیب یا کاروباری شخص کی صورت حال دیکھتے ہیں جو اپنے پیشے میں جدید ترین ایجادات اور اختراعوں سے بھرپور استفادہ کرتا ہے لیکن سماجی، سیاسی یا معاشی شعبوں میں ہونے والی تبدیلیوں اور اختراعات سے بے بہرہ رہتا ہے۔یونیورسٹیوں میں احتجاج کا جتنا جوش وولولہ ہوگا اتنے زیادہ ہی مخصوص شعلے فنا ہونا شروع ہو جائیں گے وہ شخص ان چیزوں کے بارے میں جتنی کم رکھنے کی کوشش کرے گا اتنا ہی زیادہ شگاف تنگ ہونا شروع ہو جائے گا جس کے ذریعے وہ دنیا کو دیکھتا ہے۔

سطحی طور پر وہ بہتر مقابلہ کرتا ہے لیکن اسے خود کے مدمقابل بہت سی دشواریاں نظر آ رہی ہیں۔ہو سکتا ہے کسی صبح وہ بیدار ہو اور اسے اپنی مہارت اور تخصص پرانا دکھائی دے یا اس کی سوچ سمجھ سے بالاتر ہو جائے اور اس قسم کے واقعات رونما ہوں جو اس کے تخیل سے باہر ہوں۔

مستقبل کے صدمے سے متعلق ایک تیسرا اور عام سا ردعمل ماضی کی کامیاب مطابقت پذیری کے معمولات کی واپسی کا خبط ہے، جو اس عہد میں بے موقع اور ناموزوں ہو گئے ہیں۔معکوسیت کا شکار یہ لوگ روایتی طور پر اپنے ان فیصلوں اور عادات کے ساتھ بڑی بے خوفی اور بے جگری سے چپٹے ہوئے ہیں۔انھیں جتنی زیادہ تبدیلیوں کا علم ہوتا ہے اتنی ہی باریک بینی سے وہ ماضی کے طریقہ کار کو دہراتا ہے۔اس کی سماجی حیثیت رجعت پسندانہ ہے۔مستقبل کی آمد سے خوفزدہ یہ شخص اپنی ماضی کی یادوں سے ایسی چیزوں کو لانے کی

کوشش کرتا ہے جو بہت زیادہ ایک حالت میں رہنے والی نہ ہوں، یا وہ کسی بھی روپ میں موجود ایسی چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے جو اسے گزشتہ ایام کی بہاریں لوٹا دے۔

اس کی دنیا موجود Barry Goldwaters اور George wallace جیسے لوگ، یاد ایام کی سیاست کے ذریعے، اس کی لرزاں خیز ہمت کو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ماضی میں پولیس ہی نظم و نسق سنبھالنے کے لیے ہمیں خرید مزید پولیس کی ضرورت ہے۔ ماضی میں بچوں کے ساتھ حاکمانہ روّیہ روا رکھا جاتا تھا؛ لٰہذا موجودہ دور کے مسائل رواداری اور چھوٹ دینے کی وجہ سے ہیں۔ ایک درمیانی عمر کا، دائیں بازو سے تعلق رکھنے والا جاگیردار اپنے قصبے کے سادہ اور منظم معاشرے کی خواہش کرتا ہے...... نسبتاً سست رفتار سماجی ماحول جس میں پرانے معمولات ہی مناسب دکھائی دیتے ہیں۔ بجائے یہ کہ نئے معمولات اختیار کرے، وہ خود بخود چیزوں اور مسئلوں کے پُرانے حل نکالتا ہے اور ایسا کرنے میں وہ حقیقت سے مسلسل دور ہوتا جاتا ہے۔

اگر وہ جاگیردار ماضی کے اس قصبے کو بحال کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ایک جوان اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والا جاگیردار اس روایتی سماجی نظام کو بحال کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کی یہ کاوش دیسی طبقات سے الفت و محبت کا ثبوت پیش کرتی ہے، وہی دیسی رومانویت جو ہپی (Hippie) اور مابعد ہپی ذیلی ثقافت کے پوسٹر اور شاعری کو مالا مال کرتی ہے، چے گیوارا کی صنم گری (جس کی شناخت پہاڑ اور جنگل ہیں، نہ کہ شہری یا اس سے ملتا جلتا ماحول)، قبل از تکنیکی معاشروں کی مبالغہ خیز عزت و تکریم اور سائنس و ٹیکنالوجی کے لیے ان کی مبالغہ خیز نفرت و حقارت۔ تبدیلی کے لیے ان لوگوں کی شعلہ فشاں مطالبوں کے لیے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے کچھ طبقے ''wallacites'' اور ''Gddwaterites'' نامی طبقوں کے خیالات کی طرح ماضی سے خفیہ قسم کی خاص محبت رکھتے ہیں۔

ان لوگوں کے ہیڈ بینڈ، ایڈوارڈئین (Edwardian) ٹوپیوں، ڈیئرسلیئر (Deerslayer) بوٹوں اور سونے کی تاروں والی عینک ماضی کے مختلف ادوار کی تقلید کرتی ہیں، اسی طرح ان کے خیالات بھی ''Turn of the Century'' دہشت گردی اور قدیم وضع کے ''Black Flag'' افراتفری کا دور واپس آ گیا ہے۔ روسو (Rousseau) کے مسلک کے شائستہ وحشی دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔ قدیم قسم کے خیالات، جن کا بیشتر اطلاق ماضی کی صنعت کاری پر ہوتا تھا، وہ اب تر و تازہ ہو کر آنے والے وقت کی جدید ترین صنعت کاری کے مسائل کا فوری حل بن کر سامنے آ گئے ہیں۔ جاگیرداری اب انقلاب کے سوانگ پہلے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

اور آخر میں ہمارے پاس اعلیٰ قسم کا تسہیل کار موجود ہے۔ پرانے ہیروز اور اداروں کے ڈگمگانے کی وجہ سے، ہڑتالوں، ہنگاموں اور مظاہروں کے اس کے شعور پر ضربیں مارنے کی وجہ سے وہ صرف ایک واضح مساوات کی طرف دیکھتا ہے جو ان تمام پیچیدہ قسم کی ندرتوں کو بیان کرتی ہے، جو اس نگلنے کا خطرہ لیے ہوئے ہیں۔ بڑی آزادی سے ایک سے دوسرے نظریے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ شخص عارضی طور پر ایک حقیقی معتقد بن جاتا ہے۔

اس بات سے بے روک ٹوک دانشورانہ نقالی کی سی صورت سامنے آتی ہے جو پہلے سے ہی فیشن میں تبدیلی کی شرح کو کم کرنے کے لیے ایک خطرہ بنا ہوا۔ میلکوہن؟ بجلی کے عہد کا نمایاں ترین فرد؟ لیوی۔ سٹراس؟ اوہ! مارکیوس؟ مجھے اب پتہ چلا! دو چما کیلٹ کی ماہارشی؟ شاندار! علم نجوم؟ زمانوں کی بصیرت!

اعلیٰ قسم کا تسہیل کار بڑی بے خوفی سے تلاش کرتے ہوئے ہر اس نظریے کا اطلاق کرتا ہے جس کا سامنا اسے آفاقی موزونیت کے حوالے سے ہوتا ہے...... عموی طور پر اس کے مصنف کی ناراضگی مول لے کر۔ صد حیف! کوئی نظریہ، نہ میرا اور نہ ہی آپ کا، کامل بصیرت پر مبنی ہے۔ لیکن اعلیٰ تسہیل کار کے لیے مکمل موزونیت سے بڑھ کر کوئی چیز بھی کافی نہیں۔ منافعوں کی بلندی امریکہ کی وضاحت کرتی ہے۔ کیمونسٹ سازش دوڑوں کے فسادات کی وضاحت کرتی ہے۔ اس کا جواب شراکتی جمہوریت ہے۔ غیر مزاحم قسم کی صورت حال (یا ڈاکٹر سپاک) تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

دانشورانہ سطح پر اس قسم کے وجدانی حل کی تلاش کے متوازی عوامل بھی حرکت میں ہیں۔ لٰہذا ایک سراسیمہ، پُر جوش طالب علم، جو والدین کے دباؤ کا شکار ہے، اور اپنے مجوزہ مستقبل کی طرف سے بھی غیر یقینی کا شکار ہے، تعلیمی نظام سے پریشان ہے جس کے فرسودہ ہونے کے بارے میں روز انکشاف ہوتے ہیں، اسے کسی پیشے کو انتخاب کرنے کے لیے دباؤ کا سامنا ہے، اقدار کا مجموعہ اور ایک کارآمد طرز زندگی وہ اپنے وجود کی تسہیل کاری کے لیے بڑی بے تابی سے سرگرداں ہے۔ ایل ایس ڈی (L S D)، میتھی ڈرین (Methedrine) یا ہیروئن کی طرف راغب ہو کر وہ ایک غیر قانونی قدم اٹھاتا ہے جو، کم از کم، اس کی پریشانیوں کو مجتمع کرنے کا وصف ہے۔ وہ دردناک اور بظاہر ناقابلِ حل مسائل کے مجموعے کے مقابلے میں ایک بڑے مسئلے کو چننے کا بیوپار کرتا ہے، گویا منطقی طور پر، عارضی طور پر ہی صحیح، اپنے وجود کی تسہیل کاری کے لیے۔

ایک ٹین ایجر لڑکی جو روزمرہ بڑھتے ہوئے دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتی اپنی اعلیٰ قسم کی تسہیل کاری کے لیے ایک اور ڈرامائی کام کا سہارا لے سکتی ہے: حاملہ ہونا...... نشہ آور اشیا کی طرح حاملہ ہو جانے کا یہ عمل آنے والے وقت میں

اس کے لیے پیچیدگیوں کا باعث بن سکتا ہے لیکن وقتی اور فوری طور پر اس کے دیگر مسائل کو نسبتاً غیر اہم بنا دیتا ہے۔

تشدد بھی انتخاب میں پیچیدگیوں کے پھیلاؤ اور عمومی بیش تحرک کے مرحلے سے نکالنے کا ایک ذریعہ ہے۔ بزرگ نسل اور سیاسی حاکمہ کے لیے پولیس کی لاٹھیاں اور فوجی سنگین جاذب قسم کا مداوا فراہم کرتی ہیں، ایک ایسا ذریعہ جو مخالف کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں، سیاہ فام انتہا پسند اور تحفظ امن سے تعلق رکھنے والے سفید فام لوگ انتخاب کے معاملے میں کمی لانے اور اپنی زندگیوں کو انتشار سے پاک کرنے کے لیے تشدد کا سہارا لیتے ہیں۔ ان لوگوں کیلیے جو دانش پر مبنی ایک جامع پروگرام سے محروم ہیں، جو ندرتوں اور ان دیکھی پیچیدگیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تشدد، بہتر سوچ کا نعم البدل ثابت ہوتا ہے۔ شاید تشدد حکومتوں کو تو متزلزل نہیں کر سکتا مگر یہ ابہام دور کر دیتا ہے۔

ہم میں سے اکثر لوگ ان مختلف رویوں کی نشاندہی دوسروں میں تو کر سکتے ہیں...... حتیٰ کہ اپنے اندر بھی...... لیکن ان کی وجوہات جانے بغیر۔ تاہم معلومات سے منسلک سائنس دان فوراً ہی پہچان لیں گے کہ انکار تخصص، واپسی اور اعلیٰ تسہیل کاری بیش باری کا مقابلہ کرنے کی روایتی تکنیک ہیں۔

ان میں سے تمام لوگ، بڑے خطرناک طریقے سے، حقیقت کی ٹھوس پیچیدگی سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ یہ حقیقت کی مسخ شدہ تصویر پیش کرتے ہیں۔ کوئی بھی فرد جتنا زیادہ انکار کرے گا، وہ وسیع تر مفادات کے بل بوتے پر اتنا ہی تخصص حاصل کرے گا، اور میکانکی طور پر وہ ماضی سے منسوب عادات اور پالیسیوں کی طرف اتنی تیزی سے ہی پلٹ کر جائے گا، جتنی بے چینی اور اضطراب کے ساتھ وہ اعلیٰ پیمانے کی تسہیل کاری کرے گا اس کی زندگی میں داخل ہونے والی ندرت اور حق انتخاب کے لیے ردعمل اتنا ہی ناموزوں ہوگا۔ وہ جتنا زیادہ ان حکمت عملیوں پر انحصار کرے گا اس کا رویہ اتنا ہی وحشیانہ اور فرسودہ طریقے سے حرکت میں آئے گا اور عمومی عدم استحکام کا مظاہرہ کرے گا۔

معلومات سے متعلق ہر سائنس دان اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ ان میں سے کچھ حکمت عملیاں بیش باری کی صورت میں انتہائی ضروری ہیں۔ تاہم جب تک کوئی فرد متعلقہ حقیقت پر واضح گرفت سے کام کا آغاز نہیں کرے گا، اور جب تک وہ بھرپور وضع کردہ اقدار اور ترجیحات سے ابتدا نہیں کرے گا اس قسم کی تکنیکی مہارتوں پر اس کا انحصار اس کے لیے مطابقت پذیری میں مشکلات کا باعث ہوگا۔

تاہم ان لازمی شرائط کی تکمیل انتہائی مشکل ہے۔ لہٰذا مستقبل کے صدمے کا شکار ہو شخص جو اس قسم کے لائحہ عمل کو بروئے کار لاتا ہے وہ الجھن اور غیر یقینی کے گہرے احساسات کا شکار ہو جاتا ہے۔ تبدیلی کی

متلاطم لہر کا سامنا کرتے ہوئے، زندگی سے متعلق اہم اور انتہائی تیز رفتار فیصلے کرتے ہوئے، اسے نہ صرف دانشورانہ سراسیمگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ ذاتی اقدام کی سطح پر بے سمتی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ جوں ہی تبدیلی کی شرح رفتار تیز ہوتی ہے یہ الجھن خود تشکیک، اضطراب اور خوف کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

وہ کچھاؤ کا شکار ہو جاتا ہے اور جلد ہی تھک جاتا ہے۔ وہ بیمار بھی پڑ سکتا ہے۔ جوں جوں دباؤ میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے، کچھاؤ چڑچڑے پن، غصے اور کبھی کبھار نامعقول قسم کے دباؤ کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات بڑے ردعمل کا باعث ہوتے ہیں؛ بڑے واقعات ناکافی ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

کئی سال قبل پیولوو (Pavlov) نے اس مظہر کی طرف اشارہ کیا تھا اور اسے ''متناقض مرحلہ کیا تھا اور یہ اصطلاح انھوں نے کتوں پر کیے جانے والے تجربات کے دوران تجزیات کرتے ہوئے کہیں۔ اس کے بعد کی جانے والی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انسان بھی اس حالت سے اس وقت گزرتے ہیں جب وہ بیش تحرک کے زیر اثر ہوتے ہیں، اور اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کبھی کبھار ہنگامہ آرائی بغیر کسی سنجیدہ یا باقاعدہ اشتعال کے کیوں ہوتی ہے، اس کی کوئی وجہ سامنے نہیں آتی، ہزاروں کی تعداد میں ٹین ایجر کسی مقام پر جمع ہو کر اچانک ہنگامہ آرائی پر کیوں تل جاتے ہیں، کھڑکیاں توڑنے لگتے ہیں، پتھر اور بوتلیں پھینکنے لگتے ہیں، کاروں کی توڑ پھوڑ شروع کر دیتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ ایک لغو قسم کی غارت گری تکنیکی مہارت سے بھرپور معاشرے کا مسئلہ کیوں ہے، وہ بھی اس حد تک کہ روزنامہ ''جاپان ٹائمز'' کا ایک اداریہ، ٹوٹی پھوٹی مگر پُرجوش انگریزی میں اس بات کو یوں واضح کرتا ہے کہ: ''ہم نے اس سے پہلے کبھی بھی اتنے وسیع تر انداز میں چیزوں کو نہیں دیکھا تھا، جتنے خبطی انداز میں آج سرگرمیاں رواں ہیں۔''

اور آخر میں یہ بات وہ الجھن اور غیر یقینی جو ناپائیداری، ندرت اور تنوع اپنے ساتھ لے کر آئی ہے وہ اس عمیق سرد مہری کو واضح کر سکتی ہے جو لاکھوں بوڑھوں اور جوانوں کو یکساں طور پر، عدم معاشرتی میلان کا شکار کر دیتی ہے۔ یہ اس معقول شخص کی سوچی سمجھی اور عارضی سطح کی دستبرداری نہیں جو ان مسائل سے از سر نو برسرپیکار ہونے کے لیے کچھاؤ کم کرتا ہے یا اپنی رفتار نسبتاً کم کر دیتا ہے۔ غیر یقینی اور بیش انتخاب کی صورت حال میں فیصلہ کرنے کے تناؤ اور کچھاؤ میں یہ چیز کامل دستبرداری ہی ہے۔

تاریخ میں پہلی بار کثیر تعداد میں افراد کے لیے، فراوانی نے اس بات کو ممکن بنا ڈالا کہ وہ اپنی دستبرداری کو کل وقتی قضیہ ہی بنا ڈالیں۔ خاندان اور کنبے میں رہنے والا وہ شخص جو اپنی شام کو مارٹینی (مرکب

شراب) میں مسدود و محدود کرتا ہے اور ٹیلی وژن کے چند افسانوی پروگراموں سے خود کو ''مدہوش'' کر لیتا ہے، وہ کم از کم دن کے اوقات میں کام کرتا ہے، اور ایسا سماجی فریضہ سرانجام دیتا ہے جس پر دوسروں کا انحصار ہے۔ اس کی دستبرداری جز وقتی ہے۔ لیکن کچھ (تمام نہیں) ہپّی تارک الدّنیا لوگوں کے لیے، بہت سے سرفرز (Surfers) اور خوابیدہ (دن کو خواب دیکھنے والے) لوگوں کے لیے دستبرداری کل وقتی اور مکمل ہے۔ ذمہ دار قسم کے والدین کی طرف سے نگرانی، شاید بڑے معاشرے سے واحد تعلق ہو سکتا ہے۔

مثلاً (Matala) کے ساحلی مقام پر، چمکتی دھوپ والے ایک گاؤں کریٹ (Crete) میں چالیس یا پچاس غاریں ایسی ہیں جن پر وہ امریکی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں قابض ہیں جو یہاں بھاگ کر آئے ہیں اور گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں، جنھوں نے بہت حد تک، دھما کا خیز رفتار سے چلنے والی زندگی کی پیچیدگیوں کا مقابلہ کرنے کی مزید کوشش ترک کر دی ہے۔ یہاں پر فیصلے چند ہیں اور وقت وافر، یہاں حقِ انتخاب کا دائرہ محدود ہے۔ بیش تحرک کو کوئی مسئلہ نہیں۔ وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی محسوس کرنے کی۔ ان لوگوں سے ملاقات کرنے والے ایک اخباری رپورٹر نے 1968ء میں انھیں رابرٹ ایف کینیڈی (Robert F.Kennedy) کے قتل کی خبر سنائی۔ ان کا ردعمل: خاموشی' کوئی دھچکا نہیں، کوئی غم و غصہ نہیں، کوئی آنسو نہیں۔ کیا یہ ہی نیا مظہر ہے؟ امریکہ سے بھاگ نکلنا اور جذبات سے بھی بھاگ نکلنا؟ میں عدم شمولیت کو سمجھتا ہوں، فسوں ربائی کو بھی جانتا ہوں حتیٰ کہ غیر وابستگی کو بھی لیکن تمام تر احساسات کہاں گئے؟''

شاید رپورٹر اس بات کو سمجھ لیتا کہ تمام تر احساسات کہاں گئے اگر وہ تحرک کے اثرات کو سمجھ لیتا، اگر چھاپہ مار گوریلے کی سرد مہری کو جان لیتا، قدرتی آفت کے شکار کسی فرد کا چہرہ اس کے سامنے ہوتا، ثقافتی دھچکے کے شکار کسی شخص کی دانشورانہ اور جذباتی دستبرداری ملاحظہ کی ہوتی۔ کیونکہ یہ تمام نوجوان لوگ اور لاکھوں دیگر افراد...... جن میں الجھن کا شکار افراد، تشدد پسند اور سرد مہری کا شکار افراد...... مستقبل کے صدمے کی علامت ظاہر کر چکے ہیں وہ اس (دھچکے) کا ابتدائی شکار ہیں۔

مستقبل کے صدمے کا شکار معاشرہ

یہ بات ناممکن نظر آتی ہے کہ مجموعی طور پر معاشرے کی معقولیت پر اثر انداز ہوئے بغیر، کثیر تعداد میں افراد کے لیے مستقبل کے صدمے کا سامان کیا جائے۔ امریکہ کے شہری امور کے لیے وائٹ ہاؤس کے مشیر ڈینئل پی موئیہان (Daniel P.Moynihan) کے مطابق، ''آج کا عہد کسی فرد کی ان صلاحیتوں کو

ظاہر کرتا ہے جو اعصابی خلل کا شکار ہیں''۔ کیونکہ حیاتی، دانشمندانہ یا فیصلہ سازی پر مبنی بیش تحرک کے اجتماعی اثرات، اس میں اعصابی یا غدودی بیش بار کو نہ بھی شامل کریں، ہمارے ''درمیان'' عارضہ پیدا کرتے ہیں۔

اس عارضے کی جھلک ہمیں ثقافت ہمارے فلسفے اور حقیقت کے لیے ہمارے روّیوں میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں کہ بہت سے عام لوگ بھی دنیا کو اب ''پاگل خانہ'' سمجھتے ہیں اور یہ کہ دیوانگی سے متعلق نظریات اب ادب، مصوری، ڈرامے اور فلم کے حوالے سے سنائی دیتا ہے۔ پیٹر ویس نے اپنے ڈرامے Marat/Sade میں ایک ایسی ہنگامہ خیز دنیا کا نقشہ کھینچا ہے جسے چارنٹون (Charenton) دارالامان میں رہنے والے افراد کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ Morgan نامی فلم میں دماغی امراض کے ایک ادارے میں زندگی کو بیرونی دنیا کے مقابلے میں برتر دکھایا گیا ہے۔ اور Blow-up نامی فلم میں کہانی کا نقطۂ عروج اس وقت آتا ہے جب ہیرو ٹینس کے کھیل سے منسلک ہو جاتا ہے جس میں کھلاڑی ایک ''بے وجود'' گیند کو بار بار شاٹ لگا نیٹ پر پھینکتے ہیں۔ یہ اس کی غیر حقیقی اور غیر منطقی چیزوں کی علامت قبولیت ہے۔ اس بات کی پہچان کہ وہ فریب اور حقیقت میں تفریق نہیں کر سکتا۔ اس خاص لمحے، لاکھوں ناظرین کی اس ہیرو سے مماثلت پائی گئی۔

اس بات پر اصرار کرنا کہ دنیا ''احمق'' ہو گئی ہے، یہ تحریر شدہ نعرے کہ ''حقیقت ایک سہارا ہے''، فریب نظر پیدا کرنے والی ادویات میں دلچسپی، علم نجوم اور دیگر مخفی علوم میں دلچسپی، جذبات، جنون اور ''انتہاء درجے کے تجربے'' میں سچ کی تلاش، انتہائی داخلیت پسندی کی طرف جھکاؤ، سائنس پر حملے، تیزی سے بڑھتا ہوا اجتہاد کہ منطق نے انسان کو ناکام کر دیا ہے، یہ کثیر تعداد میں ان لوگوں کے روزمرہ تجربات کی عکاسی کرتا ہے جو اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ وہ منطقی طور پر تبدیلی کا مزید مقابلہ نہیں کر سکتے۔

لاکھوں افراد اس علم الاعضا کو محسوس کر سکتے ہیں جو فضا میں بکھرا پڑا ہے لیکن وہ اس کی جڑوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ جڑیں ایک یا دوسرے سیاسی اصولوں میں نہیں، نہ ہی وہ کسی تصوف سے جڑے ہوئے نظریے میں ہیں جس کی بنیاد مایوسی یا تنہائی ہے، جو قیاسی طور پر ''انسانی حالت'' کا لازمی جزو ہے۔ اور نہ ہی جڑیں سائنس، ٹیکنالوجی یا سماجی تبدیلی کی جائز طلب اور تقاضوں میں ہے۔ اس کی بجائے ان کو مستقبل میں ہماری غیر منضبط، عدم نتیجہ پیش قدمی میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ جدید ترین صنعت کاری کی طرف ہماری، شعوری اور تخیلی پیش قدمی، کی ہدایت کاری میں ناکامی میں پنہاں ہیں۔

لہٰذا مصوری، سائنس، دانشورانہ، اخلاقی اور سیاسی شعبوں میں غیر معمولی ترقی کے باوجود امریکہ

ایک ایسی قوم ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں لڑکے اور لڑکیاں حقیقت سے راہ فرار اختیار کر گئے اور انھوں منشیات کے ذریعے بے کیفی کے حصول کو پسند کیا؛ ایک ایسی قوم جس میں لاکھوں والدین ویڈیو دیکھنے میں مدہوش ہونے تک محدود ہو گئے ہیں یا الکحل میں مخمور ہیں؛ ایک ایسی قسم جس میں بزرگ نسل کے لوگ، کثیر تعداد میں، مجہول حالت میں رہتے ہیں اور تنہائی کا شکار ہو کر وفات پا جاتے ہیں؛ جہاں پر خاندان سے ذرا اور پیشہ ورانہ ذمے داری کی حیثیت خروج کی سی ہو گئی ہے؛ جس میں افراد اپنے بڑھتے ہوئے اضطراب کو ملٹاؤن (Miltown)، لبریئم (Librium) یا اکوینل (Equanil) یا مختلف قسم کی سکون آور اور نفسیاتی مسکن ادویات سے دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی قوم بھی، چاہے اسے معلوم ہے یا نہیں، مستقبل کے صدمے سے دو چار ہے۔ ترکی میں امریکہ کے ایک نوجوان تارک وطن رونلڈ بیرل (Ronald Bierl) کہتے ہیں، ''میں امریکہ واپس نہیں جاؤں گا، اگر آپ اپنی معقولیت پر کاربند ہیں تو آپ کو دیگر لوگوں کی معقولیت کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اور بہت سے امریکی بالکل نامعقول ہوئے جا رہے ہیں۔'' لوگوں کی کثیر تعداد امریکی حقیقت کے اس عدم خوشامدانہ نظریے پر باہمی تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ کیا یورپی یا جاپانیوں یا روسیوں کو اپنی قیاسی معقولیت پر، خود پسندانہ انداز میں، برقرار رہنا چاہیے تاہم یہ بات دریافت کرنا بہتر ہو گا کہ کیا ان لوگوں کے درمیان بھی اس قسم کی علامتیں پہلے سے موجود تو نہیں۔ کیا اس حوالے سے صرف امریکی ہی منفرد ہیں یا وہ بھی اس قسم کی علامتیں پہلے سے موجود تو نہیں کیا اس حوالے سے صرف امریکی ہی منفرد ہیں یا وہ نفسیات پر حملے کا پہلا زخم سہہ رہے ہیں جو عنقریب ہی دیگر اقوام کو متزلزل کر دے گا؟

سماجی معقولیت انفرادی معقولیت پر دلالت کرتی ہے اور، نتیجے کے طور پر، اس کا انحصار مختلف حیاتیاتی لوازمات پر نہیں بلکہ ماحول میں تسلسل، ترتیب اور باقاعدگی میں ہے۔ اس کی بنیاد شرح رفتار اور تبدیلی کی پیچیدگی اور فرد کے فیصلہ کرنے کی صلاحیتوں کے درمیان باہمی تعلق پر ہے۔ تبدیلی کی شرح، ندرت کے معیار اور حق انتخاب کی وسعت کی طرف بے سوچے قدم اٹھانے سے ہم لوگ معقولیت کی ان ماحولیاتی شرائط لازم میں، بڑی لاپروائی سے تحریف کیے جا رہے ہیں، ہم لاتعداد ملین افراد کو مستقبل کے صدمے کا سزاوار ٹھہرا رہے ہیں۔

☆☆☆

چھٹا حصّہ

بقا کے لیے حکمتِ عملیاں

سترھواں باب

آنے والے وقت سے مقابلہ کرنا

جنوبی بحرالکاہل کی نیلی وسعت میں، نیوگنی(New Guinea) کے شمال میں مینوس(Manus) نامی جزیرہ واقع ہے جہاں، جیسا کہ علم بشریات کا مضمون پڑھنے والا سال اول کا طالب علم جانتا ہے، بیسویں صدی میں ایک نسل پر مبنی، حجری عہد کی ایک آبادی دریافت ہوئی۔ مارگریٹ میڈ اپنی کتاب ''New lives for old'' میں ثقافتی مطابقت پذیری کے اس ظاہری کرشمے کی کہانی بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ قدیم عہد سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے، فوری طور پر، یکسر نئے طرز زندگی کو اختیار کرنے کی نسبت مغربی تکنیک کی حامل ثقافت کے چھوٹے چھوٹے جز قبول کرنا زیادہ مشکل ہے۔

وہ لکھتی ہیں، ''ہر انسانی ثقافت، ہر انسانی زبان کی طرح، ایک کل ہے اور اگر افراد نے یا افراد کے گروہوں نے تبدیل ہونا ہے...... تو یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ انھیں کل کے ایک نمونے سے تبدیل کر کے دوسرے نمونے تک جانا ہے۔''

اس بات پر بھی معقولیت پائی جاتی ہے کہ کیونکہ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ثقافتی عناصر کے درمیان عدم تناسب کی وجہ سے ہی دباؤ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ بغیر سیورج کے شہروں کو متعارف کروانا، اور ضبط تولید کے بغیر ملیریا زاادویات کے متعارف ہونے کا مطلب ہے کہ ثقافت کو تار تار کرنا اور اس کے ممبران کو شدید قسم کے اور عموماً نا قابلِ حل مسائل میں گرفتار کر دینا۔

یہ کہانی کا ایک حصہ ہے کیونکہ کسی فرد یا گروپ کے لیے، انتہائی مختصر وقت کے دوران جدت کی مقدار کو جذب کرنے کی واضح حدود ہیں، باوجود اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ ''کل'' کتنے بہتر طریقے سے یکجا کیا گیا ہے۔ کوئی شخص بھی، مینوس(Manus) یا مسکووٹ(Muscovite)، اس مطابقت پذیر حد سے تجاوز نہیں کر سکتے بغیر پریشانی اور بے سمتی کا سامنا کیے بغیر...... مزید یہ کہ جنوبی سمندری علاقے سے تعلق رکھنے والی اس چھوٹی سے آبادی کے تجربے کو کلیہ بنانا خطرناک ہوگا۔

مینوس کی کامیابی کی کہانی جدید دور کی لوک داستان کی طرح بار بار سنائی جاتی ہے اور اسے گواہی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل ممالک کے رہنے والے لوگ بھی اس قابل ہوں گے کہ وہ، بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کیے بغیر ہی، ترقی کے ایک نئے مرحلے میں چھلانگ لگا دیں گے۔ تاہم ہماری صورت حال، جدید ترین صنعتی دور میں داخل ہونے کی وجہ سے، جزیرے میں بسنے والے افراد سے یکسر مختلف ہے۔

ہم ایسی صورت حال میں نہیں ہیں، جیسے وہ ہوتے تھے، کہ ایک کل کو ایک مجموعی، اور بہتر طور پر شناسا ثقافت کے طور پر درآمد کیا جائے، جس کی نشو ونما اور آزمائش دنیا کے کسی اور حصے میں ہوئی ہو۔ ہمیں چاہیے کہ ہم جدید ترین صنعت کاری کو ایجاد کریں نہ کہ اس کو درآمد کریں۔ آنے والے تیس یا چالیس سالوں میں ہمیں تبدیلی کی صرف ایک لہر کی پیش گوئی نہیں کرنی چاہیے بلکہ لہروں کے اتار چڑھاؤ کا ایک سلسلہ...... اس نئے معاشرے کے اجزاء، بجائے اس کے کہ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ آپس میں جڑے ہوئے ہوں، حیرت انگیز طور پر گم شدہ کڑیوں اور خیرہ کن تضادات سے ناموزوں طور پر بھرے ہوں گے ہمارے سامنے کوئی ''مکمل نمونہ'' ایسا نہیں ہے جسے اپنایا جائے۔

اہم تر بات یہ ہے کہ ناپائیداری کی سطح اتنی بلند ہو گئی ہے، شرح رفتار پر خاصا دباؤ ڈالا جا رہا ہے اور تاریخی طور پر ناقابلِ پیش گوئی صورت حال ہمارے اوپر ٹھونسی جا رہی ہے، ہم لوگوں کو، مینوس (Manus) لوگوں کی طرح نئی ثقافت سے مطابقت پذیری کے لیے نہیں کہا گیا بلکہ نئی عارضی ثقافتوں کے بے سوچے سمجھے تسلسل کے لیے کہہ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مطابقت پذیری کی بلند حدود تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہم سے کسی بھی نسل نے اس قسم کی آزمائش کا سامنا نہیں کیا۔

یہ صرف موجودہ صورت حال میں، ہماری مدت حیات اور ابھی تک صرف جدید تکنیک کے حامل معاشروں تک ہی یہ بات کی جا سکتی ہے کہ بڑے پیمانے پر مستقبل کے صدمے کی قوت آشکار ہوئی ہے۔

تاہم ایسا کہنا شدید غلط فہمی کو جنم دیتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ کوئی مصنف جو کسی سماجی مسئلے پر توجہ دیتا ہے وہ جدید تکنیکی مہارت کے حامل معاشروں کو اپنی لپیٹ میں لینے والی یاسیت کو شدید تر کرنے کا خطرہ لیے ہوئے ہے۔ خواہش پرستی سے منسوب ناامیدی آج کے ادب میں خاصی بکنے والی چیز ہے تاہم ناامیدی لاپروائی سے راہ فرار کا نام نہیں؛ یہ ناجواز ہے۔ بہت سے ایسے مسائل جنھوں نے ہمیں گھیرا ہوا ہے، بشمول مستقبل کا

صدمہ، بے رحم قسم کی قدرتی قوتوں سے نہیں نکلتے بلکہ انسان کے بنائے ہوئے ان عوامل سے پیدا ہوتے ہیں جو امکانی طور پر ہمارے کنٹرول میں ہیں۔

دوسرے یہ کہ اس بات کا خدشہ موجود ہے کہ وہ لوگ جو غیر مبدل صورت حال کو شاندار تصور کرتے ہیں ''مستقبل کے صدمے'' اور اس کے نظریے پر برقرار رہ سکتے ہیں اور وہ بھی تبدیلی کے حوالے سے ''مہلت پر کیے جانے والے بہانے کے طور پر...... اور تبدیلی کو دبانے اور اس کا راستہ مسدود کرنے کی ایسی کوئی کوشش نہ صرف ناکام ہو گی۔ ہمارے ماضی تمام تر تجربات سے کہیں بڑے نسبتاً زیادہ خطرناک اور ناقابلِ انتظام تبدیلیوں کے ساتھ اخلاقی حماقت کا باعث بھی ہو گی۔ انسانی معیارات کے کسی مجموعے کی رو سے اس طرح کی بنیادی سماجی تبدیلیاں، پہلے ہی خاصی زائد از میعاد ہو چکی ہیں۔ مستقبل کے صدمے کا جواب تبدیلی کا نہ ہونا نہیں بلکہ ایک مختلف قسم کی تبدیلی ہے۔

جدید ترین صنعتی انقلاب کے دوران توازن کی کسی مماثلت کو برقرار رکھنے کا واحد راستہ ایجاد کا مقابلہ ایجاد سے کرنا ہے...... یعنی ذاتی اور سماجی حیثیت کے ''آلات تبدیلی'' تشکیل دینا ہے۔ نہ تو ہمیں ان دیکھی قبولیت کی ضرورت ہے نہ ہی ان دیکھی مزاحمت کی بلکہ تبدیلی کی انتخابت کو تشکیل دینے، منعکس کرنے، تیز کرنے یا سست کرنے کے تخلیقی لائحہ عمل کی صف بندی کی ضرورت ہے۔ کسی فرد کو اپنی زندگی کو نئی قسم کی ڈرامائی تعلیم سے ہم آہنگ ہونے اور اس کے مطابق ترتیب دینے نئے اصول وضوابط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے اپنی مطابقت پذیری کو بڑھانے کے لیے مخصوص قسم کے نئے ٹیکنالوجی آلات کی بھی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس دوران معاشرے کو نئے اداروں اور تنظیمی سلسلوں، نئے ''ضرب روک'' اور متوازن پہیوں کی ضرورت ہے۔

یہ تمام باتیں مزید تبدیلی پر دلالت کرتی ہیں، یہ بات یقینی...... لیکن آغاز ہی سے ایک ایسی قسم تشکیل دینی چاہیے جو تیز رفتار دھکے کی ترتیب و ترکیب کر سکے، اس کو قابو میں رکھ سکے اور اس کی شرح رفتار کا تعین کر سکے۔ ایسا کرنا آسان نہ ہو گا۔ ایک نامعلوم قسم کے سماجی علاقے میں داخل ہونے کے لیے، ہمارے پاس کوئی آزمودہ تکنیک نہیں اور نہ ہی کوئی خاکے موجود ہیں۔ لہٰذا ہمیں تبدیلی کو منظم کرنے والے اقدامات کے وسیع تر پیمانوں پر تجربے کرنے ہوں گے، اور ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایجادات اور رد کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھنا ہو گا۔ مندرجہ ذیل لائحہ عمل اور طریقہ کار کو پیش کرنے کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما ہے...... یقینی اکسیر کی حیثیت سے نہیں بلکہ نئے زاویوں کی مثالوں کی حیثیت سے جنھیں آزمانے اور جانچنے کی ضرورت ہے۔ ان

میں سے کچھ ذاتی نوعیت کے ہیں دیگر ٹیکنالوجی پر مبنی اور کچھ سماجی حیثیت کے حامل اور ضرورت اس بات کی ہے کہ تبدیلی کو راستے پر لگانے کی کوشش ان تمام مراحل پر ایک ساتھ ہونی چاہیے۔

ان تمام مسائل پر واضح دسترس حاصل کرتے ہوئے اور کچھ کلیدی عوامل پر دانشمندانہ کنٹرول کرتے ہوئے ہم لوگ بحران کو بہتر قسم کے مواقع میں تبدیل کر سکتے ہیں تا کہ لوگوں کو نہ صرف ان کی بقا میں مدد دی جائے بلکہ تبدیلی کے مختلف مرحلوں میں کمال حاصل کرنے کی صلاحیت سے بھی نوازا جائے تا کہ وہ اپنی اپنی منزلوں کے حصول میں درکار مہارت میں بڑھوتری اور نئے احساسات سے لطف اندوز ہوں۔

براہِ راست مقابلہ

ہم لوگ مستقبل کے صدمے کے تدارک کے لیے جنگ کی ابتدا ذاتی سطح سے کر سکتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ، چاہے ہمیں اس کا علم ہے یا نہیں کہ ہمارے روزمرہ رویے کا بڑا حصہ، حقیقی طور پر، مستقبل کے صدمے کا وار روکنے کی ہی کوشش ہوتی ہے۔ ہم لوگ تحرک کے معیارات کو کم کرنے کے لیے اس وقت مختلف تدابیر کا اطلاق کرتے ہیں جب وہ ہمیں، ہماری مطابقت پذیری کی سطح سے زیادہ لے جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ تاہم خاصی حد تک یہ تدابیر لاشعوری طور پر سرانجام ہوتی ہیں۔ ہم انھیں شعوری طور پر سرانجام دے کر ان کی تاثیر میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم تبدیلی سے متعلق اپنے جسمانی اور نفسیاتی ردعمل کا جائزہ لینے کے لیے گاہے بگاہے مطالعہ باطن کر سکتے ہیں اور ایسا اس وقت ممکن ہے جب ہم اپنی اندرونی کائنات کا اندازہ لگانے کے لیے اپنی بیرونی کائنات کا تعدد بدل دیں۔ یہ مسئلہ داخلیت میں محو ہو جانے کا نہیں بلکہ بڑے ٹھنڈے طریقے سے اپنی کارکردگی کو جانچنے کا ہے۔ ہینز سیلیے (Hans Selye) جن کے ''دباؤ'' پر کیے جانے والے کام نے حیاتیات اور نفسیات میں نئی راہیں کھول دیں، کے الفاظ میں، ''کوئی فرد، بڑے حساس طریقے سے بہت زیادہ احساسات کی شدت اور اس کی علامات پر غور کر سکتا ہے۔''

دل کی دھڑکن، رعشہ، بے خوابی یا ناقابلِ بیان تھکاوٹ بیش تحرک کا واضح اشارہ ہیں جس طرح الجھن، غیر معمولی چڑ چڑاپن، انتہا درجے کی بے کیفی اور ایسے خوف کا احساس کہ چیزیں کنٹرول سے باہر ہو رہی ہیں، یہ تمام نفسیاتی اشارے ہیں۔ اپنا مشاہدہ کرنے سے ماضی قریب ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لینے سے ہم اس بات کا تعین کر سکتے ہیں کہ ہم اپنی مطابقت پذیری کی حد میں بآسانی کام کر رہے ہیں یا اس کی حدود سے

باہر نکل رہے ہیں، مختصر یہ کہ ہم اپنی زندگی کی شرح رفتار کا شعوری طور پر اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ایسا کرنے سے ہم شعوری طور پر اثر انداز بھی ہونے لگیں گے...... اس کی رفتار کو تیز کر کے یا اس میں کمی کر کے...... پہلے چھوٹی چیزوں کے حوالے سے، چھوٹی کائنات اور پھر بڑے پیمانے پر، تجربات کے ساختہ نمونوں کے زمرے میں۔ ہم اس وصف کے بارے میں بیش تحرک کے مقابلے میں اپنے ناعاقبت اندیش قسم کے ردعمل کی جانچ پڑتال کر کے بھی بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم ایک عدم تحرک پر مبنی تدابیر استعمال کرتے ہیں، جب ہم کسی ٹین ایجر کے بیڈروم میں داخل ہو کر اس کے سٹیریو (Sterio) یونٹ کو بند کر دیتے ہیں جس کی ناگوار اور بھدی آواز ہمارے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ جب اس سٹیریو کا شور بند ہوتا ہے تو ہم سکھ کا سانس لیتے ہیں۔ ہم دیگر طریقوں سے بصری بھرمار کو بھی کم کرتے ہیں۔ جب ہم اپنے کمرے میں پردے لگا کر اس میں سے نظر آنے والے منظر کی راہ روک لیتے ہیں اور کمرے میں اندھیرے کا سماں کر لیتے ہیں یا خاموشی کی تلاش میں کسی ویران ساحل کا رخ کرتے ہیں۔ ہم ایئر کنڈیشنر کا سہارا لیتے ہیں محض اس لیے نہیں کہ کمرے کا درجہ حرارت کم کیا جائے بلکہ سڑک سے آنے والی عجیب و غریب اور انجانی آوازوں پر ایک متواتر جانی پہچانی آوازوں کا پردہ ڈالا جا سکے۔

ہم دروازے بند کر دیتے ہیں، دھوپ کے چشمے لگاتے ہیں؛ بدبودار مقامات سے گریز کرتے ہیں اور جب ہم اپنے ''نادر حسیاتی ادخال'' کی شرح کو کم کرنا چاہتے ہیں تو ہم انجانی سطحوں اور مقامات کو چھونے سے بھی پرہیز کر لیتے ہیں۔ اسی طرح جب اپنے دفتر سے گھر جانے کے لیے کسی نئے راستے کی بجائے شناسا راستے کا انتخاب کرتے ہیں تو ہم ''حسیاتی ڈھالوں'' کا استعمال کرتے ہیں...... دقیق قسم کے ہزاروں کرداری حربے تا کہ جب حسیاتی محرکات ہماری مطابقت پذیری کی اوپری حدود تک پہنچیں تو انھیں روک دیا جائے۔

ہم لوگ اسی قسم کی تدابیر دانشمندانہ تحرک کی سطح کو کنٹرول کرنے کے لیے بھی اپناتے ہیں، بہترین طلبہ بھی کبھی کبھار (کمرۂ جماعت کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتے ہیں، استاد کا تسلسل توڑ دیتے ہیں اور اس ذریعے سے آنے والے نئے مواد کی راہ روک لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ زبردست قسم کا مطالعہ کرنے والے لوگ کبھی کبھار ایسے ایام سے بھی گزرتے ہیں جب وہ کسی جریدے یا کتاب کا مطالعہ نہیں کرتے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی کسی دوست کے گھر جمنے والی محفل میں کوئی ایک شخص تاش کی ایک نئی گیم سیکھنے سے انکار کر رہا ہوتا ہے جبکہ دیگر دوست اس پر زور دے رہے ہوتے ہیں؟ اس سلسلے میں کئی عوامل کام کر

رہے ہوتے ہیں: کسی فرد کی ذاتی انا، بیوقوف نظر آنے کا خوف وغیرہ۔ لیکن ایک نظر انداز کیے جانے والے عامل جو کوئی چیز سیکھنے پر رضامندی کا اظہار کر رہا ہوتا ہے وہ اس شخص کی زندگی میں دانشمندانہ تحرک کی سطح ہو سکتی ہے۔ ''مجھے نئے نئے حقائق سے روشناس کرانے کی زحمت نہ کرو'' یہ ایک ایسا جملہ ہے جسے عموماً مزاحیہ انداز میں کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ مذاق ایک حقیقی خواہش کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو چیز سے گریز کرنے پر اکساتی ہے اور کسی نئے مواد کے سامنے دباؤ کا شکار کر دیتی ہے۔

یہ چیز جزوی طور پر، تفریح سے متعلق ہمارے خاص انتخاب کے بارے میں ہے۔ اضافی وقت میں مطالعے سے متعلق، فلموں یا ٹیلی وژن پروگراموں سے متعلق...... کبھی کبھار ہمیں ندرت کی بلند شرح اور معلومات کے تیز بہاؤ کا سامنا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر اوقات ہم دانشمندانہ تحرک کی عملی مزاحمت کرتے ہیں اور ''ہلکی پھلکی'' تفریح سے لطف اندوز ہوتے ہیں، مثال کے طور پر روایتی سراغ رسان سلسلہ ناقابلِ پیش گوئی چیزوں کے بارے میں بتاتا ہے۔ کون......؟ انتہائی احتیاط سے تعمیر کردہ ایک روایتی ڈھانچے میں، ایک ایسے سیٹ میں جو ندرت پر مبنی نہیں، قابل پیش گوئی تعلقات کا وجود پایا گیا۔ اس طرح ہم نے تفریح کو تحرک کو کم کرنے یا بڑھانے کے ایک آلے کے طور پر استعمال کیا، ہمارے ادخال کی شرح کو موزوں بناتا ہے تاکہ ہماری استعداد بیش باری کا شکار نہ ہو۔

اس طرح کی تدابیر کو مزید شعوری طریقے سے استعمال کرتے ہوئے ہم اپنے چھوٹے ماحول سے بہتر ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے دانشمندانہ ''بوجھ'' کو کم کرنے کی سعی کر کے غیر ضروری تحرک کو بھی کم کر سکتے ہیں۔ مسٹر سیلیے (Selye) مزید لکھتے ہیں، ''لاتعداد چیزوں کو یاد کرنے کی کوشش نفسیاتی دباؤ کی وجوہات میں سے ایک وجہ ہے، میں نے شعوری کوشش کی کہ فوری طور پر ان چیزوں کو فراموش کر دوں جو غیر ضروری ہیں اور اپنی یادداشت میں صرف اسی چیز کو جگہ دوں جو ممکنہ اہمیت کی حامل ہو...... یہ طریقہ کار کسی بھی شخص کو مدد دے سکتا ہے کہ وہ اس عظیم ترین سادگی کی تکمیل کر لے جو اس کی دانشورانہ زندگی کی پیچیدگی کی سطح سے موزونیت رکھتی ہو۔''

ہم لوگ فیصلوں کے تسلسل کو باضابطہ بنانے کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ جب ہم فیصلے کرنے کے بوجھ تلے دبے ہوں تو ہم فیصلوں کو مؤخر کرتے ہیں یا انھیں کسی کے سپرد کرتے ہیں، کبھی کبھار ہم فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ میں نے ایک خاتون ماہر عمرانیات دیکھیں جو ایک پُر ہجوم اور انتہائی

متحرک قسم کی پیشہ ورانہ کانفرنس سے واپس آئی تھیں، وہ ریستوران میں بیٹھیں اور اپنے کھانے سے متعلق فیصلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس خاتون کے شوہر نے پوچھا، ''آپ کیا کھانا پسند کریں گی؟'' خاتون نے جواب دیا، ''میرے کھانے سے متعلق آپ فیصلہ کریں''۔ جب مختلف چیزوں میں سے انتخاب کے لیے ان سے اصرار کیا گیا، تو انھوں نے ذرا ناراضگی سے کہا کہ اس وقت ان کے پاس فیصلہ کرنے کی قوت مفقود ہو چکی ہے۔

ایسے طریقوں سے ہماری حتی الواسع کوشش ہوتی ہے کہ حسیاتی، دانشمندانہ اور فیصلہ کرنے کے تحرک کو متوازن بنانے کی کوشش کرتے ہیں شاید کسی پیچیدہ اور ابھی تک نامعلوم طریقے سے ان کو آپس میں بھی متوازن بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس بیش تحرک کے خطرے سے نبرد آزما ہونے کے مضبوط طریقے ہیں۔ ان طریقوں میں، ہمارے اس ماحول میں موجود ناپائیداری، ندرت اور تنوع کی شرح کو کنٹرول کرنے کی کاوشیں شامل ہیں۔

ذاتی استحکام کے علاقے

ہماری زندگیوں میں ردوبدل کی شرح پر، فرض کریں، شعوری فیصلوں سے اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ اپنے وجودی ماحول کے مختلف عناصر کے ساتھ شعوری طور پر طویل المیعاد تعلقات استوار کر کے تبدیلی اور تحرک میں کمی لا سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم تلف پذیر اشیاء کی خریداری سے انکار کر سکتے ہیں۔ ہم کسی پرانی جیکٹ کو ایک اور سیزن کے لیے استعمال میں لا سکتے ہیں؛ ہم جدید فیشن پر عمل پیرا ہونے سے صریحاً انکار کر سکتے ہیں؛ ہم اسی وقت مزاحمت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں جب کوئی سیلز مین ہمیں بتائے کہ ان کی کمپنی کی تیار کردہ کار خریدنے کا یہ بہترین وقت ہے۔ اس طریقے سے ہم اپنے اردگرد موجود چیزوں سے تعلق جوڑنے اور توڑنے کی ضرورت کو کم کرتے ہیں۔

ہم اسی تدبیر کو لوگوں اور تجربات کے مختلف زاویوں پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ کوئی مخصوص وقت ایسا بھی ہوتا ہے جب انتہائی مخلص اور ملنسار شخص غیر سماجی روّیے اختیار کرتا ہے اور ان اجتماعات اور محفلوں سے گریز کرتا ہے جہاں لوگوں کے ساتھ باہمی میل جول ہو۔ ہم دانستہ طور پر قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہم سفر بھی کرنا کم کر دیتے ہیں۔ ہم اپنی صحبت، گرجا گھر، برادری یا کمیونٹی گروپوں میں لغو قسم کی تنظیم نو پر بھی مزاحمت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اہم فیصلے کرنے میں ہم بڑے شعوری انداز میں، مفادات کے حوالے سے تبدیلی کے اندر پنہاں قیمتوں کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔

ان میں سے کسی کا بھی مقصد یہ نہیں کہ تبدیلی کو روکا جا سکتا ہے یا روک دیا جانا چاہیے۔ ان تمام باتوں میں کوئی بات بھی ماورائے عقل نہیں جتنی ڈیوک آف کیمبرج کی یہ ناعاقبت اندیش نصیحت تھی: ''کوئی بھی تبدیلی، کسی بھی وقت، کسی بھی وجہ سے ہو قابلِ افسوس ہے''۔ مطابقت پذیری کی حد سے متعلق نظریہ ہمیں بتاتا ہے کہ اپنی وجودی قیمت رکھنے کے باوجود، تبدیلی کی کچھ سطح صحت کے لیے ضروری ہے جبکہ بہت زیادہ تبدیلی خطرناک ہوتی ہے۔

کچھ لوگ، نامعلوم وجوہات کی بنا پر، دیگر لوگوں کی نسبت محرک کے اعلیٰ ترین معیار سے جڑے ہوتے ہیں۔ وہ اس وقت تبدیلی پر کام کر رہے تھے جب دیگر افراد ڈگمگا رہے تھے۔ ایک نیا گھر، نئی کار، ایک اور تفریحی سفر، ملازمت پر ایک بحران، گھر پر آنے والے مزید مہمان، دورے، مالیاتی مہم جوئی اور المناک واقعات...... یہ لوگ ان تمام چیزوں کو بغیر کسی ناگواری کے تاثر کے قبول کرتے ہیں۔

ان تمام لوگوں کا گہرا تجزیہ عموماً اس چیز کے وجود کو ظاہر کرتا ہے جسے ان کی زندگیوں میں ''استحکامی حدود'' کا نام دیا گیا ہے...... تمام تر تبدیلیوں کے باوجود وہ مضبوط اور دیرپا رشتے جو بڑی احتیاط کے ساتھ برقرار ہیں۔

میرا جاننے والا ایک شخص معاشقوں، طلاق اور دوبارہ شادی کے لگاتار سلسلوں سے گزرا...... اور یہ سب کچھ ایک قلیل عرصے میں ہی ہو گیا، وہ تبدیلی کے مرحلے سے گزرتا ہے، سیر و سیاحت کرنا پسند کرتا ہے، نئے نئے کھانے، نئے خیالات، نئی فلمیں، ڈرامے اور کتابیں۔ وہ انتہائی ذہین شخص ہے اور اس کی شخصیت میں بوریت کا عنصر انتہائی کم ہے، وہ روایات میں تبدیلی کا آرزومند رہتا ہے اور بڑی شدت سے ندرت کا منتظر رہتا ہے۔ بظاہر وہ ''تبدیلی'' کی ایک چلتی پھرتی مثال ہے۔

تاہم جب ہم زیادہ قریب سے دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی جگہ روزگار پر دس سال برقرار رہا۔ وہ سات سال پرانی کار استعمال کرتا ہے۔ اس کے کپڑے پرانے فیشن کے ہیں۔ اس کے قریب ترین دوست اس کے دفتر کے پرانے ساتھی ہیں اور کالج کے زمانے کے کچھ ہم جماعت۔

ایک اور مثال دوسرے شخص کی ہے جس نے حیران کن حد تک روزگار تبدیل کیا، اور اپنے خاندان کو 18 سال میں 13 مرتبہ منتقل کیا، بہت زیادہ سفر کرتا ہے، کاریں کرایے پر لیتا ہے، تلف پذیر چیزیں استعمال کرتا ہے، پڑوسیوں کے لیے نئی دلچسپیوں کا سامان مہیا کر کے فخر محسوس کرتا ہے اور عمومی طور پر ناپائیداری، نئے پن

اور تنوع کی کیفیت میں رہتا ہے۔ تاہم ایک مرتبہ پھر، اس شخص پر نظرِ ثانی اس کی زندگی میں موجود ''استحکامی حدود'' کو سامنے لے کر آتی ہے: اس کے اپنی بیگم کے ساتھ مضبوط اور خوشگوار تعلقات؛ اپنے والدین سے تعلقات کا استوار رہنا؛ نئے دوستوں کے درمیان کالج کے عہد کے پرانے دوستوں کا برقرار رہنا۔

ایک مختلف نوعیت کی ''استحکامی حد'' عادات کا وہ نمونہ ہے جو اس شخص کے ساتھ ہر جگہ جاتا ہے چاہے اس کی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں سے اسے کوئی فرق پڑتا ہے یا نہیں۔ ایک پروفیسر جنھوں نے دس سال میں سات مرتبہ نقل مکانی کی، جو امریکہ، جنوبی امریکہ، یورپ اور افریقہ میں متواتر گھومتے رہتے ہیں، جنھوں نے کئی مرتبہ اپنا روزگار تبدیل کیا ہے، وہ جہاں بھی جاتے ہیں اپنا روز کا معمول انتہائی شاندار رکھتے ہیں۔ صبح آٹھ بجے سے لے کر نو بجے تک مطالعہ کرتے ہیں، دوپہر کھانے کے وقت سے پہلے 45 منٹ ورزش کرتے ہیں، اس کے بعد آدھے گھنٹے کا قیلولہ کرتے ہیں اور اس کے بعد رات دس بجے تک مصروف رہتے ہیں۔

مسئلہ یہ نہیں کہ تبدیلی کو دبایا جائے، ایسا ناممکن ہے۔ بلکہ اس کا بندوبست کیا جائے۔ اگر ہم زندگی کے مختلف شعبوں میں تیز رفتار تبدیلی چاہتے ہیں تو ہمیں کسی اور جگہ پر شعوری حوالے سے، ''استحکامی نکتے'' تشکیل دینے ہوں گے۔ جیسے طلاق کے عمل کے بعد ملازمت میں تبادلے کے عمل کو ناگزیر نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کنبے میں بچے کی پیدائش سے خاندان کے اندر انسانی تعلق اور رشتوں کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے، شاید اس صورت حال کے بعد فوری طور پر نقل مکانی نہیں ہونی چاہیے، جس سے کنبے کے باہر تعلقات کی نوعیت یکسر تبدیل ہو جاتی ہے۔ شاید کسی خاتون کو بیوہ ہونے کے بعد فوراً ہی مکان فروخت نہیں کر دینا چاہیے۔

تاہم قابلِ عمل قسم کی ''استحکامی حدود'' تشکیل دینے کے لیے، زندگی کے بڑے نمونے تبدیل کرنے کے لیے ہمیں مضبوط قسم کے آلات کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے ہمیں مستقبل کے بارے میں نئی سمت بندی کی ضرورت ہے۔

بالآخر، تبدیلی کے بندوبست کے لیے ہمیں اس کی پیش بندی کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ خیال کہ کسی ایک فرد کے مستقبل کی، کسی حد تک، پیش بندی کی جا سکتی ہے اور یہ بات مستقل روایتی تعصب پسند افراد کے لیے حیران کن ہے۔ بہت سے افراد، خاص طور پر ابتدائی سطح کی سوچ رکھنے والے، یہ یقین رکھتے ہیں کہ مستقبل ایک سپاٹ چیز کا نام ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی ذات کو متاثر کرنے والے اور اپنے ریکارڈ میں رہنے والی تبدیلیوں کے حوالے سے قیاس قائم کر سکتے ہیں، خاص طور پر بڑی بڑی تبدیلیوں کے حوالے

سے ،اور کچھ ایسے طریقے بھی ہیں کہ ان کا اور دیگر چیزوں کا علم ذاتی نوعیت کی ''استحکامی حدود'' تشکیل دینے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم بڑے یقین کے ساتھ اس بات کی پیش بینی کر سکتے ہیں کہ جب تک موت کا مرحلہ نہ آن پہنچے، ہم بڑھاپے کی طرف جاتے رہیں اور یہ بات کہ ہمارے بچے، ہمارے رشتہ دار اور دوست بھی بوڑھے ہوں گے؛ اور یہ کہ ایک خاص نہج کے بعد ہماری صحت گرنی شروع ہوجائے گی۔ جس طرح یہ بات یقینی ہے، ہم اسی سادہ سے بیان کے نتیجے میں، اپنی زندگیوں کے بارے میں نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں یعنی ہمیں ایک، پانچ یا دس سال بعد کتنی تبدیلیوں کو اپنے اندر سمونا ہوگا۔

چند ہی افراد یا خاندان، منظم انداز میں، آنے والے وقت کے بارے میں پلان تیار کرتے ہیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کی یہ پلاننگ عموماً بجٹ سے متعلق ہی ہوتی ہے۔ تاہم مالی معاملات کی طرز پر ہم وقت اور احساسات کے بارے میں بھی پیش بینی کے سکتے ہیں اور اثر و نفوذ کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔ لہذا یہ ممکن ہے کہ اپنے ہی مستقبل کے بارے میں انکشافات پر مبنی عکس دیکھا جا سکے اور آنے والی تبدیلیوں کی مجموعی سطح کا اندازہ لگایا جا سکے اور بتدریج اس کام کے لیے تیار ہوا جائے جسے ''وقت اور احساسات کی پیش بینی'' کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایک کوشش ہے جس کے ذریعے زندگی کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں میں صرف کی جانے والی وقت اور احساسات کی قوت کی شرح کا اندازہ لگایا جا سکے......اور یہ بھی دیکھا جا سکے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں کس قسم کی تبدیلی آسکتی ہے۔

مثال کے طور پر کوئی بھی شخص کسی ایک کالم میں زندگی کے ان شعبوں کی فہرست پیش کر سکتا ہے جو ہمیں انتہائی اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں: صحت، پیشہ، تفریح، ازدواجی تعلقات، والدین کے ساتھ تعلقات، اولاد سے تعلقات وغیرہ۔ اس کے بعد یہ ممکن ہوگا کہ ہر چیز کے آگے ''قیاسی تخمینہ'' درج کر دیا جائے کہ ہم اس خاص شعبے کے لیے، آج کل کتنا وقت مختص کر رہے ہیں۔ بات کو سمجھانے کے لیے ہم فرض کر لیتے ہیں: روزگار کے لیے 9 سے پانچ بجے تک کا وقت مختص ہے، آدھ گھنٹے کا سفر کرنا، عمومی طویل چھٹیاں اور ہفتہ وار چھٹیاں۔ اس طریقہ کار پر کاربند شخص اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ کام کے لیے اپنے دستیاب وقت کا پچیس فی صد ہی صرف کرتا ہے۔ اگر صورت حال ایسی ہی ہے تو وہ ملازمت پر صرف کی جانے والی، جذبات اور احساسات کے حوالے سے ذاتی تخمینہ کاری کر سکتا ہے۔ اگر وہ شخص بوریت کا شکار ہے اور خود کو محفوظ بھی سمجھتا ہے، تو وہ بہت

محدود حد تک ہی سرمایہ کاری کر سکتا ہے......وقت کے صرف کیے جانے اور جذبات کی سرمایہ کاری کے درمیان کوئی ضروری تعلق نہیں۔

اگر وہ شخص زندگی کے ہر اہم شعبے میں یہی معمول اختیار کرتا ہے، خود کو مجبور کرتا ہے کہ ایک ایسی شرح میں رہ کر کام کرے کہ وہ شرح ابتدائی سطح کے تخمینے کے معیار کی ہو اور پھر ان اعداد و شمار میں اس طرح سے اضافہ کیا جائے کہ ان کی شرح 100 فی صد سے اضافہ نہ کرے تو وہ شخص یقینی طور پر حیران کن بصیرت سے نوازا جائے گا۔ کیونکہ جس طریقے سے وہ اپنا وقت اور جذبات پر مبنی توانائیاں تقسیم کرتا ہے وہ اس کی شخصیت اور اخلاقی اقدار کے نظام کے لیے ایک براہ راست حوالہ ہے۔

اس عمل میں شمولیت کی قیمت اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ بڑی ایمانداری سے اور بڑی تفصیل سے یہ پوچھتا ہے کہ اس کا روزگار، ازدواجی زندگی، بچوں یا والدین سے اس کے ساتھ تعلقات آنے والے وقت میں مزید بہتر ہو جائیں گے۔

مثال کے طور پر وہ ایک چالیس سالہ منیجر ہے جس کے دو ٹین ایجر بیٹے ہیں، والدین یا ساس سسر ہیں، اس شخص کو، ابتدائی سطح کا، کینسر کا مرض بھی لاحق ہے، وہ شخص یہ قیاس کر سکتا ہے کہ تقریباً پانچ سال میں اس کا بیٹا کالج کا طالب علم ہوگا یا والدین سے علیحدہ زندگی گزار رہا ہوگا۔ والدین سے منسوب وقت کی مدت میں کمی آجائے گی۔ اسی طرح والدین کے کردار کے حوالے سے مطلوبہ جذباتی توانائیوں میں بھی کمی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ دوسری جانب جب اس کے اپنے والدین اور سسرالی عزیز بزرگی کے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں اس کی ذمہ داریاں بھی وسعت اختیار کر جائیں گی۔ اگر وہ بیمار ہیں تو اسے، اپنے وقت اور جذبات کے حوالے سے، زیادہ توانائیاں صرف کرنی ہوں گی۔ اگر ان کے، مشاہدے اور مطالعے کے اس مخصوص وقت میں ہی، وفات پا جانے کے امکانات ہیں تو اسے اس حقیقت کا سامنا کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنی وابستگیوں میں ایک واضح تبدیلی کی توقع ہے۔ اسی دوران اس کی اپنی صحت بھی بہتری کی طرف نہیں جائے گی۔ اس طرح اسے روزگار کے حوالے سے بھی کچھ خدشات نظر آتے ہیں......اس کی ترقی کے امکانات، تنظیم نو کے امکانات، کسی جگہ پر تبادلہ، از سرِ نو تربیت وغیرہ

یہ تمام سلسلہ انتہائی مشکل نظر آتا ہے اور ''مستقبل کے علوم'' کے تقاضے بھی پورے ہوتے نظر نہیں آتے۔ اس کی بجائے یہ تمام امور مستقبل کے بارے میں اس کی قیاس آرائیوں کو واضح کرتے ہیں۔ جونہی وہ

آگے بڑھتا ہے اور حالیہ سالوں سے متعلق پیش بینی کرنے لگتا ہے، اگلے سال، پانچویں اور دسویں سال سے متعلق تبدیلی کے نمونوں کی جھلک اس کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ، آنے والے، چند سالوں اسے تبدیلیاں اور از سرنو تقسیم نظر آرہی ہیں۔ کچھ سال تلاطم سے بھرے ہوئے اور تبدیلی سے بھرپور ہیں جبکہ دیگر ایسے نہیں...... اور پھر انہی سلسلہ وار قیاس آرائیوں کے بل بوتے پر، وہ یہ فیصلہ کرسکتا ہے زمانہ حال میں بڑے بڑے فیصلوں پر کیسے قابو پایا جائے۔

کیا اس کے کنبے کو اگلے سال شفٹ ہو جانا چاہیے...... یا ایسی بھی کوئی صورت ہے کہ اس کے بغیر بھی کوئی بڑی تبدیلی اور ہنگامہ آرائی ممکن ہے؟ کیا اسے اپنا روزگار چھوڑ دینا چاہیے؟ نئی کار خریدنی چاہیے انتہا درجے کا خرچہ کر کے طویل چھٹیاں گزارنی چاہئیں؟ اپنے بزرگ سسر کو فلاحی ادارے میں چھوڑ دینا چاہیے؟ کوئی معاشقہ چلانا چاہیے؟ کیا وہ ایسا کرسکتا ہے کہ اپنی شادی شدہ زندگی کو متزلزل کردے یا اپنا پیشہ تبدیل کر لے؟ کیا اسے کوشش کرنی چاہئیں کہ وہ اپنی وابستگیوں کے مختلف معیارات کو غیر مبدّل رکھ سکے؟

ذاتی پلاننگ کے لیے یہ تکنیک انتہائی بنیادی درجے کے آلات کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاید ایسا ممکن ہو کہ ماہرین عمرانیات اور ماہرین سماجی عمرانیات ایسے شستہ آلات تشکیل دینے میں کامیاب ہو جائیں جو امکانی اختلافات کے حوالے سے زیادہ حساس ہوں اور بصیرت پیدا کرنے کے لیے جدید تر ہوں۔ تاہم اگر ہم یقینی چیزوں کی بجائے قیاس آرائی پر زیادہ توجہ دیں تب بھی یہ بنیادی سطح کے آلات ہماری زندگیوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو جدید تر بنانے یا اس کا راستہ بنانے میں ہماری مدد کرسکتے ہیں۔ کیونکہ تیز رفتار تبدیلی کی حدود کی نشاندہی سے وہ ہماری اس سلسلے میں بھی مدد کرتے ہیں کہ ہم ''استحکامی حدود'' کی شناخت کرسکیں...... یا انھیں ایجاد کریں...... اور اس غلبہ پاتی ہوئی صورت حال میں نسبتاً ثابت قدم قسم کے نمونے بھی وضع کرسکیں۔ تبدیلی پر قابو پانے کی اس ذاتی کوشش میں وہ عجیب وغریب چیزوں میں اضافہ کر بیٹھتے ہیں۔

یہ سارے کا سارا خالصتاً منفی مرحلہ نہیں...... تبدیلی پر غلبہ پانا یا اسے محدود کرنے کی کوشش۔ تیز رفتاری کا مقابلہ کرنے کی کسی شخص کی انفرادی کوشش کرنے کا معاملہ مطابقت پذیری سے خود کو ہم آہنگ کرنے سے مشتق ہے اور اس کے علاوہ مناسب ترین موقع تلاش کیے جانے کی کوشش کہ جس پر وہ موثر ترین صورت حال میں رہتا ہے۔ بار ہاربر مین (Bar Harbor, Maine) میں واقع جیکسن لیبارٹری نامی بائیومیڈیکل ریسرچ سنٹر سے تعلق رکھنے والے سینئر سائنسدان ڈاکٹر جان ایل فلر (Dr.John L.Fuller) نے تجرباتی

کمی اور بیشی کے موضوع پر تجربات کیے۔ وہ کہتے ہیں، ''کچھ لوگ افراتفری کی حالت میں بھی طمانیت اور سکون کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ جذبات سے بے بہرہ ہوتے ہیں بلکہ اس لیے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں تبدیلی کی صحیح مقدار کے حصول کی صلاحیت حاصل کرلی ہے۔'' اس کی مناسب مقدار وہی ہوسکتی ہے جو ''خوشی کی مقدار کی تلاش'' کی مقدار ہوسکتی۔

اعصابی اور اندرونی غدودوں کے ان نظاموں میں عارضی طور پر گرفتار ہو کر ہمیں نئی تدابیر سے متعلق سوچنا چاہیے جو اس تحرک کو جاری وساری رکھتی ہیں جو ہماری ذات سے متعلق ہیں۔

مواقعاتی گروپ بندی

مسئلہ یہ ہے کہ اس قسم کی ذاتی تدابیر ہر گزرنے والے دن کے ساتھ نسبتاً کم موثر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جونہی تبدیلی کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے افراد کے لیے مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق استحکامی حدود تشکیل دیں۔ عدم تبدیلی کی قیمت میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہم پرانے گھر میں قیام کرسکتے ہیں...... محض یہ دیکھنے کے لیے کہ ہمارا پڑوسی ترقی کر رہا ہے۔ ہم پرانی کار استعمال کرسکتے ہیں...... مرمت کے بلوں کو حد سے بڑھتا ہوا دیکھنے کے لیے۔ ہم کسی نئے مقام پر تبادلے سے انکاری ہوسکتے ہیں...... تاکہ اس کے نتیجے میں اپنے روزگار سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ ایسے اقدامات بھی اٹھائے جاسکتے ہیں جن کی بدولت ہم اپنی نجی زندگیوں میں تبدیلیوں کے اثرات کو کم کرسکتے ہیں تاہم اصل مسئلہ ہماری ذات سے باہر کا ہے۔

ایک ایسا ماحول تشکیل دینا جس میں تبدیلی فرد کو تازگی بخشتی ہے اور اسے مطلوبہ چیزوں سے مالا مال کردیتی ہے لیکن اس پر غالب نہیں آتی اس سلسلے میں ہمیں ذاتی حیثیت کی تدابیر اختیار نہیں کرکرنی چاہئیں بلکہ سماجی حیثیت کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اگر ہمیں لوگوں کو تیز رفتاری کے حامل عہد میں بنے لے کر گزرنا ہے تو ہمیں جدید ترین صنعت کاری کے حامل معاشرے میں مستقبل کے صدموں کا مقابلہ کرنے کے لیے ''صدمے روک'' تعمیر کرنے شروع کردینے چاہئیں اور اس کے لیے ہمیں اپنی زندگیوں میں تبدیلی یا عدم تبدیلی سے متعلق نئے طریقے سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے لوگوں کی مختلف طریقے سے درجہ بندی کی بھی ضرورت ہے۔

آج ہم لوگوں کے حوالے سے درجہ بندی فی الوقت کی جانے والی تبدیلیوں کے تناظر کو مدنظر رکھ کر

نہیں کرتے بلکہ تبدیلیوں کے دوران ان کے مرتبے یا حالت کو مدنظر رکھ کر کرتے ہیں۔ ہم کسی یونین میں شامل ہونے والے فرد کے طور پر لیتے ہیں جس نے کسی یونین میں شمولیت اختیار کی ہو اور ابھی تک اس شمولیت سے دستبردار نہ ہوا ہو۔ ہمارے تعین کا تعلق (اس یونین سے) منسلک ہونے یا دستبردار ہونے سے نہیں بلکہ ان دونوں مراحل کے درمیان ''عدم تبدیلی'' سے ہے۔ فلاحی مراعات حاصل کرنے والا، کالج کا طالب علم، میتھوڈسٹ (Methodist) فرقے سے تعلق رکھنے والا، حکام اعلیٰ...... تمام کے تمام فرد کی اس حالت کو بیان کرتے ہیں جو ''تبدیلیوں'' کے درمیانی عرصے میں تھیں۔

تاہم یہ لوگوں کا جائزہ لینے سے متعلق یکسر مختلف قسم کا ایک نظریہ ہے۔ مثال کے طور پر ''وہ شخص جو کوئی نئی رہائش اختیار کرنے والا ہے''، یہ ایسی درجہ بندی ہے جس میں کسی ایک مذکورہ دن میں 100,000 امریکی موزوں بیٹھتے ہیں، تاہم انھوں نے کبھی ایک گروپ کی حیثیت سے اکٹھے ہونے کا نہیں سوچا۔ اور ایک درجہ بندی 'وہ شخص جو اپنا روزگار تبدیل کر رہا ہو'، بھی ہو سکتی ہے، یا ''وہ جو کسی گرجا گھر سے وابستگی اختیار کر رہا ہے'' یا ''جو طلاق حاصل کر رہے ہیں/رہی ہیں'' ان تمام کی درجہ بندی عارضی، ناپائیدار حالات پر ہے بجائے تبدیلیوں کے درمیان مضبوط حالتوں پر۔

توجہ مرکوز کرنے کی اس اچانک تبدیلی، یعنی اس سوچ سے کہ ''لوگ کیا ہیں'' تبدیل ہو کر ''لوگ کیا ہوتے جا رہے ہیں'' تک کی تبدیلی مطابقت پذیری کی یکسر نئی راہیں وضع کرتی ہے۔

ان راہوں میں سب سے زیادہ پر تخیل اور سادہ ترین کو ہیومن ریسورس ریسرچ آرگنائزیشن (Humman Resource Research Organization) کے عملے کے لیے مختص ماہر نفسیات ڈاکٹر ہربرٹ گرجوائے (Dr.Herbert Gerjuoy) نے وضع کیا ہے۔ انھوں نے اسے ''مواقعاتی گروپ بندی ایک بہتر حوالے سے مستقبل کی سماجی خدمات میں کلیدی حیثیت کی حامل ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر گرجوائے تجویز پیش کرتے ہیں کہ ہمیں عارضی تنظیمیں مہیا کرنی چاہئیں...... ''مواقعاتی گروپ بندیاں''...... ان لوگوں کے لیے جو زندگی میں ناپائیداری کے مرحلے سے گزر رہے ہیں، ایسے مواقعاتی گروہ ''ان خاندانوں کے لیے تشکیل دینے چاہئیں جو مسلسل نقل مکانی کے مرحلے سے گزر رہے ہیں، ان مرد و خواتین کے لیے جو طلاق کے مرحلے سے گزرنے والے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو والدین یا شریک حیات میں سے کسی ایک کی موت کا صدمہ دیکھنے والے ہیں، جن کے ہاں کسی بچے کی پیدائش متوقع

ہے، وہ افراد جو کوئی نیا پیشہ اختیار کرنے والے ہیں، وہ خاندان جو کسی نئے طبقے میں شامل ہو گئے ہیں، وہ افراد جو اپنے سب سے چھوٹے بچے کی شادی کرنے والے ہیں، وہ لوگ جو ریٹائرمنٹ کے مرحلے سے گزرنے والے ہیں...... بالفاظ دیگر کسی بھی ایسے فرد کے لیے جو زندگی کی کسی اہم تبدیلی کے مرحلے سے گزرنے والا ہو۔
''تاہم اس گروپ کی ممبر سازی عارضی بنیادوں پر ہونی چاہیے، دیگر کو محض ایک میٹنگ کے انعقاد تک ہی محدود رہنا چاہیے۔''

ڈاکٹر گرجوائے مزید کہتے ہیں ایسے لوگوں کو قریب لا کر جو ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں یا کرنے والے ہیں ایک مشترک مطابقت پذیر تجربے کے ذریعے ہم انھیں مقابلے کے لیے تیار کر سکتے ہیں۔ ''ایک شخص جو زندگی کی ایک نئی صورت حال سے مطابقت کی ضرورت محسوس کر رہا ہے وہ اپنی انا کے لیے کچھ بنیادی چیزوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں پر ہی شک کرنے لگتا ہے۔ اگر ہم اس شخص کو دیگر ایسے افراد کے ساتھ ملائیں جو انہی تجربات سے گزر رہے ہیں تو اس کے شناخت کردہ افراد کے ذریعے اور ان کے حوالے سے، ہم اسے مضبوط کر سکتے ہیں۔ اس گروپ کے افراد اگر ذرا سی بھی حس شناخت کے مالک ہیں تو وہ ایک دوسرے سے تعاون کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے مسائل کو خارجی حوالے سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ مفید خیالات اور بصیرتوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے مستقبل کے لیے متبادل چیزوں کی تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر گرجوائے کہتے ہیں مستقبل پر اس قسم کی توجہ مرکوز کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کچھ گروپ تھراپی کے مشین برعکس مواقعاتی گروہ بندیوں کو ماضی سے متعلق واقعات دہرانے، اس پر قابو پانے، احتساب بالنفس سے متعلق کشف ذات نہیں بلکہ ذاتی مقاصد کا تبادلۂ خیال اور زندگی کی نئی صورت حال میں مستقبل سے متعلق عملی لائحہ عمل کی پلاننگ اس گروپ بندی کے ممبران دیگر گروپوں سے تعلق رکھنے والے ان افراد کی فلمیں دیکھ سکتے ہیں جو انہی جیسے مسائل سے نبرد آزما ہیں۔ وہ ان لوگوں کی گفتگو بھی سن سکتے ہیں جو ان سے زیادہ ناپائیداری کی صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ان لوگوں کو یہ موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ تبدیلی کے لمحے کے پہنچنے سے قبل ہی ذاتی تجربات اور خیالات سے دوسروں کو روشناس کروا دیں۔

ان تمام باتوں کا نچوڑ یہ ہے کہ اس سوچ سے متعلق کوئی بات بھی نادر اور انوکھی نہیں ہے۔ اب بھی بہت سی تنظیمیں ایسی ہیں جن کی بنیاد مواقعاتی اصولوں پر ہے۔ امن عامہ کے مقصد کے لیے تشکیل دی جانے

والی ایک تنظیم کے رضا کاران جو کسی بیرونی مشن پر جا رہے ہوں وہ بھی ایسے مواقعاتی گروہ کی طرح ہیں جیسے کسی کی پیدائش سے قبل یا مابعد پیدائش دیے جانے والے لیکچرز۔ بہت سے امریکی قصبوں میں ''نقل مکانی کر کے آنے والے نئے افراد'' کے کلب ہیں جو نئے آنے والوں کو روایتی طرز کے پکے ہوئے کھانے کی دعوتوں اور دیگر سماجی تقریبات میں مدعو کرتے ہیں اور انھیں یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ دیگر نئے آنے والے افراد کے ساتھ گھل مل جائیں اور اپنے اپنے مسائل اور پلان زیرِ بحث لائیں۔ شاید ایسے افراد کا بھی ایک کلب ہونا چاہیے جو کسی جگہ کو چھوڑ کر جا رہے ہوں۔ جو چیز نئی ہے وہ یہ تجویز ہے کہ ہم لوگ ایک خاص نظم کے ساتھ، ایسی ہی کلاسوں کے انعقاد سے جو ہمیں مقابلہ کرنا سکھائیں، معاشرے میں نفوذ کر سکتے ہیں۔

بحران سے متعلق مشاورت

کسی بھی فرد کے لیے مدد کا سلسلہ صرف گروپوں سے نہیں آ سکتا یا لازمی طور آنا چاہیے بہت سے معاملات میں تبدیلی کے دباؤ کے شکار فرد کو مطابقت پذیری کے بحران کے دوران انفرادی حیثیت میں مشاورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نفسیات کی خاص اصطلاح میں ''بحران'' کسی بھی اہم تغیر کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ ''زندگی میں کسی بڑی تبدیلی'' کے مترادف ہے۔

آج کے دور میں تغیر کے بحران میں مبتلا افراد مختلف قسم کے ماہرین کا رخ کرتے ہیں......ڈاکٹرز، شادی کی مشاورت دینے والوں، ماہرین نفسیات، تفریحی امور کے ماہرین اور دیگر افراد......تا کہ انفرادی نوعیت کی مشاورت حاصل کر سکیں۔ تاہم بحران کی بے شمار اقسام کے لیے موزوں ماہرین ناپید ہیں۔ کون ایسا شخص ہے جو اس کنبے یا فرد کی مدد کرتا ہے جسے پانچ سال کے عرصے میں تین مرتبہ ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟ کون ایسا شخص ہے جو کسی ایسے لیڈر کو مشاورت دے سکے جو اپنے کلب یا کمیونٹی آرگنائزیشن میں ہونے والی تنظیم نو کی وجہ سے اپنے عہدے میں ترقی یا تنزلی کا سامنا کر رہا ہو/ رہی ہو۔ کون ایسا شخص ہے جو کسی ایسے سیکریٹری کی مدد کرے جس کا عہدہ گھٹا کر اسے ٹائپ کاری پر معمور کر دیا گیا ہو؟

اس طرح کے لوگ کسی عارضے کا شکار نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی انھیں نفسیاتی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ دی جانی چاہیے، تاہم ان لوگوں کی سہولت کے لیے کوئی مشاورتی مشینری کی دستیابی نہیں۔

موجودہ زندگی کے تغیرات کی بہت سے اقسام کے لیے نہ صرف یہ کہ کوئی مشاورت کا سامان میسر نہیں بلکہ ندرت کی بھرمار مستقبل میں افراد کو، ذاتی نوعیت کے بے شمار بحرانوں کے سامنے لا کھڑا کرے گی اور

جوں جوں معاشرہ تبدیلی کی طرف رواں دواں ہوتا چلا جائے گا مسائل کی اقسام میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ نسبتاً سست روی سے تغیر پذیر معاشروں میں افراد کو پیش آنے والے بحرانوں کی نوعیت یکساں ہوتی ہے خصوصی مشاورت کے ذرائع بآسانی شناخت کے قابل ہوتے ہیں۔ جو افراد بحران کا شکار ہوتے ہیں وہ اپنے متعلقہ پادریوں، طلسم گروں یا مقامی سرداروں سے رجوع کرتے ہیں۔ آج کے دور میں جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل ممالک میں مشاورتی خدمات اتنی مخصوص حیثیت حاصل کر چکی ہیں کہ ہم نے، ان کے نتیجے میں، دوسرے درجے کے مشاورت کنندگان بھی تشکیل دے دیئے ہیں جو کچھ بھی نہیں کرتے بلکہ فرد فرد کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ مشاورت کہاں سے حاصل کی جائے۔

یہ حوالہ جاتی خدمات سرخ فیتے کا کام کرتی ہیں، فرد اور اسے درکار مشاورت میں تاخیر کا موجب بھی بنتی ہیں، جب تک اس فرد تک مدد پہنچتی ہے وہ پہلے ہی ابتدائی نوعیت کے فیصلے کر چکا ہوتا ہے......اور وہ فیصلے بھونڈے انداز میں کیے ہوتے ہیں۔ جب تک ہم یہ قیاس کرتے ہیں کہ مشاورت وہ چیز ہے جسے کسی پیشہ ور ماہر کی طرف سے آنا چاہیے، ہم اس مرحلے میں حائل مشکلات کی پیش بینی بھی کر لیتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہم لوگ جب تک اپنی مہارتوں کی بنیاد اس بات پر رکھیں گے کہ لوگ ''کیا ہیں'' بجائے اس کے کہ وہ ''کیا ہوتے جا رہے ہیں'' ہم بہت سے مطابقت پذیر مسائل کو یکسر فراموش کرتے چلے جائیں گے۔ سماجی خدمات کے لیے مختص روایتی نظام اس کے مطابق نہیں چل سکیں گے۔

اس کا جواب مواقعاتی گروپ بندی کے نظام کا مثل ہے......ایک ایسا مشاورتی سلسلہ جو نہ صرف کُل وقتی پیشہ ور مشیران کی خدمات مہیا کرتا ہے بلکہ عمومی مشیران کی بھی ایک بڑی تعداد کا حامل ہے۔ ہمیں اس بات کا ادراک ہو جانا چاہیے کہ کسی بحران کے دوران، جو چیز کسی شخص کو کسی ایک ''بحران'' کا ماہر بنا دیتی ہے وہ ضروری نہیں کہ باقاعدہ تعلیم ہی ہو بلکہ اسی قسم کے بحران سے گزرنے کا تجربہ ہے۔

لاکھوں افراد کو پیچیدہ قسم کے متوقع تغیرات میں مدد دینے کی غرض سے ہم پر کمیونٹی کے بے شمار غیر پیشہ افراد کو مصروف کار کرنے کا دباؤ ہونا چاہیے......کاروباری حضرات، طلبہ، اساتذہ، محنت کش اور دیگر افراد ......جو ''مشیر برائے بحران'' کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دیں سکیں۔ آنے والے وقت میں ''مشیر برائے بحران'' روایتی قسم کے شعبوں کے ماہرین نہیں ہوں گے، جیسے نفسیات یا صحت، بلکہ مخصوص قسم کے تغیرات، جیسے نقل مکانی، ملازمت میں ترقی، طلاق یا ذیلی مسالک کی تشکیل وغیرہ، کے ماہرین ہوں گے۔

اپنے حالیہ تجربات سے لیس، رضا کارانہ خدمات سرانجام دیتے ہوئے یا انتہائی معمولی معاوضے کے عوض، وہ اپنے وقت کا کچھ حصہ عام لوگوں کی گفتگو سننے میں گزاریں گے، ان کے مسائل، ان کے اندیشے اور خطرات اور پلان سنیں گے۔ اس کے علاوہ ان کی رسائی اسی قسم کی مشاورت کے لیے دیگر افراد تک بھی ہو گی جو خود ان لوگوں کی مطابقت پذیرانہ ترقی میں مددگار ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ یہ بات کہی جاتی ہے کہ ایک دوسرے سے باہمی مشورہ لینے والوں سے متعلق کوئی چیز بھی نئی نہیں۔ جو چیز نئی ہے وہ، کمپیوٹرائزڈ سسٹمز کے استعمال کے ذریعے، بہت ہی عجلت میں مواقعاتی گروہوں کی تشکیل ہے۔ افراد کی مشیران سے مماثلت، اور ان دونوں امور کی انجام دہی پوشیدگی اور گمنامی کو ملحوظِ خاطر رکھ کر کی جانی چاہیے۔

ہم اس سمت میں پیش رفت کا اندازہ ''سمعی'' اور ''حفاظت کرنے والی'' خدمات کے پھیلاؤ سے کر سکتے ہیں۔ ڈیون پورٹ، اووا، (Davenport,Iowa) میں کوئی بھی تنہا شخص ٹیلی فون نمبر ملا سکتا ہے اور کسی بھی ''بڑھاپے'' کے مسئلے پر شروع کیے جانے والا پروگرام نیویارک کے کیئرنگ سروس پروگرام سے مماثلت تو رکھتا ہے مگر ہو بہو وہ پروگرام نہیں، کیئر۔رنگ (Care-Ring) اپنے صارفین سے فیس وصول کرتا ہے جس کے عوض ہر صارف روزانہ مقررہ وقت پر، دو کالیں موصول کرتا ہے۔ صارفین کو ان کے ڈاکٹر، پڑوسی، بلڈنگ سپرنٹنڈنٹ اور کسی قریبی رشتہ دار کے حوالے سے خدمات فراہم کی جاتی ہیں۔ اگر ایسا ہو کہ وہ کال کا جواب نہ دیں تو انھیں آدھ گھنٹہ بعد دوبارہ کال کی جاتی ہے۔ اگر وہ پھر بھی جواب نہ دیں تو ڈاکٹر کو اطلاع کر دی جاتی ہے اور اس مقام پر نرس کی ڈیوٹی لگا دی جاتی ہے۔ کیئر۔رنگ (Care-Ring) کی خدمات کو اب دیگر شہروں میں، قانونی اجازت کے ساتھ، پھیلایا جا رہا ہے۔ اسی قسم کی دونوں خدمات کی فراہمی میں ہمیں مستقبل میں فراہم کیے جانے والی بحران سے متعلق مشاورت کا عکس نظر آتا ہے۔

اس نظام کے تحت مشاورت دینا اور حاصل کرنا، معمول کے افسر شاہانہ اور لاشخصی انداز میں، ایک ''سماجی خدمت'' ہی نہیں رہ جاتی بلکہ ایک شخصی حیثیت کا عمل ہے جو افراد کو نہ صرف ان کی زندگیوں میں ہونے والے تغیر اور تبدیلیوں کا مقابلہ کرنے میں مدد دیتی ہے بلکہ مجموعی طور پر پورے معاشرے کو ''محبت کے جال'' میں یکجا کر دیتی ہے۔ ایک ایسا اجتماعی اور مربوط نجام جس کی بنیاد اس اصول پر ہے، ''مجھے آپ کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی آپ کو میری۔'' جوں جوں ہم تمام لوگ اجتماعی حیثیت سے مستقبل کی غیر یقینی کیفیتوں میں

داخل ہوتے چلے جائیں گے مواقعاتی گروپ بندی اور، بحران سے متعلق فرداً فرداً مشاورت ہر شخص کی زندگی کا اہم حصہ بنتی چلی جائے گی۔

وسطِ راہ قیام گاہیں

ایک مختلف قسم کا ''مستقبل کا دھچکا روک''، ''وسطِ راہ کی قیام گاہوں'' کا نظریہ ہے جسے پہلے ہی ترقی پذیر قسم کے جیل حکام مجرم کی معمول کے مطابق زندگی گزارنے سے پہلے اس کی آسانی کے لیے استعمال میں لاتے ہیں۔ ایک ماہر جرمیات ڈینئیل گلیسر (Daniel Glaser) کے مطابق مستقبل کے اصلاحی اداروں کی ایک نمایاں خصوصیت ''بتدریج نکاسی'' ہوگی۔

کسی بھی شخص کو جیل کی ایک زیرِ تحرک اور مسدود زندگی سے نکال کر، بغیر پیشگی تیاری کے کھلے معاشرے میں بھیجنے کی بجائے پہلے اسے ایک وسطی ادارے میں بھیجا جاتا ہے جو اسے دن کے وقت معاشرے میں کام کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے جبکہ رات کے وقت اسے ادارے میں واپس آنا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ پابندیاں اٹھالی جاتی ہیں حتیٰ کہ وہ بیرونی دنیا سے مکمل ہم آہنگی اختیار کر لیتا ہے۔ دماغی علاج کے لیے مختص اداروں میں بھی یہی اصول اپنایا گیا ہے۔

اسی طرح یہ تجویز بھی دی گئی کہ دیہی علاقوں سے شہروں میں منتقل ہونے والی آبادی کے مسائل بھی کسی حد تک کم ہو جائیں گے اگر اسی قسم کی ''وسطِ راہ قیام گاہوں'' کا اصول اپنا کر ایک نئے طرزِ زندگی میں ان کے داخلے کے مرحلے کو آسان بنا دیا جائے۔ اس نظریے کے مطابق شہروں کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ استقبالی سہولیات ہیں جہاں پر نئے آنے والے کچھ عرصہ قیام کریں اور اس جگہ پر ماحول اس قسم کا ہو کہ اس میں سے نصف سہولیات دیہی معاشرے کی ہوں جو وہ چھوڑ آ رہے ہوں اور نصف سہولیات اس ماحول کی ہوں جہاں وہ رہنے جا رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ شہروں میں منتقل ہونے والے افراد کو حقارت سے دیکھا اور برتا جائے اور انھیں خود اپنا راستہ تلاش کرنے دیا جائے اگر انھیں ماحول کا عادی بنانے کی تربیت دے دی جائے تو وہ بہتر انداز میں مطابقت پذیری کریں گے۔

اسی قسم کا ایک نظریہ ان ماہرین میں رائج ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے جو ٹیکنالوجی کے حوالے سے غیر ترقی یافتہ دنیا میں واقع بڑے شہروں ''بغیر ملکیت کے گھروں'' سے خود کو جوڑے ہوئے ہیں۔ خرطوم، سوڈان، کے ملحقہ علاقوں میں لاکھوں کی تعداد میں سابقہ خانہ بدوش افراد نے رہائشی علاقوں کا ایک سلسلہ بنالیا ہے۔ وہ لوگ

جوشہری حدود سے دور ہیں وہ خیموں میں رہتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے وہ ہجرت سے قبل کے دور میں رہتے تھے۔ان کی نسبت شہری حدود کے قریب رہنے والے مٹی کی دیواروں والی جھونپڑیوں اور ترپال کی چھت والے گھروں میں رہتے ہیں۔اور وہ لوگ جو ان کی نسبت شہری حدود کے اور زیادہ قریب ہیں وہ لوگ ایسے گھروں میں رہتے ہیں جو مٹی کی دیواروں سے تعمیر ہوئے ہیں اور ان کے اوپر ٹین کی چھتیں ہیں۔

جب وہاں کی پولیس نے ان ٹینٹوں کو اکھاڑنا چاہا تو شہری منصوبہ سازی کے ادارے ''Constantinos Doxiadis'' نے تجویز پیش کی کہ نہ صرف ان گھروں کو اپنی جگہ پر قائم رہنے دیا جائے بلکہ ان کے مکینوں کو بلدیاتی سہولیات بھی فراہم کردی جائیں۔انھوں نے مزید تجویز پیش کی کہ ان آبادیوں کو منفی نظر سے دیکھنے کی بجائے انھیں ایک تدریسی اور تربیتی مقام کی حیثیت سے دیکھا جائے جس کے ذریعے شہروں میں نقل مکانی کرنے والوں کو بتدریج شہری بنایا جاسکتا ہے۔

تاہم اس اصول کا اطلاق صرف غریب، ذہنی معذور یا مجرموں تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے۔ تبدیلی فراہم کرنے کا یہ نظریہ جس کے ذریعے کسی فرد کو انضباطی اور مرحلہ وار سلسلے میں، نہ کہ یک لخت تغیر کے، تبدیلی کا مقابلہ کرنا سکھانا ہر اس معاشرے کے لیے ضروری ہے جو تیز تر سماجی یا ٹیکنالوجی انقلاب کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔مثال کے طور پر ایک آزمودہ کار شخص کو اپنی ملازمت سے مرحلہ وار طریقے سے فارغ کرنا چاہیے۔ جبکہ دیہی طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک طالب علم کو کسی بڑے شہر کی یونیورسٹی میں داخل ہونے سے پہلے، اوسط درجے کے ایک شہر کے کالج میں کچھ عرصہ گزارنا چاہیے۔کسی ہسپتال میں ایک طویل عرصے تک داخل رہنے والے ایک مریض کی اس طریقے سے حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ وہ ہسپتال سے فارغ ہونے سے پہلے ایک یا دو مرتبہ، آزمائشی بنیاد پر گھر رہ کر آئے۔

ہم لوگ پہلے ہی اس قسم کے طریقے آزما رہے ہیں، لیکن اس کے علاوہ بھی دیگر طریقے آزمائے جا سکتے ہیں۔مثال کے طور پر ریٹائرمنٹ کا مرحلہ اچانک نہیں ہونا چاہیے، سب کچھ یا کچھ بھی نہیں، انا کو مجروح کر دینی والی جیسا کہ اآج بہت سے لوگوں کے لیے ہے۔کوئی وجہ نہیں کہ اسے مرحلہ وارانہ بنایا جاسکے۔فوج میں بھرتی ہونے کا سلسلہ جو کسی نوجوان کو اچانک اور بڑے خوفناک انداز میں اپنے خاندان سے علیحدہ کردیتا ہے، اسے بھی مرحلہ وار ہونا چاہیے۔قانونی طور پر علیحدگی حاصل کرنا جو طلاق کے راستے میں ایک وسطی قیام گاہ کا کام کرتی ہے اسے قانونی طور پر نسبتاً کم پیچیدہ ہونا چاہیے جبکہ نفسیاتی طور پر کم الجھا ہوا ہونا چاہیے۔بدنامی کا

سبب بننے کی بجائے آزمائشی شادی کی حوصلہ افزائی کی جاسکتی ہے۔مختصر یہ کہ جب کبھی رتبے میں تبدیلی کا مرحلہ آئے مرحلہ بندی کو خارج از امکان قرار نہیں دینا چاہیے۔

ماضی کے محصورے

کوئی بھی معاشرہ ایسا نہیں جو اگلی چند دہائیوں کی ہنگامہ آرائی میں داخل ہو رہا ہو اور وہ ان تبدیلیوں کو بغیر خصوصی مراکز کی تشکیل کے قبول کرے جس میں شرح تبدیلی مصنوعی طور پر گھٹا کر پیش کی گئی ہو۔اس بات کو دیگر الفاظ میں کہتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ماضی کے محصوروں کی ضرورت ہے......ایسے طبقات جن میں ردّ و بدل، ندرت اور حق انتخاب دیدہ دانستہ محدود کردیے گئے ہوں۔

یہ ایسے طبقات ہوسکتے ہیں جن میں تاریخ جزوی طور پر منجمد کردی گئی ہے جیسے پنسلونیا کے امش (Amish) دیہات، یا وہ مقامات جہاں ماضی کو بناوٹی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔جیسے ولیمز برگ (Williamsburg)، ورجینیا یا مسٹک، (Mystic) کنیکٹیکٹ ......تاہم ولیمز برگ یا مسٹک کی ڈگر سے ذرا ہٹ کے جہاں سیر کرنے والے ایک متواتر اور تیز رفتار جھلک کی طرح گزرتے ہیں، آنے والے وقت میں ماضی کے محصورے ایسے مقامات ہونے چاہئیں جہاں مستقبل کے صدمے کے متاثرہ لوگ، اگر چاہیں تو کہیں ہفتوں، مہینوں، حتیٰ کہ سالوں تک بیش تحرک کے دباؤ کو نکال سکتے ہوں۔

سست روی کے شکار طبقات میں وہ افراد جو ایک پرسکون اور کم تحرک پر مبنی وجود چاہتے ہے وہ اسے تلاش کرنے کے قابل ہوں گے۔ان طبقات کو شعوری طور پر درجہ بند ہونا چاہیے اور گرد و نواح کے معاشرے سے چیدہ حیثیت میں قطع ہو جانا چاہیے۔گاڑیوں وغیرہ کی رسائی محدود ہونی چاہیے تاکہ ٹریفک کے مسئلے کا تدارک کیا جائے۔اخبارات روزمرہ کی بجائے ہفتہ وار ہونے چاہئیں۔اگر اجازت دی جائے تو ریڈیو اور ٹیلی وژن کی نشریات، کل وقتی کی بجائے، چند گھنٹوں کی ہونی چاہئیں۔صرف چند ہنگامی خدمات......مثال کے طور پر صحت......کو جدید ترین ٹیکنالوجی کی تمام تر مراعات کے ساتھ برقرار ہونا چاہیے۔

ایسے طبقات کے لیے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ان کا تمسخر نہ اڑایا جائے بلکہ بڑی سطح پر معاشرے سے ان کے لیے ذہنی اور سماجی بیمے کی بھی مراعات ہونی چاہئیں۔انتہائی تیز رفتار تبدیلی کے دور میں، بڑی سطح پر معاشرے کے لیے یہ ممکن ہے کہ غیر مقبول اور تباہ کن قسم کی کچھ غلطیاں کرے۔مثال کے طور پر ذرا ایسی اضافی غذائی اشیا کے بڑے پیمانے پر پھیلاؤ کا تصور کریں جو اتفاقاً Thalidomide قسم کے اثرات میں تبدیل ہو

جاتا ہے۔کوئی شخص بھی ایسے حادثات کا تصور کرسکتا ہے جو بارآوری کوختم کر سکتے ہوں یا تمام کی تمام آبادی کے قتل کا موجب بن سکتے ہیں۔

ماضی کے محصوروں کی تشکیل سے، جیسے وہ جیتے جاگتے عجائب گھر ہوں، ہم اس بات کا امکان بڑھا دیتے ہیں کہ کسی بڑی تباہی کی صورت میں ٹکڑے چننے کے لیے کوئی نہ کوئی موجود ہے۔ایسے طبقات تجرباتی تدریسی مشینوں کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔لہذا بیرونی دنیا سے تعلق رکھنے والے بچے ایک مصنوعی، جاگیردارانہ نظام کے حامل دیہات میں چند مہینے گزار سکتے ہیں اور بالکل ایسے ہی رہ سکتے ہیں اور کام کر سکتے ہیں جیسا صدیوں قبل بچے کیا کرتے تھے۔ٹین ایجر ضرورت محسوس کریں گے کہ وہ کچھ وقت، ابتدائی سطح کے صنعتی طبقے میں گزاریں اور اس طبقے کی کسی فیکٹری میں کام کریں۔اس طرح کی جیتی جاگتی تعلیم انھیں ایسا تاریخی پس منظر بیان کرسکتی ہے جو کوئی بھی کتاب فراہم نہیں کرسکتی۔ایسے طبقات میں، وہ مرد و خواتین جو نسبتاً سست روی پر مبنی زندگی کو پسند کرتے ہیں وہ شیکسپیئر یا بین فرینکلن (Ben Franklin) یا نپولیئن میں سے اپنے پیشے کا بندوبست کر سکتے ہیں...... نہ صرف ان کے کرداروں کو سٹیج پر پیش کر کے، بلکہ انہی کی طرح کا طرز بود و باش اپنا کر، کھا کر اور انہی کی طرح نیند کے مزے لے کر۔''تاریخی تحرک'' کا پیشہ بہت سے فطری باصلاحیت افراد کو اپنی جانب کھینچے گا۔

مختصر یہ کہ ہر معاشرے کو ایسے ذیلی معاشروں کی ضرورت ہوگی جس کے ممبر جدید ترین فیشن سے دور رہنے پر کاربند ہوں۔ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ہم ایسے افراد کو ادائیگی بھی کریں کہ وہ جدید اشیاء کا استعمال نہ کریں، جدید خودکار اور پیچیدہ ذرائع نقل و حمل استعمال نہ کریں۔

مستقبل کے محصورے

اسی ڈگر پر چلتے ہوئے، جس طرح ہم نے کچھ لوگوں کے لیے یہ ممکن بنایا تھا کہ وہ ماضی کی ست شرح میں ایام گزاریں، ہمیں اس بات کو بھی ممکن بنانا چاہیے کہ ہم افراد کے لیے یہ مواقع پیدا کریں کہ وہ مستقبل کے مختلف پہلوؤں کا پیشگی تجربہ کرسکیں لہذا ہمیں مستقبل کے محصورے بھی تشکیل دینے ہوں گے۔

ایک محدود حوالے سے ہم پہلے ہی ایسا کر رہے ہیں۔خلاباز، پائیلٹ اور دیگر ماہرین کی تربیت، انتہائی احتیاط سے تیار کردہ ایک مصنوعی ماحول میں ہوتی ہے جس میں آنے والے وقت میں انھوں نے اس وقت رہنا ہوتا ہے جب وہ کسی مشن کی تکمیل کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔کسی خلائی گاڑی کے کاکپٹ (Cockpit) یا

کیپسول کے اندرونی ماحول کا مصنوعی ماحول تشکیل دے کر ہم کئی درجوں تک، ان لوگوں کو، ان کے مستقبل کے ماحول کا عادی بناتے ہیں۔پولیس ملازمین اور جاسوسی کرنے والے خفیہ اداروں کے ملازمین اور کمانڈوز اور دیگر فوجی امور کے ماہرین کو فلمیں دکھا کر ان کی پیشگی تربیت کی جاتی ہے کہ انھیں کس قسم کے افراد سے نبردآزما ہونا ہے، انھیں کن کن فیکٹریوں میں اپنی مخصوص خدمات سرانجام دینا ہے، وہ خطہ جسے انھوں نے عبور کرنا ہے۔ اس طرح انھیں تیار کیا جاتا ہے کہ وہ مستقبل میں مختلف قسم کے غیر یقینی واقعات کا کیسے مقابلہ کریں گے۔

اس اصول کو وسیع تر نہ کر سکنے کی کوئی بھی وجہ سمجھ نہیں آتی۔کسی ملازم کو کسی نئے مقام پر تعینات کرنے سے پہلے اسے اور اس کے کنبے کو نئی جگہ اور اس کے پڑوس سے متعلق تفصیلی فلمیں دکھا دینی چاہئیں جہاں انھوں نے رہنا ہے، وہ سکول جس میں ان کے بچوں نے تعلیم حاصل کرنی ہے، وہ سٹورز جہاں سے انھوں نے خریداری کرنی ہے، حتیٰ کہ اساتذہ کے بارے میں، ان دکانداروں اور پڑوسیوں کے بارے میں جن سے ان لوگوں نے ملاقات کرنی ہے۔اس طریقے سے ہم آہنگی اور مطابقت کرنے کے بعد ہم ان کی انجانی پریشانیوں میں کمی کر سکتے ہیں اور ان کو درپیش آنے والے مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں پیشگی تیار کر سکتے ہیں۔

آنے والے وقت میں تجرباتی بنیادوں پر مصنوعی ماحول کی تشکیل اور اس سے متعلق ٹیکنالوجی میں پیش رفت سے ہم اس قابل ہوں گے کہ مزید آگے ترقی کر سکیں۔پیش مطابقت پذیر فرد اس قابل ہوگا کہ وہ نہ صرف اس ماحول کو دیکھ سکے اور سن سکے بلکہ اسے چھو بھی سکے اس کا مزہ چکھ سکے اور اسے سونگھ سکے جس میں وہ داخل ہونا چاہتا ہے۔وہ اس قابل ہو جائے گا کہ وہ مستقبل میں زیادہ لوگوں سے میل جول کر لے اور بڑی احتیاط سے ترتیب شدہ تجربات سے گزرے جو مقابلہ کرنے کی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے وضع کیے ہیں۔

مستقبل کے نفسی دستے اس طرح کی پیشگی مطابقت پذیر سہولیات کی تشکیل اور عملداری کے لیے ایک بارآور مارکیٹ کی دستیابی پائیں گے۔پورے کے پورے خاندان ایسے محصوروں میں جا سکتے ہیں جہاں ''کام کرو۔سیکھو۔اور عمل کرو'' کا ماحول ہو، جو مستقبل کے عجائب گھروں کی حیثیت رکھتے ہوں، اور وہ انھیں اس قابل کردیں کہ وہ اپنی ذاتی (آنے والی) ''کل'' کا مقابلہ کر سکیں۔

عالمی خلائی نمائشیں

جان کارڈنر نے Self Renewal نامی کتاب میں لکھا ہے، ''ہم لوگ تبدیلی کے اس نظریے کی وجہ سے گنگ اور ششدر ہو کر رہ گئے ہیں۔ہمیں اس قضیے کا دفاع کرنا چاہیے کہ انسانی تاریخ میں تواتر ایک بے

حقیقی چیز کا نام ہے...... اگر وہ قابلِ الزام چیز نہیں۔ یہ افراد، تنظیموں اور معاشروں کی زندگیوں میں انتہائی اہم جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔''

مطابقت پذیری کی حد سے تعلق کے نظریے کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے تجربات کے تواتر کا تقاضا ضروری نہیں کہ ''ردعمل'' کی سی نوعیت کا ہو۔ جامد قسم کے معاشروں میں ایک عمیق قسم کی نفسیاتی خواہش ہے کہ وہاں ندرت اور تحرک موجود ہو۔ ترقی یافتہ معاشروں میں مختلف چیزوں کے تواتر کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔

ماضی میں رسوم تبدیلی کا ایک بہتر ذریعہ ہوتی تھیں۔ ماہرین علم بشریات ہمیں بتاتے ہیں کہ تقریبات کا تسلسل...... پیدائش، اموات، بلوغت اور شادیوں کے حوالے سے وغیرہ...... ابتدائی عہد کے معاشروں میں افراد کی مدد کیا کرتا تھا کہ وہ کسی بڑے مطابقت پذیر سانحے کے وقوع پذیر ہونے کے بعد از سرنو توازن قائم کریں۔

ایس ٹی کمبال (S.T.Kimball) لکھتے ہیں، ''اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملی کہ ایک روشن خیال شہری دنیا نے رسوم کے حوالے سے اظہار کی ضرورت کو کم کر دیا'' کارلیٹن کون (Carleton Coon) کہتے ہیں، ''تمام معاشرے، چاہے ان کے حجم اور پیچیدگی کا درجہ جو بھی ہو، ان میں توازن کو یقینی بنانے کے لیے کنٹرول کی ضرورت ہے، اور کنٹرول کئی صورتوں میں ہوتا ہے۔ اور ان میں سے ایک رسوم ہیں''۔ وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ آج کے دور میں رسوم، ہمیں سربراہان مملکت کے عوامی سطح پر منظر عام پر آنے، مذاہب اور کاروباری معاملات میں نظر آتے ہیں۔

تاہم یہ تمام باتیں رسومات کے ''گلیشیئر'' کا ایک معمولی سا حصہ بیان کرتی ہیں مثال کے طور پر مغربی معاشرے میں کرسمس کارڈ ارسال کرنا ایک سالانہ رسم ہے، جو اپنی دانست میں، تواتر کی نمائندگی کرتی ہے لیکن یہ افراد کی تمام تر عارضی دوستیوں اور شناسائیوں کو طوالت بخشنے کا دوسرا نام ہے۔ سالگرہ کی تقریبات کا انعقاد، چھٹیوں یا برسیوں کی تقاریب کا منعقد ہونا اضافی مثالیں ہیں۔ تیزی سے فروغ پاتی ہوئی تہنیتی کارڈ چھاپنے والی صنعت...... جو صرف امریکہ میں ہی 2,248,000,000 کرسمس کارڈ سالانہ فروخت کرتی ہے...... معاشرے میں جاری و ساری رسوم کا ایک بڑا معاشی ثبوت ہے۔

تکراری رویہ، چاہے اس کے اور بھی کام ہوں، اس پس منظر کو پیش کر کے جس کے پیچھے ندرت

سایہ فگن ہے، غیر تکراری واقعات کو نئے معنی دینے میں مدد دیتی ہے۔ ماہرین عمرانیات جیمز بوسارڈ (James Bossard) اور الینور بول (EleanorBoll) نے ایک سو شائع شدہ خود نوشتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان میں سے 73 ایسی ہیں جن میں مصنفین نے ایسے طریقہ کار بیان کیے ہیں جو بڑے واضح انداز میں خاندان کے افراد کے رسوم کی حوالے سے قابل درجہ بندی ہیں۔'' یہ رسوم جو محض ''خاندان کے افراد کے درمیان سادہ سے میل جول سے شروع ہوئیں، اور پھر اس لیے رائج ہو گئیں کہ یہ ممبران کی تسکین کا باعث تھیں اور پھر تکراری طرز عمل سے یہ ایک مضبوط حیثیت اختیار کر گئیں۔''

جیسے ہی تبدیلی کی شرح رفتار میں اضافہ ہوتا ہے، ان میں سے بہت سی رسومات ختم ہو جاتی ہیں یا تبدیلی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ تاہم ہم لوگ انھیں برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک آزاد خیال خاندان کھانے کی تقاریب میں جمع ہو کر گاہے بگاہے جوہن سیبسٹیان بیچ (Johan Sebastian Bach) یا مارٹن لوتھر کنگ (Martin Luthar King) جیسے انسانیت کے محسنین کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ شادی شدہ جوڑے ''OurSong'' والی مخصوص موسیقی سننا پسند کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اس جگہ جاتے ہیں جہاں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ آنے والے وقت میں ہم اس بات کی پیش بینی کر سکتے ہیں کہ خاندانی زندگی میں رسومات کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

جیسے ہی ہم آگے بڑھتے ہیں اور تبدیلی کی شرح رفتار میں متوازن قسم کے نمونے متعارف کرواتے ہیں، ہمیں تحفظ کے لیے مختلف باقاعدگیوں کو معیاری بنانا ہوگا، بالکل ایسے ہی جیسے ہم جنگلوں، تاریخی یادگاروں یا جانوروں کے تحفظ کے لیے مختص مقامات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں رسومات کی تخلیق بھی کرنی ہے۔

ہم لوگ اب مختلف عناصر کے بھی محتاج نہیں رہے جیسا ہم کبھی ہوا کرتے تھے، اور نہ ہی رات کے اوقات میں اندھیرا اب ہماری مجبوری یا رکاوٹ ہے اور نہ ہی اب ہم صبح کی برف باری یا انتہائی ٹھنڈ کے رحم و کرم پر ہیں اور نہ کسی ایسے طبعی ماحول میں رہ رہے ہیں جو غیر مبدل ہو، اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ ہم زمان و مکان کے حوالے سے خود کی سماجی، فطری سے ذرا مختلف، سمت بندی کر سکیں۔

امریکہ میں بسنے والے شہریوں کی زندگی میں بہار کی آمد ہریالی سے منسوب نہیں...... مین ہیٹن میں ہریالی انتہائی کم ہے...... بلکہ بیس بال کا سیزن سے ہے۔ پہلی بال صدر محترم یا کسی سرکردہ لیڈر کے ہاتھوں پھینکی

جاتی ہے اس کے بعد لاکھوں شہری اس بڑی رسم میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے موسم گرما کا اختتام، بجائے کسی قدرتی نشانی کے، ورلڈ سیریز کے انعقاد سے پہچانا جاتا ہے۔

وہ لوگ جو کھیلوں میں دلچسپی نہیں رکھتے وہ بھی ان بڑے پیمانے پر منعقدہ اور، خوشگوار انداز میں، قابل پیش بینی تفریحی سلسلوں سے بے بہرہ نہیں رہ سکتے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن نشریات کے ذریعے ان کھیلوں کو گھر گھر پہنچایا جاتا ہے۔ اخبارات کھیلوں کی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ بیس بال سے متعلق تصاویر پس منظر کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں، خاص طور پر تیار کردہ دھن جو ہمارے لاشعور میں داخل ہوتی۔ سٹاک مارکیٹ، عالمی سیاست یا خاندانی زندگی میں جو کچھ بھی ہو امریکن لیگ اور نیشنل لیگ ان کی دلچسپیوں کا مرکز رہتی ہیں۔ انفرادی کھیلوں کا ماحصل مختلف ہو سکتا ہے۔ ٹیموں کی پوزیشنوں میں بھی فرق پڑ سکتا ہے۔ لیکن ایک تسکین آمیز ٹھوس اور دیرپا اصولوں کے مجموعے کے ساتھ یہ ڈرامہ جاری و ساری رہتا ہے۔

ہر سال جنوری میں کانگریس کا آغاز؛ سال کے اختتام پر کاروں کے نئے ماڈلوں کا منظر عام پر آنا؛ فیشن میں موسمی حوالے سے تبدیلیوں کا آنا؛ 15 اپریل، انکم ٹیکس کے گوشوارے جمع کروانے کی حتمی تاریخ؛ کرسمس کی آمد آمد؛ نئے سال کی آمد پر پارٹی کا اہتمام؛ طے شدہ قومی چھٹیاں۔ یہ تمام چیزیں بہترین پیش بینی کے ساتھ ہمارے اوقات کار کو ترتیب دیتی ہیں، پابندیٔ وقت کا عارضی سلسلہ جو دماغی صحت کے لیے ضروری ہے (اگرچہ کافی نہیں)۔

تاہم تبدیلی کا دباؤ اسے کیلنڈر سے آزاد کرانے کے لیے ہے، اس کی گرفت کو ڈھیلا کرنے کے لیے اور اسے بے ترتیب بنانے کے لیے۔ ایسے کرنے میں عموماً معاشی مفادات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ لیکن کچھ اہم قسم کے عارضی حوالہ جاتی نکات ایسے ہیں جن کے خسارے میں کچھ مخفی لاگتیں ایسی ہوں جو روزمرہ زندگی کے نمونوں اور اس کے جاری رہنے میں مددگار ہوں۔ ان تمام کو مجموعی حیثیت سے ختم کرنے کی بجائے ہم ان میں سے کچھ کو برقرار رکھنے کی خواہش کر سکتے ہیں اور جہاں کہیں ان کا وجود نہیں اس جگہ کچھ ضابطوں کو لاگو کرنے کی ضرورت بھی، (باکسنگ چیمپئن شپ کے میچ بے قاعدہ اور قابل پیش بین وقت پر منعقد ہوتے ہیں۔ رسومات کی سی حیثیت لیے ان میچوں کا انعقاد اولمپک گیمز کی طرز پر طے شدہ وقفوں کی بنیاد پر ہونا چاہیے)۔

جوں جوں فرصت کے لمحات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، ہمارے پاس یہ موقع آتا ہے کہ ہم

معاشرے میں اضافی مستحکم نکات اور رسومات متعارف کروائیں جیسے نئی چھٹیاں، نمائشیں اور کھیل وغیرہ۔ اس طرح کے سلسلے روزمرہ کی زندگی کے تسلسل میں نہ صرف ایک پس منظر پیش کرتے ہیں بلکہ معاشروں کو یکجا کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں اور ان معاشروں کو جدید ترین صنعت کاری کے نامکمل اثرات کے مقابلے میں کچھ تخفیف بھی فراہم کرتے ہیں مثال کے طور پر ہم گیلیلیو (Galileo)، موزارٹ (Mozart)، آئن سٹائن (Einstein) یا سیزین (Cezanne) کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے بھی چھٹیاں کر سکتے ہیں۔ ہم لوگ خلاء میں انسانی فتح کی بنیاد پر ایک عالمی نمائش کا اہتمام بھی کر سکتے ہیں۔

حتیٰ کہ اب خلانوردی اور کیپسول بھیجنے جانے کے متواتر سلسلے بھی رسوماتی ڈرامائی نمونوں کی طرز پر کیے جانے لگے ہیں۔ جب کسی خلائی شٹل کے مدار میں چھوڑے جانے سے پہلے معکوس گنتی گنی جاتی ہے تو لاکھوں افراد ساکن کھڑے اس منظر کو (ٹیلی وژن پر) دیکھ رہے ہوتے ہیں، کم از کم اس خاص لمحے (جب شٹل چھوڑی جاتی ہے) وہ تمام لوگ انسانیت کے ایک ہونے کی حقیقت کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں اور کائنات میں اس کی امکانی مہارت کا ثبوت پیش کر رہے ہوتے ہیں۔

ایسے مواقع اور ایسی تقریبات کو باقاعدہ بنا کر اور انہی کے حوالے سے منعقد ہونے والی تقاریب کے ارد گرد موجود نمائشی سلسلوں میں مزید رنگ بھر کر ہم ایک نئے معاشرے میں تشکیل پانے والے رسوم کے ڈھانچے کو ترتیب دے سکتے ہیں اور انھیں عارضی حوالہ جاتی ''دانائی محفوظ کرنے والے'' نکات کے حوالے سے استعمال کر سکتے ہیں۔ 20 جولائی کے دن خلاباز آرم سٹرانگ نے ''انسان کے لیے ایک چھوٹا قدم، انسانیت کے لیے ایک بڑی چھلانگ'' کا کارنامہ سرانجام دیا اس دن کو، یقینی طور پر، انسانی اتحاد کی سالانہ عالمی خوشی کے طور پر منانا چاہیے۔

اس طرح سے نئی چیزوں کے استعمال سے، اور پہلے سے موجود روایتی رسوم کی موجودگی میں، تبدیلی متعارف کروا کے، اور جہاں کہیں ممکن ہو، قابل پیش بینی، بجائے سیلانی نوعیت کی تقاریب کے انعقاد سے سماجی انتشار کے بیچ تواتر کے عناصر کو جاری و ساری رکھنے میں مدد دی جائے۔

مینوس آئی لینڈرز (Manus Islanders) کی ثقافتی تبدیلی کا سادہ موازنہ اس چیز سے کیا جاتا ہے جس کا سامنا ہم کرتے ہیں۔ ہم لوگ اس کی بقا کو اسی صورت برقرار رکھ سکتے ہیں جب ہم ذاتی تدابیر سے بڑھ کر سماجی لائحہ عمل کی طرف اپنا سفر شروع کریں .... تبدیلی سے خوفزدہ فرد کو سہارا دینے کی نئی خدمات

فراہم کر کے، آنے والے کل میں رونما ہونے والی تہذیب میں تسلسل اور تبدیلی کا صدمہ سہارنے کی چیزیں تعمیر کر کے۔

ان تمام چیزوں کا مقصد تیز رفتار تبدیلی کی وجہ سے ہونے والے نقصان کو کم سے کم کرنا ہے۔ لیکن اس مسئلے پر گرفت کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کی مطابقت پذیر صلاحیتوں میں وسعت پیدا کی جائے......اور جدید ترین صنعتی انقلاب میں یہی تعلیم کا بنیادی مطمح نظر بھی ہونا چاہیے۔

☆☆☆

اٹھارھواں باب

مستقبل کی گردانِ فعل میں تعلیم

انسانوں اور مشینوں کو سیاروں پر بھیجنے والی تیز رفتار دوڑ میں ایک ''دبیز قسم کی اتار'' کو ممکن بنانے کے لیے بھی بے شمار وسائل مختص کیے گئے ہیں۔ پرواز سے اترنے والے طیارے کا ہر ذیلی نظام، بڑی نفاست کے ساتھ، اس انداز سے بنایا جاتا ہے کہ وہ اترنے کے عمل سے پیدا ہونے والے دھچکے کا مقابلہ کر سکے۔ بڑی تعداد میں انجینئرز، ماہرین جیولوجی، ماہرین طبعیات، ماہرینِ فلزیات اور دیگر شعبوں کے ماہرین طیارے کے اترنے کے اس عمل کے مسئلے پر سالوں کام کرتے ہیں۔ طیارے کے زمین کو چھونے کے بعد کسی بھی ذیلی نظام کی خرابی کئی انسانی جانوں کے ضیاع کا باعث ہو سکتی ہے اور اس سلسلے میں بلین ڈالر کے آلات اور ہزاروں افراد کی محنت ضائع ہو جانے کا ذکر بے سود ہے۔

آج کے عہد میں ٹیکنالوجی سے مالا مال ممالک کی کل آبادی، ایک بلین انسان جدید ترین صنعت کاری سے ہم آہنگ ہونے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ کیا ہمیں بڑے پیمانے پر مستقبل کے دھچکے سے گزرنا ہوگا؟ یا ہم ایک شاندار اور دبیز قسم کے ''اترنے'' کے عمل سے گزر جائیں گے؟ ہم اپنے مقصد کی طرف گامزن ہیں۔ آنے والے کل کی کہر میں ہمیں نئے معاشرے کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ اگر ہم تیز رفتاری کا مظاہرہ بھی کریں، تو ہمیں اس بات کے شواہد ملیں گے کہ ہمارے ذیلی نظاموں میں سے انتہائی اہم نظام......تعلیم......خراب کارکردگی دکھا رہا ہے۔

تعلیم کے میدان میں آج جو کچھ ہو رہا ہے، حتیٰ کہ ہمارے بہترین تعلیمی اداروں، سکولوں اور کالجوں میں، وہ مایوس کن غلط زمانی ہے۔ والدین اپنے بچوں کی مستقبل کی زندگی سنوارنے کے لیے تعلیم کی طرف دیکھتے ہیں۔ اساتذہ اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ تعلیم کی کمی کسی بچے کے لیے آنے والے کل میں اس کی ترقی کے امکانات کو کم کر دے گی۔ حکومتی وزارتیں، گرجا گھر اور ذرائع ابلاغ......تمام بچوں کو سکول جانے کا کہتے ہیں، اور انحصار تعلیم پر ہے۔

مستقبل کے بارے میں تمام تر دلائل دینے کے باوجود بھی ہمارے سکول پسماندہ قسم کی تعلیم دینے

میں مصروف ہیں بجائے یہ کہ ایسی تعلیم دی جائے جو مستقبل میں ایک نئے معاشرے کے قیام کا باعث ہو۔ اس تعلیمی نظام کی زیادہ تر توانائیاں صنعتی انسان بنانے پر مرکوز ہیں۔ وہ افراد تیار کرنا جو ایسے نظام میں زندہ رہیں گے جو ان کی اپنی موت سے پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔

مستقبل کے صدمے کو ٹالنے کے لیے ہمیں جدید ترین صنعتی تعلیمی نظام تشکیل دینا ہو گا۔ اور ایسا کرنے کے لیے ہمیں، ماضی کی بجائے مستقبل کے مقاصد اور طریقہ کار تلاش کرنے ہوں گے۔

صنعتی عہد کے سکول

ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے ہر معاشرے کا اپنا روایتی اور خصوصی رویہ ہوتا ہے۔ تبدیلی کی شرح کے ردعمل کے طور پر وقت کا یہ رجحان، سماجی رویّوں کے حوالے سے، انتہائی کم توجہ حاصل کرنے والا تاہم انتہائی مضبوط فیصلہ کن چیز ہے اور اس کی بہترین عکاسی اس طریقہ کار سے ہوتی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر کوئی معاشرہ اپنے نوجوانوں کو بلوغت کے لیے تیار کرتا ہے۔

جامد قسم کے معاشروں میں ماضی زمانہ حال میں داخل ہوتا ہے اور مستقبل میں خود کو دہراتا ہے۔ ایسے ہی کسی معاشرے میں کسی بچے کو تیار کرنے کا دانشمندانہ طریقہ اسے ماضی کے تمام ہنروں سے آراستہ کرنا تھا...... کیونکہ یہی وہ ہنر تھے جن سے ''مستقبل'' میں اس کا واسطہ پڑتا تھا۔ انجیل مقدس بھی اس بات کو رد کرتی ہے، ''قدیم چیزوں کے ساتھ یہی دانش منسوب ہے۔''

لہٰذا والد اپنے بیٹوں کو ہر قسم کی عملی تدابیر سکھا دیتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑے بہتر انداز میں اخلاقی اقدار بھی سکھا دیتے تھے۔ علم کی ترسیل سکول میں موجود ماہرین تعلیم کے ذریعے نہیں ہوتی تھی بلکہ خاندان، مذہبی درسگاہوں اور شاگردی کے ذریعے ہی دی جاتی تھی۔ پورے طبقے میں تعلیم دینے والے اور تعلیم حاصل کرنے والے پھیلے ہوئے تھے۔ تاہم اس نظام کا مطمح نظر ماضی کی طرف ترغیب تھی۔ ماضی کا نصاب ہی ماضی تھا۔

مشینی عہد نے آ کر اس تمام سلسلے کو برباد کر دیا کیونکہ صنعت کاری ایک نئے انسان کا تقاضا کر رہی تھی۔ وہ ایسے ہنر کی متقاضی تھی جو نہ تو خاندان مہیا کر سکتا تھا نہ ہی گرجا گھر اس نے اقدام کے نظام میں بھی اکھاڑ پچھاڑ کر دی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ انسان نے ''وقت'' کو نئے معنی دے دیے۔

بڑے پیمانے پر تعلیم ہی وہ واحد زیرک قسم کی مشین تھی جو صنعت کاری نے تشکیل کی تاکہ مطلوبہ بالغ افراد پیدا کیے جا سکیں۔ مسئلہ انتہائی پیچیدہ تھا۔ بچوں کو نئی دنیا کے حوالے سے کیسے پیشگی مطابقت پذیر بنایا جائے .... ایک ایسی دنیا جو چار دیواری کے نیچے تکراری محنت کی دنیا ہے، ایک ایسی دنیا جو دھوئیں، شور، مشینوں، رش سے بھرپور رہائشی سہولیات، اجتماعی نظم و ضبط سے بھری ہوئی ہے، ایک ایسی دنیا جس میں وقت کا سلسلہ سورج اور چاند کی مطابقت سے نہیں تشکیل دیا جاتا بلکہ گھڑی اور فیکٹری کی سیٹی کے مطابق چلتا ہے۔

ان تمام باتوں کا حل ایک ایسا تعلیمی نظام تھا جو اپنے تشکیلی ڈھانچے میں اس نئی دنیا کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ یہ نظام فوراً ہی وجود میں نہیں آیا۔ حتیٰ کہ آج بھی اس میں صنعت کاری کے عہد سے قبل کے رجعتی عناصر موجود ہیں۔ تاہم طلبہ کی ایک کثیر تعداد (خام مال) کو اکٹھا کر کے کسی مرکزی جگہ پر واقع سکول (فیکٹری) میں اساتذہ (محنت کش) کے ہاتھوں ان کی آبیاری کروانے کا نظریہ صنعتی عہد کی ذہانت کا ایک سلسلہ تھا۔ مجموعی تعلیمی نظام مراتب جس طرح وسعت اختیار کر گیا، اس نے صنعتی افسر شاہی کے نمونے کی پیروی اختیار کی ہے۔ علم کی تنظیم کا مشتعل شعبے کی حیثیت اختیار کر جانے کی بنیاد صنعتی مفروضوں پر ہے۔ مختلف مقامات سے بچے اکٹھے ہوئے اور مخصوص ٹھکانوں پر مجتمع ہوئے۔ وقت کی تبدیلی کے اعلان کی خاطر گھنٹیاں بجائی گئیں۔

لہٰذا سکول کی اندرونی زندگی ایک متوقعانہ آئینے کی حیثیت اختیار کر گئی، صنعتی معاشرے کا بہترین تعارف آج کل کی تعلیم کے منفی اوصاف.....گروہ بندی، انفرادیت کا فقدان، سیٹوں پر بیٹھنے، درجہ بندی اور مارکنگ کے روایتی نظام، اور استاد کا تحکمانہ کردار...... یہ ایسی چیزیں ہیں جو وسیع پیمانے پر عوامی تعلیم کو جگہ اور وقت کے حوالے سے مطابقت پذیری کا مؤثر ذریعہ بنا دیتی ہیں۔

وہ نوجوان لوگ جو اس تعلیمی مشین کے سلسلے سے گزرتے ہیں وہ بالغوں کے ایک ایسے معاشرے کا حصہ بن جاتے ہیں جس میں روزگار، اصول و ضوابط اور اداروں کی مشابہت سکول میں تعلیم حاصل کرنے والا بچہ نہ صرف ان حقائق کو سیکھتا تھا جسے اس نے آنے والی زندگی میں استعمال کرنا ہوتا تھا؛ بلکہ وہ ایک ایسی زندگی گزارتا تھا اور زندگی گزارنے کا ایسا طریقہ سیکھتا تھا جس کی طرز پر اس نے مستقبل میں زندگی گزارنی ہوتی تھی۔

مثال کے طور پر وہ نیا نظام الاوقات، بتدریج اختیار کرتے تھے جسے صنعت کاری نے لازمی قرار دیا

ہو۔ ایسی صورت حال کا سامنا کرتے ہوئے جن کا وجود پہلے نہیں تھا، افراد کو زمانہ حال کا ادراک کرنے کے لیے اضافی توانائی کا اطلاق کرنا ہوتا تھا۔ لہٰذا تعلیم کا مرکز ومحور تبدیل ہونا شروع ہو گیا اور اس کا رخ، بتدریج زمانہ ماضی سے حال کی طرف ہو گیا۔

امریکی نظام تعلیم میں ''ترقی پسندانہ'' اقدامات متعارف کروانے کی جان ڈیوے (John Deway) اور ان کے ساتھیوں کی تاریخی جدوجہد دراصل وقت کی اس روایتی ''شمار بندی'' کو تبدیل کرنے کی ایک انتہائی کوشش تھی، ڈیوے (Deway) نے روایتی تعلیم کی تشریق کی جنگ کی کہ ہم تعلیم میں از سرِ نو توجہ مرکوز کروا کر صورت حال کو موجودہ تناظر میں لے آئیں۔ انھوں نے بتایا ''معلمانہ نظام کا وہ لائحہ عمل جو ماضی کو (تعلیم کا) ایک جز بنا دیتا ہے وہ ماضی کی شناسائی کو زمانہء حال کی سمجھ بوجھ کا ایک موثر ذریعہ بنانا ہے۔''

کئی دہائیوں بعد بھی جیکوئس میریٹین (Jacques Maritain) جیسے روایت پرست اور رابرٹ ہوچنز (Robert Hutchin) جیسے نو ارسطوئی کسی ایسے شخص پر شدید تنقید کرتے تھے جو اس توازن کو ''زمانہ حال'' کی طرف بڑھائے۔ مسٹر ہوچنز، جو یونیورسٹی آف شکاگو کے سابقہ صدر ہیں اور اب سنٹر فار دی سٹڈی آف ڈیموکریٹک انسٹی ٹیوشنز کے سربراہ ہیں، نے اساتذہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے کہا کہ وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے طلبہ جدید معاشرے سے متعلق ایسے جاننے کی کوشش کرتے ہیں جیسے وہ ''عجلتی قسم کی ذیلی مسلک'' کے ممبران ہوں اور ترقی پسند لوگوں پر ایک بزدلانہ جرم کا الزام ہے: ''حال پرستی''۔

وقت کی شمار بندی کے حوالے سے تضاد کی بازگشت اب بھی پائی جاتی ہے، اور تحریروں میں اس کا ثبوت ہمیں جیکوئس بارزن (Jaques Barzun) کی تحریر میں بھی ملتا ہے جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ''یہ بات حماقت پر مبنی نظر آتی ہے کہ ہم (بچوں کو) زمانہء حال کے مطابق تعلیم دیں، یہ اس کی تعریف کا حق ادا نہیں کرتی''۔ لہٰذا ہمارا تعلیمی نظام ابھی تک اس صنعتی عہد کے مطابق ہم آہنگ نہیں ہوا جب کہ ایک نئے انقلاب...... جدید ترین صنعتی انقلاب...... کی ضرورت ان کے اوپر آن پڑی ہے۔ اور جیسے گزشتہ کل کے ترقی پذیر افراد پر ''حال پرستی'' کا الزام تھا، بالکل ایسے ہی آنے والے کل کے اصلاح کنندگان پر ''مستقبل پرستی'' کا الزام ہوگا۔ کیونکہ ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے حقیقی جدید ترین صنعتی تعلیم صرف اس صورت ممکن ہے جب ہم وقت کی شمار بندی کو آگے کی طرف دھکیل دیں۔

نیا تعلیمی انقلاب

آنے والے کل کے تکنیکی نظاموں...... جو تیز رفتار، رواں اور خود ضابطگی پر مبنی ہوں گے...... مشینی مادی چیزوں کے بہاؤ سے متعلق کام کریں گی؛ جبکہ انسان معلومات اور بصیرت کے بہاؤ سے متعلق کام کریں گے۔ مشینیں عمومی کام سرانجام دیں گی؛ انسان دانشورانہ اور تخلیقی امور سرانجام دیں گے۔ مشینیں اور انسان کسی ایک جگہ بڑی بڑی فیکٹریوں یا فیکٹریوں والے شہروں میں رہنے کی بجائے پوری دنیا میں پھیل جائیں گے اور ان کے درمیان رابطہ، حیران کن حد تک، حساس اور فوری منسلک ہونے والے ذرائع ابلاغ سے ہوگا۔ انسانی کام فیکٹریوں اور بڑے دفاتر سے نکل کر طبقاتی سطح اور گھروں میں سرانجام دیا جائے گا۔

مشینیں ہمہ وقت کاری کی صلاحیت کی حامل ہو جائیں گی، جیسے کچھ پہلے سے ہی ہیں، اور وہ سیکنڈ کے کروڑویں حصے تک مہارت حاصل کر لیں گی؛ اور انسان معکوسی صورت حال اختیار کر لیں گے۔ فیکٹری کی سیٹی کا تصور ختم ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ گھڑیال، جو جدید صنعتی عہد کی کلیدی مشین ہے، اور جسے لیوئس ممفورڈ (Lewis Mumford) نے ایک نسل کا عہد کہا، انسانی امور، جو ٹیکنالوجی سے بالکل مختلف ہیں، پر اپنی دسترس کھو بیٹھے گا۔ بیک وقت وہ تنظیمیں جنھیں ٹیکنالوجی پر کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے وہ افسر شاہی سے منتقل ہو کر عارضی صورت حال پر آ جائیں گی، دوام سے ناپائیداری کی طرف اور زمانہء حال سے غرض وغایت رکھنے کی بجائے مستقبل پر اپنی توجہ مرکوز کریں گی۔

ایک ایسی دنیا میں صنعتی عہد کی بہت سی اعلیٰ وارجع چیزیں ناکارہ ہو کر رہ جائیں گی۔ آنے والے وقت کی ٹیکنالوجی، بہترین صلاحیتوں کے حامل لاکھوں افراد کی موجودگی کا تقاضا نہیں کرے گی جو تکراری قسم کی ملازمتوں میں انتھک کام کرنے کے لیے تیار ہوں گے، اسے ایسے افراد کی ضرورت نہیں ہوگی جو ایک مستقل انداز میں آرڈر لیتے ہوں اور اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں کہ روٹی کی قیمت حکام بالا کی مرہون منت ہے۔ بلکہ ایسے افراد کی ضرورت ہوگی جو اہم فیصلے کر سکیں، جو نادر اور انوکھی قسم کی صورت حال میں اپنا راستہ بنا سکیں جو اس تیزی سے بدلتی ہوئی حقیقت میں نئے راستے سنوار سکیں۔ ایسے افراد کی ضرورت ہوگی جو، سی پی سنو (C.P.Snow) کے شاندار الفاظ میں، ''اپنی ہڈیوں میں مستقبل رکھتے ہوں''۔

اور آخر میں یہ بات کہ جب تک ہم تیز رفتار دھکے پر کنٹرول حاصل نہیں کریں گے۔ اور اس بات کی کچھ علامتیں ہیں کہ ہم ایسا کر لیں گے...... آنے والے وقت کی فرد کو ایسی دشوار گزار تبدیلی سے گزرنا

ہوگا کہ جس سے ہم نہیں گزر رہے۔ تعلیم کے لیے سبق صاف ہے: اس کا بنیادی مقصد فرد کی ''مقابلہ کرنے کی صلاحیت'' کو بڑھانا ہے .... وہ رفتار اور معاشی صورتِ حال جس کے ذریعے وہ متواتر تبدیلی کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ تبدیلی کی شرح جتنی تیز ہوگی، مستقبل کے نمونوں کو سمجھنے کے لیے اتنی ہی توجہ کی ضرورت ہوگی۔

جونی کے لیے ماضی کو سمجھنا ہی کافی نہیں۔ اس کے لیے زمانہ حال کو سمجھنا بھی کافی نہیں کیونکہ ''اب اور یہاں'' والا ماحول جلد ہی فنا ہو جائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جونی (Johnny) تبدیلی کی سمتوں اور اس کی شرح کی پیش بینی کر سکے۔ اور تکنیکی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسے مستقبل کے بارے میں تکراری، احتمالی نوعیت کی اور طویل حدود پر مبنی قیاس آرائیاں کرنی سیکھنی چاہئیں اور اسی طرح جونی کے اساتذہ کو بھی کرنا چاہیے۔

جدید ترین صنعتی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مستقبل کے بارے میں باری باری اور متبادل قسم کے تخیل تشکیل دیں...... روزگار، پیشوں اور تفریحی امور سے متعلق وہ قیاس آرائیاں جن کی آنے والے پچیس سالوں میں ضرورت ہوگی؛ خاندانی صورت حال اور ان انسانی رشتوں سے متعلق پیش بینی جنھوں نے پھلنا پھولنا ہوتا ہے؛ اخلاقیات اور کردار سے متعلق وہ مسائل جنھوں نے ابھرنا ہوتا ہے؛ ٹیکنالوجی کی وہ قسم جو ہمیں گھیر لے گی اور وہ تنظیمی ڈھانچے جن کا ہم نے سامنا کرنا ہے۔

اس طرح کے مفروضوں کی تشکیل سے، ان کی تعریف و تشریح سے، ان پر بحث مباحثے سے ان کی ترتیب سازی سے اور انھیں مستقل تازہ کرنے سے ہی ہم ان دانشمندانہ اور کیفیات سے متعلق مہارتوں کا استخراج کر سکتے ہیں جو تیز رفتار دھکے کا مقابلہ کرنے کے لیے، مستقبل کے لوگوں کی ضرورت ہوگی۔

آج امریکہ میں وفاقی حکومت کے تعاون سے چلنے والے دو ''ایجوکیشن پالیسی ریسرچ سنٹرز''...... ایک سائریکیوز (Syracuse) یونیورسٹی میں اور دوسرا ٹیس فورڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں...... نہایت بلند و بالا عزم لیے ہوئے سرگرم عمل ہیں۔ پیرس میں آرگنائزیشن فار اکنامک کوآپریشن اینڈ ڈویلپمنٹ نے حال ہی میں ایک ڈویژن تشکیل دیا ہے جس کے ذمے اسی قسم کی ذمہ داریاں لاگو کی گئی ہیں۔ طلبہ تحریک میں شامل کچھ افراد نے بھی مستقبل کی طرف توجہ مبذول کروانی شروع کر دی ہے۔ تاہم یہ کوششیں تعلیم کی شمار بندی کی تبدیلی سے پیدا ہونے والی مشکلات کے مقابلے میں انتہائی کم ہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ مستقبل کی ذمہ دار

بڑے پیمانے کی مہم کے علاوہ کچھ اور نہیں۔

ہمیں ہر سکول اور طبقے کی سطح پر مستقبل کے حوالے سے ایک کونسل تشکیل دینی چاہیے: مرد و خواتین کی ٹیمیں جو زمانۂ حال کے مفاد کی خاطر مستقبل کے لیے کاوشیں کریں۔ مستقبل کے حوالے سے قیاس کر کے، ان کے سامنے تعلیمی ردعمل کے بارے میں بتا کر، ان متبادل صورتوں کو عوامی بحث کے لیے مختص کر کے اس طرح کی کونسلیں...... جس طرح برلن میں واقع ''Technische Hochsehule'' سے تعلق رکھنے والے رابرٹ جنکھ (Jungk) نے پرِدگناسٹک سلز (Prognostic cells) کا نظریہ پیش کیا تھا...... تعلیم پر ایک مضبوط اثر ڈال سکتی ہیں۔

کوئی بھی گروپ مستقبل میں بصیرت کے حوالے سے اجارہ داری کا سبب نہ بنے، ان کونسلوں کو جمہوریت پسند ہونا چاہیے۔ ان کونسلوں میں ماہرین کی اشد ضرورت ہوگی۔ لیکن مستقبل سے تعلق رکھنے والی کونسلیں کامیاب نہیں ہوں گی اگر ان پر پیشہ ور ماہرین تعلیم، منصوبہ سازوں یا غیر نمائندہ اشرافیہ نے قبضہ جما لیا۔ لہٰذا ابتدائی سطح سے ہی اس میں طلبہ کا عمل دخل ہونا چاہیے...... لیکن ان کی حیثیت صرف مشترکہ طور پر چیدہ ربڑ سٹمپ کی سی نہیں ہونی چاہیے۔ نوجوانوں کو چاہیے کے وہ رہنمائی میں مددگار ثابت ہوں اگر حقیقتاً نہیں بھی تو ان کونسلوں کو متحرک دیں وہ ''قیاسی مستقبل'' تشکیل دے سکیں اور وہ لوگ اس بحث میں حصہ میں جو مستقبل کو قیاساً ایجاد کریں گے اور اس میں آبادکاری کریں گے۔

مستقبل کی تحریک کی کونسل ہمارے سکولوں اور کالجوں میں موجود پیچیدگی کا لائحہ عمل پیش کرتی ہے۔ ایک ایسے تعلیمی نظام میں پھنسے ہوئے جو انھیں جیتی جاگتی غلط زمانی میں دھکیل رہا ہے، آج کے طلبہ کے پاس مخادت کے تمام حقوق ہیں۔ تاہم طلبہ تحریک کے لیڈروں کی طرف سے انیسویں صدی کے مارکسی اور بیسویں صدی کے فرائڈی فن پاروں پر مبنی ایک سماجی پروگرام کے انعقاد نے ان پر یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح ماضی اور مستقبل کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں مستقبل سے وابستہ، مستقبل کی تشکیل کرنے والی ٹاسک فورسز ہی نوجوانوں کے انقلاب کو مہمیز کر سکتی ہیں۔

ان ماہرین تعلیم کے لیے جو موجودہ نظام کے دیوالیے پن کا ادراک رکھتے ہیں لیکن اگلے اقدامات کے بارے میں غیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہیں، یہ کونسل موومنٹ مقصد کے ساتھ ساتھ قوت مہیا کر سکتی ہے اور نوجوانوں کے حوالے سے اتحاد، بجائے مخاصمت کے، کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتی ہے اور طبقاتی و والدین

کی شرکت حاصل کر کے کاروباری حضرات، ٹریڈ یونین والوں، سائنسدانوں اور دیگر افراد کے ساتھ یہ تحریک تعلیم کے میدان میں جدید ترین صنعتی انقلاب کے لیے بڑے پیمانے پر سیاسی امداد حاصل کر سکتی ہے۔

یہ قیاس کرنا ایک غلطی ہوگی کہ موجودہ تعلیمی نظام غیر مبدل ہے۔ اس کے برعکس یہ تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کا زیادہ حصہ موجودہ مشینری کو بہتر کرنے کی ایک کاوش سے زیادہ کچھ اور نہیں، جو مشکل مقاصد کے حصول کے لیے زیادہ متحرک اور کارگر بنا رہی ہے۔ باقی ماندہ چیزیں براؤن (Brown) سے منسوب تحرک، خود رد کر دینے والا عدم تواتر کا شکار اور سست ہیں۔ جس چیز کی کمی ہے وہ متواتر سمت بندی ہے اور ایک منطقی نقطۂ آغاز۔

کونسل موومنٹ دونوں چیزیں مہیا کر سکتی ہے۔ جدید صنعت کاری سمت ہے اور نقطۂ آغاز: مستقبل۔

تنظیمی حملہ

اس طرح کی تحریک کو تین مقاصد کا حصول درکار ہوگا...... ہمارے تعلیمی نظام کی تنظیمی ڈھانچے کو تبدیل کرنا، اس کے نصاب کو انقلابی بنانا، اور مستقبل سے منسوب سمت بندی کی حوصلہ افزائی کرنا، اس کام کا آغاز موجودہ اور برقرار صورت سے متعلق بنیادی سوالات کرنے سے ہوگا، مثال کے طور پر ہم نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ موجودہ سکول کے نظام کی بنیادی تنظیم فیکٹری کے متوازی ہے۔ کئی نسلوں تک ہم نے یہ قیاس کیا ہے کہ تعلیم کی مناسب ترین جگہ سکول ہی ہے۔ تاہم اگر نئی تعلیم آنے والے کل کے معاشرے کو ظاہر کرتی ہے تو کیا اسے صرف سکول ہی میں ہونا چاہیے؟

جیسے جیسے تعلیم کے معیارات میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے زیادہ سے زیادہ والدین ان ذمے داریوں کو نبھانے کے لیے دانشورانہ سطح پر تیار ہو گئے ہیں جو موجودہ صورت حال میں صرف سکولوں کے لیے مختص ہیں۔ سانتا مونیکا، کیلی فورنیا جہاں RAND کارپوریشن کے صدر دفاتر واقع ہیں، کیمبرج، میساچوسٹس کے گرد و نواح کے تحقیقی علاقوں میں، یا اوک رج (Oak Ridge)، لاس ایلاموس (Los Alamos)، یا ہنٹس ول (Huntsville) جیسے سائنسی شہروں میں بہت سے والدین یہ صلاحیتیں رکھتے ہیں کہ وہ سکول کے اساتذہ سے بہتر انداز میں اپنے بچوں کو بہت سے مضامین کی تعلیم دے سکیں۔ علم کی بنیاد پر مبنی صنعت کی ترویج اور اضافی وقت کی فراہمی سے ہم اس بات کی پیش بینی کر سکتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد چھوٹے لیکن اہم پیمانے پر اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ اپنے بچوں عوامی تعلیمی نظام سے جزوی طور پر علیحدہ کر لیں اور اس کی بجائے انھیں

گھر پر ہی تدریسی سہولیات فراہم کی جائیں۔

اس رجحان کی ذرا سی حوصلہ افزائی کمپیوٹر کی مدد سے دی جانے والی تعلیم، الیکٹرانک ویڈیو ریکارڈنگ، ہولوگرافی (Holography) اور دیگر تکنیکی شعبوں سے ہوئی۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ والدین اور شاگرد قریبی سکولوں میں ''تدریسی معاہدے'' بھی کریں، جو انھیں مختلف نصاب اور نصابوں کی اکائیوں کی تدریس کرنے یا سیکھنے کا موقع فراہم کریں۔ بچے سکول جانا جاری کر سکتے ہیں اور ان کا مقصد سماجی اور کھیلوں کی سرگرمیوں میں حصہ لینا ہو سکتا ہے یا ان مضامین کی تدریس کے لیے جو وہ اپنے والدین کی یا خاندانی دوستوں کی زیر نگرانی نہیں پڑھ سکتے۔ اس سمت میں دباؤ بڑھتے چلے جائیں گے اور اس کی وجہ سکولوں کے غلط زمانی ہونے کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور عدالتوں میں فرسودہ قسم کے موجودہ نظام، جس میں حاضری کو ضروری عنصر قرار دیا جاتا ہے، کی وجہ سے دباؤ بڑھ جائے گا۔ مختصراً یہ کہ ہم ایک ایسے عہد میں داخل ہو رہے ہیں جہاں گھر پر تعلیم دینے کا محدود سا رواج فروغ پا جائے گا۔

سٹین فورڈ کے ایک نظریہ ساز فریڈرک جے میکڈونلڈ نے ''گشتی تعلیم'' کا ایک نظریہ پیش کیا ہے جو طالب علم کو جماعت سے باہر کسی اہم سماجی سرگرمی کے مشاہدے کے لیے نہیں لے کر جائے گا بلکہ اس سرگرمی میں عملی شرکت کے لیے لے کر جائے گا۔

ریاست نیو یارک کے بیڈفورڈ......سٹائی ویسینٹ (Bedford Stuyvesant) ضلعے میں جو سیاہ فام افراد کا انتہائی شورش زدہ علاقہ ہے وہاں پر ایک خاص منصوبے کے تحت بنا ہوا تجرباتی کالج اپنی سہولیات تمام تر دفاتر، سٹوروں اور 45 بلاکوں پر مشتمل گھروں تک پھیلائے گا اور اس بات کو مشکل بنا دے گا کہ ہم تعین کر سکیں کہ کالج کہاں ختم ہوتا ہے اور طبقہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ طلبہ کو ان کے طبقے میں موجود بڑے افراد مختلف ہنر سکھائیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ شعبے کے اساتذہ بھی۔ طلبہ مختلف طبقاتی گروپ اور پیشہ ور ماہرین تعلیم مل کر نصاب ترتیب دیں گے۔ امریکہ کے سابقہ تعلیمی کمشنر ہیرولڈ ہو (Harold Howe) نے معکوس صورت حال تجویز کی: طبقے کو سکول میں لایا جائے تا کہ مقامی سٹور، بیوٹی پارلر، اور پرنٹنگ کی دکانوں کو سکولوں میں آزادانہ جگہ دی جائے اور اس کے عوض ان بالغ افراد سے مفت سبق حاصل کیے جائیں جو ان اداروں کو چلاتے ہیں۔ یہ منصوبہ جسے شہری علاقوں میں موجود محصوروں کے سکولوں کے لیے تشکیل دیا گیا اسے سکول میں بلائے جانے والی کمپنیوں کے ذریعے ایک اور رخ دیا جا سکتا ہے: مثال کے طور پر کمپیوٹر سروس

بیوروز، تعمیراتی دفاتر، حتیٰ کہ لیبارٹریاں نشریاتی ادارے اور اشتہارات کی کمپنیاں وغیرہ۔

کسی اور مقام پر سیکنڈری اور ہائر ایجوکیشن پروگراموں کی طرز پر گفت و شنید کے لیے سنٹرز تشکیل دیے جائیں جو بالغوں کے پروگراموں سے اتالیق کی خدمات حاصل کریں گے۔ اس طرح کے اتالیق نہ صرف اپنے ہنر کے جوہر دکھائیں گے بلکہ کتابوں کے ان اقتباسات کو سامنے لائیں گے جن کا اطلاق عملی زندگی میں ہوتا ہے۔ اکاؤنٹنٹ، ڈاکٹر، انجینئرز، کاروباری حضرات، بڑھئی، تعمیر کنندگان اور منصوبہ ساز کسی بیرونی شعبے کا حصہ بن سکتے ہیں، کسی اور منطقی حوالے سے، اس مرتبہ ایک نئی کارآموزی کے ساتھ۔

بہت سے یکساں نوعیت کی تبدیلیاں ہوا چاہتی ہیں۔ تاہم وہ آزمائشی طور پر فیکٹری ماڈل سکولوں کے بیش میعاد سلسلے کے تعطل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

جغرافیائی اور سماجی خلا کے پھیلاؤ کو وقت کے پھیلاؤ کے ہم رکاب ہونا چاہیے علم کا بڑی تیزی سے متروک ہونا اور مدت حیات کا وسعت اختیار کرنا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ نوجوانی میں سیکھے گئے ہنر ضروری نہیں کہ بڑھاپے کی دہلیز تک آتے آتے موزوں ہی رہیں۔ لہٰذا جدید ترین صنعتی تعلیم میں یہ گنجائش ہونی چاہیے کہ وہ مدت العمر تعلیم کو جدید مواد کے داخل ہونے اور اس کے فرسودہ ہونے کی بنیاد رائج ہونا چاہیے۔

اگر سیکھنے کے عمل کا پھیلاؤ مدت العمر ہے تو بچوں کے کل وقتی سکول جانا اور انتہائی کم مہارت کا کام طبقاتی خدمات کے امور سرانجام دیا جانا باعث تسکین بھی ہے اور تعلیمی امور کے تقاضوں کے مطابق بھی۔

اس طرح کی اختراعات تعلیمی تکنیک میں بھی واضح تبدیلیوں پر دلالت کرتی ہیں۔ آج کمرۂ جماعت میں لیکچرز غالب ہیں۔ یہ طریقہ کار صنعت کے پرانے اور نظام مراتب کے ڈھانچے کی علامت نگاری کرتا ہے۔ اگرچہ محدود مقاصد کے لیے اب بھی ان کی افادیت موجود ہے ان لیکچرز کو تدریسی طریقہ کار کے یکسر نئے نظام کے لیے راہ بنانی چاہیے اور اس کا دائرہ اثر کردار کی ادائیگی سے کھیلوں اور کمپیوٹر سے مزین سیمیناروں اور طلبہ کی مشغولیت، جسے ہم ''تدبیری تجربات'' کہہ سکتے ہیں تک پھیلا ہوا ہے۔ تجرباتی پروگرامنگ کے طریقہ کار جو تفریحی امور، لطف اندوزی اور صنعت جسے آنے والے کل کی نفسی کھیپ نے ترقی دی ہے وہ ایک شناسا، عمومی حیثیت کے اخراج الرجال نوعیت کے مقاصد لیے ہوئے لیکچرز کی فراوانی کا دوسرا نام ہے۔ سیکھنے کے عمل کو تصرف شدہ غذا یا دوائیاں استعمال کر کے بڑھایا جا سکتا ہے جس کی مدد سے آئی کیو (IQ) لیول بڑھایا جا سکتا ہے، مطالعے اور شعور میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی تبدیلیاں اور ان میں پنہاں ٹیکنالوجی تنظیمی نمونے

میں بنیادی تبدیلی لانے میں مددگار ہے۔

تعلیم کے موجودہ انتظامی ڈھانچے جن کی بنیاد صنعتی افسر شاہی پر ہے، وہ اس قابل نہیں ہوگا کہ مذکورہ نظام میں موجود پیچیدگیوں اور شرح تبدیلی کا مقابلہ کر سکے۔ انھیں مجبور کیا جائے گا کہ عارضی نوعیت کی تنظیموں کی طرف اپنا سفر جاری رکھیں محض اس لیے کہ ضبط کا کچھ سلسلہ برقرار رہے۔ تاہم اس سے بھی ضروری چیز کمرۂ جماعت کے دلائل و مضمرات ہیں۔

صنعتی انسان سکولوں کے ذریعے مشینی آلات سے لیس تھا تاکہ وہ سماجی اور معاشی سلسلوں میں نسبتاً دائمی حیثیت اختیار کر سکے۔ جدید صنعتی تعلیم کو چاہیے کہ وہ ایسے لوگ تیار کرے کہ وہ عارضی تنظیموں میں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں...... آنے والے کل کی عارضی چیزیں۔

آج جو بچے سکول میں داخل ہوتے ہیں وہ خود کو ایک معیاری اور بنیادی طور پر غیر متغیر تنظیمی ڈھانچے کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں: استاد کی سربراہی میں چلنے والی کلاس۔ ایک بالغ فرد اور اس کی تابعداری کرنے والے کئی نوجوان افراد، جو ایک جگہ ثبت ہوئی کرسیوں کی قطاروں میں بیٹھتے ہیں اور آگے کی طرف دیکھتے ہیں اور یہی سب کچھ صنعتی دور کے معیاری بنیادی یونٹ کے حامل سکول کا ایک اندازہ ہے۔ وہ لوگ درجہ بدرجہ اگلی جماعتوں میں بڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن وہ اس طے شدہ تنظیمی ڈھانچے میں ہی رہتے ہیں۔ یہ لوگ دیگر طرز کی تنظیموں کے حوالے سے کسی بھی قسم کا تجربہ حاصل نہیں کرتے یا ایک تنظیم سے دوسری تنظیم میں جانے کے مسائل کا سامنا نہیں کرتے۔ یہ لوگ کرداری ہمہ جہتی کی کوئی تربیت حاصل نہیں کرتے۔

کوئی بھی چیز واضح طور پر ضد مطابقت پذیری نہیں۔ مستقبل کے سکول، اگر وہ آنے والی زندگی میں مطابقت پذیری کے عمل کو جاری رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں مختلف قسم کے نئے انتظامات کے ساتھ نئے تجربات سامنے لانا ہوں گے۔ ایسی جماعتیں جس میں کئی استاد ہوں اور ایک طالب علم؛ جنھیں وقتی نوعیت کے کسی کام اور پراجیکٹ ٹیموں کے لیے یکجا کیا گیا؛ طلبہ اجتماعی کام سے ہوتے ہوئے انفرادی یا آزادانہ کاموں کی طرف اور پھر واپس آتے ہیں...... یہ تمام چیزیں اور ان کی ترتیب کے اطلاق کی ضرورت ہے تاکہ طالب علم کو آنے والے وقت کے حوالے سے پیشگی تجربے کی چاشنی پیش کی جا سکے کہ کب اس نے جدید صنعت کاری کے ناپائیدار تنظیمی جغرافیے سے گزرنا ہے۔

لہٰذا مستقبل سے متعلق کونسلوں کے تنظیمی اہداف ہمارے سامنے عیاں ہو جائیں گے: پھیلاؤ،

لامرکزیت، طبقات میں نفوذ، عارضی انتظامیہ، شیڈول اور گروپ سازی کے حوالے سے ایک مستحکم نظام کی شکستگی۔ جب یہ مقاصد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں، تو تعلیم اور صنعتی دور کی فیکٹری کے درمیان کسی بھی قسم کی تنظیمی مشابہت محض اتفاقیہ ہی ہوگی۔

زمانۂ حال میں ماضی کا نصاب

جہاں تک نصاب کا تعلق ہے مستقبل کی کونسلیں بجائے اس بات کا قیاس کرنے کے کہ آج کے عہد میں پڑھایا جانے والا ہر مضمون کسی منطق کے تحت پڑھایا جاتا ہے، اس کام کا آغاز معکوسی طرز پر کریں گی: کسی مطلوبہ نصاب میں کوئی بات اس وقت تک شامل نہ کی جائے جب تک اس کا جواز مستقبل کے حوالے سے ہو جائے۔ اگر اس کا مطلب کسی باضابطہ نصاب کے حقیقی حصے کو فرسودہ قرار دینا ہے تو ایسا ہی سہی۔

اس کا مطلب کوئی ثقافت مخالف بیان یا ماضی کی مکمل تباہی کا ارادہ نہیں۔ نہ ہی یہ کوئی ایسی تجویز پیش کرتی ہے کہ ہم مطالعے، تحریر اور ریاضی جیسی بنیادی چیزوں کو فراموش کر سکتے ہیں۔ اس کا مطمح نظر یہ ہے کہ آج لاکھوں کی تعداد میں بچے ایسے ہیں جو قانون کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے قیمتی گھنٹے اس دھات کو رگڑنے میں گزاریں جس کی مستقبل کی افادیت انتہائی قابلِ اعتراض ہے۔ (کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ آج کے دور میں اس کی خاصی افادیت ہے)۔ کیا انھیں اتنا ہی وقت صرف کرنا چاہیے جتنا وہ فرانسیسی، ہسپانوی یا جرمن سیکھنے میں کرتے ہیں؟ کیا انگریزی پر صرف کیا جانے والا زیادہ سے زیادہ وقت سودمند ہے؟ کیا تمام بچوں کو الجبرا پڑھانے کی ضرورت ہے؟ کیا انھیں امکانیت کے مطالعے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوگا؟ منطق؟ کمپیوٹر پروگرامنگ؟ فلسفہ؟ جمالیات؟ ذرائع ابلاغ؟

جو کوئی بھی یہ گمان کرتا ہے کہ موجودہ نصاب (حالات کے تقاضوں کے مطابق) درست ہے اسے دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ایک چودہ سالہ طالب علم کو اس بات کی وضاحت کرے اس کی تعلیم کے لیے الجبراء یا فرانسیسی کی تعلیم کس لیے ضروری ہے۔ بالغ سطح پر دیے جانے والے جوابات ہمیشہ مائل بہ گریز ہوتے ہیں۔ وجہ انتہائی سادہ ہے: موجودہ نصاب ماضی کا ایک ناسمجھ قسم کا التواء۔

مثال کے طور پر یہ بات کیوں ضروری ہے کہ تدریسی سلسلہ انگریزی، معاشیات، ریاضی یا حیاتیات جیسے لگے بندھے شعبوں تک ہی محدود رہے؟ انسانی زندگی کے مختلف مراحل کے گرد کیوں نہیں: پیدائش، بچپن، نوخیزی، شادی، پیشہ ورانہ زندگی، ریٹائرمنٹ یا موت پر کورسز، یا معاصرانہ سماجی مسائل پر کیوں

نہیں؟ یا زمانہ ماضی یا مستقبل سے تعلق رکھنے والی اہم ٹیکنالوجی کے گرد؟ یا بے شمار دیگر قابلِ تصور متبادل؟

موجودہ نصاب اور ''ہوابند ڈبوں'' میں اس کی تقسیم کی بنیاد مستقبل کو قابو میں لانے والی کسی چیز پر ہے نہ کسی ایسی سمجھ بوجھ پر کہ تبدیلی کے طوفان کی آنکھ میں رہنے کے لیے جونی (Johnny) کو کن کن مہارتوں کی ضرورت ہے۔ اس کی بنیاد ایک جمود پر ہے...... اور نصابی تنظیموں کے شدید اختلافات پر، جو اپنے بجٹ، تنخواہ کے سکیل اور مراتب کے بارے میں مبالغہ۔

مزید یہ کہ ایسا متروک نصاب ایلیمنٹری اور سیکنڈری سکولوں کے لیے معیاریت لاگو کرتا ہے۔ نوجوانوں کو اس بات کے یقین میں انتخاب کے کم ہی مواقع میسر آتے ہیں کہ وہ کیا سیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک سکول سے دوسرے سکول جانے کا سلسلہ کم ہے۔ یہ نصاب کالج کی روایتی ضروریات کی وجہ سے ایک جگہ پر جما دیا جاتا جو اس کے جواب میں ایک فنا ہوتے معاشرے کی تفریحی اور سماجی ضروریات کی عکاسی کرتا ہے۔

تعلیم کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانے کی تگ و دو میں انقلاب کی علامتی جزئیات کو خود کی طرف نصاب کے تجدیدی بورڈ کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ موجودہ تعلیمی قیادت کی طرف سے طبعیات کا نصاب تبدیل کیے جانے یا انگریزی کے تدریسی طریقوں کو بہتر بنانے، ریاضی کے نصاب کو جدید تر بنانے کی کاوشیں بتدریج بہتر ہوتی جا رہی ہیں۔ اگرچہ یہ بات اہم ہو سکتی ہے کہ موجودہ نصاب کے پہلوؤں کو محفوظ رکھا جائے اور بتدریج تبدیلیوں کو متعارف کروایا جائے تاہم ہمیں جدت اختیار کرنے کے لیے اچانک کوششوں سے بڑھ کر کسی چیز کی ضرورت ہے۔ ہمیں مجموعی طور پر اس مسئلے کے لیے ایک منظم لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔

تاہم انقلابی معائنہ کرنے والے ان گروہوں کے تمام مقاصد کو حاصل کرنے والا اور دائمی حیثیت والا نصاب تشکیل دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی بجائے انھیں چاہیے کہ وہ عارضی نصاب کے سیٹ بنائیں...... اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا معیار جانچنے اور اس کی تجدید کے لیے بھی طریقہ کار بنائیں۔ نصابی تبدیلیوں کے لیے ایک منظم طریقہ کار ہونا چاہیے جو ہر مرتبہ دروں دیواری تضاد شروع کیے بغیر ہی ہدف حاصل کرے۔

نصاب میں معیاریت اور اقسام کے درمیان موجود تصادم میں تبدیلی لانے کے لیے لڑائی بھی لڑنی چاہیے۔ تنوع کو اگر اس کی انتہا پر لے جایا جائے تو اس سے ایک لا معاشرہ پیدا ہو سکتا ہے جن میں عمومی حوالہ جاتی

امور لوگوں کے درمیان ایسے ابلاغ پیدا کر سکتے ہیں جو آج کل کے عہد سے بھی مشکل ہوں۔ تاہم سماجی پارگی کے خطرات کا مقابلہ ایک انتہائی متنا جس تعلیمی نظام کو برقرار رکھ کر نہیں کیا جا سکتا جبکہ باقی معاشرہ مختلف النوعیت کی طرف گامزن ہے۔

مختلف اقسام کی ضرورت اور مشترکہ حوالہ جاتی نکات کی ضرورت کے درمیان موجود تضاد حل کرنے کا ایک طریقہ تعلیم میں ''اعداد و شمار'' اور ''ہنر'' کے درمیان امتیاز میں ہے۔

اعداد و شمار میں تنوع

معاشرہ متفرق ہو رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ پیش بینی امور سے متعلق ہمارے اوزار جتنے جدید ہو جائیں، ہم لوگ کبھی بھی اس قابل نہیں ہوں گے کہ معاشرے کی مستقبل کی حالتوں کے درست تسلسل کے بارے میں پیش بینی کر سکیں۔ اس صورت حال میں یہ بات خوش آئند نظر آتی ہے کہ ہم اپنی تعلیمی بازیوں کا سامان کریں گے جس طرح جینیاتی تنوع مختلف انواع کی بقا میں بہتری کا سامان پیدا کرتا ہے تعلیمی تنوع معاشروں کی بقا کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے۔

ایک معیاری ایلیمنٹری اور سیکنڈری سکول کے نصاب کی بجائے، جس میں تمام طلبہ کا سامنا لازمی طور پر انہی اعداد و شمار سے ہوتا ہے...... وہی تاریخ، ریاضی، حیاتیات، ادب، گرائمر، بیرونِ ممالک کی زبانیں وغیرہ...... تعلیم میں مستقبلیت کی تحریک کو چاہیے کہ وہ وسیع پیمانے پر متنوع اعداد و شمار کی دستیابی پر توجہ مرکوز کرے۔ بچوں کو موجودہ صورت حال کی نسبت زیادہ حق انتخاب دینا چاہیے؛ ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ وہ مختصر مدت کے کورسز کی مختلف اقسام کا مزہ لیں (شاید ان کا دورانیہ دو سے تین ہفتے ہونا چاہیے) پیشتر اس کے کہ وہ طویل المیعاد کورسز سے بہرہ مند ہوں۔ ہر سکول کو چاہیے کہ وہ اختیاری مضامین بڑی تعداد میں متعارف کروائے اور ان سب مضامین کی بنیاد مستقبل کی ضروریات سے متعلق شناخت پذیر قیاسوں پر ہونی چاہیے۔

اس مضمون میں پڑھایا جانے والا مواد وسیع تر ہونا چاہیے جو معلوم چیزوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ (یعنی انتہائی شدتی چیزیں) جدید ترین صنعت کاری سے متعلق مستقبل کی چیزیں، اس میں سے تھوڑی سی گنجائش نامعلوم، غیر متوقع اور ممکن چیزوں کے لیے بھی ہونی چاہیے۔ ہم یہ کام ''امکانی نصاب'' کی تشکیل سے سرانجام دے سکتے ہیں...... ایسے تعلیمی پروگرام جن کا مقصد ایسے مسائل پر گرفت کرنا ہو

جو نہ صرف موجودہ زمانے میں اپنا وجود رکھتے ہیں بلکہ، درحقیقت، جو کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوں گے مثال کے طور پر ہمیں ایسے ماہرین کی ضرورت ہے جو انتہائی مضبوط، تباہ کن، لیکن خلاف قیاس، امکانی صورتوں کا مقابلہ کر سکیں: سیاروں یا ستاروں کے ذریعے زمین کی پس۔ آلودگی، اضافی۔ ارضی زندگی سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی ضرورت، جینیاتی تجربات سے پیدا شدہ عجیب الخلقت چیزیں وغیرہ۔

حتیٰ کہ اب ہمیں زیر سمندر طبقات میں موجود زندگی کے لیے نوجوان افراد کو تربیت کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اگلی نسل کے ایک بہت حصے کو سمندروں کے نیچے رہائش کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم طلبہ کے گروہوں کو سمندروں میں (تربیت کے لیے) لے کر جائیں، انھیں غوطہ خوری کی تربیت دیں، انھیں زیر سمندر تعمیراتی مادوں، درکار قوت، اور سمندروں پر انسانی قبضے میں مضمر خطرات اور بنیادی چیزوں سے متعلق آگہی دیں۔ اور ہم یہ کام صرف گریجویٹ طلبہ کے ساتھ نہ کریں بلکہ ایلیمنٹری سکولوں کے طلبہ حتیٰ کہ نرسری کے بچوں کو لے جا کر بھی کریں۔

بیک وقت دیگر افراد کو بھی خلا کے عجوبوں، خلابازوں کے ساتھ یا ان کے قریب رہنے، سیاروں کے ماحول سے متعلق شناسائی دی جائے اور ٹین ایجر طلبہ کو خلائی ٹیکنالوجی سے متعلق ایسا آشنا کر دیا جائے جیسے وہ خاندانی استعمال کی کاروں سے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر افراد کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے، نہ کہ حوصلہ شکنی، کہ وہ مستقبل کے حوالے سے طبقاتی اور خاندانی نوعیت کی صورت حال سے متعلق تجربات سے سیکھ سکیں۔ ذمہ دار افراد، تعمیری منظم شدہ سلسلے کی موجودگی میں ایسے تجربات کو مناسب تعلیم کے حصے کے طور پر دیکھا جائے نہ کہ تدریسی مرحلے میں ایک رکاوٹ یا نفی کے طور پر۔

تنوع کا اصول چند ضروری کورسز ہی کی عمل داری کرے گا، جو مخصوص مہارتوں میں چناؤ کو بڑھا دیں۔ اس سمت میں بڑھتے ہوئے اور امکانی نصاب کی تشکیل کے ساتھ یہ معاشرہ وسیع پیمانے پر مہارتوں کو اکٹھا کر سکتا ہے، ان میں وہ بھی شامل ہیں جن کا کبھی بھی استعمال نہیں ہوگا لیکن جو اس کی فوری دسترس میں ہوں اس صورت میں کہ مستقبل کے بارے میں ہمارے بلند ترین امکانی قیاس غلط ثابت ہوں۔

ایسی پالیسی کا نتیجہ زیادہ سے زیادہ انفرادیت کے حامل اور باصلاحیت انسانوں کی پیداوار کی صورت میں سامنے آئے گا، لوگوں کے درمیان زیادہ متفرق صورت حال زیادہ متنوع خیالات، سیاسی اور سماجی ذیلی نظام اور مزید رنگا رنگی۔

مہارتوں کا نظام

بدقسمتی سے اعداد و شمار کے حوالے سے یہ ضروری تنوع ہماری زندگیوں میں موجود بیش چناؤ کے مسائل کو گہرا کر دے گا۔ لہٰذا تنوع سے متعلق کسی بھی پروگرام کو مضبوط کوششوں کے ساتھ ہونا چاہیے کہ وہ مہارتوں کے مشترکہ نظام کے ذریعے لوگوں کے درمیان حوالہ جاتی نکات تشکیل دے سکیں، تمام طلبہ کو ایک جیسا کورس نہیں پڑھنا چاہیے، ایک جیسے حقائق قبول نہیں کرنے کرنے چاہئیں، یا ایک جیسے اعداد و شمار کا مجموعہ اکٹھا نہیں کرنا چاہیے، تمام طلبہ کو مختلف نوعیت کی وہ عمومی مہارتیں سیکھنی چاہئیں جو انسانی ابلاغ اور سماجی انضمام کے لیے درکار ہیں۔

اگر ہم بڑھتی ہوئی ناپائیداری، ندرت اور تنوع کے بارے میں قیاس کریں تو ہمیں چند کرداری مہارتوں کی نوعیت سمجھ میں آئے گی۔ مثال کے طور پر ایک مضبوط معاملہ بن سکتا ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے جدید صنعتی معاشروں میں لازماً رہنا ہے انھیں تین مختلف اور اہم شعبوں میں مہارتوں کی ضرورت ہوگی: سیکھنا، تعلق پیدا کرنا اور انتخاب کرنا۔

سیکھنا: مزید تیز رفتاری کے حصول کے بعد ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ معلومات رفتہ رفتہ فنا پذیر حیثیت اختیار کر جائیں گی۔ آج کی ''حقیقت'' کل کی غلط خبر بن جاتی ہے۔ حقائق کے سیکھنے یا اعداد و شمار اکٹھے کرنے میں یہ چیز رکاوٹ کا باعث نہیں...... بات اس سے بعید ہے۔ لیکن ایک ایسا معاشرہ جہاں کوئی فرد متواتر اپنا روزگار تبدیل کرتا ہو، زور دیا جاتا ہے۔ لہٰذا مستقبل سے تعلق رکھنے والے سکولوں کو صرف اعداد و شمار کی تدریس ہی نہیں دینی چاہیے بلکہ اس میں ردوبدل کی تعلیم بھی دینی چاہیے۔ طلبہ کو اس بات کی تعلیم دی جانی چاہیے کہ فرسودہ خیالات کو کیسے رد کیا جاتا ہے اور کب اور کیسے ان کا متبادل تلاش کیا جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ انھیں یہ بات سکھانی چاہیے کہ سیکھا کیسے جائے۔

ابتدائی کمپیوٹروں میں ایک ''میموری'' یا اعداد و شمار کے ایک اضافی بینک کا پروگرام ہوتا تھا جو مشین کی راہنمائی کرتا تھا کہ اعداد و شمار میں ردوبدل کیسے کیا جائے۔ بڑے لیٹ جنریشن کمپیوٹر سسٹم نہ صرف بڑی سطح پر اعداد و شمار اکٹھا کرتے ہیں بلکہ کثیر العناصری پروگرام بھی متعارف کرواتے ہیں تاکہ آپریٹر ان اعداد و شمار کے حوالے سے پروگراموں کی مختلف اقسام کا اطلاق کر سکے۔ ایسے سسٹمز ایک ''ماسٹر پروگرام کا تقاضا کرتے ہیں جو اس کے مقابلے میں مشین کو بتاتے ہیں کہ کس پروگرام کا اطلاق کیا جائے اور کب پروگراموں کو تعداد میں

اضافہ ہو اور ماسٹر پروگرام کے اضافے سے کمپیوٹر کی قوت میں اضافہ ہو۔

انسانی مطابقت پذیری میں اضافے کے لیے بھی اسی قسم کا لائحہ عمل استعمال کیا جا سکتا ہے۔ طلبہ کو اس بات کی راہنمائی کر کے کہ کس طرح سیکھا جائے، نہ سیکھا جائے اور از سرِ نو سیکھا جائے، تعلیم میں ایک نئی اور مضبوط سمت کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

ہیومن ریسورسز ریسرچ آرگنائزیشن (Human Resource Research Organization) سے تعلق رکھنے والے ماہرِ نفسیات ہربرٹ گرجوئے (Herbert Gerjuoy) نے اسے یوں بیان کیا ہے:

''نئے طرزِ تعلیم کو چاہیے کہ وہ فرد کو سکھائے کہ معلومات کی صف بندی اور باز صف بندی کیسی کرنی ہے، اس کی راست گوئی کا اندازہ کیسے کرنا ہے، جب ضروری ہو تو اس کی درجہ بندی کیسے تبدیل کرنی ہے، ٹھوس چیزوں کو تجریدی چیزوں کی طرف اور پھر واپس کیسے آنا ہے، اور مسائل کو ایک نئے رخ سے کیسے دیکھنا ہے...... خود کو تعلیم کیسے دینی ہے۔ آنے والے وقت میں ان پڑھ وہ نہیں ہوگا جو پڑھ نہ سکے؛ بلکہ وہ شخص ہوگا جو یہ نہ سیکھ سکے کہ سیکھنا کیسے ہے۔''

تعلق پیدا کرنا: ہم لوگ یقینی طور پر اس بات میں دقت محسوس کریں گے کہ اگر زندگی کی شرح رفتار تیز سے تیز تر رہی تو انسانی تعلقات کو کیسے استوار کیا جائے اور انھیں کیسے برقرار رکھا جائے۔

لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے غور سے سننے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حقیقی دوستی کی مدد سے کیا جانے والا سادہ سا کاروبار اب ان کے لیے پیچیدگی کی سی صورت اختیار کر گیا ہے۔ مثال کے طور پر جب طلبہ یہ شکایت کرتے ہیں کہ ''لوگ حصہ نہیں لیتے'' تو ان کا مقصد نسلی تقسیم کو عبور کرنا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ان مسائل کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہوتے ہیں جو خود ان کے ساتھ ہیں۔ آج کل کی نوجوان نسل کے ایک مشہور گیت نگار اور شاعر راڈ میکوئن (Rod Mckuen) لکھتے ہیں، ''میں صرف گزشتہ چار دنوں میں ملنے والے نئے لوگوں کو ہی یاد رکھ سکتا ہوں۔''

جب ایک مرتبہ ناپائیداری کے عنصر کو اجنبیت کی وجہ کے طور پر تسلیم کر لیا جائے، تو نوجوانوں کا بظاہر پریشان ہونے والا رویہ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو جنس کو ''کسی کو جاننے'' کا فوری ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جنسی عمل کو ایک ایسی چیز کی حیثیت سے سمجھنے کی بجائے کہ اس کے بعد رشتوں کی تشکیل کا ایک طویل مرحلہ ہے، وہ اسے ایک دوسرے کو سمجھنے کا ایک مختصر اور آسان راستہ سمجھتے ہیں، چاہے ان کا یہ مؤقف

درست ہے یا نہیں۔

دوستی میں تیزی لانے کی یہ خواہش ان کی ''حسیاتی تربیت''، ''ٹی۔گروپنگ''، ''مائیکرولیبز''، یا نام نہاد ''زود حس'' یا عدم فعلی کھیل جیسی نفسیاتی تکنیک سے سحر انگیزی کو بیان کرتی ہے اور اس کے علاوہ عمومی گروہی حرکیات کے مظہر کو بھی وضع کرتی ہے۔ان لوگوں کے طبقے کی صورت میں رہنے کی خواہش بھی ان کے اندر کے موجود احساس تنہائی اور دیگر لوگوں کے ساتھ ''گھلنے ملنے'' کی عدم صلاحیت کی عکاسی کرتی ہے۔

یہ تمام سرگرمیاں شرکاء کو، بغیر طویل تیاری کے، شناسا نفسیاتی ربط سے گزارتی ہیں، جو عموماً پیشگی جان پہچان کے بغیر ہی ہوتا ہے۔بہت سے معاملات میں، اپنی نوعیت کے حوالے سے، تعلقات مختصر مدت کے ہوتے ہیں اور کھیل کا مقصد، صورت حال کی ناپائیداری کے باوجود، قلبی رشتوں کو مضبوط تر بنانا ہوتا ہے۔

اپنی زندگی میں لوگوں کی تیزی سے آمد کے باعث ہم لوگ اعتماد استوار ہونے کے لیے کم وقت ہی دے پاتے ہیں اور دوستی کو مضبوط ہونے کے لیے بھی وقت تھوڑا ہی ہوتا ہے۔لہٰذا ہم ایسی راہیں تلاش کرتے ہیں جو شائستہ قسم کی عوامی ردعمل سے ذراہٹ کر ہو اور جس میں بے تکلفی کا عمل دخل ہو جائے۔

کوئی شخص ان تجرباتی تدابیر کی تاثیر میں شک وشبہ کا اظہار کر سکتا ہے کہ ان کی وجہ سے تشکیک اور تحفظ کا عمل تعطل کا شکار ہو جاتا ہے، لیکن جب تک انسانی نکاسی کی شرح سست روی کا شکار ہے تعلیم، انتہائی گہری دوستی کی کمی کو قبول کرنے میں انسان کی مدد کرتی رہے گی، حتیٰ کہ تنہائی اور عدم اعتمادی کو قبول کرنے میں بھی معاون رہے گی......یا یہ دوستی بنانے کے عمل کو تیز کرنے کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے میں بھی، یقینی طور پر مددگار ہے۔نئے تخیل پر مبنی طلبہ کی گروپنگ کے ذریعے، یا نئے طرز کی طلبہ ورک ٹیموں کی تشکیل کے ذریعے یا مذکورہ بالا تدابیر کی جدتوں کے ذریعے، تعلیم کو ہمیں تعلق بنانے کا ہنر سکھانا ہوگا۔

انتخاب: اگر ہم یہ قیاس بھی کر لیں کہ جدید صنعت کاری کی طرف تبدیلی ان اقسام اور پیچیدگیوں میں اضافہ کر دے گی جن کا سامنا فرد کو کرنا پڑ رہا ہے تو یہ بات بیّن ہو جائے گی کہ تعلیم کو براہِ راست بیش انتخاب کے مسئلہ سے نبرد آزما ہونا چاہیے۔

مطابقت پذیری یکے بعد دیگرے انتخاب کرنے کا دوسرا نام ہے۔بے شمار متبادل چیزوں کی موجودگی میں کوئی بھی فرد کسی ایسی چیز کا انتخاب کرتا ہے جو اس کی اقدار کے مطابق ہو۔جیسے ہی بیش انتخاب کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، وہ شخص جس کی اپنی اقدار پر گرفت نہیں (چاہے وہ جو بھی ہوں) وہ ترقی

کرنے کے حوالے سے ناکارہ ہو جاتا ہے۔تاہم اخلاقیات کا سوال جتنا اہم ہوتا چلا جائے گا، ہمارے موجودہ سکول بھی ان چیزوں پر اپنی دسترس پر کم ہی خواہشمند نظر آئیں گے۔اس بات میں کوئی حیرت نہیں کہ لاکھوں نوجوان لوگ مستقبل کے لیے ڈانول ڈول راستوں پر گامزن ہیں اور وہ کسی بے سمت جانے والے میزائل کی طرح ادھر ادھر اچٹتے پھر رہے ہیں۔

ماقبل صنعتی معاشروں میں جہاں اقدار نسبتاً پائیدار نوعیت کی تھیں وہاں پر بزرگ نسل کا کوئی شخص نوجوان نسل پر اپنی اقدار ٹھونسنے کے حق سے متعلق شکوک وشبہات کم ہی ہیں۔جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے یہ اپنی غرض وغایت اخلاقی اقدار کی تلقین سے اتنا ہی رکھتی ہے جتنا مہارتوں کی ترسیل سے حتیٰ کہ ابتدائی صنعت کاری کے دور میں بھی ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) نے یہ موقف اختیار کیا ''تعلیم کا بنیادی مقصد کردار کی تعمیر ہے''، جس کا آزادانہ مطلب اور مفہوم یہ ہوگا کہ اقدار کے روایتی نظاموں کے حوالے سے نوجوانوں کو بہکانا یا انھیں خوفزدہ کرنا۔

جیسے ہی صنعتی انقلاب کے دھچکے کی لہریں اقدار کی قدیم تشکیلات کو متزلزل کرتی ہیں اور نئی صورت حال نئی اقدار کا تقاضا کرتی ہے، ماہرین تعلیم پسپائی اختیار کر جاتے ہیں۔کلیسائی تعلیم کے ردعمل کے طور پر حقائق کی تعلیم اور ''طالب علم کو خود اپنا ذہن تیار کرنے'' کی مہلت دینا ترقی پر مبنی ایک وصف شمار کیا جاتا تھا۔ثقافتی ربط اور سائنسی غیر جانبداری کے سامنے آنے سے روایتی اقدار پر زور دینے کا سلسلہ بے عمل سا ہو گیا ہے۔تعلیم تعمیر کردار کے مقصد تک محدود ہو گئی ہے مگر ماہرین تعلیم اقدار کی تاکید وتلقین کے خاص نظریے سے روگردان ہو گئے ہیں اور انھوں نے خود کو مغالطے میں گرفتار کر لیا ہے کہ وہ اقدار کے معاملے کا کبھی حصہ تھے ہی نہیں۔

آج یہ بات بہت سے اساتذہ کی شرمندگی کا باعث بنے گی اگر انھیں یہ بتایا جائے کہ طلبہ کے لیے اقدار کی تدریس کا تمام کام مکمل کر لیا گیا ہے، اگر ان کی کتابوں کے ذریعے نہیں تو کم از کم ان کے غیر نصابی سلسلے کے ذریعے......ان کے کلاس میں بیٹھنے کی ترتیب، سکول کی گھنٹی، عمر کے حساب سے تقسیم، سماجی طبقاتی فرق، استاد کا اختیار، اور یہ خاص حقیقت کہ طلبہ اس وقت سکول میں موجود ہیں بجائے معاشرتی طبقے کے۔یہ تمام انتظامات طلبہ کو خاموش پیغامات بھجواتے ہیں جو اس کے رویوں اور وضع کی بہتر تعمیر کرتے ہیں۔تاہم باقاعدہ نصاب بھی ایسے پیش کیا جاتا رہے گا گویا یہ اقدار سے مبرا ہو۔خیالات واقعات اور مظاہر اقدار کے اطلاق سے مبرا ہیں اور اخلاقی حقیقت سے فارغ ہو چکے ہیں۔

تاہم اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ طلبہ کی اس سلسلے میں شاذ ہی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ خود اپنی، اپنے اساتذہ اور اپنے ہم منصب افراد کی اقدار کا تجزیہ کر سکیں۔ لاکھوں افراد اسی تعلیم سے استفادہ کرتے ہوئے فارغ التحصیل ہوتے ہیں لیکن انھیں ایک مرتبہ بھی یہ ترغیب نہیں دی جاتی کہ وہ اپنی اقدار میں موجود تضادات تلاش کرنے کی کوشش کریں، زندگی میں اپنے ہدف اور مقاصد کا گہرائی سے کھوج لگائیں حتیٰ کہ ان مسائل کے بارے میں، بڑے واضح انداز میں، اپنے بزرگوں اور ہم مرتبہ سے تبادلہء خیال کریں۔ طلبہ بڑی عجلت میں ایک کلاس سے دوسری کلاس میں جاتے ہیں۔ اساتذہ اور پروفیسرز پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں اور وہ بتدریج دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ''جماعتی بحث و مباحثے کا دور''...... جس میں جنس، سیاست یا مذہب جیسے موضوعات پر غیر رسمی، غیر نصابی گفتگو ہوتی ہے جو شرکاء کو اپنی اقدار کی پہچان اور اس کی وضاحت میں مدد کرتی ہیں...... ناپائیداری کے فروغ پانے سے بتدریج کم اور غیر مانوس ہوتا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ شمار میں لائی جانے والی کوئی چیز نہیں، جو ایسے افراد تیار کرنے سے متعلق ہو جو اپنے اہداف کے بارے میں غیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہوں، ایسے لوگ جو بیش انتخاب کی موجودگی میں مؤثر فیصلے کرنے کے اہل نہ ہوں۔ جدید ترین صنعتی عہد کے ماہرین تعلیم کو چاہیے کہ وہ طلبہ پر اقدار کا ایک روایتی مجموعہ ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں؛ بلکہ انھیں چاہیے کہ وہ، بڑے منظم انداز میں، رسمی اور غیر رسمی سرگرمیوں کا انعقاد کریں جو طلبہ کی مدد کریں کہ وہ اقدار کو، چاہے وہ کوئی بھی ہوں، واضح کر سکیں، مرتب کر سکیں اور انھیں ٹیسٹ کر سکیں۔ ہمارے سکول صنعتی انسان تیار کرتے رہیں گے تاوقتیکہ ہم نوجوانوں کو وہ مہارتیں اور ہنر نہ سکھائیں جو ان کے اقدار کے نظاموں میں موجود تضادات کی شناخت اور ان کی وضاحت، اگرچہ تجدید تعلقات نہ سہی، کر سکیں۔

آنے والے کل کے نصاب میں نہ صرف اعداد و شمار کی بنیاد پر مبنی کورسوں شامل ہونے چاہئیں بلکہ مستقبل سے منسوب کرداری مہارتوں پر بھی زور دینا چاہیے۔ اس میں حقیقی مواد اور آفاقی تربیت سے متعلق چیزوں کا ملاپ ہونا چاہیے جسے ''زندگی کی ابتدائی شناسائی'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس نصاب کو دو چیزیں کرنے کی راہیں ضرور تلاش کرنی چاہئیں مختلف حالات میں ایک کی ترسیل یا ایسے ماحول کی تشکیل جو دوسرے کو پیدا کرے۔

اس طرح مستقبل سے متعلق قیاس آرائیاں کرنے اور ایسے تنظیمی اور نصابی مقاصد کی تشکیل سے

مستقبل کی کونسلز ایک حقیقی جدید صنعتی تعلیمی نظام کی صورت گری کا کام شروع ہوگا۔ تاہم ایک آخری قدم اٹھانا ابھی باقی ہے۔ کیونکہ مستقبل سے متعلق نظام پر از سر نو توجہ مرکوز کرنا ہی کافی نہیں۔ ہمیں فرد کے وقت کے شمار بندی میں بھی ردو بدل کرنا چاہیے۔

مستقبلیت کا لائحہ عمل

ان کی وفات کے ساڑھے تین سو سال بعد بھی سائنسدان ابھی تک مطابقت پذیری کی نفسیات سے متعلق سروینٹس (Cervantes) کی جامع بصیرت پر شہادتیں تلاش کر رہے ہیں اور وہ ہے: ''جسے پہلے وارننگ ملی وہ پہلے مسلح ہوگیا۔'' یہ بات ہمیں خود عیاں نظر آتی ہے کہ بہت سی صورت حال ایسی ہیں جس میں ہم افراد کو بہتر مطابقت کی سہولیات پیش کر سکتے ہیں اگر ہم انھیں صرف پیشگی معلومات فراہم کر دیں کہ آنے والے وقت میں کیا کچھ ہونے والا ہے۔

خلا بازوں، بے گھر خاندانوں اور صنعتی کارکنان کے ردعمل پر مبنی مطالعے میں سب لوگوں نے یکساں طور پر اس نتیجے کی طرف نشاندہی کی ہے۔ ایک ماہر نفسیات ہگ بوون (Hugh Bowen) لکھتے ہیں، ''پیشگی معلومات کارکردگی میں ڈرامائی تبدیلی لے کر آتی ہیں۔ چاہے مسئلہ کسی رش والی سڑک پر گاڑی چلانے کا ہو، طیارہ اڑانے کا، ذہانت پر مبنی معما حل کرنے کا، وائلن بجانے کا یا ذاتی مسائل حل کرنے کا معاملہ، تمام امور میں کارکردگی اس وقت بہتر ہو جاتی ہے جب فرد کو یہ پتہ ہو کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔

کسی بھی مضمون کے پیشگی مواد کی ذہنی عمل داری قیاسی طور پر مطابقت پذیری کی اصل مدت کے دوران عمل داری کی مقدار اور ردعمل کے وقت میں کمی کر دیتی ہے۔ میرے خیال میں یہ فرائڈ (Freud) ہی تھا جس نے کہا تھا: ''سوچ دراصل عمل کے دہرائے جانے کا نام ہے۔''

تاہم پیشگی معلومات کے کسی خاص حصے سے بھی اہم ترین بات پیش گوئی کی عادت ہے۔ آنے والے وقت میں دیکھ لینے کی یہ مشروط صلاحیت مطابقت پذیری میں کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔ یہ بات شک و شبے سے بالا ہے کہ کامیابی سے مقابلہ کرنے کا کامیاب راز مستقبل سے متعلق فرد کی حسیات ہیں۔ ہم لوگوں کے درمیان موجود وہ افراد جو تبدیلی سے ہم آہنگ رہتے ہیں، بہتر مطابقت کر سکتے ہیں ان کے اندر آنے والے وقت سے متعلق زیادہ اور بہتر نموشدہ حس ہوتی ہے کہ کیا کچھ ہونے والا ہے بہ نسبت ان افراد کے جو تبدیلی کا مقابلہ ڈھیلے انداز سے کرتے ہیں۔ مستقبل سے متعلق پیش گوئی کرنا ان کی ایک عادت بن جاتی ہے۔ شطرنج کا

وہ کھلاڑی جو اپنے مدمقابل کھلاڑی کی چالوں کی پیش بینی کرتا ہے، وہ اعلیٰ افسر جو وسیع پیمانے پر سوچتا ہے، وہ طالب علم جو صفحہ نمبر ایک پڑھنے سے پہلے دستاویز کی فہرست پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیتا ہے، یہ تمام لوگ متوقع طور پر بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

وہ لوگ جو مستقبل پر اپنے خیالات زیادہ مرکوز کرتے ہیں، بہ نسبت زمانہء ماضی اور حال کے، وہ دیگر افراد سے یقینی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ دیگر افراد کے مقابلے میں اپنی ذات کو آگے بڑھانے کے لیے زیادہ وسائل کا استعمال کرتے ہیں.......... بہتر تخیل، تجزیہ اور مستقبل سے متعلق امکانات اور گمان تخمینہ کاری۔ وہ اس بات میں بھی تفریق کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ اپنی شخصیت کو بڑھا کر کہاں تک لے جائیں، کچھ لوگ عادتاً مستقبل میں انتہائی گہرائی سے دیکھتے ہیں جبکہ کچھ لوگ صرف ''پایاب مستقبل'' تک ہی دیکھتے ہیں۔

لہٰذا ہمارے پاس ''مستقبلیت'' کے دو پہلو ہیں..... کتنا اور کتنی دور تک۔ اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ ایک معقول ٹین ایجر میں بلوغت ایک چیز کی ہمراہی میں ہوتی ہے جسے پرنسٹن سے تعلق رکھنے والے ماہر عمرانیات سٹیفن ایل کلینی برگ (Stephen L.Klineberg) نے ''مستقبل بعید کے واقعات میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی'' لینے کا عمل قرار دیا ہے۔ اس بات سے ایک حقیقت سامنے آتی ہے کہ مختلف عمر کے لوگ خصوصیات کے حوالے سے مستقبل پر توجہ کی مختلف مقدار ڈالتے ہیں۔ ان لوگوں کے ''وقت کے افق'' بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے مستقبلیت کے نظریے پر صرف عمر ہی کا اثر نہیں ہوتا۔ ثقافتی حالات بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ثقافتی اثرات میں سب سے اہم ماحول میں ہونے والی تبدیلی کی شرح ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مستقبل کے بارے میں کسی فرد کی حس، مقابلہ کرنے کی صلاحیت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ زندگی کی شرح رفتار جتنی تیز ہوگی، موجودہ ماحول اتنی تیزی سے ہی ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے گا، اور مستقبل کے حوالے سے صلاحیتیں اتنی تیزی سے ہی زمانہء حال کی حقیقتوں میں تبدیل ہوتی رہیں گی۔ جیسے ہی ماحول تیزی سے تبدیل ہوتا چلا جائے ہم لوگ نہ صرف مستقبل کے بارے میں سوچنے کے لیے اپنی ذہنی توانائیاں صرف کرنے کے لیے مجبور کر دیے جاتے ہیں بلکہ وقت کے افق میں بھی تبدیلی لانے کے لیے دباؤ بڑھ جاتا ہے...... تاکہ ہم اپنی جستجو کو آگے سے آگے بڑھائیں۔ کسی بڑی شاہراہ پر 20 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلانے والا ڈرائیور، بڑی آسانی کے ساتھ اس شاہراہ سے نکلنے والی ذیلی سڑک کی طرف اپنی گاڑی

موڑ سکتا ہے۔ باوجود اس بات کے کہ اس موڑ کی طرف اشارہ کرنے والا بورڈ اس موڑ کے قریب ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ڈرائیور جتنی تیز گاڑی چلائے گا موڑ کا اشارہ کرنے والا علامتی بورڈ پڑھنے کے لیے اسے اتنا ہی وقت درکار ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ بورڈ بھی اتنا ہی پیچھے آویزاں کیا جائے۔ اسی طرح زندگی کی عمومی شرح رفتار ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اپنے وقت کے افق میں وسعت پیدا کریں یا واقعات کے ذریعے مغلوب ہونے کے لیے تیار رہیں۔ ماحول میں جتنی تیزی سے تبدیلی آتی چلی جائے گی مستقبلیت کی ضرورت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

یہ بات بھی درست ہے کہ کچھ افراد ایسے ہیں جو مستقبل بعید کے ادوار میں خود کی اتنی گہرائی تک لے جاتے ہیں کہ ان لوگوں کی پیش گوئیاں فراریت پسندی پر مشتمل افسانوں کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ تاہم عمومی طور پر ایسے افراد موجود ہیں جن کی پیش گوئیاں بڑی باریک اور مختصر وسعت کی حامل ہوتی ہیں اور وہ لوگ تبدیلی سے متواتر حیران ہوتے ہیں اور مضطرب ہو جاتے ہیں۔

مطابقت پذیر ایسا نظر آتا ہے جو خود کو آگے بڑھانے کے لیے، صحیح فاصلے کے لیے صحیح وقت کا استعمال کرے، ان متبادل عوامل کا مشاہدہ کرے اور تخمینہ کرے جو کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی ضرورت سے پہلے اس کے سامنے عیاں ہوں اور وہ وقتی فیصلوں کو قبل از وقت ہی کر لے۔

لائیڈ وارنر (Lioyd Warner) جیسے امریکی سماجی سائنسدان اور ایلیٹ جیکوئس (Elliott Jaques) جیسے برطانوی سماجی دانشوروں کے مطالعوں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ انتظامیہ کے فیصلے کرنے کے عمل میں ''وقت'' کے عنصر کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ اسمبلی لائن کے قریب موجود فرد کو ہی وہ کام دیا جائے گا جس کا تقاضا یہ ہوگا کہ وہ، وقت کے حوالے سے، اپنے قریب واقعات سے ہی سروکار رکھے۔

انتظامیہ کے شعبے میں ترقی کرنے والے افراد سے ہی یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ ہر مرتبہ اپنی ترقی کے ساتھ، آنے والے وقت میں پیش آنے والے واقعات تک ہی اپنی توجہ مرکوز رکھیں۔

یونیورسٹی آف ویسٹرن اونٹاریو (Ontario) سے تعلق رکھنے والے ماہر عمرانیات بینجمین ڈی سنگر (Benjamin D.Singer)، جن کا خاص شعبہ سماجی طب نفسی ہے، ذرا آگے تک چلے گئے۔ سنگر کے بقول حالیہ رویے میں مستقبل ایک اہم لیکن بے قدر نوعیت کا کردار ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، وہ دلیل پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی بچے کو خودی 'وہ کیا ہے' سے 'وہ کیا بنتا جا رہا ہے' کے رد عمل کا ایک حصہ ہی ہے۔'' وہ ہدف

جس کی طرف بچہ جا رہا ہے وہ ''مستقبل پر مرکوز کرداری تخیل'' ہے۔ ایک ایسا تصور کہ مستقبل کے مختلف نکات کے حوالے سے وہ ایسا ہونا چاہتا ہے/ چاہتی ہے۔

مسٹر سنگر لکھتے ہیں، ''مستقبل پر مرکوز کرداری تخیل اس نمونہ، زندگی کو منظم کرتا ہوا اور اسے نئے معنی دیتا ہوا نظر آتا ہے کہ جس پر عمل پیرا ہونے کی وہ خواہش کرتا ہے۔ تاہم جہاں کہیں بھی فوری بیان کرتا یا عملی طور پر مستقبل کا غیر وجودی کردار ہوتا ہے تو وہاں رویے سے منسوب عمومی معاشرے کے دیے ہوئے معانی اپنا وجود نہیں رکھتے؛ سکول کا کام اپنی اہمیت کھو دیتا ہے، اور متوسط طبقے کے معاشرے اور ماں باپ سے متعلق اور پر بھی یہی اصول کارفرما ہوتا ہے۔''

اس بات کو نہایت سادگی سے بیان کرتے ہوئے مسٹر سنگر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر فرد اپنے ذہن میں نہ صرف زمانہ حال سے متعلق اپنی ایک تصویر رکھتا ہے، خود خیالی رکھتا ہے بلکہ ان تصاویر کا ایک مجموعہ بھی رکھتا ہے جیسا وہ مستقبل میں بننا چاہتا ہے۔ ''مستقبل کا یہ انسان بچے سے متعلق توجہ مرکوز کرواتا ہے؛ یہ ایک مقناطیس ہے جس کی طرف وہ کھنچا چلا جاتا ہے، زمانہ، حال کے لیے ایک ڈھانچہ جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے اسے مستقبل نے تشکیل دیا ہے۔''

کوئی بھی شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ وہ تعلیم جس کا تعلق فرد کی نشو و نما اور مطابقت پذیری کی ترقی سے ہے وہ اپنی تمام قوت کو بروئے کار لا کر، بچوں کی مدد کرے گی کہ وہ وقت کی مناسب شمار بندی کو تشکیل دیں، مستقبلیت کی مناسب شرح۔ کوئی چیز بھی، خوفناک حد تک، جھوٹ پر مبنی نہیں ہو سکتی۔

مثال کے طور پر اس تضاد کو ہی لے لیں جس ڈگر پر آج کے سکول زمان و مکان کے حوالے سے برتاؤ کرتے ہیں۔ حقیقی طور پر ہر سکول میں موجود ہر طالب علم اس زمان بڑی احتیاط سے اپنی جگہ بنائے ہوئے ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ جغرافیے کا مطالعہ کرے۔ نقشے، چارٹ اور گلوب زماں میں اس کی خاص جگہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ نہ صرف ہم شہر، مذہب یا ملک کی بابت اس کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ ہم یہ بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس زمین کا دیگر شمسی نظام سے، اور کائنات سے مکانی تعلق بھی ظاہر کریں۔

تاہم جب مسئلہ بچے کو ''وقت'' کے زمرے میں رکھنے کا ہو تو ہم ایک ظالم قسم کی اور ناکارہ کر دینے والی تدبیر اپناتے ہیں۔ وہ ممکنہ حد تک اپنی قوم کے اور دنیا کے ماضی میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ قدیم یونان، سلطنت روما، جاگیرداری کے عروج، انقلاب فرانس اور اسی نوعیت کی دیگر چیزوں کا مطالعہ کرتے ہے۔ وہ انجیل مقدس

کے واقعات اور قومی اساطیر سے متعارف ہوتا ہے۔ اس پر لاتعداد جنگی کہانیوں، انقلابات اور شورشوں کی روداد کی بوچھاڑ ہوتی ہے اور ان میں سے ہر کسی کا ماضی میں ایک مخصوص وقت متعین ہوتا ہے۔

کسی نہج پر پہنچ کر اس کا سامنا ''حالیہ واقعات'' سے بھی ہو سکتا ہے۔ اسے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اخبارات کے تراشے لے کر آئے اور کوئی خاص رجحان رکھنے والا استاد اس حد تک جا سکتا ہے کہ وہ اسے کہے کہ ٹیلی وژن پر شام کی خبریں دیکھیں۔ مختصر یہ کہ اسے زمانہ، حال کے بارے میں بڑی باریکی اور تفصیل کے ساتھ بتایا جاتا ہے۔

اور اس کے بعد وقت ساکن ہو جاتا ہے۔ سکول آنے والے وقت کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ پروفیسر اوسپ فلیچ تھیم (Ossip Flechtheim) نے ایک نسل پہلے ہی کہہ دیا تھا، ''جس سال انھیں کسی چیز کے بارے میں تعلیم دی جاتی ہے اسی میں نہ صرف ان کا کورس تبدیل ہو جاتا ہے بلکہ اسی طرح کی صورت حال حکومتی امور، معاشیات، نفسیات اور حیاتیات کے مطالعے میں بھی پائی جاتی ہے''۔ وقت انتہائی طوفانی رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ اور طالب علم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف جا رہا ہے اور مستقبل جسے کلاس روم سے متروک کر دیا گیا ہے اس کے شعور سے بھی محو ہو گیا ہے۔ گویا کہ مستقبل آئے گا ہی نہیں۔

اس کی ''وقت'' سے تعلق رکھنے والی حس کی بیدردانہ تاراجی کی عکاسی کارنل (Cornell) یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف ہیومن ڈویلپمنٹ سے تعلق رکھنے والے ماہر نفسیات پروفیسر جان کونڈری (John condry) کے شاندار تجربے سے ظاہر ہوتی ہے۔ کارنل (Cornell) اور UCLA میں کیے گئے مختلف مطالعوں میں مسٹر کونڈری نے طلبہ کے مختلف گروہوں کو کہانی کا ابتدائی پیراگراف دے دیا۔ اس پیراگراف میں ایک فرضی کردار ''پروفیسر ہوفمین''، اس کی بیگم اور ان کی گود لی گئی دو کورین بچیوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ بچی کو روتا دکھایا گیا ہے اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور چند بچے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ طلبہ سے کہا گیا کہ وہ اس کہانی کو مکمل کریں۔

طلبہ جس چیز کو نہیں جانتے تھے وہ یہ بات تھی کہ انھیں پہلے ہی دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک گروپ کے معاملے میں ابتدائی پیراگراف زمانہ، ماضی میں لکھا گیا تھا۔ کرداروں نے ''سنا''، ''دیکھا'' اور وہ ''بھاگے''۔ طلبہ سے کہا گیا کہ وہ ''بتائیں کہ مسٹر اور مسز ہوفمین نے کیا کچھ کہا اور بچوں نے کیا کہا''۔ دوسرے گروپ کے لیے یہ پیراگراف ''زمانہ، مستقبل'' میں لکھا گیا کہ وہ بتائیں کہ مسٹر اور مسز فمین کیا کریں گے اور بچے

کیا کہیں گے۔'' زمانہ ءفعل کی اس تبدیلی کی وجہ سے دونوں پیراگراف اور اس میں دی گئی ہدایات مختلف تھیں۔

اس تجربے کے نتائج دیر پا تھے۔ ایک گروپ نے انتہائی شاندار اور دلچسپ کہانیاں، ان کا اختتام بیان کیا، انھیں کئی کرداروں سے مزین کیا، نئی صورت حال اور مکالمات کو بڑے تخلیقی انداز میں متعارف کروایا، دوسرے گروپ نے بڑے سطحی اختتام کی عکاسی کی اور ان کا بیان اختصار پر مبنی، غیر حقیقی اور مجبوری کے سے انداز میں لکھا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ماضی تخیل سے بھرپور تھا جبکہ مستقبل خالی تھا۔ پروفیسر کونڈری کہتے ہیں، ''یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ہم زمانہ ماضی کے بارے گفتگو کرنا آسان سمجھتے ہیں بجائے زمانہ ءمستقبل کے۔''

اگر ہمارے بچوں نے تیز رفتار تبدیلی سے مطابقت پذیری اختیار کرنی ہے تو وقت کا یہ انتشار ختم کرنا ہوگا۔ ہم لوگوں کو انھیں آنے والے کل کے امکانات اور ممکنات کے بارے میں احساس دلانا ہوگا۔ مستقبل کے بارے میں ان کی حس میں وسعت لانا ہوگی۔

اس معاشرے میں وقت کا ناطہ جوڑنے والے بے شمار آلات ہیں جو موجودہ نسل کو ماضی سے منسلک کردیتے ہیں۔ زمانہ ءماضی کے بارے میں ہماری حس کی تشکیل و ترقی بزرگ نسل سے ہمارے رابطے، تاریخ کے بارے میں ہمارے علم، فنون، موسیقی، ادب اور گزشتہ عرصے میں، ہم تک پہنچنے والے سائنسی علوم سے منسوب ہے۔ اس کا دائرہ کار ان اشیاء کے ساتھ تعلق سے وسعت لانے کی وجہ سے پھیلتا ہے جو اس کو گھیرے ہوئے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا ماضی کے حوالے سے ایک تعلق ہے، اور ان میں سے ہر ایک ماضی کے ساتھ ہماری پہچان کا ذریعہ فراہم کرتا ہے۔

اس طرح کا ''وقت کا آلہ'' مستقبل کے بارے میں ہماری حسیات میں اضافہ نہیں کرتے۔ ہمارے پاس کوئی اشیا، دوست، رشتہ دار، فنون کے کام، موسیقی یا ادب ایسا نہیں جس کا منبع اور ماخذ مستقبل سے ہو۔ ہمارے پاس، ماضی کے ورثے کی طرح، مستقبل کا کوئی ورثہ نہیں۔

ان تمام چیزوں کے باوجود ایسے طریقے ہیں کہ انسانی ذہن کو آگے اور پیچھے دونوں طرف بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ ہم عوام کی سطح پر مستقبل سے منسوب ایک مضبوط آگہی تشکیل دیں، نہ صرف بک روجرز (Buck Rogers) کے مزاحیہ سلسلے کی طرح، ''Barbarella'' طرز کی فلمیں بنا کر، خلائی سفر یا طبی تحقیق کے کارناموں کے بارے میں مضامین چھاپ کر۔ یہ اس سارے عمل کا حصہ تو ہوسکتا ہے

مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ مستقبل کے سماجی اور ذاتی مضمرات، نہ صرف اس کی تکنیکی خصوصیات پر بڑی گہرائی سے توجہ مرکوز کی جائے۔

اگر اس، معاصرانہ، فرد نے اس زندگی کے مختصر اور لگے بندھے سلسلے کے اندر رہ کر ایک صدی کے برابر تبدیلی کا مقابلہ ہی کرنا ہے تو اسے اپنی کھوپڑی کے اندر مستقبل کے بارے میں انتہائی درست (چاہے مبہم ہی سہی) تخیلات رکھنے ہوں گے۔ قرون وسطیٰ کے لوگ اپنے اذہان میں حیات بعد الموت کا ایک تخیل رکھتے تھے جس میں جنت اور جہنم کی مکمل عکس بندی ہوتی تھی۔ اب ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے پاس اس بات کے شاندار اور عدم مافوق الفطرت تصورات ہوں کہ عارضی زندگی کس طرح کی ہوگی اور مستقبل کی اس تیز رفتار دوڑ میں اس کی آواز کیا ہوگی، خوشبو اور ذائقہ کیا ہوگا اور اس کی حسیات کیا ہوں گی۔

اس طرح کے تخیلات کو تشکیل دینے کے لیے اور مستقبل کے دھچکے کے اثرات کو کم کرنے کے لیے ہمیں مستقبل سے متعلق قیاس آرائیوں کو ترتیب وار وضع کرنا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ ہم ''کرسٹل بال'' کے ذریعے (مستقبل کا) نظارہ کریں، ہمیں چاہیے کہ ہم لوگوں کی حوصلہ افزائی کریں اور واقعات کو بچپن سے لے کر آگے تک بڑھائیں، آزادانہ قیاس آرائی کریں، حتیٰ کہ بڑے شاندار، نہ صرف اس حوالے سے کہ آنے والا ہفتہ (Weekend) ان کے لیے کیا لیے ہوئے ہے بلکہ آنے والی نئی نسل، نوع انسانی کے لیے کیا لیے ہوئے ہے۔ ہم اپنے بچوں کو تاریخی کورسز متعارف کرواسکتے ہیں؛ کیوں نہ ''مستقبل'' کے حوالے سے کورسز متعارف کروائے جائیں جس میں مستقبل کے بارے میں ممکنات اور امکانات کو بڑی ترتیب کے ساتھ وضع کیا جائے، بالکل ایسے ہی جیسے آج کے عہد میں بیٹھ کر رومنز (Romans) کا سماجی نظام یا جاگیردارانہ نظام کے بارے میں تجزیہ پیش کرتے ہیں؟

یورپ سے تعلق رکھنے والے ایک مستقبل بین فلسفی رابرٹ جنک (Robert Jungk) نے کہا:

''آج کل کے عہد میں صرف اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ کیا کچھ ہوا اور کیا ہوتا رہا۔ آنے والے وقت میں تمام لیکچرز اور مشقوں کے ایک تہائی کو سائنسی، تکنیکی، فنکارانہ اور فلسفیانہ نوعیت کے جاری کاموں سے سروکار ہونا چاہیے، اور مستقبل سے تعلق رکھنے والے بحرانوں اور ان چیلنجوں کے ممکنہ (مستقبل کے) حل سے متعلق کا ادب نہیں ہوگا، لیکن ہمارے پاس مستقبل سے منسوب ادب ہوگا جس کا تعلق نہ صرف خیالی دنیاؤں سے ہوگا بلکہ معاصرانہ سائنسی افسانوی دنیا سے ہوگا۔ سائنسی افسانے ادب کی دنیا میں معیار کے اعتبار سے کمتر سمجھے جاتے

ہیں اور شاید اس تنقید کے وہ روادار بھی ہیں۔ لیکن اگر ہم اسے مستقبل کی عمرانیات کے حوالے سے دیکھیں، بجائے ادب کے نقطۂ نظر سے، سائنسی افسانوی ادب میں پیش بینی کرنے کی عادت کی تعمیر کے لیے، ذہنی وسعت کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ ہمارے بچے آرتھر سی کلارک(Arthur C.Clarke)، ولیئم ٹین (William Tenn)، رابرٹ ہین لین(Robert Heinlein)، رے بریڈ بری(Ray Bradbury) اور رابرٹ شیکلے (Robert Sheckley) کو اس لیے نہیں پڑھیں گے کہ یہ مصنفین انھیں راکٹ شپس (Rocket Ships) اور ٹائم مشینوں سے متعلق معلومات فراہم کر سکتے ہیں بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ لوگ سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور اخلاقی نوعیت کے ان معاملات کے جنگل میں نوجوان اذہان کی پر تخیل جستجو میں رہنمائی کر سکتے ہیں جوان بچوں کی بلوغت کے وقت سامنے آئیں گے۔ مستقبل I (Future 1) کے لیے سائنسی افسانوی ادب کے مطالعے کی ضرورت ہوگی۔

لیکن طلبہ کو صرف مطالعہ ہی نہیں کرنا چاہیے۔ مستقبل کے ممکنات و امکانات سے متعلق نوجوان افراد اور بالغوں کو معلومات دینے کے لیے بہت سی کھیلیں تیار کی گئی ہیں۔ کیسر ایلومنیئم اینڈ کیمیکل کارپوریشن (Kaiser Aluminum and Chemical Corporation) نے اپنے قیام کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر مستقبل سے تعلق رکھنے سماجی متبادلات کھلاڑیوں میں متعارف کروائے اور ان کھلاڑیوں کو مجبور کیا کہ وہ ان پسندیدہ کھیلوں کا انتخاب کریں۔ اس چیز سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ ٹیکنالوجی اور سماجی واقعات کس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں، کھلاڑیوں کی کس طرح مدد کرتے ہیں کہ وہ ایسی ممکنہ صورتوں میں سوچیں، مختلف جدتوں کے ساتھ، کہ جو فیصلہ کرنے کے عمل میں اقدار کی وضاحت اور اہمیت میں ان کی مددگار ہوں۔ کارنیل یونیورسٹی، کے Department of Design and Environmental Analysis کے پروفیسر Jose Villegas نے طلبہ کے ایک گروہ کی مدد سے ایسی کھیلیں متعارف کروائی ہیں جو مستقبل میں گھریلو اور طبقاتی سرگرمیوں سے متعلق ہیں۔ انہی کی نگرانی میں تیار ہونے والے ایک اور کھیل میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ آنے والے وقت میں تیکنالوجی اور اقدار کا ملاپ کیسے ہوگا۔

چھوٹے بچوں کے ساتھ دیگر مشقیں کرنا ممکن ہے۔ کسی فرد کے مستقبل کے بارے میں کرداری تخیل میں اضافے کے لیے طلبہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ''مستقبل کی خودنوشت'' لکھیں جس میں وہ پانچ دس یا بیس سال بعد کے ذاتی حالات و واقعات قلمبند کریں۔ ان لوگوں کو کمرۂ جماعت کے بحث و مباحثے تک

محدود کر کے، ان لوگوں میں موجود مختلف قیاسوں کا موازنہ کر کے، بچے کے ذاتی تعارف کے حوالے سے موجود تضادات کی شناخت ہو سکتی ہے اور ان کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب خودی چھوٹی چھوٹی ذیلی خودیوں میں تقسیم ہوتی ہے کسی فرد کے تسلسل کی غرض سے یہ تدبیر استعمال میں لائی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر 15 سال کے بچوں کو وہ خودنوشت دکھائیں جو انھوں نے بارہ سال کی عمر میں خود تحریر کی تھیں تو وہ محسوس کر سکیں گے کہ مستقبل کے تخیلات کے حوالے سے ان کے اندر کتنی پختگی آچکی ہے۔ انھیں یہ بات سمجھنے میں بھی مدد مل سکتی ہے کہ کس طرح ان کی اقدار، صلاحیتوں، مہارتوں اور علم نے ان کی تمام ممکنات کی تشکیل کی ہے۔

طلبہ سے اگر کہا جائے کہ وہ آنے والے سالوں کے بارے میں ذرا تصور کریں، تو انھیں اس بات کا ادراک ہو جائے گا کہ ان کے بھائی، والدین اور دوست بھی بوڑھے ہو جائیں گے اور ان سے یہ بھی کہا جائے کہ وہ اپنی زندگیوں میں ''وہ اہم چیز'' تلاش کریں کہ جو مستقبل میں ان کی اپنی شخصیت کا حصہ ہوگی۔

اس طرح کی مشقیں جو ممکنات کے مطالعے اور پیش گوئی کے سادہ طریقوں سے جڑیں انھیں کسی کی ذاتی زندگی سے جوڑا جا سکتا ہے، وہ مستقبل کے بارے میں انفرادی نظریے کی خاکہ کشی کر سکتے ہیں اور اس میں جدت لا سکتے ہیں چاہے وہ نظریہ ذاتی نوعیت کا ہو یا سماجی نوعیت کا۔ وہ وقت کی انفرادی شمار بندی کر سکتے ہیں، آنے والے وقت سے متعلق ایسی نئی حساسیت بھی تشکیل دیتے ہیں جو زمانۂ حال کی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

انتہائی مطابقت پذیر افراد، ایسے مرد و خواتین جو حقیقی معنوں میں جیتے جاگتے لوگ ہیں اور اپنے وقت اور زمانے کے حوالے سے اثر پذیر ہیں، مستقبل کے لیے ایک عملی ''یاد ایام'' ہے۔ نہ صرف آنے والے وقت کی زوردار دہشتوں کی غیر ناقدانہ قبولیت سے، اپنی ہی غرض و غایت کے لیے تبدیلی کے اعتقاد کے ساتھ، بلکہ ایک چھا جانے والا تجسس، یہ جاننے کی کوشش کہ آنے والے وقت میں کیا ہونے والا ہے۔

یہ کوشش عجیب و غریب اور حیران کن چیزیں کرتی ہے۔ سردیوں کی ایک رات میں نے ایک متحرک اور کپکپاتے ہوئے شخص کو سیمینار روم میں بھاگتے دیکھا، جب سفید بالوں والے ایک شخص نے اجنبیوں کے ایک گروہ کو بتایا کہ اس شخص کو جو چیز کھینچ کر اس کلاس میں لائی ہے وہ ''مستقبل کی عمرانیات'' ہے۔ اس گروپ میں کارپوریٹ نوعیت کی طویل المدت منصوبہ سازی کرنے والے، بڑی تعداد شامل تھے۔ ہر شریک نے اس

اجلاس میں شمولیت کی وجہ بتائی بالآخر اس چھوٹے قد اور جسامت کے حامل اس شخص کی باری آئی جو ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس شخص نے شکستہ لیکن اچھے الفاظ پر مشتمل انگریزی میں بتایا: ''میرا نام چارلس سٹین ہے، میں ساری زندگی سلائی کڑاہی کا کام کرتا رہا ہوں، میری عمر 77 سال ہے، اب میں وہ کچھ سیکھنا چاہتا ہوں جو میں ساری زندگی، خصوصاً اپنی جوانی میں نہیں سیکھ سکا۔ میں مستقبل کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، میں ایک پڑھے لکھے شخص کی حیثیت سے مرنا چاہتا ہوں!''

اس سادہ سے اعتراف کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کی جانے والی خاموشی اب بھی ان لوگوں کے کانوں میں باقی ہے جو وہاں موجود تھے۔ اس شخص کے شاندار بیان کے سامنے یونیورسٹیوں ڈگریوں کا ''اسلحہ''، کارپوریٹ القابات اور باوقار ''عہدے'' ہیچ دکھائی دیے۔ میرا خیال ہے کہ مسٹر سٹین اب بھی حیات ہیں، مستقبل سے محظوظ ہو رہے ہیں، اور جو کچھ انھوں نے اس رات سکھایا اب بھی دوسروں کو سکھا رہے ہیں۔

جب مستقبل کے بارے میں لاکھوں افراد اس جیسا جذبہ رکھیں تو ہم ایک معاشرے کے حامل ہو جائیں گے جو تبدیلی کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے بہتر طریقے سے لیس ہو جائے۔ تعلیم کی اہم ترین ذمے داری اسی قسم کا تجسس اور شعور پیدا کرنا ہے۔ سکولوں میں جدید ترین صنعتی انقلاب کا تیسرا اور، شاید سب سے اہم مقصد اسی قسم کا تجسس بیدار کرنا ہے۔

تعلیم کو مستقبل کی گردانِ فعل میں ہونا چاہیے۔

☆☆☆

انیسواں باب

ٹیکنالوجی کو مانوس کرنا

مستقبل کے صدمے...... تبدیلی سے پیدا ہونے والا عارضہ...... کا علاج ممکن ہے۔ لیکن اس کے لیے بڑے اور مضبوط پیمانے پر سماجی اور سیاسی اقدامات کی ضرورت ہوگی۔ اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ افراد اپنی زندگیوں کی شرح رفتار کو کیسے سیٹ کرتے ہیں، اس سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ ہم انھیں کون سے نفسیاتی سہاروں کی پیشکش کرتے ہیں، اس سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ ہم تعلیم میں تبدیلی کیسے لے کر آتے ہیں، مجموعی طور پر یہ معاشرہ ایک چکی کی طرح چلتا رہے گا جب تک ہم خود اس تیز رفتار دھکے پر قابو نہ پا لیں۔

تبدیلی کے عمل کی یہ سمتی رفتار بہت سے عوامل کے ذریعے جانی جا سکتی ہے۔ آبادی میں اضافہ، شہر کاری، نوجوانوں اور بوڑھوں کی شرح میں تبدیلیاں...... تمام کی تمام اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ تاہم ٹیکنالوجی کی ترقی، ممکنات کے نیٹ ورک کو متحرک کرتا ہے۔ لہٰذا بڑے پیمانے پر مستقبل کے صدمے کے تدارک اور اس کی جنگ میں ٹیکنالوجی کی ترقی میں شعوری باقاعدگی کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔

ہم لوگ ٹیکنالوجی کی ترقی کے عمل کو ختم نہیں کر سکتے اور نہ ہی ایسا کرنا چاہیے۔ صرف رومانویت کا شکار، احمق قسم کے لوگ ہی ''فطرت کی طرف لوٹ آنے'' کی خیالی باتیں کرتے ہیں۔ فطری حالت وہ ہوتی ہے جس میں معصوم بچے ابتدائی طبی سہولیات کے فقدان کی وجہ سے مر جاتے ہیں اور پھر موت کی وادی میں چلے جاتے ہیں، جس میں ناکامی خوراک انسانی ذہن کو مفلوج کر دیتی ہے، جس میں بقول مسٹر ہوبز (Hobbes) ''روایتی زندگی ''غربت و افلاس کا شکار، آلودہ، حیوانی نوعیت کی اور مختصر ہوتی ہے''۔ ٹیکنالوجی سے منہ موڑنا نہ صرف حماقت پر مبنی ہوگا بلکہ غیر انسانی بھی ہوگا۔ اس صورت حال میں جب انسانوں کی اکثریت عملاً بارھویں صدی میں رہ رہی ہے، ہم کون ہوتے ہیں جو معاشی ترقی کے اس منبع کو پرے پھینکنے پر غور و خوض کر رہے ہیں؟ وہ لوگ جو چند ''انسانی اقدار'' کے نام پر ٹیکنالوجی مخالف، احمقانہ گفتگو کرتے ہیں ان سے پوچھے جانے کی ضرورت ہے، ''کون سے انسان''؟ گھڑی کو دیدہ دانستہ الٹا گھمانے کا مطلب ہے کہ ہم لاکھوں انسانوں کو مجبور

محض بنا دیں اور انھیں دائمی مسائل کا شکار کر دیں، خاص اس لمحے پر جب ان کی آزادی کا امکان پیدا ہو رہا ہے۔ ہمیں اب کم مقدار میں نہیں بلکہ بڑے پیمانے پر آزادی کی ضرورت ہے۔

عین اسی وقت یہ بات بھی، بلاشک وشبہ درست ہے کہ ہم کبھی کبھار نئی ٹیکنالوجی کا اطلاق احمقانہ اور خود غرضانہ انداز میں کرتے ہیں۔ ٹیکنالوجی سے فوری معاشی مفاد اٹھانے کی جلدی میں ہم نے اپنے ماحول کو ایک جسمانی اور سماجی تو بکس (Tinderbox) میں تبدیل کر دیا ہے۔

نفوذ کی تیزی، ٹیکنالوجی کی ترقی کا خود...... تقویتی کردار، جس کے ذریعے جدید طرز کی سہولیات نہ صرف ایک بلکہ کئی اضافی اقدامات، ٹیکنالوجی اور سماجی انتظامات کے درمیان دیرینہ تعلق...... یہ تمام چیزیں مل کر ایک نفسیاتی آلودگی پیدا کر دیتے ہیں، بظاہر نہ رکنے والی، زندگی کی شرح رفتار۔

اس نفسیاتی آلودگی کا موازنہ اس صنعتی آلودگی سے کیا جا سکتا ہے جو سمندروں اور فضاؤں میں موجود ہوتی ہے۔ کیڑے مار اور جڑی بوٹیوں مار ادویات ہماری غذاؤں میں شامل ہوتی ہے۔ بوسیدہ کاروں کے ٹیڑھے میڑھے ڈھانچے، المونیئم کی خالی ٹن، ناقابلِ واپسی گلاس کی بوتلیں، اور مصنوعی پلاسٹک کی اشیا ہمارے کچن میں موجود ہوتی ہیں اور، چورا اور ریزے گلنے سڑنے کے عمل میں حائل ہیں۔ ہم لوگوں نے یہ جاننے کی شروعات بھی نہیں کی کہ ان تابکاری سے بھرپور فضلات کے ساتھ کیا کیا جائے۔ انھیں زمین میں دفن کر دیا جائے، انھیں فضا میں پھینک دیا جائے، یا سمندروں میں بہا دیا جائے۔

ٹیکنالوجی کے حوالے سے ہماری قوت میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن ذیلی اثرات اور توانائی کے خطرات میں بھی وسعت آ گئی ہے۔ ہمیں سمندروں کی حراری آلودگی کا خطرہ بھی ہے، ان کی بیش حرارت کا خطرہ، سمندری حیات کی بڑی مقدار کی تباہی کا خطرہ، شاید قطبین میں موجود برفانی تودوں کے پگھلنے کا خدشہ۔ زمین پر ہم نے ٹیکنالوجی سے بھرپور چھوٹے شہری جزیروں پر لوگوں کی اتنی بڑی تعداد آباد کر دی ہے کہ ہمیں یہ خدشہ لاحق ہو گیا ہے کہ ہم فضا میں موجود آکسیجن کو اتنی تیزی سے استعمال کر دیں گے کہ موجودہ شہروں کے مقامات پر نئے صحراؤں کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ قدرتی ماحولیات کے اس طرح انتشار سے، ہم لوگ، ماہر حیاتیات بیری کومنر (Berry Commoner) کے الفاظ میں، ''انسانی آبادکاری کے لیے سازگار اس سیارے کو تباہ کر دینے کے درپے ہیں۔''

ٹیکنالوجی کی پس زنی

جیسے ہی غیر ذمہ دارانہ طریقہ سے اطلاق شدہ ٹیکنالوجی کے شواہد سامنے آتے ہیں ایک سیاسی پس زنی سامنے آ جاتی ہے۔ ساحل سمندر پر ہونے والے ایک حادثے کی وجہ سے بحرالکاہل کا 800 مربع میل کا علاقہ آلودہ ہوا اور اس سے پورے امریکہ میں غیظ وغضب کی لہر دوڑ گئی تھی۔ نیواڈا (Nevada) میں ایک کھرب پتی صنعت کار ہووارڈ ہگز (Howard Hughes) نے اٹامک انرجی کمیشن کو زیر زمین نیوکلیائی ٹیسٹ سے باز رکھنے کے لیے قانونی چارہ جوئی کی تیاری کی ہے۔ سیٹل (Seattle) میں بوئنگ کمپنی کو سپر سانک جیٹ ٹرانسپورٹ کے منصوبے کے خلاف عوامی مزاحمت کا سامنا ہے۔ واشنگٹن میزائل پالیسی کے از سرنو جائزے کو عوامی تنقید کا نشانہ بنا دیا گیا ہے۔ وسکونسن، کارنیل (Winconsin,Cornell) اور دیگر یونیورسٹیوں میں سائنسدانوں نے اس وقت اپنی ٹیسٹ ٹیوبز اور سلائیڈز ایک طرف رکھ دیں جب انھوں نے اپنے تجربات کے سماجی مضمرات کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک ''تحقیقی مہلت'' کا اہتمام کیا۔ ماحولیاتی آلودگی سے متعلق شعور بیدار کرنے کے لیے بیداری مہم کا آغاز کیا جبکہ صدر محترم نے اسی موضوع سے متعلق آگہی کے لیے قوم کو لیکچر دیے۔ برطانیہ، فرانس اور دیگر ممالک میں ٹیکنالوجی سے متعلق سوچ بچار کے لیے کورسز کا اضافی اہتمام کیا گیا ہے۔

یہاں پر ہمیں بین الاقوامی بغاوت کے وہ شواہد نظر آ رہے ہیں جو آنے والی دہائیوں میں پارلیمان اور کانگریسوں کو ہلا دیں گے۔ غیر ذمے دارانہ طریقے سے استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی کے خلاف ہونے والا یہ احتجاج بڑے مریضانہ طریقے سے صورت حال کو واضح کر دیتا ہے...... مستقبل کے عارضے سے متعلق فاشزم جس میں قیدی کیمپوں میں یہودیوں کی جگہ سائنس دان موجود ہوتے ہیں۔ بیمار معاشروں کو قربانی کے بکروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے ہی تبدیلی کے دباؤ بڑی شدت کے ساتھ کسی فرد سے ٹکراتے ہیں اور مستقبل کے دھچکے کا رواج بڑھتا چلا جاتا ہے، یہ بھیانک قسم کی پیداوار قرین قیاس صورت اختیار کر جاتی ہے۔ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ پیرس میں احتجاج کرنے والے طلبہ کی جانب سے دیوار پر ایک نعرہ لکھا گیا جو یہ تھا ''تمام ٹیکنوکریٹس کے لیے موت!''

تاہم ٹیکنالوجی پر کنٹرول کے لیے عالمی سطح پر چلنے والی ابتدائی تحریک کو غیر ذمے دار قسم کے تکنیک بیزار قسم کے لوگوں، لاوجودیت کے قائل افراد اور روسو کے حامی رومانیت پسند لوگوں کے ہاتھوں

نہیں چڑھنا چاہیے............... کیونکہ ٹیکنالوجی کے بڑھنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اسے مشینی صنعت کاری کے مخالف ہیجان کے ذریعے نہیں روکا جا سکتا۔ تاہم اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کو روکنے کی عاقبت نااندیش کوششیں ایسے نتائج سامنے لے کر آئیں گی جو ایسے ہی تباہ کن ہوں گے جیسے اس کو بڑھانے کی عاقبت نااندیش کوششیں۔

ان دہرے قسم کے مسائل کا شکار ہوتے ہوئے ہمیں بڑی شدت کے ساتھ ذمے دارانہ قسم کی ٹیکنالوجی کی تحریک کی ضرورت ہے۔ ہمیں وسیع پیمانے پر سیاسی گروپنگ کی ضرورت ہے جو منطقی طور پر مزید سائنسی تحقیق اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا عزم لیے ہو...... لیکن صرف چند مخصوص بنیادوں پر۔ ''مشین'' پر تنقید کے کے اپنی توانائیاں صرف کرنے کی بجائے یا خلائی پروگرام پر منفی تنقید کرنے کی بجائے اسے مستقبل کے بارے میں مثبت ٹیکنالوجی کے اہداف کا مجموعہ تشکیل دیں۔

اس طرح کے اہداف، اگر مفصل اور بہترین طریقے سے بنے ہوئے ہیں، یہ ایسے شعبے کو ترتیب دے سکتے ہیں جو ابھی مکمل غارت گری کا شکار ہیں۔ اطالوی ماہر معاشیات اور صنعت کار اوریلو پیسی (Aurelio Peccei) کے مطابق 1980ء تک امریکہ اور یورپ میں مشترکہ تحقیقی اور ترقیاتی اخراجات 73 بلین فی سال تک چلے جائیں گے۔ اکراجات کی اس شرح میں ٹریلین ڈالر کی ایک تہائی کے حساب سے فی دس سال اضافہ ہوگا۔ اتنے بڑے اخراجات کی موجودگی میں کوئی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی کے حوالے سے، بڑی احتیاط کے ساتھ منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے، اس کا تعلق بڑے سماجی اہداف تک اس کا ناطہ جوڑ سکتے ہیں اور ایک کڑے احتساب کا تقاضا بھی کر سکتے ہیں۔ کسی بھی چیز کا اس سے زیادہ غلط اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

ایک سائنسدان اور مصنف رالف لیپ (Ralph Lapp) کہتے ہیں، ''کوئی بھی شخص...... حتیٰ کہ ذہین ترین زندہ سائنسدانوں میں سے بھی کوئی نہیں...... یہ نہیں جانتا کہ سائنس ہمیں کہاں لے کر جا رہی ہے، ہم ایک ایسی ٹرین میں سوار ہیں جو اپنی رفتار تیز کر رہی ہے، ایک ایسے ٹریک پر رواں دواں ہے جس پر بے شمار بٹن، انجانی منزلوں کی طرف گامزن ہیں۔ گاڑی کے انجن میں کوئی بھی سائنسدان موجود نہیں ہے اور ان بٹنوں پر بھوت براجمان ہیں۔ اور معاشرے میں سے اکثر لوگ گاڑی کے آخری ڈبے میں ہیں اور پیچھے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔''

یہ بات بھی ناقابلِ یقین نظر آتی ہے کہ جب آرگنائزیشن فار اکنامک کوآپریشن اینڈ ڈویلپمنٹ (Organization for Economic Cooperation and Development) نے امریکہ پر اپنی مفصل رپورٹ شائع کی تو اس کے ایک مصنف، بیلجیم کے سابقہ وزیراعظم نے اقرار کیا: ''ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھے...... جو وہاں موجود ہی نہیں تھی: ایک سائنسی پالیسی۔'' کمیٹی اس کے علاوہ بھی کچھ کڑی صورت حال کی طرف دیکھ سکتی تھی، کامیابی کی کم شرح کے ساتھ، کسی ایسی چیز کی طرف جو کسی شعوری ٹیکنالوجیکل پالیسی کے مشابہ ہو۔

انقلاب پسند لوگ اکثر ''حکمران طبقے'' یا ''حاکمہ'' یا محض ''ان'' پر تنقید کرتے ہیں کہ انھوں نے معاشرے کو ایسے طریقے سے کنٹرول کیا ہوا ہے جو عوامی مفاد کے مخالف ہے۔ اس طرح کی الزام تراشیاں وقتی موقع کی مناسبت سے ہو سکتی ہیں۔ تاہم آج ہمیں نسبتاً زیادہ خوفناک حقیقت کا سامنا: بہت سے سماجی مسائل جابرانہ کنٹرول کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ جابرانہ کنٹرول کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہیں۔ ایک بھیانک سچ یہ ہے کہ جہاں تک بیشتر ٹیکنالوجی کا تعلق ہے، ہم کسی ایک چیز کو مستوجب ٹھہرا سکتے۔

ثقافتی ڈھنگ کا چناؤ

جب تک کوئی صنعتی ملک غربت کا شکار رہتا ہے وہ ہر کسی تکنیکی جدت کو، بغیر کسی دلیل کے، خوش دلی سے قبول کرتا ہے جو معاشی پیداوار میں اضافے یا مادی خوشحالی کا باعث ہو۔ دراصل یہ ایک مسلمہ ٹیکنالوجی پالیسی ہے اور یہ تیز معاشی نشوونما کے لیے کارفرما ہو سکتی ہے۔ تاہم یہ یکسر بھونڈی پالیسی ہے اور اس کے نتیجے میں تمام کی تمام نئی مشینیں اور ان سے متعلق تمام تر مراحل، اپنے ثانوی یا دوررس اثرات کا لحاظ کیے بغیر معاشرے میں پھیل جاتی ہیں۔

جب ایک مرتبہ معاشرہ جدید ترین صنعت کاری کی راہ پر چلنا شروع کر دے تو یہ ''کسی بھی چیز کے نفوذ'' کی پالیسی مکمل طور پر بڑے خطرناک طریقے سے ناقص پڑ جاتی۔ ٹیکنالوجی کی بڑھتی ہوئی قوت اور پیش منظر کے حقِ انتخاب میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی دستیاب مال، ثقافتی پیداوار، خدمات، ذیلی مسالک اور نئے طرز زندگی کی موجودگی میں بیش انتخاب میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ عین اسی وقت بیش انتخاب خود ٹیکنالوجی کی تصویر کشی بھی کرتی ہے۔

بڑھتے ہوئے تنوع کی حامل جدتیں معاشرے کے سامنے آ جاتی ہیں اور انتخاب کے مسائل زیادہ

سے زیادہ شدت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ روایتی اور سادہ پالیسی جس کے ذریعے قلیل المدت معاشی مفاد پر مبنی انتخاب کیا جاتا ہے وہ خطرناک، پریشان کن اور عدم استحکام کا شکار نظر آتی ہے۔

آج کے دور میں ہمیں ٹیکنالوجی میں چناؤ کے لیے بڑے گنجلک قسم کے معیار کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایسی معیاری پالیسیوں کی ضرورت ہے جو نہ صرف تدارک پذیر آفتوں کو روک سکیں بلکہ آنے والے وقت کے لیے مواقع دریافت کر سکیں۔ ٹیکنالوجی کے بیش انتخاب کا پہلی مرتبہ سامنا کرنے کی وجہ سے معاشرے کو اپنی مشینیں گروپوں اور اکٹھی تعداد کی صورت اکٹھی کرنی چاہئیں بجائے یہ کہ ایک ہی مرتبہ ایسے کر لیا جائے۔ اسے اپنا طریقہ کار ایسے ہی چننا چاہیے جیسے کوئی فرد اپنا طرز زندگی چنتا ہے۔ اسے مستقبل کے بارے میں اعلیٰ ترین فیصلے کرنے چاہئیں۔

مزید یہ کہ جس طرح کوئی فرد متبادل طرز زندگی سے متعلق شعوری انتخاب کا حق استعمال کرتا ہے، اسی طرح آج کے معاشرے کو مختلف طرز ثقافت میں سے کسی ایک کو شعوری طور پر چننا ہے۔ یہ تاریخ میں ایک نئی حقیقت ہے۔ ماضی میں ثقافت بغیر کسی پیش بندی کے سامنے آتی تھی۔ آج، پہلی مرتبہ، اس عمل کو ہم شعور کے ذریعے طے کر سکتے ہیں۔ شعوری ٹیکنالوجی پالیسی کے اطلاق سے...... باقی تمام انتظامات کے ساتھ ساتھ...... ہم لوگ آنے والے وقت کی ثقافت کی خاکہ کشی کر سکتے ہیں۔

کتاب ''The Year 2000'' کے مصنفین ہرمن کاہن (Herman Kahn) اور انتھونی ویز (Anthony Wiener) نے ایک سو تکنیکی جدتوں کی فہرست پیش کی ہے ''جو بیسویں صدی کی آخری تہائی میں استعمال ہوں گی۔'' ان میں لیزر سے لے کر نئے مادوں، طاقت کے نئے ذرائع، فضا میں اڑنے والی سمندر گاڑیاں، سہ طرفہ تصویر کشی اور طبی مقاصد کے لیے ''انسانی شتویت'' سمیت تمام چیزیں شامل ہیں۔ اسی طرح کی فہرستیں اور جگہ بھی پائی جا سکتی ہیں۔ ذرائع نقل و حمل میں، ذرائع ابلاغ میں، قابلِ فہم یا ناقابلِ فہم شعبوں میں، ہمیں جدت کی غرقابی کا سامنا ہے۔ اس کے تسلسل میں، انتخاب کی پیچیدگیاں لرزاں ہیں۔

اس کا بہتر اظہار نئی ایجادات یا دریافتوں سے ہوتا ہے جس کا براہ راست تعلق انسان کی مطابقت پذیری کے معاملے سے ہے۔ اسی قسم کا ایک مسئلہ نام نہاد Oliver (اولیور) کا ہے جس کی تشکیل کے لیے بہت سے کمپیوٹر ماہرین کوششیں کر رہے ہیں تاکہ ہم فیصلہ کرنے میں بیش باری کے مسئلے سے نبرد آزما ہو سکیں۔ اپنی سادہ ترین شکل میں "OLIVER" ایک پرسنل کمپیوٹر ہوگا جس کا مقصد کسی فرد کو معلومات فراہم کرنا اور

اس لیے چھوٹے فیصلے کرنا ہے۔ اس نہج پر پہنچ کر وہ اپنے دوست کی ترجیحات سے متعلق معلومات محفوظ رکھ سکتا ہے کہ اسے مینہٹن پسند ہے یا مارٹینی (Martini) ٹریفک کے راستوں سے متعلق معلومات، موسم، سٹاک، قیمتیں وغیرہ۔ یہ آلہ اس شخص کی بیگم کی سالگرہ یاد رکھنے کے لیے استعمال ہو سکتا ہے...... یا پچلوں کی، خودکار طریقے سے، خریداری کے لیے یہ اس شخص کے لیے کسی جریدے کی ماہواری خریداری کو بھی تازہ کر سکتا ہے، بروقت کرایہ ادا کر سکتا ہے، ریزر بلیڈ کے لیے آرڈر دے سکتا ہے اور اسی طرح کے کام جیسے ہی کمپیوٹرائزڈ معلوماتی نظام پھیلتا چلا جاتا ہے تو اس کا دائرہ کار عالمی سطح پر لائبریریوں، کارپوریٹ فائلوں، ہسپتالوں، پرچون سٹوروں، بینکوں، حکومتی ایجنسیوں اور یونیورسٹیوں کے اعداد و شمار تک وسیع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا OLIVER اس کے لیے عالمی سطح کا جواب دہندہ بن جاتا ہے۔

تاہم بہت سے کمپیوٹر ماہرین اس سے بھی بالا دیکھتے ہیں۔ نظریاتی طور پر یہ ممکن تھا کہ ایک ایسا OLIVER تیار کر لیا جائے جو اپنے صارف کے الفاظ پر مبنی مواد کا تجزیہ کر سکے، اس کے انتخاب کی چھانٹی کر سکے، اس کی اقدار کے نظام کا استخراج کر سکے، اس کی اقدار کے نظام میں تبدیلیوں کی عکاسی کے لیے اس کے پروگرام کو تازہ کر سکے، اور آخر میں اس سے متعلق بڑے سے بڑے فیصلوں کو سنبھال سکے۔

لہٰذا OLIVER کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کے مالک کو کس طرح، تمام تر امکانات کی روشنی میں، کسی کمیٹی میٹنگ میں پیش کی جانے والی متعدد تجاویز کے لیے کیسے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ (ان میٹنگز کا اہتمام OLIVER کے مختلف گروپوں کی صورت میں ہو سکتا ہے جو اپنے متعلقہ مالک کی نمائندگی کر رہے ہوں، بجائے یہ کہ خود مالکان وہاں موجود ہوں۔ بے شک اس طرح کی ''کمپیوٹر کے ذریعے منسلک'' کانفرنسوں کا انعقاد پہلے ہی تجربے کرنے والے افراد کے زیر اہتمام ہو چکا ہے۔)

مثال کے طور پر OLIVER کو یہ جاننا چاہیے کہ اس کا مالک امیدوار "X" کو ووٹ دے گا، آیا وہ "Y" نام کے فلاحی ادارے میں رقم جمع کروائے گا، کیا وہ "Z" کی طرف سے کی جانے والی کھانے کی پیشکش کو قبول کرے گا۔ OLIVER کے لیے کام کرنے والے ایک پرجوش شخص، ایک کمپیوٹر تربیت یافتہ ماہر نفسیات کے الفاظ میں: ''اگر آپ ایک غیر مہذب شخص ہیں تو OLIVER جاننا ہوگا کہ موقع کے مطابق بہترین اخلاق کا مظاہرہ کیسے کیا جائے۔ اگر آپ شادی سے جان چھڑا رہے ہیں تو OLIVER کو چاہیے اس صورت حال کو جاننے اور مدد کرے۔ کیونکہ OLIVER آپ کی متبادل مشینی انا کا نام ہے۔'' سائنسی

افسانوی ادب کی طرف لوٹتے ہوئے، کوئی شخص یہاں تک تصور کر سکتا ہے کہ سوئی کی سی قامت کے OLIVER معصوم بچوں کے دماغوں میں پیوست کیا جا سکتا ہے اور اسے کلوننگ کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے...... نہ صرف میکانکی...... بلکہ جیتی جاگتی انائیں تیار کی جا سکتی ہیں۔

ٹیکنالوجی کے حوالے سے ایک اور ترقی جو کسی فرد کی مطابقت پذیر حد میں اضافہ کر دیتی ہے اس کا تعلق انسانی ذہانت کے معیار IQ سے ہے۔ امریکہ، سویڈن یا دیگر مقامات پر ہونے والے تجربات بڑے مضبوط طریقے سے یہ تجویز دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہم، ممکن پیش بینی مستقبل میں، اس قابل ہو سکتے ہیں کہ وہ انسان کی ذہانت معلومات رکھنے والی صلاحیتوں میں وسعت لا سکتے ہیں۔ حیاتی کیمیاء اور غذا سے متعلق تحقیق نے اس بات کے اشارے دیے ہیں کہ لحمیات، RNA اور دیگر جوڑ توڑ کے قابل خصوصیات، کسی ایک مشکل انداز میں، یادداشت اور سیکھنے سکھانے سے باہم پیوستہ ہیں۔ ذہانت کی حدود کو توڑنے کے لیے بڑے پیمانے پر کی جانے والی کوشش کی ادائیگی انسان کی مطابقت پذیری کی بہتری کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ تاریخ کا یہ لمحہ اس قسم کے انسانیت نواز سلوک کی ترویج کے لیے موزوں ہوتا کہ ایک نئے اعلیٰ ترین انسانی عضویہ تک رسائی حاصل کی جائے۔ لیکن اس کے نتائج اور متبادلات کیا ہوں گے؟ کیا ہمیں ایک ایسی دنیا چاہیے جو "OLIVERS" سے بھری ہوئی ہو؟ کب؟ کن شرائط اور حالات کے تحت؟ ان لوگوں تک کس کس کی رسائی ہونی چاہیے؟ کسی کی نہیں ہونی چاہیے؟ کیا معقول لوگوں کی سطح کی بلندی کے لیے حیاتی کیمیائی علاج کا سہارا لینا چاہیے، کیا اوسط درجے کے کسی شخص کا معیار بلند کرنے کے لیے ان کا استعمال ہونا چاہیے، یا ہمیں اعلیٰ سطح کے ذہین لوگوں کی افزائش پر اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے؟

مختلف شعبوں میں اسی طرح کے پیچیدہ حق انتخاب کا سامنا ہوتا ہے۔ کیا ہمیں اپنے وسائل کو کم اجرت والی نیوکلیائی قوت کے حصول کی کوشش میں صرف کر دینا چاہیے؟ یا جارحیت کی حیاتی کیمیائی بنیاد کو وضع کرنے کے لیے ایک قابل موازنہ کوشش بھی کی جانی چاہیے؟ کیا ہمیں ایک سپر سانک جیٹ ٹرانسپورٹ پر کئی بلین ڈالر خرچ کرنے چاہئیں...... یا اسی رقم کو مصنوعی دلوں کی تیاری پر خرچ کرنا چاہیے؟ کیا ہمیں انسانی نامیے سے چھیڑ چھاڑ کرنی چاہیے؟ یا ہمیں، چند لوگوں کی سنجیدہ تجویز کی روشنی میں، برازیل کے کل رقبے پر پانی چھوڑ دینا چاہیے تاکہ ہم خشکی کے رقبے کے بیچ میں ہی ایک جزیرہ بنا سکیں جو شرقی اور مغربی جرمنی، دونوں ممالک،

کے حجم جتنا ہو؟ یہ بات بھی شک و شبے سے بالاتر ہے کہ ہم لوگ بہت جلد اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنے ناشتے میں سپر ایل ایس ڈی یا ضدِ جارحیت قسم کی اضافی چیز یا ہگزلیان سوما (Huxleyian Soma) لینا شروع کر دیں۔ اس بات میں بھی زیادہ دیر نہیں کہ سیاروں پر لوگوں کی آبادیاں ہوں اور نوزائیدہ بچوں کی کھوپڑیوں میں ایسے آلات نصب کر دیں جو پودوں کا سا لطف دیں۔ لیکن کیا ہمیں ایسا کرنا چاہیے؟ کس انسانی معیار یا قدر کے تحت اس قسم کے فیصلے کیے جائیں؟

یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جو OLIVER، نیوکلیائی توانائی، سپر سانک ٹرانسپورٹ، براعظمی سطح پر میکرو انجینئرنگ، جس کے ساتھ ایل ایس ڈی اور تفریحی جستجو بھی ہو، کا انتخاب کرتا ہے وہ ایک ایسی ثقافت کو جنم دیتے ہیں جو اس ثقافت سے یکسر مختلف ہوتی ہے جو ذہانت میں اضافہ کرتی ہے، ضد جارحیت ادویات کا نفوذ کرتی ہے اور کم قیمت مصنوعی دل فراہم کرتی ہے۔

وہ معاشرہ جو ٹیکنالوجی کی جدت اور ترقی میں انتخاب پر زور دیتا ہے اور وہ معاشرہ جو ایسی ٹیکنالوجی کے رائج ہوتے ہی، فوری موقع ملنے پر اس کے حصول کو ممکن بناتا ہے ان میں معمولی فرق پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان معاشروں میں بھی فرق پایا جاتا ہے جن میں ٹیکنالوجی کی ترقی کی شرح رفتار متوسط سطح کی ہو اور انھیں مستقبل کے دھچکے (سے نبرد آزما ہونے) کی راہنمائی بھی کی جاتی ہو، اور وہ معاشرہ جس میں عام لوگوں کی اکثریت منطقی طور پر فیصلے کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں سیاسی جمہوری اور بڑے پیمانے میں شرکت ممکن ہو؛ دیگر مضبوط اور بھرپور قسم کے دباؤ کے ساتھ جو ایک چھوٹی، ٹیکنالوجی کی سہولیات سے بھرپور، اشرافیہ کی سیاسی حکمرانی کا مرہون منت ہو۔ مختصر یہ کہ ٹیکنالوجی کے حوالے سے ہمارا انتخاب یقینی طور پر مستقبل کے ثقافتی طرز کی صورت گری کرے گا۔

یہی وجہ ہے کہ ٹیکنالوجی سے متعلق سوالات کا، موجودہ دور میں، صرف ٹیکنالوجی کے نقطۂ نظر سے جواب دینا ہی کافی نہیں۔ یہ سیاسی سوالات ہیں۔ یہ سوالات یقینی طور پر ہمیں ان سطحی سیاسی معاملات کی نسبت زیادہ گہرائی سے متاثر کرتے ہیں جنھوں نے ہمیں گھیرا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ہم ٹیکنالوجی سے متعلق فیصلے پرانی طرز پر نہیں کر سکتے۔ ہم یہ مہلت نہیں دے سکتے کہ انھیں انتہائی عجلت میں، اور آزادی کے ساتھ کیا جائے۔ ہم یہ بھی نہیں چاہیں گے انھیں صرف اور صرف قلیل المدت اہمیت کے پیش نظر ہی عائد کروایا جائے۔ ہم یہ نہیں چاہیں گے کہ انھیں پالیسی کی عدم موجودگی میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا جائے اور ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ اس قسم کے

فیصلوں کی ذمہ داری کاروباری حضرات، سائنس دانوں، انجینئروں یا ان منتظمین کو سونپ دی جائے جو اپنے ہی اعمال کے عمیق نتائج سے بے بہرہ ہیں۔

ٹرانسسٹر اور جنس

ٹیکنالوجی پر قابو پانے کے لیے اور اس کے ذریعے، عمومی سطح پر، تیز رفتار دھکے پر اثر بڑھانے کے لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اس نئی ٹیکنالوجی کو معاشرے میں متعارف ہونے سے پہلے ٹیسٹوں کے مجموعے سے گزاریں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم کسی نئی ''جدت'' کی فروخت سے پہلے اسے سوالات کے ایک سلسلے سے گزارا جائے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ تلخ تجربات کی روشنی میں اب تک ہمیں یہ سیکھ لینا چاہیے کہ ہم کسی بھی نئی ٹیکنالوجی کے توانائی سے متعلق جسمانی، ذیلی اثرات کے بارے میں محتاط ہو جائیں۔ چاہے ہم کسی نئی طاقت، کسی نئی دھات، یا کسی نئے صنعتی کیمیاء کے لیے تجویز دے رہے ہوں ہمیں چاہیے کہ ہم یہ واضح کریں کہ یہ اس دقیق ماحولیاتی توازن کو کیسے تبدیل کرے گا جس پر ہم لوگ اپنی بقا کے لیے انحصار کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ زمان و مکان میں طویل فاصلوں کے حوالے سے ہمیں اس کے بالواسطہ اثرات کے بارے میں پیش گوئی کر لینی چاہیے۔ وہ صنعتی فضلہ جسے دریا میں بہا دیا جائے وہ سینکڑوں میل تک نہ صرف دریا کی بلکہ سمندر کی سطح کو بھی بلند کر سکتی ہے۔ ڈی ڈی ٹی (DDT) اپنے استعمال کے کئی سال بعد تک اپنے اثرات سے عاری رہ سکتی ہے۔ اس سلسلے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس موضوع پر مزید کچھ کہنا زیادہ ضروری نظر نہیں آتا۔

دوسری اور نسبتاً پیچیدہ بات یہ ہے کہ ہمیں سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی ماحول پر تکنیکی جدت کے طویل المیعاد اثرات کا جائزہ لینا چاہیے۔ گاڑیوں کے بارے یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہمارے شہروں کی صورت حال کو یکسر تبدیل کر دیں گی، گھروں کی ملکیتیں تبدیل کر دیں گی، پرچون فروش تجارت میں بھی تبدیلی آئے گی، جنسی روایات تبدیل ہوں گی اور خاندانی بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ مشرق وسطیٰ میں عرب قوم پرستی کے پھیلاؤ میں ٹرانسسٹر کے کثرت سے استعمال کو اہم مقام حاصل ہے۔ منصوبہ بندی کی گولیاں، کمپیوٹر، خلائی سرگرمیاں اور سسٹمز اینالسسز (Systems Analysis) جیسی دبیز ٹیکنالوجی کی ایجاد اور نفوذ تمام نے اپنی اپنی جگہ پر اہم سماجی تبدیلیاں کی ہیں۔

ہم لوگ اب یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ اس طرح کے ثانوی سماجی اور ثقافتی اثرات کو یوں ہی وقوع پذیر ہونے دیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم پیشگی طور پر اس سے متعلق قیاس آرائی کریں اور ان کی نوعیت، قوت اور وقت سے متعلق جس حد تک ہو سکے اندازہ کر سکیں، جہاں کہیں بھی ان اثرات کو شدید نقصان کا باعث پائیں، ہمیں تیار ہو جانا چاہیے کہ نئی ٹیکنالوجی کا راستہ روک دیں۔ یہ کام انتہائی سادہ ہے۔ ٹیکنالوجی کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ معاشرے میں متشدد صورت حال اختیار کرے۔

یہ بات بھی درست ہے کہ ہم کبھی بھی کسی عمل یا حرکت کے اثرات مکمل طور پر نہیں جان سکتے چاہے وہ ٹیکنالوجی سے متعلق ہو یا نہیں۔ لیکن یہ بات بھی درست نہیں کہ ہم بے بس ہیں۔ مثال کے طور پر ایسا ممکن ہے کہ ہم محدود علاقوں میں نئی ٹیکنالوجی کو ٹیسٹ کریں یہ ٹیسٹ محدود گروپوں کے درمیان ہی ہوتا کہ اس کے نفوذ سے پہلے اس کے ثانوی اثرات کا جائزہ لیا جا سکے۔ اگر ہم پُرتخیل ہوں، تو ہم ٹیکنالوجی سے متعلق اپنے فیصلوں میں راہنمائی کے لیے، عملی تجربات کا انعقاد کر سکتے ہیں حتیٰ کہ رضا کار کمیٹیاں بھی بنا سکتے ہیں۔ جس طرح ہم ایسے محصورے بنانے کی خواہش کر سکتے ہیں جہاں تبدیلی کی شرح کو مصنوعی طور پر سست روی کا شکار کر دیا گیا ہو، یا ایسے محصورے جو مستقبل سے منسوب ہوں اور جہاں پر افراد کو مستقبل کے ماحول سے متعلق پیشگی نمونہ دکھا دیا جائے، ہم اس ماحول اور صورت حال سے ایک طرف ہونے کی خواہش بھی کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ اس سے اعانت حاصل کرنے کی خواہش بھی کر سکتے ہیں، ایسی اعلیٰ ترین ندرت کے حامل طبقات میں جس میں جدید ترین ادویات، طاقت کے ذرائع، گاڑیاں، میک اپ کا سامان، روزمرہ استعمال کی اشیا اور دیگر جدتوں کو تجرباتی طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور ان کی چھان بین کی جاتی ہے۔

آج کے دور میں کوئی کارپوریشن عمومی طور پر ایک ایسا ٹیسٹ کر سکتی ہے، جس کے ذریعے یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ اپنا بنیادی کام کر رہی ہے۔ یہی کمپنی اس کی مارکیٹ کے بارے میں ٹیسٹ کر سکتی ہے یہ جاننے کے لیے کہ آیا اس کی فروخت ممکن ہے۔ لیکن، چند مستثنیٰ صورتوں کے علاوہ، کوئی شخص بھی صارف یا طبقے سے اس بات کا تعین نہیں کر سکتا کہ انسانی ذیلی اثرات کس نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ مستقبل میں ہماری بقا اسی طرح کے سیکھنے سکھانے کے عمل سے مشتق ہو گی۔

ایسی صورت میں جبکہ زندگی سے متعلق ٹیسٹ ناممکن نظر آتے ہیں، یہ بات ممکن ہے کہ ہم، ایک نظام کے تحت، بہت سی ٹیکنالوجی کے دوررس اثرات کے بارے میں پیش بینی کر سکیں۔ کرداری سائنسدان

بڑی تیزی سے نئے اوزار ایجاد کر رہے ہیں، جو ریاضی کے جدید تقاضوں سے لے کر نام نہاد الہامی تجزیات تک، جو ہمیں یہ صلاحیت بخشتے ہیں کہ ہم اپنی سرگرمیوں کے اثرات سے متعلق، معلومات پر مبنی، بہتر فیصلے کر سکیں۔ ہم اس تخیلاتی ہارڈ ویئر کو یکجا کر رہے ہیں جو ٹیکنالوجی کی سماجی تخمینہ کاری کے لیے درکار ہیں؛ ہمیں اس کے استعمال کے لیے اس کی ضرورت ہے۔

تیسرا، ایک مشکل تر اور موزوں سوال: سماجی ڈھانچے میں حقیقی تبدیلیوں سے ذرا ہٹ کر کس طرح سے ایک مجوزہ نئی ٹیکنالوجی معاشرے کے اقداری نظام پر اثر انداز ہو سکتی ہے؟ ہم لوگ اقدار کے نظام سے متعلق کم ہی جانتے ہیں اور ہمیں یہ بھی کم معلوم ہے کہ ان میں تبدیلی کیسے آتی ہے لیکن معلوم کرنے کی وجہ ہے کہ یہ (اقدار) بھی ٹیکنالوجی سے جڑی ہوئی ہیں۔ کسی اور مقام پر میں نے تجویز پیش کی تھی کہ ہم ''اقدار کے اثرات سے متعلق پیش گوئی کرنے والے'' افراد پر مبنی ایک نیا پیشہ تشکیل دے لیں...... ایسے مرد و خواتین جن کی اس بات میں تربیت ہو کہ وہ مجوزہ ٹیکنالوجی کے اقداری اطلاق کی حوصلہ افزائی کے لیے کرداری سائنس کے حوالے سے جدید تکنیک کا استعمال جانتے ہوں۔

1967ء میں یونیورسٹی آف پٹس برگ (Pittsburgh) میں ماہرین معاشیات، سائنسدانوں، ماہرین تعمیرات، منصوبہ سازوں، مصنفین اور فلسفیوں پر مشتمل ایک گروپ مستقبل سے متعلق اقدار کی پیش بینی سے متعلق ایک روزہ پروگرام میں مشغول رہا۔ ہاورڈ میں ''ٹیکنالوجی اور معاشرے'' پر منعقدہ پروگرام میں شعبے سے متعلقہ امور پر کام ہوا۔ کارنیل (Cornell) اور کولمبیا میں واقع انسٹی ٹیوٹ فار دی سٹڈی آف سائنس ان ہیومن افیرز (Institute for the study of Science in Human Affairs) میں ایک کاوش کی گئی تاکہ ٹیکنالوجی اور اقدار میں تعلق استوار کرنے کے لیے ایک ماڈل تشکیل دیا جائے اور ایک ایسا کھیل بنایا جائے جو ان کے باہمی اثرات کا تجزیہ کرنے کے لیے مفید ہو۔ یہ تمام کے تمام اقدامات، جو ابھی ابتدائی نوعیت کے ہیں، ہمیں نئی ٹیکنالوجی کو ایسے باریک اور دقیق انداز سے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں جیسے پہلے کبھی نہیں تھے۔

چوتھی اور آخری بات ہمیں ایک سوال ضرور پوچھنا چاہیے جس پر ابھی تک گفتگو نہیں ہوئی ہے اور وہ اس وقت تک اہمیت اختیار نہیں کرے گا جب تک ہم، انتہائی وسعت اختیار کرنے والے، مستقبل کے صدمے کے تدارک کے بارے میں نہیں سوچیں گے۔ کیونکہ ہر بڑی تکنیکی جدت کے حوالے سے ہمیں یہ پوچھنا

چاہیے: اس کی تیز رفتاری کے مضمرات کیا ہیں؟ مطابقت پذیری کے مسائل، پہلے ہی، ان مشکلات سے سبقت لے جاتے ہیں جو کسی ایجاد یا تکنیک کا مقابلہ کرنے میں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ ہمارا مسئلہ اب جدت نہیں ہے بلکہ جدتوں کا سلسلہ، نہ صرف سپرسانک ٹرانسپورٹ، یا بریڈر ریکٹر (Breeder Reactor)، یا گراؤنڈ ایفیکٹ مشین (Ground Effect Machine) بلکہ ایسی تمام جدتوں کے مربوط سلسلے اور وہ ندرت جس کا سیلاب وہ معاشرے میں پھیلا دیتے ہیں۔

کیا کوئی مجوزہ جدت ہماری مدد کر سکتی ہے کہ ہم کسی متاثر کن پیش رفت کی شرح اور سمت پر قابو پا سکیں؟ یا یہ ہمیں بہت سے عوامل کو تیز تر کرتی ہوئی نظر آتی ہے جس پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں؟ یہ ناپائیداری کی سطح کو کیسے متاثر کرے گی، ندرت کی شرح پر کیسے اثر انداز ہو گی اور انتخاب میں تنوع کا کیا ہو گا؟ جب تک ہم بڑے بہترین طریقے سے ان سوالات کا جواب تلاش نہیں کریں گے ٹیکنالوجی کو سماجی اختتامیے تک لے کر جانے کی ہماری کاوشیں .... عمومی تیز رفتار دھکے پر کنٹرول حاصل کرنا.......... ضائع ہی شمار ہوں گی۔

یہاں پر پھر سماجی اور جسمانی سائنسز کے لیے ایک بہترین دانشورانہ ایجنڈا ہے۔ ہم نے خود کو سکھایا ہے کہ کس طرح انتہائی طاقتور ٹیکنالوجیز کو تیار کرنا ہے اور پھر انھیں باہمی مربوط کرنا ہے۔ لیکن ہم نے ان کے اثرات کو جاننے کے لیے کوئی تردد نہیں کیا۔ آج یہ اثرات ہمیں تباہ کرنے کا خدشہ لیے ہوئے ہیں۔ ہمیں سیکھنا چاہیے اور انتہائی تیزی سے سیکھنا چاہیے۔

ٹیکنالوجی کا محتسب

تاہم یہ چیلنج صرف اور صرف دانشورانہ سطح کا نہیں ہے؛ یہ سیاسی نوعیت کا بھی ہے۔ نئے ریسرچ ٹولز ڈیزائن کرنے کے ساتھ ساتھ...... ماحول کو سمجھنے کی نئی راہیں...... یقین دہانی کے لیے کہ ان معاملات کے بارے میں، حقیقتاً، چھان بین کر لی گئی ہے؛ اور کچھ مجوزہ ٹیکنالوجی کی ترویج یا حوصلہ شکنی (یا شاید انھیں ممنوع قرار دینے کے لیے۔ دراصل ہمیں ایسی مشینری کی ضرورت ہے جو مشینوں کی ہی چھان بین کر سکے۔ اگلی دہائی میں ایک سیاسی ذمے داری اس مشین کی تیاری ہے۔ ہمیں ٹیکنالوجی پر ایک منظم سماجی کنٹرول حاصل کرنے میں خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا کرنے کی ذمے داری میں عوامی ایجنسیوں، ان کارپوریشنوں اور لیبارٹریوں کو بھی شریک ہونا چاہیے جس میں تکنیکی جدتوں پر کام ہوتا ہے۔

ٹیکنالوجی کے (فوری نفوذ) اور پر کنٹرول کرنے کی کوئی بھی تجویز سائنسی ناراضگی کا باعث ہو سکتی ہے۔ ناپختہ قسم کی سرکاری مداخلت کے واہمے کو تحرک ملتا ہے۔ تاہم ٹیکنالوجی پر کنٹرول حاصل کر لینے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تحقیق کرنے کی آزادی پر کنٹرول حاصل کر لیں۔ اس وقت جو مسئلہ زیر بحث ہے وہ دریافت نہیں ہے بلکہ نفوذ ہے، ایجاد نہیں بلکہ اس کا اطلاق ہے۔ ایک ماہر عمرانیات ایمی ٹیائی ایٹز یونی (Amitai Etzioni) اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ستم ظریفی یہ ہے کہ بہت سے آزاد خیال افراد جنھوں نے مکمل طور پر کینیئسین اکنامک کنٹرول (Keynesian Economic Controls) کو قبول کر لیا وہ ٹیکنالوجی کے بارے میں عدم مداخلت کا نظریہ رکھتے ہیں۔ انہی لوگوں کے یہی دلائل کبھی عدم مداخلت کی معاشیات کے دفاع کے لیے استعمال ہوتے تھے: یعنی ٹیکنالوجی کو کنٹرول کرنے کی کوئی بھی کوشش جدت اور تحرک کو دبا دے گی۔''

بیش کنٹرول سے متعلق وارننگ کو معمولی طور پر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن عدم کنٹرول کے نتائج بھی بدتر ہوں گے۔ دراصل سائنس اور ٹیکنالوجی کسی بھی صورت میں آزاد نہیں ہیں۔ ایجادات اور وہ شرح جس پر ان کا اطلاق ہوتا ہے ان دونوں پر اقدار اور معاشرے کے ان اداروں کا اثر ہوتا ہے جو انھیں عروج بخشتے ہیں۔ دراصل ہر معاشرہ ان کے وسیع تر استعمال سے قبل، ان کا پیشگی جائزہ لینے کے لیے تکنیکی جدّتیں کرتا ہے۔

وہ فوری طریقہ کار جس کے تحت انھیں سرانجام دیا جاتا ہے اور وہ معیار جس پر ان کا چناؤ ممکن ہے، اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ مغربی ممالک میں مختلف تکنیکی جدتوں کو چھاننے اور دیگر کے اطلاق کا معیار معاشی طور پر سودمند رہتا ہے۔ کمیونسٹ ممالک میں اس طرح کے ٹیسٹ کا تعلق ایسا ہی ہے جیسا مجموعی معاشی اضافے اور قومی قوت سے جدت کا کردار ہے۔

پہلے والے مسئلے میں فیصلے نجی حیثیت میں کیے جاتے ہیں اور تکثیری طور پر لامرکزیت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ دوسرے معاملے میں وہ عوامی ہوتے ہیں اور مکمل طور پر مرکزیت سے منسوب ہوتے ہیں۔

دونوں نظام اب دقیانوسی ہو چکے ہیں.......... جدید ترین صنعتی معاشرے کی پیچیدگیوں سے نبردآزما ہونے کی صلاحیت سے عاری، دونوں کے دونوں ان تمام کو رد کرتے ہیں سوائے ٹیکنالوجی کے فوری اور ظاہری اثرات کے۔ تاہم جس بات سے ہمارا بہتر تعلق ہوتا ہے وہ عدم عجلتی اور عدم واضح اثرات

ہیں۔ سائنس کونسل آف کینیڈا کے چیئرمین اوایم سولینڈٹ (O.M.Solandt) کہتے ہیں، ''معاشرے کو چاہیے کہ خود کو ایسا منظم کر لے کہ سائنسدانوں میں سے قابل ترین اور انتہائی پرتخیل افراد کی ایک خاص شرح نئی ٹیکنالوجی کے دوررس نتائج کی پیش بینی پر اپنی توجہ مرکوز کر دیں۔ خطرات کی پیش بینی کے لیے کسی فرد کی مستعدی پر انحصار کرنے کا موجودہ نظام اور ایسے پریشر گروپس جو غلطیاں درست کر دیں، مستقبل میں کارگر ثابت نہیں ہوں گے۔''

درست سمت کی طرف ایک قدم یہ ہوگا کہ ہم ٹیکنالوجی کے محتسب بنا دیں۔ ایک عوامی ایجنسی جو ٹیکنالوجی کے غیر ذمے دارانہ اطلاق سے متعلق شکایتوں کو موصول کرے، اس سے متعلق تحقیق کرے اور اس پر عمل درآمد کرے۔

ٹیکنالوجی کے مخالفانہ اثرات کو درست کرنے کا ذمے دار کون ہے؟ گھروں اور واشنگ مشینوں میں استعمال ہونے والے واشنگ پاؤڈر وغیرہ کے تیزی سے نفوذ کی وجہ سے پورے امریکہ میں پانی کو صاف کرنے کے مسائل میں بھرپور اضافہ ہو گیا ہے۔ گھروں میں واشنگ پاؤڈر یا مصفا اشیا کے استعمال کو متعارف کروانے کا فیصلہ نجی حیثیت میں کیا گیا تھا مگر اس کے ذیلی اثرات کا سامنا ٹیکس ادا کرنے والے شہریوں اور غیر معیاری پانی کی فراہمی کی صورت میں صارف کو بھی کرنا پڑ رہا ہے۔

فضائی آلودگی کی قیمت بھی ٹیکس دہندگان اور پورے طبقے کو چکانی پڑتی ہے حالانکہ، اکثر معاملات میں، آلودگی کا موجب انفرادی کمپنیاں، انفرادی صنعتیں یا سرکاری تنصیبات ہوتی ہیں۔ شاید یہ بات بھی معقولیت پر مبنی ہے کہ آلودگی دور کرنے کے لیے اخراجات، ایک سماجی ذمے داری کی حیثیت سے، عوام سے ہی وصول کیے جائیں، بجائے مخصوص صنعتوں کے۔ اخراجات کے تعین کے بہت سے راستے ہیں۔ ہم ان میں سے جس کسی کا بھی انتخاب کریں، یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ ذمے داری کے خطوط وضع ہو جانے چاہئیں۔ عمومی طور پر کسی بھی ایجنسی، گروپ یا ادارے کی کوئی واضح ذمے داری نہیں ہے۔

ٹیکنالوجی کا محتسب شکایتوں کے بورڈ کے حوالے سے ایک افسر کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دے سکتا ہے۔ یہ محتسب ان کمپنیوں یا سرکاری محکموں کے خلاف اخبارات کی توجہ دلا سکتا ہے جنھوں نے غیر ذمے دارانہ طریقے سے نئی ٹیکنالوجی کا اطلاق کیا ہے یا وہ اس کے استعمال میں بیش تخیل سے بے بہرہ رہے ہیں، اس طرح کی ایجنسی نئی ٹیکنالوجی کے بہتر استعمال کے لیے دباؤ ڈال سکتی ہے۔ جہاں ضروری سمجھا

جائے وہاں نقصانات کے ازالے کے لیے مقدمات دائر کرنے کا اختیار لیے ہوئے یہ محتسب ٹیکنالوجی کے غیر ذمے دارانہ استعمال کے سامنے ایک مضبوط رکاوٹ ہو سکتا ہے۔

ماحولیاتی سکرین

لیکن محض پوچھ گچھ اور حقیقت کے بعد ذمے داری کا تعین بمشکل ہی کافی ہے۔ ہمیں ایک ایسی ماحولیاتی سکرین تیار کرنی چاہیے جو ہمیں (معاشرے کے اندر) خطرناک نفوذ سے محفوظ رکھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ عوامی ترغیبات کا ایسا نظام وضع کرے جو اس ٹیکنالوجی کی حوصلہ افزائی کرے جو محفوظ بھی ہو اور سماجی طور پر اس کی طلب بھی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بڑے پیمانے پر متعارف ہونے والی ٹیکنالوجی اور اس میں ہونے والی جدت کا معائنہ کیا جائے پیشتر اس کے کہ اسے عوام میں بھیجا جائے۔

کارپوریشنوں سے امید رکھنی چاہیے کہ وہ ''اثرات کا جائزہ لینے کا عملہ'' متعین کریں گے تاکہ وہ اپنے تعاون سے متعارف ہونے والی جدت کے توانائی اثرات کا مطالعہ کر سکیں۔ چند معاملات میں ضرورت صرف اس بات کی نہیں ہوگی کہ مذکورہ علاقوں میں نئی ٹیکنالوجی کو ٹیسٹ کریں بلکہ اس جدت کو، معاشرے کی عمومی سطح تک پھیلانے سے پہلے اس کے اثرات کے حوالے سے ایک عوامی رپورٹ تیار کریں۔ زیادہ تر ذمے داری خود صنعت پر لاگو کی جائے۔ مرکزیت میں جتنی کمی ہوگی کنٹرول اتنا بہتر ہوگا۔ اگر خود پالیسی کام کرتی رہے گی تو بیرونی وسیاسی کنٹرول کے لیے یہ قابلِ ترجیح ہوگا۔

جہاں پر خود ضابطگی کا نظام ناکام ہو جاتا ہے، جیسا کہ اکثر ہو جاتا ہے، تو عوامی مداخلت انتہائی ضروری ہو جاتی ہے اور پھر ہمیں اپنی ذمے داری سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ امریکہ میں سائنس، تحقیق اور ترقیاتی امور پر بننے والی ہاؤس کمیٹی کے چیئرمین کانگریس مین ایمیلو کیو۔ ڈیڈاریو (Emilio Q.Daddario) نے وفاقی حکومت کی سطح پر ٹیکنالوجی ایسسمنٹ بورڈ کے قیام کی تجویز دی ہے۔ نیشنل اکیڈمی آف سائنسز، دی نیشنل اکیڈمی آف انجینئرنگ، دی لیجسلیٹیو ریفرنس سروس آف دی لائبریری آف کانگریس (The Legislative Reference Service of library of congress) اور جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے سائنس وٹیکنالوجی پروگرام کے تحت کیے جانے والے مطالعوں کا ہدف اسی طرز کی ایجنسی کی مناسب نوعیت کو واضح کرنا تھا۔ ہماری خواہش ہونی چاہیے کہ ہم اس کی ہیئت پر بحث کریں؛ اس کی ضرورت متنازعہ ہونے سے بالا ہے۔

معاشرے کو تکنیکی ترقی کے لیے کچھ عمومی اصول بھی وضع کرنے چاہئیں۔ مثال کے طور پر جہاں کہیں بھی کسی نئی جدت کے متعارف ہونے میں کوئی خطرہ پیش نظر ہو تو ضرورت کے پیش نظر ذمہ دار ایجنسی کو فنڈ اکٹھے کرنے چاہئیں تاکہ مذکورہ منفی اثرات کو ثمر مندہ تعبیر ہونے سے روکا جا سکے۔ ہمیں ایک ''ٹیکنالوجی بیمہ پول'' بھی تشکیل دینا چاہیے جس میں تمام تر ادائیگیاں جدت کے نفوذ کی ایجنسیاں کریں گی۔

بڑے پیمانے پر ہونے والی بہت سی ماحولیاتی دخل اندازی کو مؤخر بھی کیا جا سکتا ہے یا انھیں یکسر روکا جا سکتا ہے......... شاید اس اصول کے تحت کہ اگر فطرت پر اچانک دھاوا بہت بڑا ہے، اچانک ہے اور اس کے جائزہ لیے جانے والے اثرات ممکنہ طور پر درست ہیں تو اسے وقوع پذیر نہیں ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر مجوزہ طور پر یہ بات سامنے آئی ہے کہ اسوان ڈیم کے بارے میں یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس ڈیم کے مصری زراعت کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ ساتھ، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دریائے نیل کے دونوں کناروں پر موجود زمین کو شورزدہ کر دے۔ یہ انتہائی تباہ کن صورت حال ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ سارا عمل راتوں رات نہیں ہوگا۔ لہٰذا قیاساً اس کی نگرانی اور تدارک کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس برازیل کے اندرونی علاقے پر پانی چھوڑنے کا منصوبہ فوری اور ناقابلِ غور ماحولیاتی اثرات سے بھرپور ہے کہ اس بات کی اجازت اس وقت تک نہیں دی جا سکتی جب تک اس کی بھرپور نگرانی ممکن نہ ہو اور تمام کے تمام ہنگامی اصلاحی اقدامات دستیاب نہ ہوں۔

سماجی اثرات کی سطح پر کرداری سائنسدانوں..... ماہرین نفسیات، ماہرین عمرانیات، ماہرین معاشیات اور ماہرین سیاسیات...... کے پینلوں کے انخلا کے لیے نئی ٹیکنالوجی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس بات کا تعین کریں گے کہ وقت کے مختلف ادوار میں اس کے سماجی اطلاق کی ممکنہ قوت کیا ہے۔ جب ایک جدت شدید انتشار کے سے اثرات رکھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے یا بے ضبط قسم کے تیز رفتار دباؤ پیدا کرتے ہوئے محسوس ہوتی ہے، ضرورت اس چیز کی ہے کہ ان حقائق کو ایک تخمینی فائدے والے شماریاتی طریقہ کار میں تولا جائے۔ جہاں تک چند شدید اثرات والی جدتوں کا تعلق ہے، تکنیکی طور پر تقویمی ایجنسی اس اختیار کی حامل ہو سکتی ہے کہ وہ رکاوٹ پر مبنی قانون سازی کر سکے یا ایک ایسا فرمان صادر فرمائے جو تاخیر پر مجبور کرے تو قتیکہ عوامی بحث ومباحثہ اور مطالعہ مکمل نہ ہو جائے۔ دیگر معاملات میں اس طرح کی جدتوں کو ممکنہ طور پر نفوذ کے لیے منظر عام پر لایا جا سکتا ہے...... بشرطیکہ ان کے منفی اثرات کے تدارک

کے لیے موزوں اقدامات پیشگی طور پر اٹھائے جائیں۔ اس طرح معاشرے کو ٹیکنالوجی سے مربوط مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے کسی تباہی کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔

صرف مخصوص ٹیکنالوجیوں کو ہی شمار میں نہ لاتے ہوئے بلکہ ان کے باہمی تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے، ان کے درمیان وقت کے وقفوں کا شمار کرتے ہوئے، نفوذ کی مجوزہ رفتار اور اس سے ملتے جلتے عوامل کے ساتھ ہی، ہم تبدیلی کی شرح رفتار اور اس کی سمت پر کچھ کنٹرول حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ بات کہنا غیر ضروری سا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تجاویز از خود تباہ کن سماجی اثرات سے بھرپور ہیں اور محتاط تخمینہ کاری کا تقاضا کرتی ہیں۔ ان اہداف کے حصول کے بہتر طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب دیر ہو چکی ہے۔ مختصراً یہ کہ ہم جدید ترین صنعت کاری کی طرف نافہم طریقے سے چلنا مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ ٹیکنالوجی پر کنٹرول کرنے کی سیاست آنے والے وقتوں میں شدید تنازعات کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ لیکن تنازعہ ہو یا نہ ہو، ٹیکنالوجی کو مانوس ضرور کر لینا چاہیے، خاص طور پر اگر ہم تیز رفتار دھکے کو کنٹرول میں لانا چاہتے ہیں اور اگر ہم مستقبل کے صدمے کا تدارک چاہتے ہیں تو ہمیں لازماً تیز رفتار دھکے کو کنٹرول کرنا ہوگا۔

☆☆☆

بیسواں باب

سماجی مستقبلیت کے لیے لائحہ عمل

کیا کوئی شخص کسی ایسے معاشرے میں رہ سکتا ہے جو کنٹرول سے باہر ہو؟ یہ ایسا سوال ہے جو ہم پر ''مستقبل کے صدمے'' کے نظریے کے تحت ہم پر ثبت کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ صورت حال ہے جس میں ہم خود کو گھرا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اگر یہ صرف ٹیکنالوجی ہی ہوتی جو قابو سے باہر ہو جاتی تو ہمارے مسائل خاصے سنگین نوعیت کے ہوتے۔ تاہم یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اور بہت سے سماجی مراحل بھی، بغیر کسی رکاوٹ کے، شروع ہو گئے ہیں، جو بری طرح ارتعاش کا شکار ہیں اور ان کی راہنمائی کرنے کی ہماری کاوشوں میں رکاوٹ کا باعث ہیں۔

شہر کاری، نسلی تضاد، ہجرت، آبادی، جرائم...... ان شعبوں سے متعلق ایک ہزار مثالیں سامنے آتی ہیں جن میں تبدیلی لانے کی ہماری کوششیں ناموزوں اور بے کار نظر آتی ہیں۔ ان میں سے اکثر کا انتہائی گہرا تعلق ٹیکنالوجی کے پھیلنے سے ہے؛ باقی اس قید سے آزاد ہیں۔ بے تکے قسم کے، تبدیلی کی تیز شرح رفتار، اور اس تبدیلی کی سمت میں بھی ردوبدل اور جھٹکے ہمیں یہ پوچھنے پر مجبور کرتی ہیں کہ ایک ٹیکنالوجی کے حامل یہ معاشرے، چاہے وہ سویڈن اور بیلجیئم کی طرح نسبتاً چھوٹے معاشرے ہی کیوں نہ ہوں پیچیدگی کا شکار ہو گئے ہیں، اور اتنی تیز رفتاری کا شکار ہیں کہ ان کا انتظام سنبھالنا مشکل ہے؟

ہم مستقبل کے اس بڑے صدمے کو کیسے روک سکتے ہیں، تبدیلی کی رفتار کو موافق بنا کر، تحرک کی سطح میں کمی کر کے یا اس میں اضافہ کر کے خاص طور پر جب حکومتیں...... بشمول ان حکومتوں کے جو بہترین عزائم لیے ہوئے ہیں...... وہ بھی درست سمت میں تبدیلی کا تعین کرنے میں ناکام نظر آتی ہیں؟

لہٰذا ایک سرکردہ امریکی ماہر شہر کاری اعلانیہ بیزاری کے ساتھ لکھتے ہیں: ''تین بلین ڈالر سے زیادہ کی لاگت کے ساتھ اربن رینیول ایجنسی (Urban Renewal Agency) اس بات میں کامیاب ہوئی کہ وہ امریکی شہروں میں کم لاگت والے گھروں کی فراہمی میں کمی لا سکے۔'' ہمیں درجنوں شعبوں میں اسی قسم

کی قطعی ناکامی نظر آئے گی۔ ایسا کیوں ہے کہ آج کے عہد میں فلاحی پروگرام اپنے صارف کی مدد کرنے کی بجائے ناکامی کا شکار ہو جاتے ہیں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کالج کے طلبہ، جو عموماً ناز و نعم میں پلے ہوئے شریف گھرانوں کے بچے ہی ہوتے ہیں ہنگامہ آرائی اور بغاوت پر اتر آتے ہیں؟ ایسا کیوں ہے کہ بڑی شاہراہیں ٹریفک کے رش کو کم کرنے کی بجائے اس میں اضافے کا باعث ہیں؟ مختصر یہ کہ ایسا کیوں ہے کہ آزاد خیالی پر مبنی بہت سے پروگرام بڑی تیزی سے خرابی کا شکار ہو جاتے ہیں اور کچھ ایسے ذیلی اثرات مرتب کر دیتے ہیں جو ان کے مرکزی اثرات کو زائل کر دیتے ہیں؟ اور ہمیں اس بات پر بھی حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ ایک برطانوی پارلیمانی رکن نے بڑی اداسی سے کہا: ''معاشرہ بے ترتیبی کا شکار ہو گیا ہے!''

اگر بے ترتیبی کا مطلب کسی نمونے کے عدم موجودگی ہے تو وہ یقیناً مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن اگر بے ترتیبی سے مراد یہ ہے کہ سماجی پالیسی کا ماحصل ڈانواڈول ہے اور اس کے بارے میں پیش بینی نہیں کی جا سکتی تو ان کا موقف درست ہے۔ تو پھر یہاں پر مستقبل کے صدمے کے سیاسی معنی سامنے آتے ہیں۔ جیسے انفرادی مستقبل کا صدمہ شرح تبدیلی سے ہم آہنگ ہونے کے عدم صلاحیت سے پیدا ہوتا ہے، حکومتوں کو بھی مستقبل کے اجتماعی صدمے کا سامنا ہوتا ہے...... جہاں انھیں فیصلہ کرنے کے مراحل میں تعطل کا سامنا ہوتا ہے۔

یک برطانوی سماجی سائنسدان سر جیفری وکرز (Sir Geoffrey Vickers) نے بڑے واضح انداز میں اس معاملے کی وضاحت کی ہے: ''شرح تبدیلی میں بڑی تیزی سے تبدیلی آتی ہے بغیر اس شرح رفتار میں تبدیلی لاتے ہوئے جس پر مزید ردعمل ہو سکتے ہوں؛ اور یہ چیز ہمیں اس مقام تک لے آتی ہے جس کے بعد کنٹرول باقی نہیں رہتا''۔

ٹیکنوکریسی کی موت

ہمیں جس چیز کا سامنا ہے وہ صنعت کاری کی آخری ٹوٹ پھوٹ کی ابتدا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ٹیکنوکریٹک پلاننگ کی بھی۔ ٹیکنوکریٹک پلاننگ سے میری مراد صرف مرکزی قومی پلاننگ نہیں جس نے اب تک روس کی ہی تصویر کشی کی ہے بلکہ اس سے مراد سسٹمیٹک چینج مینجمنٹ (Systematic change managemnent) کے لیے نسبتاً کم باقاعدہ اور اور منتشر نوعیت کی وہ کاوشیں ہیں جو جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں، ان کی سیاسی ترغیبات کو بالائے طاق رکھ کر، کی جاتی ہیں۔ ایک سوشلسٹ تنقید نگار

مائیکل ہیرنگٹن (Michael Harrington) نے یہ دلیل دیتے ہوئے کہ ہم نے اس پلاننگ کو رد کر دیا ہے۔ اس صدی کو ''حادثاتی صدی'' قرار دیا ہے۔ تاہم مسٹر گیلبریتھ (Galbraith) اس چیز کو ایسے بیان کرتے ہیں کہ ایک سرمایہ دارانہ معیشت کے پس منظر میں بھی پیداوار اور اس کی تقسیم کو منطقی طور پر درست ثابت کرنے کے لیے بڑے پیمانوں تک چلے جاتے ہیں تاکہ اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی بہتر سے بہتر انداز میں کر سکیں۔ حکومتیں بھی منصوبہ سازی کے کاروبار کا حصہ ہو سکتی ہیں۔ جنگ کے بعد کی معیشتوں کی کینیسی (Keynesian) طریقہ کار نا مناسب ہو سکتا ہے لیکن یہ کوئی حادثاتی سلسلہ نہیں۔ فرانس میں ''Le Plan'' قومی زندگی کا ایک باقاعدہ وصف ہے۔ سویڈن، اٹلی، جرمنی اور جاپان میں حکومتیں بڑے بھرپور انداز میں معاشی شعبے میں اپنا عمل دخل جاری رکھے ہوئے ہیں تاکہ کچھ صنعتوں کو بچایا جا سکے، دیگر کو سرمایہ مہیا کیا جا سکے اور پیداوار میں تیزی لائی جا سکے۔ امریکہ اور برطانیہ میں تو مقامی حکومتیں بھی ان چیزوں سے پس نظر آتی ہیں جنھیں کبھی منصوبہ سازی کے محکمے کہا جاتا تھا۔

ان تمام کوششوں کے باوجود یہ نظام کنٹرول سے باہر کیوں جا رہا ہے؟ مسئلہ صرف یہ نہیں کہ ہم کم منصوبہ سازی کرتے ہیں؛ بلکہ ہم بڑے بھونڈے طریقے سے منصوبہ سازی کرتے ہیں اور اس مسائل کا کچھ حصہ ہماری پلاننگ میں مضمر قضیے بھی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ٹیکنوکریٹ پلاننگ از خود صنعت کاری کی پیداوار ہے اور بہت تیزی سے فنا ہونے والے عہد کی اقدار کی نمائندگی کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ اور کمیونسٹ دو متغیرات میں صنعت کاری ایک ایسا نظام تھا جس کا مرکز و محور مادی فلاح و بہبود تھی۔ لہٰذا کسی ٹیکنوکریٹ کے لیے چاہے وہ ڈیٹاریٹ (Detriot) میں ہو یا کیو (Kiev) میں معاشی ترقی ہی اس کا پہلا ہدف ہو سکتا ہے؛ اور ٹیکنالوجی اس کا ابتدائی آلہ۔ یہ حقیقت کہ ایک کیس میں معاملہ نجی مفاد پر ہی منتج ہو جاتا ہے اور، نظریاتی طور پر، دوسرے معاملے میں مفاد عوامی سطح پر منتج ہوتا ہے لیکن مکمل طور پر ایسے قیاس میں تبدیلی نہیں آتی جو دونوں میں مشترک ہو۔ ٹیکنوکریٹ منصوبہ سازی معاشی بنیادوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر ہی کی جاتی ہے۔

دوسری، یہ کہ ٹیکنوکریٹک منصوبہ سازی صنعتی حوالے سے وقت کی شمار بندی کی عکاسی کرتی ہے۔ خود کو گزشتہ معاشروں کی قدیم روایات پر مبنی، دبا دینے والی، صنعت کاری سے آزاد کروانے کی کوشش ہی موجودہ مطمح نظر ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عملی طور پر، اس کی ساری منصوبہ سازی کا تعلق مستقبل قریب سے ہے۔

پانچ سالہ منصوبے کا نظریہ جب روسیوں نے پہلی بار 1920ء کی دہائی میں دنیا کے سامنے رکھا تو یہ، نامعقول انداز میں، مستقبل میں نظر آیا۔ حتیٰ کہ آج بھی انتہائی جدید اور ترقی یافتہ تنظیموں میں، چاہے ان کا تعلق نظریاتی اطراف میں سے کسی بھی طرف ہو، ایک یا دو سالہ پیش گوئیاں "طویل المدت پلاننگ" دکھائی دیتی ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انتہائی محدود تعداد میں کارپوریشنز اور سرکاری ایجنسیاں ایسی ہیں جنھوں نے ایسے منصوبے بنانے شروع کیے ہیں جن کی مدت دس، بیس حتیٰ کہ پچاس سال تک ہوتی ہے۔ تاہم اکثر اداروں میں منصوبہ سازی اگلے سوموار تک کی ہوتی ہے۔ ٹیکنوکریٹ منصوبہ سازی قلیل المدت ہوتی ہے۔

تیسری یہ بات کہ صنعت کاری کی افسر شاہانہ تنظیم کی عکاسی کرتے ہوئے، ٹیکنوکریٹک پلاننگ کا انحصار نظام مراتب پر ہے۔ ان کی دنیا منیجر، کارکن، منصوبہ ساز اور منصوبہ تیار کروانے والا جس میں کوئی فرد دیگر افراد کے لیے فیصلے کرتا ہے۔ یہ نظام جو اس وقت موزوں لگتا ہے جب تبدیلی کسی صنعتی رفتار پر ہو رہی ہوتی ہے، لیکن جب رفتار جدید ترین صنعتی حدود تک پہنچ جائے تو اس وقت یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ تیزی سے بڑھتا ہوا غیر مستحکم ماحول اپنے اندر کیے جانے والے، زیادہ سے زیادہ غیر طے شدہ فیصلے کرنے کا تقاضا کرتا ہے؛ فوری ردعمل کی ضرورت عملے اور انتظامیہ میں فرق ختم کر دیتا ہے؛ اور نظام مراتب لغزش کا شکار ہو جاتا ہے۔ منصوبہ ساز مقامی صورت حال سے بہت دور اور ناآشنا ہوتے ہیں اور وہ تبدیلی کے سامنے سست روی کے ساتھ ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جونہی یہ خدشہ لاحق ہوتا ہے منتظمین اب کام نہیں کر رہے، منصوبہ ساز اس میں تامل کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ افسر شاہی نظام کی عکاسی کرتے ہوئے، ٹیکنوکریٹ منصوبہ سازی یقینی طور پر غیر جمہوری ہوتی ہے۔

وہ قوتیں جو ہمیں جدید ترین صنعت کاری کی طرف لے کر جا رہی ہیں وہ ان تلاش صنعتی دور کے طریقوں سے راستے پر قائم نہیں رہ سکتیں۔ ایک خاص عرصے تک وہ پسماندہ اور سست روی سے چلنے والی صنعتوں یا طبقات میں کام کرنا جاری رکھ سکتی ہیں لیکن جدید صنعتوں، یونیورسٹیوں اور شہروں میں ان کا غلط استعمال...... جہاں کہیں بھی تبدیلی تیز رفتاری پر مبنی ہے...... عدم استحکام میں اضافہ کر سکتا ہے جو شدید تر لغزشوں اور جھکاؤ کا شکار ہیں۔ مزید یہ کہ جس طرح ناکامی کی شہادتیں اکٹھی کی جاتی ہیں خطرناک قسم کی سیاسی، ثقافتی اور نفسیاتی لہریں چھوڑ دی جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر کنٹرول نہ کر سکنے کا ایک نقصان ذہانت کے خلاف اچانک اور شدید ردعمل ہے۔

سائنس نے انسان کو پہلے اس کے ماحول پر حکمرانی کا احساس دیا اور اس کے بعد مستقبل پر۔ مستقبل کو تغیر ناپذیر سمجھنے کی بجائے اسے اثر پذیر سمجھتے ہوئے اس نے مذاہب پھیلا دیے جو سست روی اور باطنیت کا پرچار کرتے ہیں۔ آج کے دور میں اس بات کی شہادت ملنا کہ معاشرہ کنٹرول سے باہر ہے، سائنس کے ساتھ اثر ربائی پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے اثر کے طور پر ہمیں باطنیت کا ایک خیرہ کن اعادہ نظر آتا ہے۔ اچانک علم نجوم پھیلنے لگتا ہے۔ زین (Zen)، یوگا، مرحومین کی روحوں سے ہم کلام ہونا اور سحر وقت گزاری کی مقبول چیزیں بن گئیں۔ اسی قسم کے ڈائیونیسی تجربات کی روشنی میں ذیلی مسالک بھی وجود میں آ گئے تا کہ غیر لفظی اور قیاساً غیر مخلوط ابلاغ کی راہیں بھی سامنے آئیں۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ "محسوس کرنا" "سوچنے" کی نسبت اہمیت کا حامل ہے کہ جیسے ان دونوں میں کوئی تضاد ہو۔ وجودیت پسند غیبی آوازوں والے کیتھولک باطنیت پسندوں، یوگ نفسیاتی تجزیوں اور ہندو گروؤں سے منسلک ہو جاتے ہیں اور باطنیت اور جذباتیت کو سائنس اور منطق پر ترجیح دیتے ہیں۔

ماقبل سائنس کی طرف لوٹ جانے کا یہ عمل، کوئی حیرت انگیز بات نہیں، اپنے ساتھ معاشرے میں یاد ماضی کی ایک لہر لیے ہوئے ہے۔ روایتی فرنیچر جو کسی گزرے ہوئے زمانے کی یادگار ہے، ایسے کھیل جو گزرے ہوئے وقت کی معمولی چیزوں کو یاد دلائے، آرٹ نوویو (Art nou veau) کا از سر نو ابھر کر سامنے آیا، ایڈورڈ سٹائل کا پھیل جانا، ایسی بھولی بسری شخصیات کی از سر نو دریافت جیسے "Humphrey Bogart" یا "W.C Fields"، یہ تمام کی تمام باتیں ایک سادہ اور نسبتاً کم شوریدہ ماضی کی نفسیاتی خواہش کی عکاسی کرتی ہیں۔ وقتی فیشن کی مشینیں اس بھوک کو بڑھانے کے لیے عمل میں آ گئی ہیں۔ یاد ماضی سے متعلق کاروبار، تیزی سے بڑھتی ہوئی صنعت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

ٹیکنوکریٹ منصوبہ بندی کی ناکامی اور اس کے نتیجے میں کنٹرول سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا احساس "نئے پن" کے فلسفے کی آبیاری کرتا۔ گانے اور اشتہارات "نئی نسل" کی نمائش کا موجب ہے اور قابل ماہرین نفسیات دباؤ کے ممکنہ خطرات پر دلائل دیتے ہوئے ہمیں وارننگ دیتے ہیں کہ ہم اپنی طمانیت کو کبھی بھی ملتوی نہ کریں۔ اس پر عمل کرنا اور اس کی فوری ادائیگی کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ وڈسٹاک راک میوزک فیسٹیول کے اختتام پر ایک ٹین ایجر لڑکی نے اخباری رپورٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا، "ہم لوگ زمانہ حال سے زیادہ وابستہ ہیں، اور بات صرف اتنی ہے کہ آپ اب کیا کرنا چاہتے ہیں...... اگر آپ کسی جگہ زیادہ عرصہ قیام کریں گے تو آپ منصوبہ سازی کرنے لگتے ہیں...... لہٰذا آپ کو حرکت کرتے رہنا چاہیے۔"

برجستہ طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سماجی عدم منصوبہ سازی کا مساوی ایک نمایاں نفسیاتی وصف کی صورت میں موجود ہے۔

اس تمام صورت حال کی تمثیل دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے افراد اور نئے ترقی پسندوں کے درمیان ایک عجیب و غریب اتحاد کی صورت سامنے آئی جس کے لیے مستقبل کے حوالے سے ''Hang lose'' کی اصطلاح استعمال ہوئی۔ کبھی کبھار ہمیں حسن کلام پر مبنی اصطلاح ''نامیاتی ترقی'' بھی سننے کو ملتی ہے۔ چند بنیاد و پرستوں کے درمیان یہ صورت حال انتشاری تلوین کی حیثیت کر لیتی ہے۔ کسی بھی ایسے معاشرے یا ادارے کے لیے طویل المدت منصوبے تشکیل دینا غیر ضروری یا غیر دانشمندانہ ہی نظر نہیں آتا جسے وہ الٹ پلٹ کر دینا چاہتے ہوں، کبھی کبھار تو یہ بات بھی عجیب ہی محسوس ہوتی ہے کہ ہم اگلے گھنٹے یا نصف میٹنگ کی بھی منصوبہ سازی کریں۔ عدم منصوبہ سازی ہی قابلِ تعریف ہے۔

یہ دلیل دینا کہ منصوبہ سازی مستقبل کے حوالے سے کچھ اقدار مسلط کرتی ہے، منصوبہ سازی کے مخالفین اسے یہ کہہ کر رد کرتے ہیں کہ عدم منصوبہ سازی بھی ایسا کر دیتی ہے..... عموماً بدتر نتائج کے ساتھ۔ ٹیکنوکریٹک منصوبہ سازی کے خاص معاشی اور محدود وصف سے تنگ آتے ہوئے۔ یہ لوگ سسٹمز اینالسز (Systems analysis)، کاسٹ بینیفٹ اکاؤنٹنگ اور اسی طرح کے طریقہ کار کی سرزش کرتے ہیں، اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ اگر انھیں مختلف انداز سے استعمال کیا جائے تو یہ آلات، مستقبل کو متصف کرنے کے لیے، منضبط تدابیر کے طور پر کام آسکتے ہیں۔

جب تنقید نگار یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ٹیکنوکریٹک منصوبہ سازی انسان دشمن ہے اس خاص وجہ سے کہ معاشی مفاد میں اضافے کے لیے یہ سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی اقدار کو نظر انداز کرتی ہے تو وہ لوگ عموماً درست کہتے ہیں۔

لیکن جب یہ لوگ غیر منطقی اور غیر سائنسی رویے اختیار کرتے ہیں، یاد ایام کا بیمار سلسلہ اور زمانۂ حال کی رفعت و عظمت تو یہ لوگ نہ صرف غلط ہوتے ہیں بلکہ خطرناک بھی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ صنعت کاری سے متعلق ان کے متبادلات قبل از صنعت کاری اداروں کی طرف لوٹنے کا کہتے ہیں، ٹیکنوکریسی کے لیے ان کا متبادل پس ٹیکنوکریسی نہیں بلکہ بیش ٹیکنوکریسی ہے۔

کسی بھی چیز کا استعمال اتنا بھونڈا اور خطرناک نہیں۔ نظریاتی دلائل جو مرضی ہوں دنیا میں وحشیانہ

قوتیں کھلی پھر رہی ہیں۔ چاہے ہم مستقبل کے صدمے کو روکنا چاہیں یا آبادی پر کنٹرول کرنا چاہیں، آلودگی پر قابو پانا چاہیں یا ہتھیار کی دوڑ روکنا چاہیں، ہم کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ انتہائی اہمیت کے حامل فیصلوں کو عجلت میں کیا جائے، غیر دانشمندی سے کیا جائے اور منصوبہ سازی کے بغیر کیا جائے۔ اس معاملے میں غفلت برتنا خودکشی کے مترادف ہے۔

ہمیں ماضی کے غیر منطقی سلسلوں کو دہرانے کی ضرورت نہیں، نہ ہی تبدیلی کی سست رفتار قبولیت، نہ ہی مایوسی اور نہ لاوجودیت۔ اس کی بجائے ہمیں ایک نئے لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ ان کئی وجوہات کے پیش نظر جو واضح ہو جائیں گی، میں اس لائحہ عمل کو ''سماجی مستقبلیت'' کا نام دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس لائحہ عمل سے لیس ہو کر تبدیلی کے اس نظام میں مہارت کی ایک نئی سطح تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ہم منصوبہ سازی کی ایک ایسی قسم ایجاد کر سکتے ہیں جو انسان دوست ہو، زیادہ دور رس ہو اور اب تک عمل میں لائے جانے والے منصوبوں میں نسبتاً زیادہ جمہوری ہو۔ مختصر یہ کہ ہم ٹیکنوکریسی سے سبقت لے جا سکتے ہیں۔

منصوبہ ساز کی انسان دوستی

ٹیکنوکریٹس مسلسل معاشی سوچ کے عمل سے گزرتے ہیں۔ ماسوائے جنگ کے دوران اور انتہائی ہنگامی حالت کے، وہ اس قضیے سے شروع کرتے ہیں کہ غیر معاشی مسائل کو بھی معاشی منصوبہ سازے سے حل کیا جا سکتا ہے۔

سماجی مستقبلیت مارکسی اور کینیسی منیجرز دونوں کے بنیادی قیاسوں کو چیلنج کرتی ہے۔ زمان و مکاں کے، اپنے، تاریخی تناظر میں مادی ترقی کا یہ یک رخا سلسلہ نوع انسانی کی بہتر خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔ تاہم جیسے ہی ہم جدید ترین صنعت کاری کے دور میں داخل ہوتے ہیں ایک نیا خلقیہ ابھر کر سامنے آتا ہے جس میں دیگر اہداف مساوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں حتیٰ کہ وہ معاشی بہبود کے لیے مختص معاملات کو بھی تقویت دیتے ہیں۔ ذاتی حیثیت میں خود کفالت، سماجی ذمے داری، جمالیاتی کارنامے، لذت پسند انفرادیت اور دیگر اہداف برسرِ پیکار ہوتے ہیں اور اکثر مادی کامیابیوں کے لیے خام نوعیت کی کوششوں سے برتری لے جاتے ہیں۔ خوشحالی ایک بنیادی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتی ہے جس سے افراد مختلف نوعیت کے مابعد اہداف کے حصول کے لیے کوششیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

بیک وقت، ایسے معاشرے میں جو جدید ترین صنعت کاری کی طرف گامزن ہیں معاشی

متغیرے..... تنخواہیں، ادائیگیوں میں توازن، پیداوار..... غیر معاشی ماحول میں ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے اثر پذیر ہو جاتا ہے۔ معاشی مسائل بکثرت موجود ہیں لیکن معاملات کا لامتناہی سلسلہ جو معاشی حوالے سے ثانوی اہمیت کے حامل ہیں، اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ نسل پرستی، نسلوں کے درمیان جاری جنگ، جرائم، ثقافتی خود مختاری، تشدد۔ ان تمام کے معاشی زاویے ہیں؛ تاہم ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے مؤثر طریقے سے صرف اور صرف معاشی اصولوں کے مطابق ہی حل کیا جائے۔

چیزوں کی تیاری سے خدمات کی فراہمی تک کا سفر، اشیا اور خدمات دونوں کی نفسیات آرائی، اور بالآخر تجرباتی پیداوار کی طرف تک کی تبدیلی یہ تمام چیزیں معاشی شعبے کو غیر معاشی قوتوں کے ساتھ بڑی مضبوطی سے باندھ دیتی ہیں۔ صارف کی ترجیحات لائف سٹائل میں ہونے والی تیز تر تبدیلیوں کے مطابق تبدیل ہوتی ہیں اور اسی حوالے سے معاشی انتشار کے دوران ذیلی مسالک کے وجود میں آنے اور معدوم ہو جانے کا عمل وجود میں آتا ہے۔ جدید ترین صنعتی پیداوار علامتی کارستانی میں ماہر ہنرمندوں کا تقاضا کرتی ہے اور وہ بھی ایسے کہ جو کچھ ان کے ذہنوں میں آتا ہے وہ ماضی کی نسبت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے اور اس کا زیادہ انحصار ثقافتی عوامل پر ہے۔

اس بات کے بھی شواہد ملے ہیں کہ مالیاتی نظام سماجی اور نفسیاتی دباؤ کا اثر پذیر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ صرف اس خوشحال معاشرے کا ہی خاصہ ہے جو جدید ترین صنعت کاری کی طرف اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے کہ کوئی شخص سرمایہ کاری کے نئے صنعت کاری کی طرف اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے کہ کوئی شخص سرمایہ کاری کے لیے ذرائع کی ایجاد دیکھ سکتا ہے جیسے مشترکہ فنڈز جو غیر معاشی امور کے تحت تحرک اختیار کرتے ہیں یا مسدود کر دیے جاتے ہیں۔ وینڈر بلٹ میوچل فنڈ(Vanderbilt Mutual Fund)اور پرویڈنڈ فنڈ (Provident Fund)اس بات سے انکاری ہیں کہ ان کا سرمایہ شراب یا تمباکو کی کمپنیوں کے حصص (Shares) میں لگایا جائے۔ اور بڑے Mates Fund کسی بھی ایسی کمپنی کے سٹاک کو رد کر دیتی ہے جو گولا بارود کی تیاری میں ملوث ہو، جبکہ چھوٹا Vantage 10/90 فنڈ اپنے اثاثوں کا کچھ فی صد ایسی صنعتوں میں لگاتی ہے جو ترقی پذیر ممالک میں غذائی اور آبادی کے مسائل کے تدارک کے لیے مصروف عمل ہیں۔ کچھ ایسے بھی فنڈ ہیں جن کی بنیادی سرمایہ کاری صرف نسلی طور پر متحد و اتحام پر مشتمل ہاؤسنگ سکیموں پر ہوتی ہے۔ فورڈ فاؤنڈیشن(Ford foundation)اور پریسبٹیرین چرچ دونوں اجتماعی طور پر اپنی سرمایہ کاریوں کا

بہت بڑا حصہ ایسی کمپنیوں پر صرف کرتی ہیں جن کا انتخاب وہ صرف معاشی ادائیگیوں کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ ایسی کمپنیاں بھی جو شہری مسائل حل کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ اس طرح کی پیش رفت، چاہے تعداد میں انتہائی کم ہی کیوں نہ ہو، تبدیلی کی سمت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اسی دوران امریکہ کی ایسی بڑی کمپنیاں جنھوں نے شہری علاقوں میں ٹھوس نوعیت کی سرمایہ کاری کی ہوئی ہے وہ، باوجود اپنی ناپسندیدگی کے سماجی تبدیلی کے شدید گرداب کی طرف کھنچی چلی جاتی ہیں۔ آج کے دور میں سینکڑوں کمپنیاں ایسی ہیں جو مستقل بے روزگار افراد کو روزگار فراہم کر رہی ہیں، خواندگی اور روزگار کی تربیت کے پروگرام ترتیب دے رہی ہیں، اس کے علاوہ نامعلوم قسم کی دیگر سرگرمیاں۔ اس طرح کی نئی چیزوں کی شمولیت سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی کارپوریشن امریکن ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کمپنی نے شعبہ امور ماحولیات (Department of Environmental Affairs) قائم کیا۔ یہ ابتدائی اور بنیادی سطح کا کام ہے، یہ ایجنسی کے ذمے بہت سے امور ہیں جن کا تعلق پانی اور فضائی آلودگی سے، کمپنی کے ٹرکوں اور آلات کی جمالیاتی نمود کو بہتر بنانے سے ہے اور شہری علاقوں میں سکول کی تعلیم سے بیشتر بہت سے پروگراموں سے ہے۔ ان میں سے کسی چیز کا یہ مطلب نہیں کہ بڑی کمپنیاں انسان دوست بنتی جا رہی ہیں؛ بات صرف یہ ہے کہ یہ کمپنیاں معاشی شعبے اور مضبوط ثقافتی، نفسیاتی اور سماجی قوتوں کے درمیان بڑھتے ہوئے دیرینہ تعلق کی اہمیت اجاگر کرتے ہیں۔

یہ قوتیں ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہوتی ہیں لیکن اکثر ٹیکنو کریٹ منصوبہ ساز اور منیجر ایسے رویے اختیار کرتے ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ ایسے ردعمل کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ یہ بات بھی شک وشبہ سے بالا ہے کہ معاشی قضیے اتنی گہرائی تک سرائیت کیے ہوئے ہیں اور ان کا پھیلاؤ سرمایہ دارانہ اور کمیونسٹ ممالک میں اتنا وسیع ہے کہ وہ تبدیلی کے نظم ونسق کے لیے ضروری معلوماتی نظاموں کو بھی مسخ کر دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر تمام جدید اور ترقی یافتہ اقوام معاشی کارکردگی کی پیائش کے لیے مشینوں کا ہی سہارا لیتی ہیں۔ ہم لوگ تبدیلیوں کی تمام تر سمتوں کو عملاً روزمرہ کے حساب سے جانتے ہیں کہ ان میں ہونے والی پیداواری، قیمتوں کے حوالے سے، سرمایہ کاری کے حوالے اور اسی طرح کے دیگر عوامل کے حساب سے کس نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ''معاشی اشاریوں'' کے ایک مجموعے کے ذریعے ہم معیشت کی اجتماعی صحت کا اندازہ لگا لیتے ہیں، وہ رفتار جس پر اس میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے اور تبدیلی کی مجموعی سمتیں۔ ان تمام

اقدامات کے بغیر معیشت پر ہماری دسترس نسبتاً کم مؤثر ہی ہوگی۔

اس کے برعکس ہمارے پاس کوئی ایسے ذرائع نہیں ہیں اور نہ ہی قابلِ موازنہ ''سماجی اشارے ہیں جو ہمیں یہ بتا سکیں کہ یہ معاشرہ، جو معیشت سے ذرا منفرد ہے، بھی صحت مند ہے۔ ہمارے پاس کوئی ذرائع نہیں جو ہمیں ''معیارِ زندگی'' کے بارے میں بتا سکیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسی منظم علامتیں بھی نہیں ہیں جو ہمیں یہ بتا سکیں کہ افراد ایک دوسرے سے بیگانگی کا شکار ہیں؛ آیا تعلیم زیادہ مؤثر ہے؛ آیا مصوری، موسیقی اور ادب فروغ پا رہے ہیں؛ آیا اخلاقیات، سخاوت یا رحم دلی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکہ کے سابقہ سیکریٹری داخلہ سٹیورٹ اوڈل (Stewart Udall) لکھتے ہیں، ''مجموعی قومی پیداوار ہمارا مقدس جام مسیح ہے..... لیکن ہمارے پاس کوئی ماحولیاتی اشاریہ نہیں ہے، کوئی ایسے اعداد و شمار نہیں ہیں جو یہ تعین کر سکیں کہ اس ملک میں سکونت کے حوالے سے سال بہ سال کیا تبدیلی اور بہتری آ رہی ہے''۔

بظاہر یہ ایک خالص تکنیکی مسئلہ نظر آتا ہے..... ایک ایسی چیز پر ماہرین شماریات بحث کریں۔ تاہم اس کی انتہائی سنجیدہ سیاسی اہمیت ہے کیونکہ ایسے افعال کی عدم دستیابی سے یہ بات مشکل دکھائی دیتی ہے کہ قومی یا مقامی پالیسیوں کو موزوں، طویل المیعاد سماجی اہداف سے جوڑا جائے۔ ان اشارات کی غیر موجودگی بیہودہ ٹیکنوکریسی کو دوام بخشتی ہے۔

عوام کو اس کے بارے میں کم ہی معلومات ہیں کہ اس معاملے پر ایک، نسبتاً مہذب قسم کی، لیکن تلخ نوعیت کی بحث کا آغاز واشنگٹن میں ہو گیا ہے۔ ٹیکنوکریٹک منصوبہ ساز اور ماہرین معاشیات سماجی اشاریوں میں ایک ایسا نظریہ دیکھتے ہیں جو ان کی مضبوط پوزیشن کے لیے خطرہ ہو وہ بھی سیاسی منصوبہ ساز ماہرین معاشیات کے حوالے سے۔ اس کے برعکس سماجی اشاریوں کی ضرورت کا زبردست اظہار سرکردہ سماجی سائنس دانوں، جیسے وائن سٹیٹ یونیورسٹی (Wayne State University) کے برٹریم ایم گراس، رسل سیج فاؤنڈیشن (Russell Sage Foundation) کے ایلینو رشیلڈن اور ولبرٹ مور، اور ہاورڈ یونیورسٹی کے ڈینیل بیل (Daniel Bell) اور ریمنڈ بائر (Raymond Bauer)، نے کیا۔ مسٹر گراس کہتے ہیں، ''ہم لوگ امریکی حکومت کی موجودہ شماریاتی ترقی کی ''معاشی کم نظری'' کے خلاف تیزی سے پھیلتی بغاوت دیکھ رہے ہیں۔''

اس بغاوت کو سیاست دانوں کے ایک چھوٹے سے گروپ اور سرکاری عہدیداروں کی طرف سے شاندار حمایت حاصل ہو گئی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو پوسٹ ٹیکنوکریٹک سوشل انٹیلی جنس سسٹم (Post-technocratic

Social Intelligence Systm) کی شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ ان میں وائٹ ہاؤس کے ایک سرکردہ مشیر ڈینیئل پی۔ موینہن (Deniel P.Moynihan)؛ سینیٹر والٹر مونڈیل جن کا تعلق منی سوٹا (Minnesota) سے ہے اور سینیٹر فریڈ ہیرس (Fred Harris) جن کا تعلق اوکلاہوما (Oklahoma) سے ہے؛ اس کے علاوہ کئی سابق کابینہ افسران بھی شامل ہیں۔ مستقبل قریب میں ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ دنیا کے مختلف دارالحکومتوں میں بھی اس طرح کی بغاوت سر اٹھائے گی اور ٹیکنوکریٹس اور مابعد۔ٹیکنوکریٹس کے درمیان ایک خط کھینچ دیا جائے گا۔

تاہم مستقبل کے صدمے کا خطرہ از خود ایسے نئے سماجی اقدامات کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو سماجی اشاریوں کے اوپر لکھے گئے، تیزی سے پھیلتے ہوئے، ادب میں ابھی تک نظر نہیں آئیں۔ مثال کے طور پر ہمیں ایسی تدابیر کی شدت سے ضرورت ہے جو مختلف طبقات، آبادی کے مختلف گروہوں اور ذاتی تجربے میں ناپائیداری کی سطح کی پیمائش کر سکیں۔ اصولی طور پر یہ بات بھی ممکن ہے کہ ایک ''ناپائیدار اشاریہ'' تشکیل دیا جائے جو ایسی شرح کو عیاں کر دے کہ جس پر ہم چیزوں، مقامات اور لوگوں، تنظیموں اور معلوماتی ڈھانچوں سے تعلقات بناتے اور توڑتے ہیں جو ہمارے ماحول پر مشتمل ہیں۔

اس طرح کا اشاریہ، دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ، معاشرے کے مختلف گروپوں کے تجربات کو عیاں کر دے گا۔ بے شمار لوگوں کے جامد اور ناگوار معیارِ زندگی میں، دیگر افراد کی زندگیوں میں شوریدہ سر قسم کا ردوبدل۔ وہ سرکاری پالیسیاں جو دونوں قسم کے افراد سے ایک ہی طرح نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتی ہیں انھیں ایک گروپ کی طرف سے یا دوسرے سے..... یا دونوں کی طرف سے..... ناراضگی اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

اسی طرح ہمیں ماحول میں ندرت کے رسوم و رواج کی ضرورت ہے۔ طبقات، تنظیموں یا افراد کو پہلی مرتبہ درپیش صورت حال کا مقابلہ کیسے کرنا ہے؟ اوسط درجے کے محنت کش گھرانوں میں کتنی ایسی چیزیں ہیں جو اپنے کام اور نظر آنے میں نئی ہیں؛ ان میں سے کتنی چیزیں روایتی اہمیت کی حامل ہیں۔ تحرک جو بیش تحرک بغیر ہو، اس کے لیے..... چیزوں، افراد یا کسی اہم سمت کی جانب..... ندرت کے کیسے معیار کی ضرورت ہے؟ بچے اپنے والدین کی نسبت کتنی زیادہ ندرت جذب کر سکتے ہیں..... اگر یہ بات درست ہے کہ وہ زیادہ ندرت جذب کر سکتے ہیں؟ ندرت کو نچلی سطح پر برداشت کرنے کے لیے عمر کا اس سے کیا تعلق نکلتا ہے۔ اور اس

طرح کی دیگر تفریق ان سیاسی اور باہمی نسلی تضاد سے کس طرح رابطہ رکھتی ہیں جو جدید ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں کو پارہ پارہ کر رہی ہیں؟ نئی چیزوں کی یلغار کا مطالعہ کرنے اور ان کا اندازہ لگانے کے بعد شاید ہم اس قابل ہو جائیں کہ اپنے سماجی ڈھانچے اور اپنی نجی زندگیوں میں آنے والی تبدیلیوں کی سرایت کو کنٹرول کر سکیں۔

اور پھر انتخاب اور بیش انتخاب کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا ہم انسانی زندگیوں میں اہم انتخاب کے معیار کے لیے پیمانہ بنا سکتے ہیں؟ کیا ایسی کوئی حکومت جو خود کو جمہوری کہلوانے کا دعویٰ کرتی ہو اس طرح کے کسی معاملے سے غرض و غایت نہیں رکھے گی؟ آزادی اظہار سے متعلق جتنی بھی لفاظی کا استعمال کیا جائے دنیا کی کوئی بھی حکومتی ایجنسی یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس نے اس کی پیمائش کی ہے۔ قیاس صرف اتنا ہی ہے کہ زیادہ آمدنی یا خوشحالی کا مطلب ہے بیش انتخاب اور اس بیش انتخاب کا ثمرہ ہے آزادی۔ کیا یہ وقت نہیں ہے کہ اپنے سیاسی نظام کے بنیادی قیاسوں کا تجزیہ کیا جائے؟ مابعد ٹیکنوکریٹک منصوبہ سازی کو صرف ان معاملات سے کیا نبرد آزما ہونا چاہیے اس صورت میں کہ اگر ہم مستقبل کے صدمے کا التوا چاہتے ہیں اور ایک انسان دوست جدید ترین صنعت کاری کے حامل معاشرے کا قیام چاہتے ہیں۔

اشاریوں کا ایک حساس قسم کا نظام جس کا مقصد سماجی اور ثقافتی اہداف کے حصول کی پیمائش' بنا اور معاشی اشاریوں سے منسلک رہنا ہے وہ ان تکنیکی اوزاروں کا حصہ ہے جس کی کسی معاشرے کو اس وقت ضرورت ہوتی ہے جب وہ معاشی، تکنیکی ترقی کے اگلے مرحلے میں کامیابی سے داخل ہونے سے پہلے کی حالت میں ہو۔ یہ مابعد ٹیکنوکریٹک منصوبہ سازی اور چینج مینجمنٹ کی قطعی شرط لازم ہے۔

منصوبہ سازی کی یہ انسان دوستی ہمارے سیاسی ڈھانچوں میں بھی چھلکنی چاہیے۔ جدید ترین صنعت کاری کے اس سماجی دانشورانہ نظام کو معاشرے کے فیصلہ ساز مراکز سے جوڑنے کے لیے ہمیں معیارِ زندگی کی غرض و غایت کو اداراتی صورت دینی ہوگی۔ لہٰذا سماجی اشاریوں کی اس تحریک میں شامل مسٹر برٹرام گراس (Bertram Gross) اور دیگر افراد نے صدر محترم کے لیے "Council of Social Advisors to the president" کی تجویز پیش کی ہے اور اسے وہ پہلے سے موجود "Council of Economic Advisors" کی سی صورت میں دیکھ رہے ہیں، اور یہ سماجی شعبوں میں متوازی امور سرانجام دے گی۔ یہ نئی ایجنسی کلیدی سماجی اشاریوں کی نگرانی کرے گی اس طرح جیسے Council of Economic Advisors معاشی اشاریوں پر نظر رکھتی ہے اور اس شعبے میں ہونے والی تبدیلیوں سے صدر محترم کو آگاہ کرتی ہے۔ یہ کونسل معیارِ زندگی پر اپنی سالانہ رپورٹ پیش کرے گی جو بڑی وضاحت سے ہماری سماجی ترقی (یا اس میں کمی) کو مخصوص اہداف کی صورت پیش کر دے گی۔ لہٰذا یہ رپورٹ "Counsil of Economic Advisors" کی تیار کردہ رپورٹ کا ضمیمہ اور توازن پیش کرے گی۔ ہماری سماجی حالت کے بارے میں مفید اعداد و شمار فراہم کر کے "Council of Social Advisors" عمومی منصوبہ بندی پر اثر انداز ہونا شروع ہو جائے گی اور اسے سماجی لاگتوں اور مفادات کے لیے زیادہ حساس بنا دے گی اور نسبتاً کم ٹیکنوکریٹک اور معاشی امور پر زور دینے والا۔

اس طرح کی کونسلوں کا قیام، نہ صرف وفاقی سطح پر بلکہ ریاستی اور میونسپل سطح پر بھی، ہمارے تمام مسائل حل نہیں کر دے گا؛ یہ تضادات کا تدارک بھی نہیں کرے گا؛ اور یہ اس بات کی بھی ضمانت بھی نہیں دے گا کہ تمام اشاریوں کا استعمال مناسب طریقے سے کیا جائے۔ مختصر یہ کہ اس کی وجہ سے سیاسی زندگی سے سیاست کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی وجہ سے اس بات کا اعادہ ہو جائے گا کہ ترقی کے مقاصد...... اور سیاسی قوت...... معاشیات کی حدود سے باہر نکل جائیں گے۔ معیارِ زندگی میں تبدیلی کے اشاریوں کی نگرانی کے لیے ایجنسیوں کا تعین ہمیں منصوبہ سازوں کی انسان دوستی کی طرف لے جاتا ہے جو سماجی مستقبلیت کے لائحہ عمل کا لازمی پہلا مرحلہ ہے۔

وقت کے افق

ٹیکنوکریٹس کوتاہ بینی کا شکار ہیں۔ ان کا مطمح نظر فوری ردعمل اور فوری نتائج کے بارے میں سوچنا ہے۔ یہ لوگ موجودہ نسل کے غیر پختہ ارکان ہیں۔

اگر کسی خطے کو بجلی کی ضرورت ہے، تو یہ ایک پاور پلانٹ کی طرف بڑھیں گے۔ یہ حقیقت کہ اس قسم کا پلانٹ محنت کشوں کے نمونوں میں ذرا تبدیلی کر دے گا اور یہ کہ ایک دہائی کے اندر لوگوں کو کام سے فارغ کر دے گا، محنت کشوں کی بڑے پیمانے پر تربیت نو پر مجبور کرے گا اور کسی قریبی شہر کی سماجی بہبود کی لاگتوں میں شاندار اضافہ کر دے گا۔ اس طرح کا خیال وقت کے لحاظ سے ابھی بہت دور ہے کہ ان سے غرض رکھی جائے۔ اس حقیقت کا ادراک کہ یہ پلانٹ ایسے تباہ کن قسم کے ماحولیاتی نتائج کا آغاز کر سکتا ہے جو ایک نسل بعد ان کے وقت کے دائرے میں شمار ہی نہیں ہوں گے۔

تیز رفتار تبدیلی کی اس دنیا میں ہمارے سامنے اگلا سال، اگلے مہینے کی نسبت، زیادہ قریب ہے اور

یہ سب کچھ ایک پر کشش عہد کا سلسلہ ہے۔ زندگی کی اس یکسر تبدیلی شدہ حقیقت کو صنعت، حکومت یا کہیں بھی موجود فیصلہ سازوں کو داخلی بنالینا چاہیے۔ ان کے ''وقت کے افقوں'' میں وسعت آنی چاہیے۔

مستقبل بعید کے لیے منصوبہ سازی کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ خود کو راسخ العقیدہ پروگراموں سے منسوب کر لینا۔ منصوبے عارضی، سیال اور مسلسل دہرائے جانے کے عمل کا شکار ہو سکتے ہیں۔ تاہم لچک کا مطلب تنگ نظری نہیں، ٹیکنوکریسی سے سبقت لے جانے سے ہمارے وقت کے افق دہائیوں کے حساب سے، حتیٰ کہ نسلوں کے حساب سے، مستقبل میں چلے جائیں گے۔ اس کے لیے ہمارے معمول کے منصوبوں کی طوالت سے زیادہ چند چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب ہے تمام معاشرے کی، نیچے سے اوپر تک اور جدید معاشی آگہی کے ساتھ مستقبل کے شعور کے ساتھ، ریزش۔

حالیہ سالوں کا سب سے مضبوط مظہر، مستقبل کے مطالعے کا عزم لیے ہوئے، تنظیموں کی فراوانی ہے۔ یہ حالیہ پیش رفت، اپنی دانست میں، تبدیلی کی رفتار کے سامنے قرار گیرانہ ردعمل ہے۔ چند سالوں کے اندر اندر ہمارے سامنے مستقبل سے منسوب سپاہ دانش تھی جیسے انسٹی ٹیوٹ فار دی فیوچر؛ نصابی سٹڈی گروپس کی تشکیل جیسے ''Commission on the year 2000'' اور ''Harvard programme on Technology of science''؛ برطانیہ، فرانس، اٹلی، جرمنی اور امریکہ میں مستقبلیت پر مبنی جریدوں کا منظر عام پر آنا؛ پیش بینی اور اس سے متعلقہ موضوعات پر یونیورسٹی کورسز کا پھیلاؤ؛ اوسلو، برلن، اور کیوٹو میں بین الاقوامی سطح پر مستقبلیت پر مبنی میٹنگز کا انعقاد؛ فیوچریبلز (Futuribles)، یورپ 2000 مین کائنڈ (Mankind) 2000 اور دی ورلڈ فیوچر سوسائٹی جیسے گروپوں کا اتصال۔

اب ہمیں مستقبلیت پر مبنی مراکز دنیا کے مختلف شہروں مغربی برہن، پراگ، لندن، ماسکو، روم، واشنگٹن، کراکس حتیٰ کہ برازیل کے دور افتادہ جنگلوں بیلم (Belem) اور بیلو ہوریزونٹ (Belo Horizonte) میں نظر آتے ہیں۔ روایتی ٹیکنوکریٹک منصوبہ سازوں کے برعکس کہ جن کے افق آنے والے وقت میں ان تبدیلیوں سے سروکار رکھتے ہیں جو پندرہ، پچیس حتیٰ کہ پچاس سالوں میں ہونے والی ہیں۔

ہر معاشرہ نہ صرف ''اغلب'' مستقبل کے ایک تسلسل کو دیکھتا ہے بلکہ ''ممکنہ'' مستقبل کے ایک سلسلے کو دیکھتا ہے اور ''قابلِ ترجیح'' مستقبل کے ایک تضاد کو تبدیلی کا نظم ونسق مختلف ''ممکنہ'' چیزوں کو ''اغلب'' میں تبدیل کر دینے کی کوشش ہے، وہ بھی متفقہ ترجیحات کی تلاش میں۔ مستقبلیت کی سائنس کی اغلب دعوتوں کا

تعین کرتے ہوئے مستقبلیت کے فن کی ممکنہ دعوتوں کی خاکہ کشی کرتے ہوئے۔۔ مستقبلیت کی سیاست کے لیے قابلِ ترجیح دعوتوں کی تعریف وتوضیح کرتے ہوئے۔

آج کے دور میں عالمی سطح پر چلنے والی مستقبلیت کی تحریک ان عوامل میں فرق کو بہتر طریقے سے واضح نہیں کر سکتی۔ اس کا زیادہ زور اغلب چیزوں کی تخمینہ کاری پر تھا۔ لہٰذا ان بہت سے مراکز میں ماہرین معاشیات، ماہرین عمرانیات، ریاضی دان، ماہرین حیاتیات، ماہرین طبیعیات، آپریشن ریسرچرز اور دیگر افراد نے مستقبل کے امکانات کی پیش بینی کے لیے مختلف طریقے ایجاد کیے اور ان کا اطلاق کیا۔ کس تاریخ تک آبی کاشت دنیا کی آدھی آبادی کو غذائی اشیا فراہم کرنے لگے گی؟ اگلے پندرہ سالوں میں وہ کون سے مسائل ہوں گے جو بجلی سے چلنے والی کاریں گیس سے چلنے والی کاروں کے لیے پیدا کریں گی؟ 1980ء تک ''Sino-Soviet detente'' کی صورت حال کیا ہوگی؟ تفریحی نمونوں، شہری حکومتوں، نسلی تعلق میں کون سی تبدیلیاں اغلب ہیں؟

مختلف نوعیت کے واقعات اور رواجوں کے باہمی ربط پر زور دیتے ہوئے سائنسی پیرویان مستقبلیت ٹیکنالوجی کے سماجی اثرات پر زیادہ توجہ مرکوز کر رہے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ فار دی فیوچر دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ، جدید ترین ذرائع ابلاغ کی ٹیکنالوجی کے اغلب سماجی اور ثقافتی اثرات کی چھان بین کر رہا ہے۔ ہاورڈ میں موجود گروپ ان سماجی مسائل کی طرف اپنی توجہ مبذول کیے ہوئے ہے جو بائیو.........میڈیکل ترقی سے ابھر سکتی ہیں۔ برازیل میں مستقبل بین مختلف معاشی ترقیاتی پالیسیوں کے اغلب اثرات کا تجزیہ کر رہے ہیں۔

اغلب مستقبل کا منطقی مطالعہ مجبوری ہے۔ یہ بات ناممکن نظر آتی ہے کہ کوئی فرد کسی مصروف دن میں اغلب مستقبل کے بارے میں ہزاروں قیاس کیے بغیر وہ دن گزارے، روزگار کے لیے روزانہ سفر کرنے والا شخص اگر یہ کہتا ہے، ''میں ٹھیک چھ بجے گھر ہوں گا''، تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کی یہ توقع اس قیاس پر مبنی ہے کہ ٹرین وقت پر روانہ ہوگی۔ جب جونی (Johnny) کی والدہ اسے سکول کے لیے روانہ کرتی ہے تو وہ یہ قیاس ضرور کرتی ہے کہ جب جونی سکول پہنچے گا تو سکول وہاں موجود ہوگا۔ جس طرح کسی بحری جہاز کا کیپٹن اس جہاز کے راستے کا تعین کیے بغیر اسے نہیں چلاتا اسی طرح ہم اپنی زندگیوں کو رواں دواں نہیں رکھ سکتے۔ معاشرے بھی آنے والے کل سے متعلق قصبوں پر مبنی تعمیرات تیار کرتے ہیں۔ صنعتوں، حکومتوں،

سیاست اور معاشرے کے دیگر شعبوں میں موجود فیصلہ ساز لوگ ان کے بغیر اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے۔ ہنگامہ پرور تبدیلیوں کے دور میں اغلب مستقبل کے بارے میں، سماجی طور پر تشکیل کردہ یہ تخیل اپنی درستی میں ذرا کمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آج کے عہد میں، معاشرے کے اندر کنٹرول کے اس فقدان کا بلا واسطہ تعلق اغلب مستقبل کے ناکافی تخیل سے ہے۔

یہ بات بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ کوئی بھی شخص مکمل طور پر مستقبل کے بارے میں جان نہیں سکتا۔ ہم لوگ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے قیاس کو منظم اور گہرا کر دیں اور ان کو امکانی صورت دینے کی کوششوں کو تیز تر کر دیں۔ اگر چہ یہ ایک مشکل کام ہے تاہم مستقبل کے بارے میں پیش بینی سے اس میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح سے اگر کسی پیش بینی کی تشہیر کر دی جائے، تو تشہیر کا یہ عمل (جو تفتیش سے منفرد ہے) اضطراب بھی پیدا کرتا ہے پیش بینی تکمیل ذات یا خود شکست دونوں نوعیت کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ چونکہ وقت کا افق ایک منفرد مستقبل تک پھیلا ہوا ہے لہٰذا ہمیں معلومات اور قیاسی کاموں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ مزید یہ کہ کچھ انہونی قسم کے واقعات...... جیسے اہم شخصیات کے قتل وغیرہ...... اپنے تمام تر عزائم اور مقاصد کے ساتھ موجودہ صورت حال میں ناقابلِ پیش گوئی ہیں (اگر چہ ہم اس قسم کے واقعات کے درجات کے بارے میں پیش بینی کر سکتے ہیں)۔

اس تمام صورت حال کے باوجود اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس مشہور اسطورہ کو فراموش کر دیں کہ مستقبل ''ناقابلِ ادراک'' ہے۔ یہ تمام کی تمام مشکلات ہمارے ترکیے اور ہمیں چیلنج کرنے کے لیے تو ہونی چاہئیں ہمیں مفلوج کرنے کے لیے نہیں۔ ولیم ایف آگبرن (William F.Ogburn) جن کا شمار سماجی تبدیلی پر کرم کرنے والے دنیا کے سرکردہ افراد میں ہوتا ہے، نے ایک مرتبہ تحریر کیا: ''ہمیں ہماری سوچوں میں اندازے کے نظریے کو جگہ دینی چاہیے، یعنی اندازے میں درستی اور عدم درستی کے مختلف درجے ہیں۔'' مستقبل میں کیا ہونے والا ہے اس سے متعلق ایک مکدر سا نظریہ، نہ ہونے سے بہتر ہے، اور انھوں نے مزید بتایا کہ بہت سے معاملات کے لیے انتہائی درستی یکسر غیر ضروری ہے۔

لہٰذا ہم لوگ مستقبل کی اغلب صورتحال سے نبرد آزما ہونے کے لیے اتنے بھی بے بس نہیں جتنا لوگ ہمارے بارے میں سوچتے ہیں۔ برطانوی سماجی سائنسدان ڈونلڈ جی میکرے (Donald G.Mackae) نے بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے: ''جدید ماہرین عمرانیات، حقیقتاً، ایک کثیر تعداد میں، ایک بہتر یقین دہانی کے ساتھ،

قلیل المیعاد اور محدود پیش بینیاں کر سکتے ہیں۔'' تاہم سماجی سائنس کے مجوزہ طریقوں سے ہٹ کر ہم انتہائی مضبوط نئے اوزاروں کے ساتھ مستقبل کا کھوج لگانے کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ان کا دائرہ کار موجودہ رواجوں کے تخمینہ لگانے کے طریقوں سے لے کر انتہائی پیچیدہ ماڈلوں، کھیلوں اور تشکیلات کی تیاری، تفصیلی قیاسی تناظر کی تعمیر، متعلقہ تمثیلات کے لیے تاریخ کے مرحلہ وار اور منظم مطالعہ، شکلیاتی تحقیق، متعلقہ تجزیات، سیاق وسباق سے متعلق خاکہ کشی اور اسی حوالے سے دیگر چیزیں۔ تکنیکی پیش گوئیوں سے متعلق ایک تفصیلی تفتیش میں OECD کے سابقہ مشیر اور MIT کے ریسرچ ایسوسی ایٹ ڈاکٹر ایریچ جینٹسچ (Dr.Erich Jantsch) نے بے شمار، امتیازی قسم کی، نئی تکنیک کی نشاندہی کی جو استعمال میں لائی جا رہی ہیں یا تجرباتی مرحلے میں ہیں۔

مڈل ٹاؤن، کنکٹیکٹ (Connecticut) میں واقع انسٹی ٹیوٹ فار دی فیوچر، جو مستقبلیت سے متعلق سیاہ دانش کا روایتی ادارہ ہے۔ وہ پیش بینی سے متعلق نئے اوزار کی تیاری میں سرکردہ حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک ڈیلفی (Delphi) ہے۔ ایک ایسا طریقہ کار جس کا بیشتر کام ایک فلسفی، ریاضی دان اور IFF کے شریک بانی ڈاکٹر اولاف ہیلمر (Olaf Helmer) نے کیا۔ ڈیلفی کی مدد سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ماہرین کی ایک بڑی تعداد کے تیار کردہ ''بدیہی'' تخمینوں کے نظم وترتیب کی مدد سے مستقبل میں دور تک دیکھا جائے۔ ڈیلفی پر کیے جانے والے کام نے مزید جدت کی راہ کھول دی ہے، جس کی بدولت تبدیلی کی شرح رفتار کو باترتیب بنا کر مستقبل کے دھچکے کے تدارک کی کوشش کی جائے گی اور اسی وجہ سے اس طریقہ کار کو خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ آئی ایف ایف (IFF) سے تعلق والے تھیوڈور جے گورڈن (Theodore J.Gorden) کے ہاتھوں اپنی ابتدا کے بعد، یہ طریقہء کار جسے (Cross impact Matrix Analysis) کا نام دیا گیا ہے، یہ ایک جدت کے دوسری جدت پر اثرات کا جائزہ لیتے ہیں، جس کی وجہ سے پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ سماجی، تکنیکی اور دیگر وقوعات کے پیچیدہ سلسلوں کا پیشگی تجزیہ پیش کیا جا سکے...... اور وہ شرح بھی جس پر وہ وقوع ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ہم مستقبل کی اغلب سرگرمیوں کی سائنسی تقویم کی طرف ایک یکسر غیر معمولی دھکے کا پیدا ہونا دیکھ رہے ہیں، یہ ایک ایسا جوش جس کا مستقبل پر انتہائی گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ یہ بات انتہائی حماقت پر مبنی نظر آتی ہے کہ پیچیدہ واقعات کی انتہائی درست انداز میں پیش بینی کے لیے سائنسی صلاحیت کو ترقی دے دی جائے۔ تاہم آج کے عہد میں خطرہ یہ نہیں کہ ہم اپنی صلاحیت کا بیش اندازہ کر لیں گے؛ حقیقی خطرہ یہ ہے کہ ہم کم

استفادہ کریں گے۔ کیونکہ جب سائنسی پیش بینی کے لیے ہماری، ابھی تک، قدامت پر مبنی کوششیں غلطی میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہیں تو یہ خاص کوشش ہماری مدد کرتی ہے کہ ہم تبدیلی میں ہونے والے کلیدی متغیرات کی شناخت کریں، یہ اہداف کی وضاحت میں بھی مدد کرتی ہے اور یہ پالیسی میں تغیرات کی محتاط تخمینہ کاری پر بھی مجبور کرتی ہے۔ ان طریقوں سے، اگر کئی اور نہ ہوں تو، مستقبل کے بارے میں چھان بین، کی ادائیگی زمانۂ حال میں ہوتی ہے۔

اغلب مستقبل کے بارے پیش بینی ہی وہ حصہ ہے جس کے بارے میں کارکردگی کی ضرورت ہے اگر ہم منصوبہ ساز کے وقت کا افق تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور پورے معاشرے میں آنے والے وقت سے متعلق ''بڑی'' حس کا نفوذ چاہتے ہیں۔ کیونکہ ممکنہ مستقبل سے متعلق ہمیں اپنے خیالات میں بھی وسعت لانی چاہیے۔ سائنس کے اس کڑے مضمون کے لیے ہمیں مصوری کے شعلہ خیز تخیل کو شامل کرنا چاہیے۔

آج کے دور میں ہمیں خیالات، خوابوں اور پیش گوئیوں کی جتنی ضرورت ہے پہلے کبھی نہیں تھی...... یہ تمام چیزیں آنے والے وقت کی قوت ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم منطقی طور پر یہ فیصلہ کریں کہ کون سے راستوں کا انتخاب کرنا ہے، کون سے ثقافتی نمونوں کا اپنانا ہے، ہمیں پہلے یہ یقین کرنا ہوگا کہ ان میں سے کون سے ہیں جن کی انجام دہی عملاً ممکن ہے۔ احتمالی، مفروضہ اور تخیلی نقطہ نظر ایسے ہی عملی ضرورت بن جاتا ہے جیسے گزشتہ وقتوں میں ضرورت ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کی بڑی اور مضبوط نظریے کے حامل کارپوریشنز، جو کبھی زمانہ ء حال کی تجسیم شمار کی جاتی تھیں، پر تخیل مستقبل میں حضرات، سائنس فکشن لکھنے والوں اور باصلاحیت افراد کو مشاورت کی غرض سے اپنے پاس ملازم رکھتی ہیں۔ ایک بڑی یورپی کیمیکل کمپنی نے ایک مستقبل بیں شخص کو ملازمت دی جن کے پاس سائنسی تعلیم کے پس منظر کے ساتھ ساتھ اس نے ایک نظریہ ساز شخص کی حیثیت سے بھی تربیت حاصل کی ہوئی تھی۔ امریکہ میں ذرائع ابلاغ کی ایک بڑی کمپنی نے پیرو مستقبلیت سماجی نقاد کی خدمات حاصل کی ہیں۔ ایک شیشہ ساز فیکٹری کے مالک نے سائنسی فکشن لکھنے والے ایک لکھاری کی خدمات حاصل کیں تاکہ مستقبل میں ممکنہ کارپوریٹ صورت حال کے بارے میں جانا جا سکے۔ کمپنیاں ان ''دوررس'' نظر رکھنے والے افراد کی خدمات اس لیے حاصل نہیں کرتیں کہ ان سے ممکنہ سائنسی پیش گوئیاں کرائی جائیں بلکہ وہ ان کی خدمات ممکنہ وسیع النظر قیاسوں سے بارے میں معلومات کے لیے حاصل کرتے ہیں۔

کارپوریشن کو صرف ایسی ہی ایجنسیاں بن کر نہیں رہ جانا چاہیے جن کی رسائی ایسی ایجنسیوں تک محدود ہو۔ مقامی حکومتوں، سکولوں، رضا کار تنظیموں اور دیگر اداروں کو بھی چاہیے کہ اپنے مضبوط مستقبل کے بارے میں پر تخیل انداز سے تجزیہ کرے۔ ان تمام اداروں کو ایسا کرنے میں مدد دینے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر طبقے میں ''تخیلی مراکز'' قائم کرنے چاہئیں جسے اپنی تخلیقی کارکردگی بڑھانے کے لیے تکنیکی معاونت بھی حاصل ہو۔ یہ ایسے مقامات ہوں گے جہاں لوگوں کو ان کے تخیلی تصورات اور خیالات کی وجہ سے جانا جاتا ہوگا بجائے تکنیکی مہارت کے اور انھیں موجودہ بحرانوں کا تجزیہ کرنے کے لیے، مستقبل کے بحرانوں کی پیش بندی اور پیش گوئیوں کے لیے، آزادانہ مفروضوں کی تشکیل کے لیے، حتیٰ کہ تفریحی انداز میں ممکنہ مستقبل میں سوچنے کے لیے اکٹھا کیا جائے۔

مثال کے طور پر شہری ذرائع نقل و حمل کا کیا ممکنہ مستقبل ہے؟ ٹریفک کے مسائل اب خلا سے بھی مشتق ہونے لگے ہیں۔ آنے والے وقت میں خلاء میں انسانوں اور چیزوں کی نقل و حرکت سے انسانی آبادی کے شہر کیسے نبرد آزما ہوں گے؟ اس سوال سے متعلق قیاس آرائی کرنے کے لیے ایک ''تخیلی مرکز'' میں جو لوگ شامل ہوں گے ان میں مصور، مجسمہ ساز، رقاص، فرنیچر ڈیزائن کرنے والے، گاڑیاں پارک کرنے والے مقامات پر ڈیوٹی دینے والے، اور دیگر بے شمار افراد جو کسی نہ کسی طرح، پر تخیل انداز میں خلائی معاملات سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ جب اس طرح کے لوگ موزوں ترین صورت حال میں اکٹھے ہو جائیں تو وہ یقینی طور پر ایسے تخیلات اور نت نئے خیالات سامنے لائیں گے جن کے بارے میں ٹیکنوکریٹ منصوبہ ساز، ہائی وے انجینئرز اور ٹرانزٹ (Transit) حکام نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو۔

موسیقار، ہوائی اڈوں کے ساتھ رہنے والے عوام، مشینوں کے ذریعے بوجھ اٹھانے والے اور زمین دوز برقی ریل میں کام کرنے والے شور کو کم کرنے، اس کو ترتیب میں لانے یا اس پر قابو پانے کی نئی اور بہتر راہیں تلاش کر سکتے ہیں۔ نوجوان افراد کے گروپوں کو دعوت دی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ذہن میں موجود خیالات کو سامنے لائیں اور نکاسی آب کے شہری مسائل، ہجوم، نسلی تضاد، بزرگوں کی دیکھ بھال اور زمانہ ء حال اور مستقبل سے متعلق ہزاروں ایسے مسائل کو زیر بحث لائیں جو عدم توجہی کا شکار ہیں۔

ایسی ہی کسی کوشش میں، پیش کردہ نظریات کی ایک واضح اکثریت، لازمی اور پُر احمقانہ نوعیت کے مزاحیہ یا تکنیکی طور پر ناممکن ہو سکتے ہیں تاہم تخلیقیت کا نچوڑ یہ ہے کہ احمق کے ساتھ کھیلا جائے، بے معنی چیز

کے ساتھ مذاق کیا جائے،صرف اور صرف اس لیے کہ خیالات کی اس رو کو بعد میں شاید تنقیدی پرکھ کے مرحلے سے گزارا جائے۔لہٰذا مستقبل کے حوالے سے تخیل کا اطلاق ایک ایسے ماحول کا متقاضی ہے جس میں غلطی کرنا بھی محفوظ ہی شمار کیا جائے جس میں خیالات کی نادر پیوستگی کا، تنقیدی طور پر چھان پھٹک کرنے سے پہلے، آزادانہ اظہار کیا جاسکے۔ہمیں سماجی تخیل کے لیے محفوظ مقامات کی ضرورت ہے۔

تمام طبقات سے تعلق رکھنے والے تخلیقی لوگوں کو ممکنہ مستقبل سے متعلق قیاس میں شامل ہونا چاہیے۔ ان لوگوں کی...... ذاتی یا ذرائع ابلاغ کے ذریعے...... صوتی انجینئرز سے لے کر ماہرین حیوانیات تک، رسائی ہونی چاہیے جو کسی تجویز کے تکنیکی طور پر ناممکن ہونے کی نشاندہی کرسکیں۔(یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اکثر ناممکن صورت حال بھی عارضی ہوتی ہے)

تاہم تخیلی عمل میں سائنسی مہارت بھی ایک تخلیقی، بجائے محض پژمردہ کردار ادا کرنے کے، کردار ادا کرتی ہے۔ہنرمند ماہرین ایسے ماڈل کھڑے کرسکتے ہیں جو انجینئرز کی اس کام میں مدد کریں کہ وہ تعلقات کے مجوزہ مجموعے میں تمام ممکنہ ترتیب کا تجزیہ کرسکیں۔اس طرح کے ماڈل زندگی کی حقیقی حالت کی نمائندگی کرتے ہیں۔لندن کے انسٹی ٹیوٹ فار سٹریٹیجک سٹڈیز (Institute for strategic studies) کے کرسٹوف برٹریم (Christoph Bertram) کے الفاظ میں، ''ان لوگوں کا مقصد مستقبل کی پیش بینی کرنا نہیں ہے بلکہ متبادل مستقبل کا تجزیہ کرکے حق انتخاب میں وسعت لانا ہے''۔

مثال کے طور پر ایک مناسب قسم کا ماڈل پر تخیل حضرات پر مشتمل ایک گروپ کی اس سلسلے میں مدد کر سکتا ہے کہ وہ اس بات کا قیاس کریں کہ اگر کسی شہر کے تعلیمی اخراجات ڈانواں ڈول ہوجائیں تو اس شہر پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے، فرض کیجیے اس بات کا اثر اس کے ذرائع نقل وحمل پر کیا اثر ہوگا۔معکوس طور پر یہ دکھا سکتا ہے کہ ان دیگر شعبوں میں ہونے والی تبدیلیاں تعلیم کو کس طرح متاثر کرسکتی ہیں۔

سماجی تخیل کے ان مراکز میں جنم لینے والی ان جنگلی، غیر روایتی، انوکھے یا محض رنگین خیالات کی یہ تیز رفتار لہر کو اپنے اظہار کے بعد۔چھانے جانے کے کڑے عمل سے گزرنا چاہیے۔اور چھانے جانے کے اس عمل کے بعد ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جو اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔تاہم ان میں سے کچھ ایسی اہمیت کے حامل ہیں جو نئے امکانات کی طرف توجہ مبذول کروائیں، جن پر عمومی حالات میں توجہ نہیں دی جاتی۔جیسے ہی ہم غربت سے خوشحالی کی طرف سفر کرتے ہیں تو سیاست میں بھی تبدیلی آتی ہے جسے ماہرین ریاضی ''صفر''

گیم سے ''لاصفر'' گیم کی طرف آنا کہتے ہیں۔پہلی صورت حال میں اگر ایک کھلاڑی جیتتا ہے تو دوسرے کو لازماً ہارنا ہوتا ہے۔دوسری صورت حال میں تمام کھلاڑی بھی جیت سکتے ہیں۔ہمارے سماجی مسائل کے لیے ''لا۔صفر'' حل اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم تمام تر تصورات کو اکٹھا کریں۔ایک ایسا نظام جس پر تخیل پالیسی نظریات تیار کرسکے وہ ہی ہماری مدد کرسکتا ہے کہ ہم آنے والے وقت میں ''لا۔صفر'' مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاسکیں۔

جبکہ پر تخیل مراکز آنے والے وقت کے حوالے سے جزوی تخیل پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں لہٰذا کسی واحد صفت کے لیے ممکنہ مستقبل کی وضاحت کے لیے، چاہے وہ ایک تنظیم ہو، ایک شہر یا اس کے ذیلی سلسلے ہمیں ان سب کے لیے وسیع تر تخیلی نظریات کی ضرورت ہے خاص طور پر اجتماعی حیثیت میں معاشرے کی...... ممکنہ مستقبل سے متعلق ہمارے تخیل میں اضافہ ضروری ہے؛ لیکن ان تخیلات کے لیے ضروری ہے کہ انھیں منظم کیا جائے اور ڈھانچوں کی صورت میں شفاف کیا جائے۔ماضی میں ہمارے لیے یہ کام خیالی ادب کیا کرتا تھا۔یہ متبادل مستقبل کے بارے میں انسانی خوابوں کو ترتیب دینے میں عملی اور اہم کردار ادا کرتا تھا۔آج ہمیں خیالی نظریات کی کمی کا سامنا ہے کہ جن کے گرد ہم ممکنہ مستقبل کے تقابلی تخیلات کی تشکیل کرتے ہیں۔

اکثر روایتی خیالی دنیائیں سادہ اور جامد معاشروں کی عکاسی کرتی تھیں۔یعنی وہ معاشرے جن میں اور جدید ترین صنعتی معاشروں میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔بی ایف سکنز کی ''Walden Two'' جو بہت سے موجود تجرباتی طبقات کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتا تھا وہ ایک بیش صنعتی طرز زندگی کی عکاسی کرتا تھا۔ چھوٹا، فطری ماحول سے قریب، زراعت اور دستی ہنر کی نمائندگی کرنے والا۔حتیٰ کہ دو ضد خیالی ادبی کتابیں ''Brave New World'' اور ''1984ء'' ہمیں بیش سادہ نظر آتی ہیں۔یہ دونوں کتابیں ایسے معاشروں کی عکاسی کرتی ہیں جن کی بنیاد جدید ترین ٹیکنالوجی اور نسبتاً کم پیچیدگی پر ہے: مشینیں تو جدید ترین ہیں مگر سماجی اور ثقافتی رشتے پکے اور دیدہ دانستہ طور پر سادگی پر مبنی ہیں۔

آج ہمیں ایسے مضبوط خیالی اور ضد خیالی نظریات کی ضرورت ہے جو، غیر ترقی یافتہ اور سادہ معاشروں کی طرف پیچھے دیکھنے کی بجائے جدید ترین صنعت کاری کی طرف آگے دیکھیں۔تاہم یہ نظریات کسی بھی طرح پرانی ڈگر پر نہیں لکھے جاسکتے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی کتاب، اپنی دانست میں ایسی نہیں جو انتہائی جذباتی اور قاتل کردینے کے انداز میں، ایک جدید ترین صنعتی مستقبل کو بیان کرے۔جدید ترین صنعت

کاری پر مشتمل خیالی دنیا یا ضد خیالی دنیا کو مختلف صورتوں میں بیان کیا جا سکتا ہے...... فلموں ڈراموں، ناولوں اور مصوری کے کاموں میں...... بجائے یہ کہ صرف ادب ہی کی ایک صنف میں...... دوسری بات یہ کہ کسی انفرادی مصنف کے لیے انتہائی مشکل ہوگا، چاہے وہ کتنی ہی صلاحیتوں کا مالک کیوں نہ ہو کہ وہ، قائل کر دینے والے، ایک پیچیدہ مستقبل کو بیان کرے۔ لہٰذا ہمیں خیالی دنیاؤں کے بیان میں ایک انقلاب کی ضرورت ہے: شراکتی خیال پرستی۔ ہمیں ''خیال پرست فیکٹریوں'' کی تعمیر کی ضرورت ہے۔

اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ قابل ترین سماجی سائنسدانوں کے ایک چھوٹے سے گروپ کا اکٹھا کیا جائے۔ ایک ماہر معاشیات، ایک ماہر عمرانیات، ایک ماہر علم الانسانیات، وغیرہ۔ انھیں اکٹھا کام کرنے کا کہا جائے، حتیٰ کہ اکٹھے رہنے کا کہا جائے اتنے عرصے تک کہ وہ اپنے اندر بہتر انداز سے بیان کردہ اقدار وضع کر لیں کہ جس پر ان کا اعتماد ہے کہ ایک حقیقی جدید صنعتی خیالی معاشرے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد ٹیم کا ہر ممبر انہی اقدار پر تعمیر ہونے والے خیالی معاشرے کو عدم افسانوی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے خاندان کا ڈھانچہ کیا ہوگا؟ اس کی معیشت، قوانین، مذہب، جنسی سرگرمیاں، نوجوانوں کی ثقافت، موسیقی، مصوری، وقت کی حس، اس میں امتیاز کی سطح، اس کے نفسیاتی مسائل؟ اکٹھے کام کرتے ہوئے اور عدم توافق کے امکان کو ختم کرتے ہوئے، جہاں کہیں بھی ممکن ہو جدید ترین صنعت کاری کی عارضی صورت سے متعلق ایک مفصل اور موزوں تر اور پیچیدہ تصویر کی عکاسی کی جا سکتی ہے۔

اس نہج پر پہنچ کر، تفصیلی تجزیے کی تکمیل سے، منصوبہ افسانوی دائرے میں داخل ہو جائے گا۔ ناول نگار، فلم ساز، اور دیگر لوگ جو ماہرین نفسیات کے ساتھ کام کر رہے ہیں وہ اس افسانوی معاشرے کے انفرادی کرداروں کی زندگیوں سے متعلق تخلیقی کام کر سکتے ہیں۔

اسی دوران دیگر افراد بھی متوازی، خیالی دنیاؤں پر کام کر سکتے ہیں۔ اگر خیالی دنیا ''A'' مادہ پرست نوعیت کی، کامیابی کا عزم لیے ہوئے اقدار پر زور دیتی ہے تو خیالی دنیا ''B'' کی بنیاد حسن ولذت پر مبنی اقدار پر ہو سکتی ہے، ''C'' جمالیاتی اقدار پر، ''D'' انفرادیت پر، ''E'' اجتماعیت پر اور اسی طرح دیگر بھی۔ بالآخر کتابوں کا ایک سلسلہ، ڈرامے، فلمیں اور ٹیلی وژن پروگرام فنون، سماجی سائنس اور مستقبلیت کے درمیان تعاون سے ہی چلیں گے اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو مختلف قیاسی، خیالی دنیاؤں کی لاگتوں اور مفادات سے متعلق آگاہ کریں گے۔

اور آخر میں یہ بات کہ اگر سماجی تصور کی دستیابی مختصر ہے تو ہم لوگ، ان افراد کی تعداد کو کم ہی ہوتا دیکھ رہے ہیں جو خیالی نظریات کو کسی ایک نظام کے تحت ٹیسٹ سے گزارنے کے خواہش مند ہیں۔ زیادہ سے زیادہ نوجوان حضرات جو صنعت کاری سے عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں، وہ اپنی ہی زندگیوں میں تجربے سے گزر رہے ہیں، وہ خیالی طبقات تشکیل دے رہے ہیں، نئے سماجی انتظامات کے لیے کوششیں کر رہے ہیں، اجتماعی شادیوں سے لے کر اکٹھے رد کر سیکھنے کے طبقات تک۔ آج کے عہد میں ماضی کی طرح ترقی یافتہ معاشرے کا بوجھ اس صاحب بصیرت شخص پر آن پڑتا ہے جو عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ نشر و اشاعت بھی کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ خیالی دنیا والوں سے قطع تعلق کیا جائے ہمیں ان کے تجربہ کرنے کی لگن سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اگر انھیں عزت نہ دے سکیں تو سرمایے اور برداشت کے ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

تاہم آج اکثر ''ارادتی طبقات'' یا خیالی آبادیاں ماضی کی ترجیحات کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ ان میں موجود افراد کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر معاشرہ خیالی تجربات سے بہتر طور پر خدمات سے بہرہ مند ہو سکتا ہے جن کی بنیاد اعلیٰ ترین بجائے پیش صنعتی صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ ایک اجتماعی فارم کے، کیوں نہ ایک کمپیوٹر سافٹ ویئر کمپنی اجتماعی حیثیت میں کام کرے جس کے پروگرام رائیٹرز اکٹھے رہتے ہیں اور اکٹھے کام کرتے ہیں؟ کیوں نہ ایک تعلیمی ٹیکنالوجی کی کمپنی جس کے ارکان اپنا سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں اور اپنے خاندانوں کو اکٹھا رکھتے ہیں؟ بجائے اس کے کہ مولی کاشت کی جائے یا سینڈل بنائے جائیں کیونکہ نہ خیالی خطوط پر چلتے ہوئے بحری جغرافیے کا تحقیقی مرکز بنایا جائے؟ اس کے ممبران معمولی تنخواہ وصول کرتے ہیں اور اپنے منافع جات اکٹھے کرتے ہیں تاکہ یکسر نئی طرز کا طبی سکول قائم کر لیا جائے۔ کیوں نہ نئے گروپوں کی بھرتی کا انتظام کیا جائے تاکہ خیالی دنیا کی فیکٹریوں کی تجاویز کو آزمایا جائے؟

مختصر یہ کہ ہم لوگ خیال پرستی کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں بجائے یہ کہ اس سے راہِ فرار اختیار کی جائے، اگر ہم اپنے تجربات کی بنیاد آنے والے کل کے معاشرے اور ٹیکنالوجی پر رکھیں بجائے ماضی کے۔ اور اگر ایک مرتبہ ایسا کر لیا جائے، تو کیوں نہ انتہائی سختی سے تیار شدہ، نتائج کے سائنسی تجزیے؟ اس سے حاصل ہونے والے ماخذات انتہائی قیمتی ہو سکتے ہیں، کیا یہ ہمیں غلطیوں سے بچانے کے لیے ہیں یا صنعتی، تعلیمی، یا خاندانی زندگی یا سیاست کی طرف مائل کرتے ہیں۔

ممکنہ مستقبل کی ایسی پُرتخیل دریافتیں اغلب مستقبل سے متعلق ہمارے سائنسی مطالعے میں گہرائی اور رچاؤ لے کر آئیں گے۔ وہ معاشرے کے وقت کے افق کی بنیادی، اور پیش رفت سے متعلق، وسعت کی بنیاد رکھ دیں گے۔ وہ اس سلسلے میں ہماری مدد کریں گے کہ ہم ازخود مستقبلیت کے مستقبل سے متعلق سماجی تخیل کا اطلاق کر دیں۔

یہ بات بھی یقینی ہے کہ انہی چیزوں کے ساتھ تناظر میں، ہمیں شعوری طور پر، معاشرے کے ان ارکان میں اضافہ کر دینا چاہیے جو مستقبل کی حسیات سے منسوب ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں موجود حکومت کے کلی ڈھانچے کے ڈھیلے نیٹ ورک میں سائنسی مستقبلیت پسند اداروں کو ابھار کی طرح عیاں ہونا چاہیے تاکہ ہر محکمے میں، چاہے وہ مقامی سطح کا ہو یا قومی سطح کا، عملے کے کچھ حصے کو اس بات کے لیے مختص ہونا چاہیے کہ وہ اپنے مجوزہ شعبے میں اغلب طویل المیعاد مستقبل کی عکاسی کرنی چاہیے۔ مستقبلیت کے پیرو افراد کو چاہیے کہ وہ خود کو ہر سیاسی پارٹی، یونیورسٹی، کارپوریشن، پیشہ ورانہ تنظیموں، تجارتی انجمنوں اور طلبہ تنظیموں سے منسلک کر لیں۔

ضرورت اس چیز کی ہے کہ ہم ہزاروں نوجوان افراد کو سائنسی مستقبلیت کے تناظر میں تربیت دیں اور انھیں اس بات کی دعوت دیں کہ وہ اغلب مستقبل کی خاکہ کشی کے شاندار مواقع پر...... ہمیں ایسی قومی ایجنسیوں کے قیام کی بھی ضرورت ہے جو مقامی طبقات کو تکنیکی معاونت فراہم کریں تاکہ وہ خود اپنے لیے مستقبلیت پر مبنی گروپ تشکیل دے سکیں۔ اس کے علاوہ ہمیں اسی طرح کے مرکز کی بھی ضرورت ہے، شاید امریکی اور یورپی فاؤنڈیشنز سے اعانت لینے والا، تاکہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں بننے والے ابتدائی نوعیت کے مستقبلیت پر مبنی مراکز کی مدد کی جا سکے۔

ہم لوگ ایک ایسی دوڑ میں ہیں جو تبدیلی کی تیز رفتاری کی وجہ سے پیدا ہونے والی بے یقینی اور ان درست تخیلات کی ضرورت ہے جو فی الوقت انتہائی اغلب مستقبل ہے۔ لہٰذا اغلب مستقبل کے قابل بھروسا تخیلات کی پیداوار کا مسئلہ اعلیٰ درجے کی قومی، بلکہ بین الاقوامی ضرورت بن جاتا ہے۔

چونکہ دنیا مستقبل سے متعلق سنسر (تحرک قبول) سے بھری پڑی ہے، ہمیں اس بات کی بھی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے کہ ہم بین الاقوامی نوعیت کا ایک ادارہ بنائیں اور عالمی سطح کے اعداد و شمار جمع کرنے والا ایک ڈیٹا بینک۔ اسی طرح کا ادارہ جس کے عملے میں تمام سائنسی اور سماجی سائنس سے متعلق تمام شعبوں سے تعلق

رکھنے والے مرد و خواتین ہوں اور وہ ایک مقصد سمجھتے ہوئے پوری دنیا کے دانشوروں اور پُرتخیل افراد کے ہاتھوں تیار کردہ رپورٹوں کو جمع کریں اور اس کی ترتیب وار آہنگ سازی کریں۔

یہ بات بھی یقینی ہے کہ جو لوگ اس طرح کے ادارے میں کام کر رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ کبھی بھی مستقبل کے بارے میں ایک جامد عکس نہیں بنا سکتے۔ اس کی بجائے ان کی کوششوں کا ثمرہ مستقبل کا مسلسل تبدیل ہوتا ہوا جغرافیہ ہے، ایک متواتر دوبارہ تشکیل شدہ، عجیب و غریب انداز میں تبدیل ہونے والے مستقبل کا تصور جس کی بنیاد پیش گوئی پر مشتمل بہترین دستیاب کام پر ہے۔ جو مرد و خواتین اس کام میں مصروف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کوئی چیز بھی یقینی نہیں؛ وہ یہ بھی جان جائیں گے کہ انھیں ناکافی اعداد و شمار کے ساتھ کام کرنا ہے؛ وہ ان مشکلات کا اندازہ لگائیں گے جو آنے والے وقت کی حدود کا تعین کرنے میں لازمی طور پر ان کے سامنے آئیں گی۔ لیکن انسان مستقبل کے بارے میں پہلے ہی جانتا ہے بہ نسبت اس کے جو اس نے کسی خاص نظام کے تحت اور کسی سائنسی طریقے سے سرانجام دینے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کے علم کو اکٹھا کرنے کی کوششیں تاریخ میں دانشورانہ سطح پر انتہائی اعلیٰ سطح کی کوششیں شمار کی جائیں گی...... اور انتہائی اہمیت کی حامل بھی۔

صرف اور صرف اسی صورت میں فیصلہ لوگ مستقبل کی بہتر پیش گوئیوں کی صلاحیت سے لیس ہو سکتے ہیں جب متواتر اندازوں کے ذریعے ہم پیش گوئیوں کی صداقت کے ذریعے، تبدیلی قبول کرنے کی کوششوں میں کامیابی حاصل کر لیں، مستقبل سے متعلق مناسب طور پر درست مفروضات کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اعمال اور اپنی سرگرمیوں کے مضبوط نتائج کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اور اس سمجھ بوجھ کے بغیر، تبدیلی سے متعلق انتظام و انصرام ناممکن ہے۔

اگر کسی منصوبہ ساز کی انسان دوستی سماجی مستقبلیت کے لائحہ عمل کی پہلی منزل ہے تو ہمارے وقت کے افق میں آگے کی طرف وسعت دوسری ہے۔ ٹیکنوکریسی سے سبقت لے جانے کے لیے ہمیں نہ صرف اپنی معاشی عامیانہ پن سے اس پار دیکھنے کی ضرورت ہے بلکہ اپنے ذہنوں کو دور پار مستقبل کے حوالے سے کھول دینا چاہیے جو اغلب بھی ہوں اور ممکن بھی۔

متوقعانہ جمہوریت

تاہم آخر میں سماجی مستقبلیت کو اور بھی گہرا ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ ٹیکنوکریٹس معاشی سوچ اور کوتاہ بینی سے ہٹ کر بھی کسی کرب سے گزرتے ہیں؛ وہ خواصیت کے وائرس کا بھی شکار ہوتے ہیں۔ تبدیلی پر دسترس

حاصل کرنے کے لیے، ہمیں ٹیکنو کریٹک روایات سے روگردانی کرتے ہوئے ہیں انقلابی سوچ کی ضرورت ہے بالکل اسی طرح جیسے ہم اپنے سماجی اہداف حاصل کرتے ہیں۔

ندرت میں اضافہ ہمارے بڑے اداروں..... ریاست، گرجا گھر، کارپوریشن، فوج اور یونیورسٹی کے روایتی اہداف کو غیر متعلقہ صورت حال کی طرف لے جاتا ہے۔ تیز رفتاری اہداف کے ردو بدل میں بھی تیزی کا باعث ہے، مقصد کی ناپائیداری، تنوع یا پارگی اہداف میں درشت قسم کے اضافے کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ مسلسل حرکت کرتے ہوئے اور بے ترتیبی کا شکار اس ماحول میں، ہم لوگ مسلسل لڑکھڑاتے ہیں، ایک بحران سے دوسرے بحران کی طرف مستقبل کے دھچکے کا شکار نظر آتے ہیں، تضاد سے بھرے ہوئے اور خود منسوخ کردہ مقاصد کی افراتفری کا تعاقب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کسی بھی جگہ پر یہ بات اتنی واضح نظر نہیں آتی جتنی شہروں پر حکمرانی کرنے کی ہماری حسرت ناک کوششوں میں دکھائی دیتی ہے۔ نیویارک کے شہروں نے گزشتہ کچھ عرصے میں بحرانوں کا سامنا کیا: پانی کی کمی، چھوٹی سڑکوں کی بندش، سکولوں میں نسلی ہنگامے کولمبیا یونیورسٹی میں طلبہ کے ہنگامے، کوڑا اٹھانے والوں کی ہڑتال، رہائشی مکانات کی کمی، ایندھن کا کاروبار کرنے والوں کی ہڑتال، ٹیلی فون سروس میں رکاوٹ، اساتذہ کا واک آؤٹ، توانائی کا بحران اور اس کے علاوہ بہت کچھ۔ اسی شہر کے سٹی ہال میں، جدید ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں موجود ہزاروں ہالوں میں ہونے والے واقعات کی طرح ٹیکنو کریٹس آپس میں لڑے، گھتم گھتا ہوئے، ایک بھڑکتے ہوئے معاملے سے دوسرے کی طرف وہ بھی شہری مستقبل کے لیے کسی مربوط منصوبے یا پالیسی کی ذرا سی مماثلت کے بغیر۔

یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ کوئی بھی منصوبہ سازی نہیں کر رہا۔ جبکہ اس کے برعکس؛ اس ہنگامہ خیز سماجی منصوبہ سازی میں، ٹیکنو کریٹ منصوبہ سازی میں، ذیلی منصوبے اور مخالف منصوبے سامنے آتے ہیں۔ وہ لوگ نئی شاہراہوں، نئی سڑکوں، نئے پاور پلانٹوں اور نئے سکولوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ بہتر ہسپتالوں، رہائشی مکانات، دماغی امراض کے ہسپتالوں، اور فلاحی اداروں کا وعدہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ منصوبے منسوخ ہو جاتے ہیں، تضادات کا شکار ہو جاتے ہیں اور اتفاقی صورت میں ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ سطحی طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مستقبل سے تعلق رکھنے والے ترجیح شدہ شہر کے مجموعی تاثر سے جڑے ہوئے نہیں ہوتے اور ان کا کوئی بھی مستقبل سے تعلق رکھنے والا ترجیح

شدہ شہر مجموعی تاثر سے جڑا ہوا نہیں ہوتا اور ان کی کوئی بھی پیش بینی...... خیالی یا دیگر...... ہماری کوششوں کو منضبط نہیں کرتی۔ نہ ہی منطقی طور پر منضبط شدہ اہداف اس افراتفری کو ترتیب میں لاتے ہیں۔ اور قومی و بین الاقوامی سطح پر، مربوط پالیسی کا فقدان برابری کی سطح پر نشاذ و نادر ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔

بات صرف اتنی سادہ نہیں کہ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کون سے اہداف کے تعاقب میں جائیں، کسی شہر یا کسی قوم کے حوالے سے..... معاملہ اور گہرا ہے، کیونکہ تیز رفتار تبدیلی نے طریقوں کو فرسودہ بنا دیا کہ جن کے ذریعے ہم سماجی اہداف تک پہنچتے ہیں۔ ٹیکنو کریٹ ابھی تک اس بات کو نہیں سمجھ سکے ہیں اور ایک فوری حرکت کے سے انداز میں ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے، وہ ماضی کے آزمودہ اور درست طریقوں تک پہنچ پائے ہیں۔

لہٰذا، غیر متواتر طور پر، ایک تبدیلی پسند حکومت ہی عوامی سطح پر اپنے اہداف واضح کرنے کی کوشش کرے گی۔ یہ خود بخود ایک کمیشن تشکیل دے گی۔ 1960ء میں صدر آئزن ہاور (Eisenhower) نے، دیگر افراد کے ساتھ ساتھ ایک جنرل، ایک جج، دو صنعت کار، چند طلبہ تنظیم کے عہدیداروں، اور ایک مزدور رہنما اکٹھے کر کے ان کی خدمات حاصل کیں تاکہ ''مشترکہ قومی پالیسیوں اور پروگراموں کی خاکہ کشی'' کے لیے ایک بورڈ تشکیل دیا جا سکے اور'' قومی سرگرمی کے مختلف شعبوں میں اہداف کے ایک سلسلے کی تعمیر کی جائے''۔ اس تمام عرصے میں کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ سرخ، سفید اور نیلے پیپر بیک کے ساتھ ایک اور چیز شائع ہوئی جسے ''امریکیوں کے لیے اہداف'' کا نام دیا گیا نہ تو کمیشن، نہ ہی اس کے اہداف کا عوام یا ان کی پالیسیوں پر ذرہ برابر اثر ہوا۔ تبدیلی کی یہ بے پناہ طاقت پورے امریکہ میں، بڑے اچھوتے پن سے، پھیل گئی کہ جیسے اسے دانشورانہ انتظامیہ نے تیار کیا ہو۔

حکومتی ترجیحات کی ترتیب سازی کے لیے ایک اہم کوشش کا آغاز صدر جونسن نے "PPBS" (Planning-Programming-Budgeting-System) کے پورے وفاقی حاکمہ اطلاق سے کیا۔ "PPBS" ایک ایسا طریقہ کار ہے جو تنظیمی اہداف کے، قریبی اور تنظیمی طور پر تیاری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے اطلاق سے صحت، تعلیم اور بہبود عامہ کا ادارہ، مخصوص اہداف کے حصول کے لیے، متبادل پروگراموں کی لاگتوں اور مفادات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن کون ہے جو ان بڑے اور انتہائی اہمیت کے حامل اہداف کی تخصیص کرے؟ "PPBS" کا متعارف کروایا جانا اور سسٹمز تک رسائی ایک بڑا حکومتی کارنامہ ہے۔ بڑی تنظیمی کوششوں کی ترتیب سازی میں اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ لیکن یہ دیرینہ

سیاسی سوال دسترس سے باہر ہی رہتا ہے کہ کسی حکومت یا معاشرے کے مجموعی اہداف پہلی ترجیح کے طور پر لیے جائیں۔

صدر نکسن جو اہداف کے بحران میں گرفتار تھے، نے ایک تیسرا راستہ چُنا۔ انھوں نے اعلامیہ جاری کیا، ''اب وقت آ گیا ہے، ہم نے بڑے شعوری اور منظم انداز سے خود سے مخاطب ہو کر کہا، کہ ہم کس قسم کی قوم بننا چاہتے ہیں......'' لہٰذا انھوں نے اپنی توجہ چیدہ قسم کے مسائل کی طرف مبذول کروائی۔ لیکن ایک مرتبہ پھر اس کا جواب دینے کے لیے جو طریقہ کار چنا گیا وہ ناکامی تھا۔ صدر محترم نے یہ بھی اعلان کیا، ''آج میں نے وائٹ ہاؤس کی حاکمہ کو ''National Goals Research Staff'' کا حکم جاری کیا ہے''۔ انھوں نے مزید بتایا، ''یہ ایک چھوٹا، جدید ترین تکنیکی اہمیت کا حامل عملہ ہوگا، جس میں مجموعی طور پر ماہرین ہوں گے...... اور اس میں سماجی ضروریات سے متعلق اور سماجی رواجوں کے ابھار سے متعلق اعداد و شمار اکٹھے کرنے کا عمل بھی ہوگا۔''

اس قسم کا عملہ، جو صدارتی محل سے قریبی فاصلے پر مامور ہوگا، اہداف کے منصوبوں، ایجنسیوں کے درمیان تضادات کے حل (کم از کم کاغذات ہی میں)، اور نئی ترجیحات کی تجویز میں انتہائی مفید ثابت ہوگا۔ سماجی سائنسدانوں اور پیرویان مستقبلیت کی شاندار شمولیت کے ساتھ، اگر یہ کچھ بھی نہ کرے تو افسران بالا کو مجبور کر سکتی ہے کہ وہ بنیادی اہداف پر توجہ دیں۔

حتیٰ کہ اس قدم پر بھی، پہلے دو اقدامات کی طرح ٹیکنوکریٹ ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ بھی معاملے کے سیاسی پہلو سے گریز کرتا ہے۔ قابلِ ترجیح مستقبل کیسے واضح کیے جائیں؟ اور ایسا کون کرے؟ مستقبل کے لیے اہداف کس نے وضع کرنے ہیں؟

ان تمام کاوشوں کے پیچھے یہ نظریہ کارفرما ہے کہ معاشرے کے مستقبل سے متعلق قومی (اور اضافی طور پر، مقامی) اہداف، ترجیحی بنیادوں تشکیل دیے جائیں۔ یہ تکنیکی قضیہ افسر شاہانہ طرز کی تنظیموں کی عکاسی کرتا ہے جس میں لائن (ملازمین) اور (اوپر کا) عملہ علیحدہ علیحدہ تھے، جس میں، دقیانوسی، غیر جمہوری نظام مرتب قائدین اور رعایا، مینجروں کو ان کے عملے اور منصوبہ سازوں کو منصوبہ علیہان سے ممتاز کرتا ہے۔

تاہم چرب زبانی سے بیان کردہ اہداف سے ذرا ہٹ کر، حقیقی طرز میں، جدید ترین صنعت کاری کے اہداف کی طرف سفر کرنے والے معاشرے پہلے ہی، رعایا کی متمنی شرکت کے کارنامے میں، انتہائی

پیچیدگی، ناپائیداری اور انحصاری کا شکار ہیں کہ انھیں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے اور ان کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ ہم لوگ بزرگوں کی غیر رسمی محفل کا انعقاد کر کے تبدیلی کی تیز رفتار قوتوں کو اپنے قابو میں لانے کی توقع نہیں رکھ سکتے، کہ وہ لوگ ہمارے لیے اہداف کا تعین کریں گے یا اس مقصد کو 'اعلیٰ تکنیکی عملے کے سپرد کر کے ہم کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ اہداف کے تعین کا ایک نیا اور انقلابی زاویہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

نہ ہی یہ زاویہ ان لوگوں کی طرف سے آنے کی توقع ہے جو انقلاب کا بہروپ بھرتے ہیں۔ ایک جدید ترین گروپ جس نے تمام تر مسائل کو 'منافع جات کی زیادہ سے زیادہ حد'' کے مظاہرے سے دیکھا، وہ بھرپور سادگی کے ساتھ، معاشی معاملات کو ایسے ہی بیان کرتے ہیں جیسا کہ ٹیکنوکریٹس۔ دوسرا شخص ہمیں چاروناچار قبل از صنعت کاری والے ماضی میں دھکیلنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ہمیں ذاتی اور نفسیاتی حیثیت میں، انقلاب کی سی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ان میں سے کوئی گروپ ایسا نہیں جو اس قابل ہو کہ ہمیں تبدیلی کی انتظامیہ کے حوالے سے مابعد ٹیکنوکریٹک صورت کی طرف لے جائے۔

ٹیکنوکریٹس کی بڑھتی ہوئی عدم استعداد کی طرف توجہ دیتے ہوئے اور نہ صرف ذرائع کو چیلنج دیتے ہوئے، بلکہ صنعتی معاشرے کے اہداف کے بحران کا مقابلہ کیسے کیا جائے بجائے ٹیکنوکریٹس پر کڑی تنقید کرنے کے، مسٹر آئزن ہاور، جانسن اور نکسن کی طرح وہ مستقبل کے بارے میں مثبت تاثر دینے میں ناکام رہے ہیں، ایک ایسے مستقبل کا تاثر جو انھیں جدوجہد کرنے پر اکسائے۔

لہٰذا ایک نوجوان انقلاب پسند امریکی ٹوڈ گٹلن (Todd Gitlin) جو ڈیموکریٹک سوسائٹی میں طلبہ کے سابقہ صدر بھی رہے نوٹ کرتے ہیں کہ ''مستقبل کی طرف سمت بندی ہر انقلابی کا ایک نشان امتیاز ہے...... اور اس مسئلے کے لیے، آزادی گزشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران ہونے والی سرگرمی''، اور بائیں بازوں کے نئے لوگ ''مستقبل میں عدم یقین'' کا شکار ہوتے ہیں۔ تمام تر ظاہری وجوہات سامنے لانے کے باوجود اس نے اب تک مستقبل کے بارے میں ایک متوازی تاثر کیوں نہیں دیا، وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں: ''ہم لوگ مستقبل کی تشکیل کے بارے میں خود کو عدم صلاحیت کا شکار نظر آتے۔''

دائیں بازو کے مزید نئے نظریہ ساز اس مسئلے پر توجہ دیتے ہوئے اپنے پیروکاروں پر زور دیتے ہیں کہ وہ مستقبل کو زمانۂ حال میں شامل کرتے ہیں اور وہ آئندہ زمانے کے طرزِ زندگی اپنانے سے ہی ممکن ہے۔ جہاں تک اسے ہماری شراڈ پہلی تک لے جانے کا تعلق ہے......''آزاد معاشرے''،

کوآپریٹیو، قبل از صنعت کاری کے طبقات، جن میں سے کچھ کا مستقبل سے کوئی نہ کوئی تعلق ہے اور ان میں سے اکثر، اس کی بجائے ماضی کا ایک پرجوش اور زبردست رجحان ہے۔

ستم ظریفی اس وقت دکھائی دیتی ہے جب ہم اس بات پر زور دیں کہ موجودہ عہد کے نوجوان انقلابیوں میں سے چند (اگرچہ تمام ہی) ٹیکنوکریٹس کے ساتھ مضرت رساں خواصیت کے معمولی حصے کو بھی شامل کرتے ہیں، افسر شاہی کی مذمت کرتے ہوئے اور ''شراکتی جمہوریت'' کا تقاضا کرتے ہوئے وہ لوگ اکثر و بیشتر محنت کشوں، سیاہ فام افراد یا طلبہ کے گروپوں کی راہ ہموار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کے بل بوتے پر وہ شراکت کا تقاضا کرتے ہیں۔

جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں محنت کش اس سیاسی انقلاب سے مکمل طور پر بے بہرہ نظر آتے ہیں جس کا مقصد ملکیت کی ایک قسم سے دوسری میں تبدیلی ہو۔ کیونکہ اکثر لوگوں کے لیے خوشحالی میں بہتری آنے کا مقصد ہے ایک بہتر، نہ کہ بدتر، وجود، اور وہ لوگ اپنی پست قسم کی ''دیہی اور متوسط طبقے پر مبنی زندگیوں کو محرومیوں بھری زندگی کی بجائے اپنی تکمیل ہی سمجھتے ہیں۔

اس ٹھوس قسم کی حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے بائیں بازوں سے تعلق رکھنے والے غیر جمہوری عناصر اس مارکیوسی (Marcusian) نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عوام میں سے اکثر لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، ضرورت سے زیادہ کرپشن کا شکار اور میڈیسن ایوینیو (Madison Avenue) سے پریشان نظر آتے ہیں تاکہ یہ کان سکیں کہ ان کے لیے کیا درست ہے۔ لہٰذا اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ایک انقلابی کو انسانی بنیادوں پر مستمل اور جمہوری مستقبل تشکیل دینا چاہیے، چاہے اس کا مطلب ان لوگوں کے گلوں میں کوئی چیز بھر دینا ہو جو اتنے احمق ہوں کہ انھیں اپنے مفادات کا بھی علم نہیں۔ مختصر یہ کہ معاشرے کے اہداف اشرافیہ ثابت ہوتے ہیں۔

تاہم اہداف کی تشکیل کے وہ نظام جن کی بنیاد اشرافیہ کے قبضیوں پر ہے وہ اب ''مستعد'' نہیں رہے۔ تبدیلی کی قوتوں کو قابو میں لانے کی اس کاوش میں یہ بڑی تیزی سے جوابی پیداوار کی حامل ہو رہی ہیں۔ کیونکہ جدید ترین صنعت کاری کے زیر نگیں جمہوریت ایک سیاسی آسائش نہیں ہے بلکہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔

مغرب میں جمہوری سیاسی طریقہ کار اس لیے ابھر کر سامنے اس لیے نہیں آیا کہ چند ذہین افراد نے

ایسا کرنے کی کوشش کی تھی یا انسان نے ''آزادی کی نہ بجھنے والی جبلت'' کا اظہار کیا تھا۔ بلکہ یہ جمہوری قوتیں اس لیے سامنے آئیں کہ سماجی امتیازات کے حوالے سے تاریخی دباؤ بڑھتا چلا گیا اور انتہائی تیز رفتار نظام انتہائی حساس قسم کی سماجی بازرسی چاہتے تھے۔ پیچیدہ قسم کے، امتیازی حیثیت کے حامل معاشروں میں دستیاب معلومات کی ایک بڑی تعداد کو باقاعدہ تنظیموں اور ذیلی ثقافتوں کے درمیان انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ چلنا چاہیے جو ان میں موجود ذیلی ڈھانچوں اور تہوں کے درمیان ''کل'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سیاسی جمہوریت، سماجی فیصلہ سازی میں زیادہ سے زیادہ شمولیت کے بل بوتے پر، بازرسی میں سہولت پیدا کرتی ہے۔ اور یہ بازرسی ہی ہے جس پر کنٹرول کرنا لازم ہے۔ انتہائی تیز رفتار تبدیلی پر کنٹرول کرنے کے لیے ہمیں جدید ترین...... اور مزید جمہوری...... بازرس طریقوں کی ضرورت ہے۔

تاہم ٹیکنوکریٹ ابھی بھی معمولی سطح پر ہی سوچ رہے ہیں، اکثر ایسے منصوبے بناتے ہوئے جو مختلف شعبوں سے مناسب اور فوری بازرس کے بغیر ہی چل رہے ہیں، اس حد تک کہ وہ شاذ ہی جانتا ہے کہ اس کے منصوبے کیسے کام کر رہے ہیں۔ جب وہ بازرسی کا اہتمام کرتا ہے تو وہ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا ہے اور وہ اسے معاشی، ناکافی حد تک سماجی، نفسیاتی یا ثقافتی رنگ دیتا ہے۔ تاہم بدتر بات یہ ہے کہ وہ ان منصوبوں کی تیاری ان لوگوں کی تیزی سے تبدیل ہوتی ضروریات اور خواہشات کو بغیر خاطر میں لائے کی جاتی ہے جن کی شرکت کامیابی کے لیے درکار ہوتی ہے۔ وہ درست بات فرض کرتا ہے کہ وہ خود ہی سماجی اہداف کو ترتیب دے یا وہ کسی بڑی قوت سے موصول ہونے والے واقعات پر بغیر سوچے سمجھے عمل پیرا ہو۔

وہ اس بات کی پہچان میں ناکام ہو جاتا ہے کہ تبدیلی کی تیز رفتاری معاشرے میں ایک نئی طرز کے معلوماتی نظام کا تقاضا کرتی ہے...... اور اسے تشکیل بھی دیتی ہے: بجائے سیڑھی کے ایک رسی۔ معلومات کو انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اسی رسی کے ذریعے ہی چلنا چاہیے۔ ایک گروہ کی نکاسی اور دیگر کے ادخال کے ساتھ ساتھ، صورت حال ایسی ہے کہ کوئی بھی گروپ چاہے سیاسی طور پر کتنی بھی قوت کا حامل ہو، کسی کل کے لیے، آزادی سے اہداف وضع نہیں کر سکتا۔

جیسے ہی سماجی اجزاء کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور تبدیلی تمام کے تمام نظام کو ہلا کر رکھ دیتی ہے اور اسے کمزور کر دیتی ہے اور مجموعی طور پر ذیلی گروہوں کی وہ قوت جو تباہی پھیلا سکے، اس میں حد درجہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ سائبرنیٹ کے ایک سرکردہ ماہر ڈبلیو راس ایشبی (W.Ross Ashby) کے الفاظ میں

ریاضی کے آزمودہ قانون کے مطابق، ''جب کوئی کُل نظام بے شمار ذیلی نظاموں پر مشتمل ہوتا ہے، تو ان میں سے وہ نظام جو غالب آنے کی کوشش کرتا ہے وہ ان سب میں نسبتاً کم پائیدار ہوتا ہے۔''

اس بات کو بیان کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ جیسے ہی سماجی اجزاء کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور تبدیلی اس سارے نظام کو پائیدار بنا دیتی ہے تو اس بات کا امکان کم سے کم ہو جاتا ہے کہ سیاسی اقلیتوں...... ہپی، سیاہ فام لوگ، نچلا متوسط طبقہ، سکول اساتذہ یا مثالی چھوٹی بزرگ خواتین جنھوں نے ٹینس کے جوتے پہنے ہوں...... کے مطالبات کو رد کیا جائے۔ سست روی کا شکار صنعتی پس منظر میں امریکہ اپنی سیاہ فام اقلیت کی ضروریات سے روگردانی کر سکتا تھا؛ لیکن اس تیز رفتار سائبرنیٹ معاشرے میں، امریکہ کی یہ اقلیت، کسی بڑے احتجاج کے ذریعے یا دیگر ہزاروں نوعیت کے حربے استعمال کرتے ہوئے، تمام نظام کو ناکارہ کر سکتی ہے۔ جیسے ہی باہمی انحصاری میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے معاشرے میں موجود چھوٹے چھوٹے گروہ، انتشار پیدا کرنے کے حوالے سے، زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ جیسے ہی تبدیلی کی شرح تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے تو اس وقت کی طوالت جس میں انھیں بھلایا جا سکتا ہے وہ سکڑ کر نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا: ''فوری آزادی''۔

اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ناراض یا مزاحمتی اقلیتوں سے نبرد آزما ہونے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس نظام کو مزید کھول دیا جائے، اور انھیں اس کے کامل شرکا کی حیثیت سے سامنے لایا جائے، انھیں اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ سماجی اہداف کی تشکیل میں برابر شرکت کریں، بجائے یہ کہ انھیں حقوق سے محروم کر دیا جائے یا انھیں تنہا کر دیا جائے۔ چینیوں کی وہ آبادی جسے اقوام متحدہ اور دنیا کے بڑے بین الاقوامی طبقات سے خارج کر دیا جائے وہ دنیا کو غیر مستحکم کرنے کے لیے زیادہ مؤثر ہوگی، بجائے آبادی کے ایسے حصے کے جو ایک مربوط نظام سے جڑا ہوا ہو۔ وہ نوجوان افراد جنھیں آغاز بلوغت کے ایک طویل مرحلے میں رکھا جائے اور انھیں سماجی فیصلہ سازی کے عمل میں شرکت سے محروم رکھا جائے وہ شدید ترین ناپائیداری کا شکار ہو جائیں گے حتیٰ کہ وہ اس سارے نظام کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔ مختصر یہ کہ سیاسیات میں، صنعت کاری میں، تعلیم میں، اگر اہداف کی تشکیل ان لوگوں کی شرکت کے بغیر ہو جو اس سے متاثر ہو رہے ہوں تو اس کا اطلاق انتہائی مشکل ہوگا۔ اور ٹیکنوکریٹ سطح پر درجہ وار اہداف کی تشکیل زیادہ سے زیادہ سماجی عدم استحکام اور تبدیلی کی قوتوں پر کم سے کم کنٹرول؛ اور مستقل بنیادوں پر بڑھتے ہوئے سیلاب کا خطرہ، انسان کی تباہی کے

باعث ہنگامہ خیزی پر منتج ہوگی۔

لہٰذا تبدیلی کے عمل کو بہتر بنانے کے لیے ہمیں طویل المیعاد، اور انتہائی اہمیت کے حامل سماجی اہداف کی وضاحت اور ان تک رسائی کے طریقوں کو جمہوری رنگ دینے کی ضرورت ہے اور اس کا مطلب ہے کوئی ایسی چیز جو جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں سیاسی انقلاب سے کم تر کوئی چیز نہیں...... عوامی جمہوریت کی تصدیق و توثیق۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم تبدیلی کی سمت کی ڈرامائی، از سر نو تخمینہ کاری کریں، ایک ایسی از سر نو تخمینہ کاری جو صرف سیاست دانوں یا ماہرین عمرانیات یا پادریوں یا مخصوص انقلابی اشرافیہ، تکنیکی اہمیت کے حامل لوگوں کی طرف سے یا کالج یونین کے صدر کی طرف سے ہی نہ ہو بلکہ خود لوگوں کی طرف سے ہو۔ ہمیں عملی طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ''لوگوں کے پاس جائیں'' اور ان سے وہ سوال کریں جو ان سے کبھی بھی نہ پوچھا گیا ہو: ''آپ لوگوں کو کس قسم کی دنیا کی ضرورت ہے اب سے دس، بیس، یا تیس سال بعد کی دنیا''؟ مختصراً ہم لوگوں کو مستقبل کے بارے میں ایک مسلسل استصواب رائے کی ضرورت ہے؟

اب انتہائی موزوں وقت ہے کہ جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل اقوام میں مکمل افشائے نفس، عوامی سطح پر خود احتسابی کی ایک تحریک چلائی جائے جس کا مقصد ''ترقی'' کے اہداف کو سماجی اور معاشی سطح پر پھیلانا اور اس کی توضیح و تشریح کرنا ہو۔ نئی ہزاری کے آغاز پر، انسانی ترقی کے ایک نئے مرحلے پر، ہم لوگ مستقبل کی طرف اندھا دھند طریقے سے بھاگتے چلے جا رہے ہیں، لیکن ہم جانا کہاں چاہتے ہیں؟

اگر ہم نے واقعی ان سوالوں کے جوابات دینے کی کوشش کی تو ہمیں کیا ہوگا؟ ذرا تاریخی ڈرامے کو یاد کرنے کی کوشش کریں، طاقت اور ارتقائی اثرات، اگر جدید ترین ٹیکنالوجی کی حامل قوم میں آنے والے پانچ سالوں کو ایک ایسا عرصہ قرار دیں جو قومی حوالے سے انتہائی خود تحسینی کا دور ہو؛ اور اگر پانچ سال کے آخر میں یہ ہمارے سامنے مستقبل کے ایک عارضی ایجنڈے کے ساتھ سامنے آئے، ایک ایسا پروگرام جو نہ صرف معاشی اہداف پورے کرے بلکہ، مساوی اہمیت کے حامل، سماجی اہداف کے مجموعے کی بھی تکمیل کر سکے...... اگر اس کے نتیجے میں، ہر قوم دنیا کے سامنے وہ چیز رکھے کہ جو کچھ وہ اس ہزاری کے آخر میں، اپنی عوام اور انسانیت کے لیے، حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

آئیں ہم ہر قوم، ہر شہر اور اپنے پڑوس میں ایسی جمہوری دستور ساز اسمبلیاں مجتمع کریں جو سماجی

طور پر مال تجارت سے لیس ہوں، اور باقی ہزاری کے مخصوص سماجی اہداف کے لیے ترجیحات کو وضع کریں اور ان کی سپردگی کا فریضہ سرانجام دیں۔

اس طرح کی ''سماجی مستقبل کی اسمبلیاں'' صرف جغرافیائی مقامات کی نمائندگی ہی نہیں کرسکتیں بلکہ سماجی اکائیوں کی نمائندگی بھی کرسکتی ہیں .....صنعت، محنت، گرجا گھر، دانشورانہ طبقہ، فنون، خواتین، نسلی اور مذہبی گروپ، طلبہ اس کے ساتھ ساتھ غیر منظم چیزوں کی بھی نمائندگی ہو۔ ان تمام چیزوں کی یکساں نمائندگی کے لیے کوئی یقینی طریقہ کار نہیں ہیں، یا غریب لوگوں کی خواہشات کی تکمیل کے لیے یا غیر مربوط یا تنہائی کا شکار لوگوں کے لیے۔ جب ہم ان لوگوں کو اس قابل سمجھنے لگیں گے کہ ان کو یقینی طور پر شامل کریں تو اس وقت ہمیں راہیں ملنا شروع ہو جائیں گی۔ یقینی طور پر مستقبل میں شرکت کا مسئلہ صرف غریب، غیر مربوط اور تنہائی کے شکار فرد کا مسئلہ نہیں۔ شاندار تنخواہیں وصول کرنے والے اعلیٰ افسران، مالدار پیشہ ور لوگ، غیر مربوط دانشور اور طلبہ ......تمام کے تمام لوگ کسی نہ کسی وقت میں تبدیلی کی شرح رفتار اور اس کی سمت پر اثر انداز ہونے کی قوت سے کٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان تمام کو ایک نظام میں مربوط کرنا، انھیں معاشرے کی راہنمائی کے لیے مختص مشینری کا ایک جزو بنانا، آنے والی نسلوں کے لیے ایک اہم سیاسی کام ہے۔ ذرا اس اثر کا تصور کریں کہ اگر کسی نہج پر ایک ایسا مقام فراہم کر دیا جائے جہاں مستقبل میں رہنے والے تمام افراد کو اس زمانے کی خواہشات سے متعلق گفتگو کرنے کا موقع مل جائے۔ ذرا اختصار کے ساتھ تصور کریں کہ پیشگی جمہوریت کے لیے ایک بڑے پیمانے پر، عالمی سطح کی مشق کروائی جائے۔

سماجی مستقبل کی اسمبلیوں کو نہ تو ضرورت ہے..... اور اگر انھیں ناپائیداری کی شرح دی جائے...... تو وہ مستحکم اور مستقل ادارے نہیں بن سکتے۔ اس کی بجائے وہ عارضی گروپوں کی صورت اختیار کر سکتے ہیں جنھیں متواتر قسم کے وقفوں سے یاد کیا جا سکتا ہے جن کے ساتھ، ہر مرتبہ، شرکت کرنے والے مختلف نمائندگان موجود ہوتے ہیں۔ آج کے عہد میں شہریوں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ بوقت ضرورت جیوری (Jury) میں اپنی خدمات سرانجام دیں۔ انھیں اس خدمت کی انجام دہی کے لیے چند دن یا چند ہفتے دیے جائیں گے۔ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہ جیوری کا نظام جمہوریت کے لیے ضمانتوں میں سے ایک ہے اور چاہے یہ خدمت ان کے لیے باعث زحمت ہی کیوں نہ ہو، کسی نہ کسی کو تو یہ خدمت سرانجام دینی چاہیے۔ سماجی مستقبل کی اسمبلیوں کو بھی اس طرح اور انہی خطوط پر منظم کیا جا سکتا ہے، نئے شرکا کی ایک متواتر لہر کے ساتھ، جنھیں مختصر

مدت کے لیے یکجا کیا جائے تاکہ وہ معاشرے کے ''مستقبل کے مشیر'' کی حیثیت سے کام کریں۔

ابتدائی سطح کی ایسی تنظیمیں، جن کا مقصد ان لوگوں کی خواہشات کا اظہار کرنا ہے جو ابھی تک مشورے سے عاری ہیں، مستقبل سے متعلق ٹاؤن ہال کا کردار ادا کر سکتی ہیں جس میں لاکھوں افراد کو اپنی دوررس منزلوں کی تصویر کشی میں مدد ملے گی۔

کچھ لوگوں کے لیے نوعوامیت کی یہ نئی قسم ان گھڑ محسوس نہیں ہوگی۔ تاہم کوئی چیز بھی ایسی ان گھڑ جتنا یہ خیال کہ ہم اس معاشرے کو سیاسی طور پر ایسے ہی چلا سکتے جیسے ہم موجودہ دور میں چلا رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ چیز ناقابلِ عمل لگتی ہے۔ تاہم کوئی چیز بھی اتنی ناقابلِ عمل نہیں جتنی انسانیت پر مبنی مستقبل کو، اعلیٰ سطح پر اطلاق کرنے کی کوشش ہے۔ صنعت کاری میں جو چیز ان گھڑ شمار کی جاتی تھی وہ جدید ترین صنعت کاری میں حقیقی شمار کی جا سکتی ہے؛ اور شاید جو چیز عملی ہو اسے فضول خیال کیا جا سکتا ہے۔

حوصلہ افزا قسم کی حقیقت یہ ہے کہ اب ہمارے پاس جمہوری فیصلہ سازی میں نمایاں کارنامے سرانجام دینے کے لیے بہتر صلاحیت موجود ہے بشرطیکہ ہم اس مسئلے کے حوالے سے موزوں تر، ''ہارڈ'' اور ''سافٹ'' سمیت، جدید ترین ٹیکنالوجی کا پرتخیل استعمال کریں۔ لہٰذا ترقی یافتہ ٹیلی مواصلات کا مطلب ہے کہ سماجی مستقبل کی اسمبلی کے شرکا کو ایک ہی کمرے میں ملاقات کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ شاید وہ ایسے مواصلاتی ربط میں جڑے ہوئے ہوں جس کی تنائیاں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ مستقبل سے متعلق تحقیقی نوعیت کے اہداف پر بحث کرنے کے لیے یا ماحولیاتی معیار پر بحث کرنے کے لیے، ایک ہی وقت میں مختلف ممالک سے شرکا اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح سے سٹیل ورکرز، یونین کے عہدیدار اور ناظمین و منتظمین کی کوئی اسمبلی جو خود کاری سے متعلق معاملات پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے اور اپنے کام میں بہتری لانے کے لیے اکٹھے ہوئے ہوں کئی ممالک سے تعلق رکھنے والے کارخانوں، دفاتر اور ویئر ہاؤسز سے شرکا کو اکٹھا کر سکتے ہیں اور اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ایک دوسرے سے کتنے دور افتادہ مقامات پر ہی کیوں نہ ہوں۔

نیویارک یا پیرس میں ہونے والی ثقافتی طبقے کی کوئی میٹنگ...... جس میں مصور، اور گیلری میں جانے والے، مصنفین اور مطالعہ کرنے والے، ڈرامہ نویس اور حاضرین وغیرہ شریک ہوں...... تاکہ وہ اس شہر کی ثقافتی ترقی سے متعلق مناسب اور طویل المیعاد اہداف پر تبادلۂ خیال کر سکیں، یہ سب کچھ ویڈیو ریکارڈنگ اور دیگر تکنیک کے ذریعے دکھایا جا سکتا ہے اس کے علاوہ آرٹسٹک پروڈکشن کے اصل حصے جو زیر بحث لائے

جاتے ہیں، نئی سہولیات کے لیے تعمیراتی ڈیزائن، نئے آرٹسٹک ذرائع ابلاغ کے وہ نمونے جو ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے دستیاب ہیں وغیرہ۔ مستقبل میں تعمیر ہونے والے ایک بڑے شہر میں کس قسم کی ثقافتی زندگی ہونی چاہیے؟ اہداف کے مجوزہ مجموعے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کون کون سے وسائل درکار ہیں؟

اس قسم کے سوالات کا جواب دینے کے لیے تمام سماجی مستقبل کی اسمبلیاں تکنیکی سٹاف سے لیس ہو سکتی ہیں اور ہونی چاہئیں تاکہ وہ مختلف اہداف پر ہونے والی معاشی لاگتوں کے اعداد و شمار پیش کر سکیں اور مجوزہ فروخت ہونے والی اشیا پر لاگتوں اور منافعوں کی عکاسی بھی کر سکیں تاکہ شرکا اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ معقول قسم کا، اور معلومات سے بھرپور انتخاب کر سکیں، کہ جیسے، متبادل قسم کے مستقبل میں ہو۔ اس طرح سے ہر اسمبلی، اپنے اختتامی مرحلے میں، بھونڈے طریقے سے بیان کردہ، غیر مربوط امیدوں کی طرف نہیں بلکہ آنے والے کل کی ترجیحات کے مربوط بیانات میں...... جو اس طرح کی شرائط میں بندھی ہوں کہ ان کا موازنہ دیگر گروپوں کے اہداف سے متعلق، بیانات سے کیا جا سکے۔

نہ ہی سماجی مستقبل کی ان اسمبلیوں کو ''گفتگو کا جشن'' کہا جا سکے۔ ہم تیزی سے فروغ پاتی گیمز اور تشکیلی مشقیں ہیں جس کی بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ کھلاڑیوں کو اپنی اقدار کی وضاحت میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی الی نائنس (Illinois) میں پراجیکٹ پلاٹو میں چارلس آسگوڈ (Charles Osgood) ان کمپیوٹروں اور مشینوں پر تجربے کر رہے ہیں جو گیمز کے ذریعے تخیلاتی، قابلِ ترجیح مستقبل کی منصوبہ سازی میں عوام کے مختلف طبقات کی شمولیت کو ناممکن بنائیں۔

کارنیل یونیورسٹی (Cornell University) سے تعلق رکھنے والے پروفیسر جوز ویلیگاس (Jose Villegas)، جن کا تعلق ''Department of Design and Environmental Analysis'' سے ہے، نے سیاہ فام اور سفید فام طلبہ کی مدد سے ''Ghetto Games'' کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو طلبہ پر مختلف اعمال کے نتائج سامنے لے کر آتی ہے اور ان نتائج کو کھلاڑیوں پر منکشف کیا جاتا ہے اور انھیں ان کے اہداف کی تشریح و توضیح میں مدد دی جاتی ہے۔ ''Getto 84'' نے انھیں دکھایا کہ کیا ہوتا اگر ''Kerner riot Commission'' سول نافرمانی پر امریکی قومی مشاورتی کمیشن کی سفارشات پر عمل درآمد ہوتا۔ اس کھیل میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اگر ان سفارشات کے تسلسل پر عمل کروایا جاتا تو ان کے اثرات محصوروں پر کیا پڑتے۔ یہ کھیل سفید فام اور سیاہ فام دونوں کھلاڑیوں کی مدد کرتی ہے کہ وہ اپنے مشترکہ اہداف

کی نشاندہی کریں اور اپنے درمیان موجودہ غیر حل شدہ تضادات کو بھی سامنے لائیں۔ اور ''Peru2000''، ''Squatter city2000'' جیسی گیمز میں کھلاڑی مستقبل کے لیے طبقات کی تشکیل کرتے ہیں۔

ایک اور کھیل ''Lower Eastside'' میں مسٹر Villegas توقع کرتے ہیں کہ وہ مین ہٹین (Manhatton) طبقے کی اصل زندگی کی عکاسی کریں، کھلاڑی طلبہ نہیں ہوں گے بلکہ، غریب محنت کش ہوں گے، متوسط طبقے کے سفید فام ہوں گے، Puerto Rico کے چھوٹے تاجر ہوں گے یا نوجوان لوگ ہوں گے، بے روزگار سیاہ فام لوگ ہوں گے، پولیس ملازمین، جاگیردار اور شہر کے افسران ہوں گے۔

1969ء کے موسم بہار میں بوسٹن، فلاڈیلفیا (Philadelpia) اور سائراکیوز (Syracuse) نیویارک میں ہائی سکولوں سے تعلق رکھنے والے 50,000 طلبہ نے ٹیلی وژن پر نشر ہونے والے ایک کھیل میں شرکت کی جو 1975ء میں کانگو (Cango) میں ہونے والی نام نہاد جنگ پر مبنی تھا۔ اس کھیل میں شرکت کرنے والی ٹیموں نے روس، کمیونسٹ چین اور امریکہ کی نمائندگی کی اور سفارت کاری اور پالیسی پلاننگ کے مسائل زیرِ بحث لائے، طلبہ اور اساتذہ نے یہ کھیل دیکھا اور اس پر بحث کی جبکہ مرکزی کرداروں کو ٹیلی فون کی مدد سے ہدایات بھی دی گئیں۔

اسی طرح کی کھیلیں جس میں دسویں نہیں بلکہ سینکڑوں، حتیٰ کہ لاکھوں افراد بھی شریک ہو سکتے ہیں انھیں تیار کیا جا سکتا ہے جو ہمیں مستقبل کے اہداف کی تشکیل میں مدد دیں گی۔ جبکہ اس کھیل کے تمثیلی کردار اعلیٰ حکومتی حکام کا کردار ادا کرتے ہیں جو بحرانی کیفیت سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتے ہیں...... مثال کے طور پر ایک حیاتیاتی بحران، تاجر تنظیموں، خواتین کے کلب، گرجا گھر کے گروپ، طلبہ تنظیمیں اور دیگر آئین ساز ادارے ایسی پوزیشن اختیار کر سکتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کریں، چیزوں کے انتخاب کے حوالے سے وہ اجتماعی فیصلوں تک پہنچ سکتے ہیں اور پھر اپنی رائے کو ابتدائی کھلاڑیوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ خاص قسم کے سوئچ بورڈ اور کمپیوٹر ان کے مشورے کو لے کر آگے جا سکتے ہیں یا ''ہاں'' اور ''ناں'' کے ووٹ لے سکتے ہیں اور انھیں فیصلہ سازوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنے گھروں میں بیٹھ کر ہی شریک ہو سکتی ہے لہٰذا اس عمل کا دائرہ کار غیر منظم اور نہ شریک ہونے والے لاکھوں افراد تک پھیل جاتا ہے۔ اس طرح کے پر تخیل کھیلوں کی تیاری سے نہ صرف یہ ممکن ہے، بلکہ اس پر عملدر آمد بھی ہوتا ہے، کہ ماضی سے تعلق رکھنے ان افراد کے ذریعے مستقبل کے اہداف کا استخراج کیا جائے کہ جن سے کبھی مشورہ لیا ہی نہیں گیا۔

اس طرح کے طریقۂ کار، جو ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں، مستقبل قریب میں ہی انتہائی ترقی یافتہ ہو جائیں گے اور ہمیں ایک ایسا منظم طریقہ فراہم کر دیں گے کہ ہم لوگ قابلِ ترجیح مستقبل سے متعلق متضاد تخیلات کو اکٹھا کر سکیں گے اور ان سے ہم آہنگ ہو سکیں گے اور ان میں وہ لوگ بھی شامل ہو سکیں گے جو تعلیمی بحث مباحثے یا پارلیمانی عمل میں غیر ہنر مند شمار ہوتے ہیں۔

یہ بات انتہائی رجائیت پسندی پر مبنی ہوگی کہ ہم مستقبل کے ان ٹاؤن ہالوں سے یہ توقع رکھیں کہ شاندار ہوں گے اور ہم آہنگی پر مبنی معاملات طے کریں گے اور اسی طریقے سے یہ جگہ پر منظم ہوں گے۔ کچھ مقامات پر سماجی مستقبل کی اسمبلیاں، طبقاتی تنظیموں منصوبہ ساز کونسلوں یا حکومتی ایجنسیوں کے ہاتھوں بھی معرض وجود میں آئیں گی۔ کسی مقام پر تاجر یونینیں، نوجوانوں کے گروپ، انفرادی حیثیت میں کوئی شخص، پیرویان مستقبل سیاسی رہنما۔ دیگر مقامات پر گرجا گھر، فاؤنڈیشن یا رضا کار تنظیمیں اس سلسلے میں پیش قدمی کر سکتی ہیں اور مزید مقامات پر ان کا ابھر کر سامنے آنا کسی باقاعدہ نوعیت کے کنونشن کی وجہ سے ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ کسی بحران کے ردعمل کے طور پر ہو۔

اسی طرح یہ بھی ایک غلطی ہوگی کہ ان اہداف کے بارے میں سوچا جائے جن کی خاکہ کشی ان اسمبلیوں نے کی ہے اور ان کا عکس مستقل، افلاطونی آئیڈیل کی صورت میں ماورائی سرزمین میں نظر آتا ہے۔ اس کی بجائے انھیں عارضی سمتی اشاریوں، اور محدود وقت کے لیے بہتر وسیع تر مقاصد، اور کسی طبقے یا قوم کے منتخب سیاسی نمائندگان کی مشاورت کا قصد کرنے والے۔

باوجود اس کے اس طرح کے مستقبلیت سے مربوط، مستقبل تشکیل کرنے والے واقعات کا بے انتہا سیاسی اثر ہو سکتا ہے۔ بے شک یہ نمائندہ سیاست کے مجموعی نظام کے نجات دہندہ ہو سکتے ہیں۔ ایک ایسا نظام جو بحرانی کیفیت کا شکار ہے۔

آج کل ووٹروں کی اکثریت اپنے منتخب نمائندگان سے اتنا فاصلے پر چلے گئے ہیں، وہ معاملات جن پر بحث کی جاتی ہے وہ انتہائی تکنیکی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے، اعلیٰ تعلیم یافتہ شہری بھی اہداف وضع کرنے والے مرحلے سے کنارہ کش نظر آتے ہیں۔ زندگی کی عمومی تیز رفتاری کی وجہ سے الیکشن کی وجہ سے بہت سے معاملات اتنی تیزی سے پیش آتے ہیں کہ سیاست دان شاید ہی اپنے علاقے کے لوگوں کے سامنے جواب دہ نظر آتے ہیں۔ مزید یہ کہ علاقے کے لوگوں میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے اور پھر

مخصوص نظریے کے تحت وہ ووٹر جو اپنے نمائندے کی کارکردگی سے نالاں ہے اگلے الیکشن میں اس کے خلاف ووٹ دے سکتا ہے۔ عملی طور پر لاکھوں افراد اس چیز کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ ضلعی سطح پر بڑے پیمانے پر ہونے والی نقل و حرکت انھیں وہاں سے ہٹا دیتی ہے، کبھی کبھار انھیں بالکل ہی محروم استصواب کر دیا جاتا ہے۔ نئے آباد کار ضلع میں در آتے ہیں۔ مزید یہ کہ سیاست دانوں کو اپنے خطاب کے دوران نئے چہرے نظر آتے ہیں۔ اسے اپنی کارکردگی کے حوالے سے کبھی بھی احتساب کا سامنا نہیں کرنا پڑتا...... یا ان وعدوں کے لیے جو گزشتہ آئینی مدت کے دوران کیے گئے۔

جمہوریت کے لیے مزید نقصان دہ چیز سیاست میں وقت کی شمار بندی ہے۔ سیاست دان کا وقت کا افق عموماً اگلے الیکشن سے زیادہ پھیلا ہوا نہیں ہوتا۔ کانگریس، مجلسِ ملی، پارلیمان، شہری کونسلیں...... عمومی قانون ساز ادارے...... ان تمام کو وقت، وسائل یا ان تنظیمی فورم کی کمی کا سامنا ہے جو طویل المیعاد مستقبل سے متعلق سنجیدگی سے سوچنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ جہاں تک شہری کا تعلق ہے وہ آخری چیز جس کے بارے میں اس سے ہمیشہ مشورہ لیا جاتا ہے وہ اس کے طبقے، ریاست یا قوم سے متعلق بڑے اور فاصلے پر واقع اہداف ہیں۔

ووٹر سے ہمیشہ مخصوص معاملات میں رائے لی جاتی ہے کبھی بھی قابل ترجیح مستقبل کی عمومی شکل کے بارے میں نہیں۔ یہ بات بھی درست ہے کہ سیاست میں کہیں پر بھی کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں جس کے ذریعے کوئی عام شہری اپنے ان خیالات کا اظہار کر سکے کہ اسے مستقبل بعید کیسا نظر آتا ہے، وہ اس کے بارے میں کیا محسوس کرتا ہے اور اس کی دیگر حسیات کیا کہتی ہیں۔ اسے کبھی بھی اس کے بارے میں سوچنے کے لیے نہیں کہا جاتا، اور کبھی اگر وہ ایسا کرتا بھی ہے تو کوئی ایسا منظم راستہ نہیں کہ وہ اپنے خیالات و نظریات کو سیاست کے دائرہ کار میں شامل کر دے۔ مستقبل سے کٹ جانے کی وجہ سے وہ ایک سیاسی مخنث بن کر رہ جاتا ہے۔

ہم لوگ مذکورہ اور دیگر وجوہات کی بنا پر سیاسی نمائندگی کے تمام نظام کی خرابی کی طرف گامزن ہیں۔ اگر مقننہ اپنا وجود برقرار رکھنا چاہتی ہیں، تو اسے اپنے حلقہ انتخاب سے نئے روابط استوار کرنے ہوں گے اور آنے والے کل کے ساتھ بھی نئے رابطے رکھتے ہوں گے۔ سماجی مستقبل کی اسمبلیاں ایسے ذرائع فراہم کر سکتی ہیں جو مقننہ کو اپنی عوام کی بنیاد سے جوڑ سکے، اور زمانۂ حال کو مستقبل سے جوڑ سکے۔

کبھی کبھار مجتمع ہونے اور متواتر وقفوں کے ساتھ اس طرح کی اسمبلیاں عوامی خواہشات کی عکاسی

بڑے زود حس طریقے سے کرسکتی ہیں بہ نسبت کسی دستیاب ذریعے کے۔ اس طرح کی اسمبلیوں کے اجلاس منعقد کرنے سے سیاسی دھارے میں لاکھوں ایسے افراد بھی شریک ہوں گے جنھیں اب نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مستقبل کے معاملے پر مرد اور خواتین کو آمنے سامنے لانے کے بعد، ان سے یہ کہا جائے گا کہ وہ اپنی اپنی منزلوں اور اہداف کے بارے میں گہرائی سے سوچیں اور اس کے ساتھ تیز رفتار عوامی خط مستدیر کے بارے میں بھی غور کریں، اس سارے عمل سے عمیق قسم کے اخلاقی معاملات سامنے آئیں گے۔

لوگوں کے سامنے محض اس طرح کے سوالات رکھنا ہی، اپنی دانست میں، آزادی کا احساس ہے۔

سماجی تخمینہ کاری کا یہ عمل ایسی آبادی کو یکجا کر دے گا اور اسے صاف ستھرا کر دے گا جو تکنیکی بحث و مباحثے کے ختم ہونے سے آزردہ نظر آتی ہے کہ اس سلسلے میں تھوڑی سی جگہ کیسے حاصل کرے جس کے بارے میں اسے یقین نہیں کہ وہ جاری رکھنا چاہتی ہے۔ سماجی مستقبل کی اسمبلیاں ان اختلافات کے حل میں مددگار ثابت ہوں گی جو تیزی سے رو بہ زوال معاشروں میں، ہمیں بھی تقسیم کرتے ہیں؛ یہ، معکوسی انداز میں، عام سماجی ضروریات کی نشان دہی کریں گی۔ عارضی اکائیوں کے لیے مضبوط بنیادیں۔ اس طرح یہ مختلف سیاسی نظاموں کو ایک تازہ ڈھانچے میں اکٹھا کر دیں گی، جس کے بعد، لازماً، نئے سیاسی طریقہ کار ابھر کر سامنے آئیں گے۔

تاہم سب سے اہم بات یہ ہے کہ سماجی مستقبل کی اسمبلیاں ثقافت کو اعلیٰ صنعت کاری میں وقت کی شمار بندی میں تبدیل کر دیں گی۔ لوگوں کی توجہ ایک مرتبہ طویل المیعاد اہداف پر مرکوز کروانے سے، بجائے محض فوری پروگراموں پر مبذول کروانے کے، لوگوں کو متبادل کے سلسلے میں سے ایک قابلِ ترجیح مستقبل کا انتخاب کرنے کا کہہ کر، یہ اسمبلیاں مستقبل کو انسان دوست بنانے کے امکانات کو ڈرامائی حیثیت سے نواز سکتے ہیں۔ ایسے امکانات جنھیں بہت سے افراد نے گمشدہ سمجھ کر ترک کر دیا۔ ایسا کرنے سے سماجی مستقبل کی اسمبلیاں مضبوط تعمیری قوتوں کو کھلا چھوڑ سکتی ہیں، شعوری ارتقاء کی قوتیں۔

اب تک انسان کا پیدا کردہ تیز رفتار دھکا ہی اس سیارے پر ہونے والے تمام ارتقائی عمل کی بنیاد رہا ہے۔ دیگر انواع کے ارتقاء کی شرح اور سمت، ان کی بقاء کا دارومدار بھی انسان کے کیے ہوئے فیصلوں پر ہے۔ تاہم اس ارتقائی عمل میں کوئی ایسی خلقی چیز نہیں جو خود انسان کی بقا کی ضمانت دے۔

زمانہء ماضی میں سماجی ارتقاء کے متواتر مراحل کے منظر عام پر آنے سے، انسان کی آگہی کا سلسلہ کسی واقعے کے پیچھے آیا بجائے اس سے پہلے آنے سے۔ چونکہ تبدیلی کی رفتار انتہائی سست تھی وہ لاشعوری طور

پر مطابقت پذیری موزوں نہیں رہی، نسبے کو تبدیل کر دینے کی قوت کا سامنا کرتے ہوئے، نئی انواع کی تخلیق کرنے کے لیے سیاروں کی آبادکاری یا زمین کی عدم آبادکاری کے لیے، اب انسان کو خود ارتقاء پر بھی شعوری کنٹرول کا قیاس کر لینا چاہیے۔ تبدیلی کی لہروں پر سفر کرتے ہوئے، مستقبل کے جھٹکے سے گریز کے لیے اسے ارتقاء پر دسترس رکھنی چاہیے، آنے والے کل کو انسانی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کے لیے۔ اس کے خلاف بغاوت کرنے کی بجائے اسے، آج کے تاریخی لمحے سے آگے، مستقبل کی پیش بینی اور اس کی عکس بندی کرنی چاہیے۔

سماجی مستقبلیت کا یہی مقصد ہے، نہ صرف ٹیکنوکریسی کی سبقت اور مزید انسان دوست، مزید دور اندیشی پر مبنی، مزید جمہوری منصوبہ سازی لیکن ارتقاء کے عمل کی شعوری انسانی راہنمائی سے مغلوبیت۔ کیونکہ یہ ایک اعلیٰ ترین لمحہ ہے تاریخ کا ایک اہم موڑ جس پر پہنچ کر انسان یا تو تبدیلی کے مراحل کو شکست دے دیتا ہے یا مٹ جاتا ہے، جہاں پہنچ کر وہ ارتقاء کا غافل آلہ کار بننے کے بعد یا تو وہ اس کا شکار ہو جاتا ہے یا اس کا حاکم بن بیٹھتا ہے۔

اس طرح کے تناسب کا چیلنج ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم تبدیلی کے خلاف ڈرامائی طور پر نئے اور گہرائی کے ساتھ، منطقی ردعمل کا مظاہرہ کریں۔ اس کتاب (کی حیثیت) میں بھی تبدیلی آئی ہے اور یہ اس کے طرفدار کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ پہلے ایک طاقتور ولن کی حیثیت اور پھر یہ ایک طاقتور ہیرو کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ تبدیلی کی جدت اور باقاعدگی کا مطالبہ کرتے ہوئے اس نے اضافی انقلابی تبدیلیوں کا مطالبہ کیا۔ یہ جتنا خلافِ قیاس نظر آتا ہے اس سے کم ہی ہے۔ تبدیلی انسان کے لیے ضروری ہے یہ ہمارے موجودہ 800 ویں مدت حیات میں بھی اتنی ضروری ہے جتنی پہلی مدت حیات میں۔ تبدیلی بذات خود زندگی ہے لیکن متجاوز تبدیلی، بے قابو قسم کی تبدیلی اور بے روک ٹوک تبدیلی اور تیز رفتار تبدیلی نہ صرف انسان کے جسمانی تحفظ پر غالب آجاتی ہے بلکہ اس کے فیصلے کرنے کے عوامل کو بھی متاثر کرتی ہے۔ اس طرح کی تبدیلی زندگی کی دشمن ہے۔

لہٰذا ہماری سب سے دیرینہ ضرورت، پیشتر اس کے کہ ہم اپنی ارتقائی منزل کی بہتر راہنمائی کا آغاز کریں، پیشتر اس کے کہ ہم ایک انسان دوست مستقبل کی تعمیر کر سکیں، یہ ہے کہ ہم تیز رفتاری کو روکیں جو مستقبل کے صدمے اور اس کے خوف میں اضافہ کر رہی ہے اور اس پر زور دے رہی ہے جبکہ اسی لمحے ان مسائل میں بھی شدت لے کر آ رہی ہے جس ۔ سے اس نے نبرد آزما ہونا ہے۔ جنگ، ماحولیاتی معاملات،

نسل پرستی، غریب اور امیر کے درمیان ناشائستہ تضاد، نوجوانوں کی بغاوت، اور بڑے پیمانے پر، انتہائی خطرناک حدتک، نامعقولیت کا ابھرنا۔

اس جنگلی نشو و نما اور تاریخ کے کینسر کے علاج کا کوئی سہل راستہ نہیں۔ ایسی کوئی جادوئی دوائی نہیں جو اس تیز رفتاری میں پنہاں انوکھی بیماری کا علاج کر سکے: مستقبل کا صدمہ تبدیلی کے اس سیلاب میں گرفتار افراد کے لیے میں نے تخفیف کنندگان کی تجویز پیش کی ہے اور معاشرے کے لیے انقلابی شافی طریقہ کار، نئی سماجی خدمات، مستقبل کا مقابلہ کرنے والا تعلیمی نظام، ٹیکنالوجی کے تسلسل کی نئی راہیں اور تبدیلی پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل...... دیگر راہیں بھی تلاش کی جانی چاہئیں۔ تاہم اس کتاب کا بنیادی زور تشخیص پر ہے۔ کیونکہ تشخیص علاج کی پیش روی کرتی ہے اور ہم لوگ اپنی مدد کرنا اس وقت تک شروع نہیں کر سکتے جب تک ہم بڑی گہرائی کے ساتھ مسئلے سے آگاہ نہ ہو جائیں۔

یہ صفحات اپنا مقصد بیان کر چکے ہوں گے، اگر کسی حد تک، یہ اس شعور کو بیدار کر دیں، جو تبدیلی پر دسترس حاصل کرنے کے لیے انسان کو درکار ہے، ارتقاء کی راہنمائی۔ کیونکہ تبدیلی کو کسی راستے پر لگانے کے لیے تبدیلی کے پر تخیل استعمال سے ہم نہ صرف خود کو مستقبل کے دھچکے سے پیدا ہونے والا صدمے سے بچا سکیں گے بلکہ ہم دور تک پہنچ کر، بعید نظر آنے والے ''کل'' کو بھی انسان دوست بنا سکتے ہیں۔

☆☆☆